فتاویٰ صراطِ مستقیم

مولانا محمود احمد میر پوری رحمہ اللہ

مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور

مولانا محمود احمد میرپوری رحمہ اللہ

مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور

فہرست عنوانات

مسائل وضو

جرابوں پر مسح

تیمّم کا بیان

احکام مسجد

نماز کے مسائل

جمعہ کے مسائل

صلوۃ جنازہ

ایصال ثواب کی بدعات

احکام رمضان

مسائل عیدین

قرآن حکیم سے متعلق مسائل

مسائل زکوٰۃ

مسائل حج

جہاد

احکام طلاق

مسنون کام

بدعت کے مختلف روپ

عورتوں کے متفرق مسائل

گانا بجانا

حرام اشیاء

سود کی حرمت

مختلف فرقے

جدید مسائل

متفرق مسائل

مولانا محمود احمد میرپوری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات وخدمات

یورپ کے علامہ 'جمعیت اہلحدیث برطانیہ کے ناظم اعلیٰ 'اسلامی شریعت کونسل کے جنرل سیکرٹری' مجلس تحفظ مقامات مقدسہ کے کنوینئر "صراط مستقیم" کے مدیر مسئول جو کہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۸ء کی شب کو نیوکاسل سے برمنگھم آتے ہوئے کار کے حادثے میں فوت ہوگئے تھے۔ ان کے جنازے میں شرکت بھی کی' تکفین کے وقت بھی موجود تھا' اپنے ہاتھوں سے مٹی بھی ڈالی مگر ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ وہ فوت ہوگئے ہیں۔

مولانا مرحوم کو برطانیہ کے سیاسی، مذہبی اور صحافتی حلقوں میں جو مقام حاصل ہوا ہے وہ کسی شخصیت کو حاصل نہیں ہوا۔ انہیں اس ظلمت کدہ یورپ میں نور توحید کی شمع جلانے والوں میں السابقون الاولون کا مقام حاصل تھا۔ انہوں نے ساکت و جامد، خوابیدہ فکر کو برطانیہ کے اہلحدیث طبقہ میں بیدار کردیا۔ وہ حقیقت میں مسلمانان برطانیہ کیلئے چراغ راہ اور حق کی گونجتی صدا تھے' وہ کتاب و سنت کے داعی' جمعیت اہلحدیث برطانیہ کی پہچان' شان اور آن تھے' وہ شمع رسالت کے ہزاروں نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن اور بڑوں کی امیدوں کا مرکز تھے وہ برطانیہ میں روشنی کا مینار اور علم کا قطب ستارہ تھے جو برطانیہ کے افق پر ہمیشہ تابندہ رہے گا۔ کفر و الحاد کی سرزمین میں امنڈتی ہوئی آندھیوں اور باد صرصر کے طوفانوں میں اسلامی اقدار کی وہ شمعیں جلاگئے ہیں جو کبھی بجھیں گی نہیں۔ وہ اپنا خون دے کر توحید کے دیپ روشن کرگئے ہیں جو کفرستان کو نورستان میں تبدیل کرنے تک جلتے رہیں گے۔ برطانیہ میں ان کی خدمات کا سورج ہمیشہ طلوع رہے گا۔

حالات زندگی:

مولانا مرحوم میرپور آزاد کشمیر کے گاؤں ننھیال میں ۱۹۴۶ء کو پیدا ہوئے پیدائش سے کچھ ماہ بعد والدہ محترمہ فوت ہوگئیں' پرورش ننھیال میں ہوئی۔ ان کے

والد محترم کا نام مولوی نور محمد تھا جو کہ بڑے پکے مذہبی آدمی تھے۔ آٹھویں جماعت تک ہائی سکول جمال میں پڑھتے رہے سکول میں اکثر تلاوت کیا کرتے تھے۔ والد کی وفات کے بعد ان کی تربیت کا ذمہ ان کے چچا نے لیا تھا۔ یتیمی نے آپ کو بچپن میں ہی جفاکش بنادیا تھا اسی لئے ہر مشکل کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے رہے آج اسی مقام پر بچوں کو چھوڑ گئے ہیں جہاں والدین نے انہیں چھوڑا تھا۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ یہ عالم دین بنیں ان کی خواہش کی تکمیل کیلئے گوجرانوالہ کے مشہور دینی مدرسہ جامعہ اسلامیہ میں حصول تعلیم کے لئے آئے۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید بھی آخری کلاسوں میں پڑھتے تھے اسی دوران دونوں کے تعلقات قائم ہوئے جو آخر دم تک قائم رہے۔ اسی دوران راقم الحروف کی ساتھ ان کا تعارف ہوا چار سال تک دوران تعلیم ان کے ساتھ رفاقت رہی ہر مرحلے پر رہنمائی فرماتے اور مفید مشوروں سے نوازتے۔ طالب علمی کے زمانے میں گوجرانوالہ کی ادبی سرگرمیوں مباحثوں اور مناظروں میں حصہ لیتے اور اخبارات و رسائل کیلئے مضامین لکھتے اساتذہ اور طالب علموں میں ہر دلعزیز تھے۔ جناب علامہ حافظ محمد گوندلویؒ اور شیخ الحدیث مولانا ابوالبرکاتؒ کے خاص شاگرد تھے۔ مولانا کے ساتھیوں میں مولانا حفیظ الرحمٰن لکھوی' مولانا محمد اعظم اور مولانا محمد حیات ڈسکوی قابل ذکر ہیں۔ دوران تعلیم انہوں نے لومز لگائی ہوئی تھیں جہاں شنیل کا کپڑا بنایا جاتا تھا۔ کہا کرتے تھے کہ علماء کو معاشی لحاظ سے خود کفیل ہونا چاہئے لوگوں کا دست نگر نہیں تاکہ تبلیغ احسن انداز سے کر سکیں۔ ادیب عربی ادیب عالم اور میٹرک کا امتحان بھی اسی دوران انہوں نے پاس کیا۔ گوجرانوالہ سے فراغت کے بعد بہاولپور یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اور وہاں یونین کے وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوئے وہاں ہی سے قائدانہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں' تقاریر کے مقابلے میں اول انعام حاصل کیا۔ یہاں سے بی اے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے عربی کا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اسی دوران ہفت روزہ اہلحدیث لاہور کے ایڈیٹر رہے اور بیگم کوٹ میں خطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ مزید تعلیم کیلئے جامعہ اسلامیہ مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا وہاں سے فراغت کے بعد برطانیہ میں حکومت

سعودیہ کی طرف سے دینی خدمات سرانجام دینے کیلئے مقرر کئے گئے۔

برطانیہ میں آمد اور جمعیت کی تشکیل نو:

مولانا نے برطانیہ میں توحید کے اس پودے کی خوب آبیاری کی جسے مولانا فضل کریم عاصم نے لگایا تھا۔ انہوں نے جماعت کو منظم کیا۔ وہ افراد جو بکھرے اور سوئے ہوئے تھے ان کو جماعت کی لڑی میں پرو دیا اور جگایا۔ انہیں اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک وہاں توحید کا مرکز نہ قائم کر دیا۔ انہوں نے ہر جگہ توحید و سنت کے سدابہار درخت لگائے تاکہ روحانی سکون کے متلاشی کفر و الحاد کی تپش سے محفوظ رہ کر ان کے سایہ میں بیٹھیں۔ انہوں نے توحید کا پودا سنگلاخ زمین میں لگایا تھا جو اب کافی بڑا ہو گیا ہے جس کی تیس کے قریب شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور مزید شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔ ان کی نظامت میں جماعت اہلحدیث باوجود چھوٹی ہونے کے سب سے زیادہ متحرک اور منظم جماعت تھی۔ ہر برانچ کا مرکز کے ساتھ مضبوط تعلق تھا۔ مرکز سے حکم ملتے ہی برانچوں کے لوگ دیوانہ وار دوڑ پڑتے تھے۔ مولانا ہر برانچ کی کارکردگی کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ انہیں چند سال اور زندگی مل جاتی تو برطانیہ کا کوئی شہر توحید کے مرکز سے خالی نہ رہتا ان کی روح کہتی ہوگی۔

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

مولانا بڑے وسیع الظرف عالم تھے' ہمیشہ رواداری کے قائل تھے' مسائل میں تشدد کو پسند نہ کرتے تھے' اختلاف علم کی حد تک رہے تو برا نہیں' ائمہ کرام کے درمیان بھی اختلاف رہا ہے۔ تمام جماعتوں کے علماء کے ساتھ ان کے بڑے تعلقات اور روابط تھے اسی لئے انہیں ہر ایک عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ کہا کرتے تھے فروعی مسائل کو لڑائی جھگڑے کی بنیاد بنا کر فتنہ بپا کرنا ٹھیک نہیں۔ مساجد میں لڑائی جھگڑے کرانے اور تالے لگوانے والے علماء کے خلاف تھے۔

اتفاق و اتحاد کی علامت:

وہ برطانیہ میں مسلمانوں کے حقوق کے علمبردار اور اتحاد و اتفاق کی علامت

تھے۔ ہر وقت اسی کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ وہ علماء کو اجتماعی اور مشترکہ مسائل میں یگانگت کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ ان کی دعوت کا نقطہ عروج اتحاد تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انگریزوں کے ساتھ مل جل کر بیٹھ سکتے ہیں دعوتیں کھا سکتے ہیں باوجود اس کے کہ انکی تہذیب ثقافت اور مذہب ہم سے جدا ہے تو آپس میں ہمیں بیٹھنے سے کیا چیز مانع ہے۔ اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ایک پلیٹ فارم پر کیوں جمع نہیں ہو سکتے۔ شریعت کونسل کا قیام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں تمام فرقوں اور تمام ممالک کے علماء شریک ہیں۔ یہ ادارہ بڑے احسن طریقہ سے عائلی مسائل حل کر رہا ہے۔ اس کے جنرل سیکرٹری مولانا ہی تھے۔ رؤیت ہلال کے مسئلہ کے بارے میں بڑے متفکر رہتے اور کہتے اللہ کرے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے تاکہ مسلمان عیدیں اکٹھی منا سکیں۔

مولانا کے دل میں قومی تڑپ اور ہمدردی تھی جب بھی مسلمانوں پر کہیں ظلم و ستم ہوتا اور یہ آپس میں جنگ و جدال کرتے تو چلا اٹھتے۔ افغانستان کا مسئلہ ہوتا یا فلسطین کا تحریک آزادی کشمیر کی بات ہوتی یا عراق و ایران کی جنگ کی' افریقہ میں قحط زدگان کے لئے امداد کا مسئلہ ہوتا یا خانہ کعبہ کی حرمت کے تحفظ کا' تو بے قرار و بے تاب ہو جاتے۔ تقریر و تحریر کے ذریعہ مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرتے ساتھ ساتھ مسلمان حکمرانوں کے ضمیروں کو جھنجوڑتے اور غیرت دلاتے کہ حکمرانی کے نشہ نے تمہیں مردہ ضمیر اور بے حس کیوں کر دیا ہے؟

مغربی تہذیب کی یلغار سے نوجوانوں کو بچانے کے بارے بڑے متفکر رہتے اور کہا کرتے تھے کہ والدین اور علماء اس کے حقیقی ذمہ دار ہیں۔ مگر یہ توجہ نہیں دیتے۔ والدین رات دن فیکٹریوں اور کارخانوں میں کام کرتے رہتے ہیں مگر بچوں کی اصلاح اور تربیت کے لئے ان کے پاس وقت نہیں ہے جو اصل سرمایہ ہے۔ رہے اکثر علماء تو انہوں نے اسلام کو چند رسومات اور کھانے پینے کے مسائل تک محدود رکھا ہے۔ جدید مسائل کا حل بتانے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ نوجوانوں کی احسن طریقہ سے اصلاح ہونی چاہئے کیونکہ ان کو سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ صراط مستقیم کے اکثر مضامین نوجوان نسل پر لکھتے تھے۔

مولانا بڑے متحمل مزاج اور بردبار تھے' ہر وقت ان کے چہرے پر بشاشت اور مسکراہٹ رہتی' ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی سے ملتے' اپنے آپ پر تنقید سن کر ہنستے رہتے' تند خو آدمی کو بھی مسکرا کر جواب دیتے۔ وہ بڑی مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک تھے۔ رفقاء کے ساتھ بڑے شگفتہ اور شستہ مذاق بھی کرتے۔ باوجود شہرت ہونے کے عجز وانکساری کے ساتھ رہتے۔ وہ سادگی اور شرافت کا پیکر تھے۔ حسن اخلاق کا مجسمہ تھے ہر ایک آدمی یہی محسوس کرتا جتنے روابط میرے مولانا کے ساتھ تھے اور کسی کے ساتھ نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کام کیے جاؤ صلہ اللہ دے گا۔ لالچ نہ رکھو دولت اللہ دے گا۔ عاجز ہو جاؤ عزت شہرت اللہ دے گا۔ جو آدمی جس چیز کے پیچھے جتنا بھاگتا ہے وہ چیز اس سے اتنی ہی دور بھاگتی ہے۔

وہ اپنی ذات میں انجمن تھے۔ کئی افراد مل کر جو کام نہیں کر سکتے وہ تن تنہا اسے کر لیتے۔ آج جماعت کے تمام افراد سوچ رہے ہیں کہ ہم ان کاموں کو کس طرح مکمل کریں جو انہوں نے شروع کیے تھے۔ جماعت کے احباب کو وہ کام پہاڑ نظر آ رہے ہیں۔ اب تو ہر فرد کو سوچنا ہو گا کہ کس طرح تندہی سے کام کرے کہ جماعت ترقی کی مزید منازل طے کر لے اور اس مشن کو کیسے جاری رکھے جسے مولانا میرپوری مرحوم نے شروع کیا تھا۔ مرکزی قائدین پر بڑا بوجھ آن پڑا ہے کہ وہ توحید کی کشتی کو کس طرح کفر والحاد کے بھنور سے نکال کر ساحل تک لے جاتے ہیں۔

"صراط مستقیم":

"صراط مستقیم" برطانیہ کا مقبول عام دینی رسالہ ہے جو بین الاقوامی معیار کا ہے اسے بام عروج تک پہنچانے کا تمام کریڈٹ مولانا میرپوری مرحوم کو جاتا ہے۔ اداریہ' سوالات کے جوابات' تلخ و شیریں اور اخبار عالم مولانا خود لکھا کرتے تھے جو اس رسالہ کی جان تھے۔ یہ رسالہ برطانیہ کی شب تاریک میں قندیل رہبانی ہے۔ یہ جہالت کے اندھیرے میں روشنی کا مینار ہے۔ ہر فرقے کے لوگ اسے بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بڑی بے قراری سے اس کے شائع ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ مولانا

کا طرز تحریر نہایت سادہ، دلکش اور دل نشین ہوتا تھا۔ ان کے الفاظ میں آمد ہوتی تھی۔ بڑے ڈھلے ہوئے الفاظ استعمال کرتے تھے جو قاری کے دل میں اتر جاتے تھے۔ راقم الحروف میں ان کی تحریریں پڑھ کر ہی لکھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ ہم جو لکھتے اس کی تصحیح بھی فرماتے بلکہ کہتے اس موضوع پر لکھو۔

اب اس رسالہ کے مدیر مسئول جناب حفیظ اللہ خان صاحب ہیں جو مولانا مرحوم کے دست راست تھے اللہ کرے ان کی ادارت میں یہ رسالہ دن دگنی اور رات چگنی ترقی کرے۔ اس رسالے کو جاری رکھنے کے لئے ہر فرد کو دست تعاون بڑھانا چاہئے تاکہ معاشی رکاوٹوں کے بغیر یہ جاری و ساری رہے۔ یہی بہترین صدقہ جاریہ ہے اسی سے مولانا کو روحانی سکون ملے گا۔

میرپور خاص کا مرد درویش:

برطانیہ میں اکثر لوگ جو پاکستان سے آئے ہیں ان کا تعلق میرپور سے ہے۔ یہ لوگ جفاکشی اور کاروباری لحاظ سے مشہور ہیں۔ مگر مولانا نے میرپور کو علمی لحاظ سے متعارف کرایا کہ اس سنگلاخ زمین میں ہیرے اور موتی بھی ہیں۔ ایسی عبقری شخصیات بھی موجود ہیں جو عالم اسلام میں شہرت کے مالک ہیں۔ میرپور کے لوگوں کو فخر تھا کہ مولانا کا تعلق اس سرزمین سے ہے ان کی وفات سے یہ علاقہ علمی لحاظ سے قلاش ہو گیا ہے علم سے یہ لوگ تہی دامن ہو گئے ہیں۔ یہ خطہ علماء سے یتیم ہو گیا ہے۔ انہوں نے میرپور کو سیاسی، مذہبی اور صحافت کے لحاظ سے مشہور کرایا تھا۔ ایسے لوگ صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ یہ میرپور کے مرد درویش اور مرد مومن تھے۔ یہ علاقہ اپنے علماء کی قدر ناشناسی پر بھی نوحہ کناں ہو گا۔

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تھا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

آئندہ عزائم:

مولانا کا پروگرام تھا کہ سلفی انداز سے قرآن کی تفسیر لکھی جائے جس میں جدید

مسائل کا حل بھی ہو۔ نوجوانوں کیلئے لٹریچر لکھنے کا پروگرام تھا۔ ان کا خیال تھا اب چھ ماہ مجھے میرپور رہنا چاہیئے تاکہ وہاں بھی جماعت کو منظم کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ تمام اسلامی ممالک میں سلفی حضرات کی عالمی تنظیم بنانی چاہیئے اس سلسلہ میں انہوں نے مختلف حضرات سے بات چیت بھی شروع کر دی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ جماعت کا اپنا پریس ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کاروباری حضرات کی ایک میٹنگ بھی بلائی تھی۔ غرضیکہ مولانا کے ذہن میں ہر وقت کوئی نہ کوئی پلان رہتا جس سے جماعت ترقی کر سکے۔

مولانا کا آخری سفر:

برطانیہ میں ان کا جنازہ تاریخی تھا- ہر طرف انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا تھا- ہر فرد غم واندوہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر آدمی دوسرے سے ملتا- آہوں' سسکیوں سے اس کی ہچکی بند جاتی- ہر آنکھ نمناک تھی اور دل فگار تھا اللہ والوں کے جنازے یوں ہی ہوا کرتے ہیں۔ پھر جنہوں نے جنازہ پڑھایا انہوں نے بھی ہر آدمی کو رلا دیا۔ بڑا رقت آمیز برمنگھم کی مرکزی مسجد میں جنازہ تھا۔ ایسے لوگ دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ جنازے پر اتنی بڑی تعداد کو دیکھ کر ایک ساتھی نے کہا آج پتہ چلا مولانا کس پائے کے عالم تھے۔ عالم کی قدر مرنے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ مولانا کو ان کی وصیت کے مطابق برمنگھم کے قبرستان میں دفنایا گیا۔ ان کی ناگہانی وفات سے جو ملی' سیاسی اور مذہبی خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پورا ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ مولانا نے اپنے پیچھے بیوہ اور دو بچے سوگوار چھوڑے ہیں- دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں صبر جمیل دے اور مولانا کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

جس کو پامال کیا باد حوادث تو نے
یہی غنچہ کبھی کھلتا تو گلستان ہوتا ہے

☆☆☆

عرض مرتب

صراط مستقیم میں سوال وجواب کے کالم میں مولانا محمود احمد میرپوری قارئین کے سوالات کے جوابات دیتے تھے جو برطانیہ' دیگر یورپین ملکوں' متحدہ عرب امارات اور دیگر ممالک سے آتے تھے۔ مولانا یہاں کے ماحول اور مسائل سے بخوبی آگاہ تھے حالات حاضرہ پران کی کڑی نظر ہوتی تھی۔ مسلم کمیونٹی کو جن باتوں سے واسطہ پڑتا تھا وہ ان کی نظر میں تھا۔ اس لئے جوابات دیتے وقت تمام چیزوں کو ملحوظ رکھ کر جواب دیتے۔ مسلمانوں کو عموماً یہاں حلال' حرام' نکاح' طلاق' تعمیر مساجد' غیر مسلموں سے تعلقات' نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت جیسے مسائل سے واسطہ پڑتا تھا۔ مولانا ان کا بڑی تفصیل سے جواب دیتے اور فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر اسی وجہ سے یہ کالم تمام فرقوں کے لوگ بڑی پسندیدگی سے پڑھتے۔

مولانا میرپوری مرحوم آخری بار جب سکیپٹن تشریف لائے تو میں نے ان کے سامنے تجویز پیش کی کہ سوال وجوابات کے کالم کو کتابی شکل میں مرتب کردیں تو یہ یہاں کے لوگوں پر بہت بڑا احسان ہوگا بلکہ پاک وہند کے لوگ بھی اس سے مستفید ہوں گے۔ مولانا کہنے لگے میرے پاس تو وقت نہیں' تمہیں یہ کام کرنا ہوگا۔ میں تمہاری ڈیوٹی لگاتا ہوں مگر مولانا جلد ہی داغ مفارقت دے گئے۔ جبکہ کام کا ابھی آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔

مولانا کے ساتھ آخری نشست میں حامی تو بھرلی مگر کام شروع کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا آخر پاکستان سے سالانہ تعطیلات گزار کر مئی میں واپس آئے تو سوچا اس وعدہ کو اب ایفاء کرنا چاہئے اور اس کی تکمیل ہونی چاہیے جس کی ڈیوٹی مولانا زندگی میں لگاگئے تھے۔ اللہ کا نام لے کر رسائل اکٹھے کئے اور ان کی عرق ریزی کی دوماہ کا عرصہ انہیں ترتیب دینے میں لگا۔ پہلے خیال تھا صرف ایک ہی حصہ ہوگا جب

ترتیب کی باری پڑی تو کتاب کا حجم بڑھ گیا لہٰذا اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

قارئین کرام بعض مقامات پر آپ کو کچھ بے ترتیبی سی نظر آئے گی اس کی وجہ محض بعض حضرات کے سوالات کا خلط ملط ہونا ہے۔ ایک ایک سوال کے کئی کئی ضمنی سوالات بنتے تھے جنہیں بعینہ اسی طرح رہنے دیا گیا ہے۔ بعض جگہ آپ کو تکرار بھی نظر آئے گی دراصل قارئین بار بار مولانا سے سوالات پوچھتے رہتے ہیں جن کے جوابات وہ مختلف انداز سے دیتے رہے پھر ان میں چیزیں بھی نئی ہوتی تھیں' اس لئے تکرار کو باقی رکھا گیا۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر سی کوشش کو قبول و منظور فرمائے۔

اظہار تشکر:

اللہ تعالیٰ کا بے حد احسان و امتنان ہے جس نے اس ناچیز پر اپنا خاص لطف و کرم کیا کہ صراط مستقیم کے گیارہ سالہ شماروں کے علمی موتی یکجا کرنے کی سعادت بخشی۔ اگر اس کا فضل و کرم نہ ہوتا تو یہ کام نہ کر سکتا۔

اس کے ساتھ ساتھ جمعیت اہلحدیث برطانیہ کے ناظم اعلیٰ مولانا عبدالہادی صاحب اور صراط مستقیم کے مدیر مسئول جناب حفیظ اللہ خان صاحب کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے نہ صرف کتاب پر نظر ثانی فرمائی بلکہ مفید مشوروں سے بھی نوازا۔

آخر میں عزیزان محمد جمیل اور ریاست علی کا اگر شکریہ ادا نہ کروں تو بخیلی ہوگی جو نہ صرف میری ہمت بندھاتے رہے بلکہ کتاب کی تیاری کے سلسلے میں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی فوراً بازار سے لا کر دیتے۔ دعا ہے اللہ انہیں اور دیگر بچوں کو دین کا سچا خادم بنائے۔ آمین

ثناءاللہ سیالکوٹی

خطیب سکپٹن

۱۴ اڈلینڈ سٹریٹ۔ سکپٹن انگلینڈ۔

☆☆☆

عمل' ایمان اور عقائد

کیا عمل ایمان کا حصہ ہے؟

مسلمان عمل نہ کرنے سے اسلام سے خارج ہو جائے گا؟

مکرمی جناب مدیر مسئول پندرہ روزہ صراط مستقیم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مندرجہ ذیل سوال کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ مطلوب ہے۔ شکریہ۔

سوال: کیا عمل ایمان کا حصہ ہے؟ کیا اعتقادات پر ایمان لانے والا عمل نہ کرنے سے اسلام سے خارج تصور ہو گا؟

دعاگو۔

نذیر احمد صغیر ایجباسٹن برمنگھم نمبر ۱۶

جواب: ایمان اور کفر کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ خصوصاً کسی کلمہ گو مسلمان کو کافر قرار دینا' اسے دائرہ اسلام سے خارج کرنا' یہ مسئلہ بڑا نازک ہے اور اس میں بے حد احتیاط کی ضرورت ہے اور پھر ایمان کی تعریف' ایمان اور عمل کا تعلق اور ایمان کے ساتھ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب' یہ مسائل خالص علمی ہیں اور بسا اوقات ایک عام آدمی جسے قرآن وحدیث یا ائمہ دین کے اجتہادات کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہوتا' وہ جب ان مباحث میں پڑتا ہے تو اس کا ذہن کافی الجھ جاتا ہے- لہٰذا اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے بنیادی طور پر قرآن وحدیث کا مطالعہ ضروری ہے۔ خصوصاً ایمانیات کی بحث کے بارے میں بڑی دقت نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ اس موضوع کی پیچیدگیوں سے بچتے ہوئے عام فہم انداز سے اس مسئلے کی وضاحت کروں تاکہ ایک عام مسلمان بھی اس سے فائدہ حاصل کر سکے۔

اس موضوع پر اب تک قرآن و حدیث کی روشنی میں جتنا کچھ کام کیا گیا اس کے نتیجے میں درج ذیل آراء یا نظریے سامنے آئے ہیں۔

ا۔ کلمہ پڑھنے کے بعد جو شخص بھی اہل قبلہ میں شامل ہو گیا' اسے کسی شکل میں بھی کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۲۔ کلمہ پڑھنے کے بعد جس نے کبیرہ گناہ کیا' وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

۳۔ کلمہ پڑھنے کے بعد جس نے کبیرہ گناہ کیا وہ دائرہ اسلام سے تو خارج ہو جائے گا لیکن کافر بھی نہیں ہو گا بلکہ کفر اور اسلام کے درمیانی درجہ پر رہے گا۔

۴۔ جس نے ایمان کے بعد اعمال کا کھلا انکار کیا اور اسلام میں محرمات کے وجود سے بھی انکار کر دیا وہ اسلام سے خارج ہے۔

۵۔ بعض وہ اعمال جن کے تارک پر واضح طور پر کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے' ان کے ارتکاب سے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گا۔

۶۔ اعمال نہ کرنے سے جہنم میں جائے گا لیکن ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا بلکہ اگر اس کا عقیدہ درست ہو یعنی شرک کا ارتکاب نہ کیا تو عذاب کے بعد وہ جنت میں داخل ہو گا۔

قبل اس کے کہ مندرجہ بالا نکات پر تفصیل سے بحث کی جائے ایمان کی تعریف کے بارے میں بیان کرنا ضروری ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ایمان اور عمل کا ایک ساتھ ذکر آیا ہے اور اس مفہوم کی کثیر آیات آئی ہیں کہ ایمان کے لئے عمل شرط ہے اور عمل ایمان کا حصہ ہے۔ ارشاد ربانی ہے ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا﴾ (الکھف : ۱۰۷)

حدیث میں اسلام کے بنیادی ارکان کا جہاں ذکر آیا وہاں عقیدے کے ساتھ اعمال کا بھی بیان آیا ہے۔ بخاری شریف کی حدیث ہے: ((بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله و ان محمدا رسول الله واقام الصلوة وایتاء الزكوة والحج و صوم رمضان))[1]

[1] بخاری کتاب الایمان رقم الحدیث ۸ ' ترمذی کتاب الایمان رقم الحدیث ۲۷٤۹

یہاں شہادتین کے اقرار کے بعد جن کا تعلق عقائد سے ہے اعمال نماز' زکوٰۃ حج اور روزے کا ذکر ہے۔ قرآن و حدیث میں عقائد و اعمال کے بیان میں یہ اسلوب ان دونوں کے باہمی ربط کی اہمیت کافی حد تک واضح کر دیتا ہے اس لئے کہا گیا کہ ایمان نام ہے دو چیزوں کا یعنی قول (اقرار) اور عمل کا۔ قول سے مراد زبان سے اللہ تعالیٰ کی ذات (مع جملہ صفات) کا اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا (ان تمام چیزوں سمیت جنہیں لے کر آپ آئے) اقرار کرنا۔ اس طرح ایمان کی تعریف یہ ہو گی۔

دل سے تصدیق' زبان سے اقرار اور اعضاو جوارح سے عمل۔ یہ وہ متفق علیہ تعریف ہے جس پر جمہور ائمہ حدیث و سنت کا اتفاق ہے۔ کچھ لوگوں نے ایمان صرف تصدیق اور اقرار کو کہا ہے۔ بعض کے نزدیک صرف اقرار کا نام ایمان ہے۔ لیکن یہ دونوں تعریفیں نامکمل ہیں اور صحیح بھی نہیں۔

اب ایمان کی پہلی جامع تعریف کی روشنی میں عمل کی حیثیت کی تعین میں پھر دو رائے ہیں- پہلی یہ کہ عمل ایمان کا حصہ ہے اور عمل نہ ہوا تو ایمان نہیں ہو گا یعنی عمل ایمان کے وجود کے لئے شرط ہے- دوسری رائے یہ ہے کہ عمل ایمان کی صحت یا وجود کے لئے ضروری نہیں بلکہ تکمیل کے لئے ضروری ہے یعنی عمل کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہو گا۔

ظاہر ہے جہاں تک دل کا تعلق ہے تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے کہ کس کے دل میں کیا ہے؟ لہٰذا تصدیق کے بارے میں کوئی دوسرا آدمی کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ اس لئے زبان کا اقرار ہی وہ چیز ہے جس کے بعد ایک آدمی کو مسلمان کہا جائے گا اور اس پر اسلامی قوانین جاری ہوں گے۔ ہاں اعمال کے ذریعے بعض اوقات اس کے دل کی تصدیق کی کیفیت کا علم ہو سکتا ہے اور جن اعمال کے ارتکاب پر اس کی تصدیق اور اقرار دونوں کالعدم ہو جاتے ہیں۔ اس پر کچھ تفصیل سے ہم بعد میں لکھیں گے-

اور جب کسی پر مطلق ایمان کا لفظ استعمال ہو گا تو وہ اس کے اقرار کی بنیاد پر ہو گا

اور جب کسی پر مطلق کفر کا لفظ استعمال ہو گا تو وہ اس سے کسی کافر جیسا عمل سرزد ہونے کی وجہ سے ہو گا اور جب کسی عمل کے ترک کی وجہ سے ایمان کی نفی کی جاتی ہے تو اس سے مراد کمال ایمان کی نفی ہے نہ کہ ایمان کی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ عمل ایمان کا حصہ ہے اور تکمیل ایمان کی شرط ہے کہ نفس ایمان کی‘ رہی یہ بات کہ اعتقادات پر ایمان لانے والا یعنی زبان سے عقائد اسلامی کا اقرار کرنے والا کچھ برے اعمال کا ارتکاب کرنے سے یا کچھ فرائض کے ترک کرنے سے دائرہ اسلام سے خارج ہے یا نہیں‘ یہ مسئلہ بحث طلب ہے- لہٰذا ہم تفصیل سے اس کا جائزہ لیتے ہیں اور شروع میں بیان کی گئی چھ مختلف آراء کی روشنی میں اس پر بحث کرتے ہیں۔

پہلی رائے:

پہلی رائے میں یہ کہا گیا ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جو شخص کلمہ پڑھتا ہے اور اسلام پر چلنے کا اقرار کرتا ہے وہ مسلمان ہے کیونکہ شہادتین کے اقرار کے بعد وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ رائے اس لئے درست نہیں کہ منافقین رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں شہادتین کے اقرار کے باوجود یہود و نصاریٰ سے بھی خطرناک کفار قرار دیئے گئے۔ حالانکہ وہ بظاہر اہل قبلہ میں سے بھی تھے مگر اس کے باوجود انہیں کافر قرار دیا گیا اور پھر اس بارے میں تو کسی کا اختلاف ہی نہیں کہ جو اسلامی فرائض کا انکار کرے اور محرمات کو حلال کرے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے‘ بے شک وہ کتنے اقرار کیوں نہ کرے۔ لہٰذا پہلی رائے درست نہیں ہے۔

دوسری رائے:

دوسری رائے میں جس نے کلمہ طیبہ پڑھنے کے بعد کوئی کبیرہ گناہ کیا‘ وہ دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔ ان کی دلیل آیات و احادیث ہیں۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (المائدة : ٤٤)

''جنہوں نے اللہ کے نازل کردہ قانون کے ذریعہ فیصلہ نہ کیا، وہ کافر ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سباب المسلم فسق و قتاله كفر[1]

''مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔''

آپؐ نے فرمایا جس نے کسی کو کافر کہہ کر پکارا، ان میں سے ایک ضرور کافر ہوگا۔

یہ اور اس طرح کی اور بھی متعدد روایات ہیں جن میں کسی عمل کے ترک کرنے یا گناہ کے ارتکاب پر کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے بھی گناہ کبیرہ کیا وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوگا۔ لیکن یہ رائے بھی کلی طور پر درست قرار نہیں دی جاسکتی کہ محض لفظ کفر سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ دائرہ اسلام سے نکل گیا۔ بلکہ کفر کا لفظ بعض حالات میں صرف لغوی معنوں میں یا مجازی طور پر استعمال کیا جاتا ہے بعض دفعہ اس سے مراد کفر عمل ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ہم یہ کہیں کہ وہ کافر ہو جاتا ہے تو وہ مرتد ہو گیا اور مرتد کی سزا معلوم ہے۔ مثلاً مسلمان سے قتال کو کفر کہا گیا جب کہ قرآن میں یہ وضاحت ہے کہ قتل کے قصاص کے طور پر قتل ہوگا۔ یہاں قصاص کے بیان میں ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى﴾ (البقرة : ١٧٨) کے الفاظ آئے ہیں کہ اے ایمان والو! تمہارے لئے قصاص فرض ہے تو قتل کے بعد بھی انہیں اہل ایمان کہا گیا۔

تیسری رائے:

یہ کہ اسلام سے تو خارج ہو جاتا ہے لیکن کافر بھی نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ اس نے ایسا کام کیا جس نے اسے اسلام کے دائرے سے تو نکال دیا لیکن وہ

---

[1] بخاری رقم الحدیث ٤٨، ترمذی رقم الحدیث ٢٠٦٦۔ ابن ماجه ٦٩۔ فتح الباری ج ١٤ کتاب الفتن رقم الحدیث ٧٠٧٦۔

کافر بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہ زبان سے مسلمان ہونے کا اقرار کرتا ہے- لہٰذا وہ مسلمان ہے نہ کافر لیکن وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ یہ رائے درست نہیں ہے کیونکہ اقرار کی وجہ سے وہ اگر کفر میں داخل نہیں ہوا تو پھر اس پر ہم ہمیشہ جہنم میں رہنے کا حکم نہیں لگا سکتے۔

چوتھی رائے:

جس نے اقرار کے بعد فرائض یا دوسرے اعمال کا کھلا انکار کیا- نہ حرام کو حرام سمجھا اور نہ حلال کو حلال بلکہ ان سب چیزوں کو تسلیم کرنے سے اعلانیہ انکار کردیا تو ایسے شخص کے دائرہ اسلام سے خارج ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

پانچویں رائے:

وہ اعمال جن کے کرنے پر کفر کا لفظ آیا ہے یا کسی فرض کے ترک کرنے پر جو کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے صرف انہی اعمال کے ارتکاب یا بعض کے ترک پر کفر کا فتویٰ لگایا جا سکتا ہے۔ جیسے یہ آیت ہے ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (المائدة : ٤٤) جس نے اللہ کے نازل کردہ قانون سے فیصلہ نہ کیا وہ کافر ہیں۔

ایک حدیث ہے-

بين العبد و بين الكفر ترك الصلوة [1]

"(مسلمان) بندے اور کافر کے درمیان ترک نماز ہے" (یعنی جس نے نماز ترک کی وہ کفر میں داخل ہو جائے گا)

ایک دوسری حدیث ہے کوئی شخص بھی اس وقت مومن نہیں ہوتا جب وہ چوری کرتا ہے یا زنا کرتا یا شراب پیتا ہے۔ بظاہر یہ رائے کافی مدلل ہے اس لئے چھٹی رائے کے بیان کا جائزہ لیتے ہیں۔

چھٹی رائے:

اگر شرک نہیں کیا تو وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا بلکہ کبھی نہ کبھی اس کی

[1] مسلم ۲/ ۷۰' ۷۱ ابو عوانہ ۱/ ٦١' ابوداؤد ٤٦٧٨' ترمذی ٢٦٢٠' ابن ماجه ١٠٧٨

نجات ضرور ہو گی۔ کیونکہ قرآن میں واضح ارشاد ہے کہ

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ (النساء : ۱۱۶)

"اللہ شرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اس کے علاوہ جسے چاہے گا معاف کرے گا۔"

ظاہر ہے وہ کافر نہیں ہو سکتا ورنہ اس کے لئے معافی نہیں ہو سکتی۔

جائزہ :

پانچویں اور چھٹی رائے میں یہ فرق ہے کہ چھٹی رائے میں سوائے شرک کے اور کسی گناہ سے اس سے قیامت کے دن کفار جیسا سلوک نہیں ہو گا جبکہ پانچویں رائے میں اور تو کسی گناہ سے کافر نہیں ہوتا لیکن جن کاموں کے کرنے یا ترک پر کفر کا لفظ قرآن یا سنت میں آیا ہے ان سے کافر ہو سکتا ہے۔

اب جب ہم ان آیات یا احادیث کا جائزہ لیتے ہیں جن میں کفر کا لفظ استعمال ہوا ہے تو ہم مطلق اس لئے وہاں کفر کا حکم نہیں لگاتے کہ وہاں کفر کا حقیقی معنی قرار دینے سے بعض دوسری آیات سے تصادم ہوتا ہے جیسا کہ ایک طرف تو قتال مسلم کو کفر کہا گیا اور دوسری طرف مسلمانوں میں باہمی قتال کے موقع پر صلح کرانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دونوں میں سے ایک جگہ تو ہمیں تاویل کرنا پڑے گی کہ وہاں کفر کا حقیقی معنی مراد نہیں ہے۔ اس لئے ہم مطلق یہ نہیں کہہ سکتے کہ جہاں بھی کفر کا لفظ آیا وہاں مراد حقیقی کفر ہے بلکہ اس کے لئے مزید شواہد تلاش کرنا ہوں گے۔

تمام دلائل کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفر کے مختلف درجات ہیں جس طرح ایمان کے درجے ہیں۔ اس لئے کسی جگہ تو کفر انکار کے معنی میں استعمال کیا گیا اور کسی جگہ کفر سے مراد کفر دون کفر ہے (یعنی وہ کفر نہیں جس سے دائرہ اسلام میں سے نکل جائے) بلکہ نچلے درجے کا کفر۔ یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجازی معنی میں کفر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

کفر کی تقسیم:

میرے خیال میں اگر ہم کفر کی ایک تقسیم کریں تو اس مسئلے کو سمجھنے میں کافی آسانی پیدا ہو جائے گی وہ اس طرح کہ کفر کی دو قسمیں ہیں: کفر اعتقادی اور کفر عملی

اگر تو عقیدۃً کسی حرام کو حلال سمجھا یا کسی حکم کو بے کار اور فضول جانا تو یہ کفر اعتقادی ہے۔ اس کا اعتقاد یہ ہے کہ نماز اسلام میں نہیں' اس کا پڑھنا فضول ہے۔ اس کا اعتقاد ہے کہ سود حرام نہیں۔ شراب حلال یا زنا جائز ہے تو یہ کفر اعتقادی ہے جس کے بعد وہ شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا جیسا کہ چوتھی رائے میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن میں جو آیا ہے کہ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (المائدہ: ٤٤) جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قوانین کے ذریعے فیصلے نہیں کرتا وہ کافر ہے۔ اب یہاں ہم بغیر تفصیل کے کفر کا فتویٰ نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ یہاں حاکم کے احوال کا خیال رکھنا ہو گا۔ اگر کوئی حکمران یا جج احکام الٰہی کو غیر واجب سمجھتا ہے یا قوانین الٰہی کو فرسودہ خیال کرتے ہوئے انہیں نافذ نہیں کرتا یا حقیر سمجھ کر ان کے ذریعے فیصلے نہیں کرتا تو یہ کفر اعتقادی ہے اور اسے ہم کفر اکبر کہہ سکتے ہیں اور ایسا حکمران دائرہ اسلام سے بہر حال خارج ہے اور اگر وہ ان قوانین کے وجوب کا قائل ہے اور عدم نفاذ کو اپنی کوتاہی سمجھتا ہے اور اس پر اللہ کی گرفت کا بھی اقرار کرتا ہے تو یہ نافرمان ہے۔ ایسے شخص کے لئے جب کفر کا لفظ استعمال ہو گا تو وہ مجازی ہو گا اور ہم اسے کفر عملی کہیں گے نہ کہ کفر اعتقادی۔

خلاصہ کلام:

اب تک کی بحث سے یہ تو واضح ہو گیا کہ کفر اعتقادی کا مرتکب تو دائرہ اسلام سے خارج ہے لیکن باقی کاموں میں اگر اللہ نے چاہا تو اس کی بخشش ہو سکتی ہے۔ اگر بخشش نہ بھی ہوئی تو عذاب بھگتنے کے بعد جنت میں داخل ہو گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ واضح ارشاد ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (النساء: ١١٦) لیکن یہاں ان دلائل کو نظر انداز کرنا بھی آسان نہیں جن

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض اعمال کے ترک سے کفر لازم آتا ہے خصوصاً نماز اور زکوٰۃ کے بارے میں- جن اعمال پر کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ان کے متعلق تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہاں کفر مجازی مراد ہے یا کفر عمل مراد ہے لیکن صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے بارے میں یہ کہنا بظاہر ممکن نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ پانچویں رائے کے ضمن میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس لئے ہم محتاط سے محتاط الفاظ میں بھی یہ کہیں گے کہ تارک نماز اور زکوٰۃ کے ساتھ معاملہ کفار والا ہی ہو گا۔اس سلسلے میں یہ آیت مضبوط دلیل ہے۔

﴿فَإِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ (التوبة : ٥)

"اگر وہ کفر سے تائب ہو کر اسلام لے آئیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کے لئے راستہ چھوڑ دو۔ یعنی ان سے قتال نہ کرو۔"

اس آیت کی تائید بخاری شریف کی یہ حدیث بھی کرتی ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشهدوا ان لا اله الا الله و ان محمد رسول الله و یقیموا الصلوة ویوتوا الزکوة فاذا فعلوا ذالك عصموا منی دمائهم و اموالهم الا بحق الاسلام و حسابهم علی الله–[1]

"مجھے لوگوں سے اس وقت تک قتال کا حکم ہے جب تک وہ یہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔جب یہ کریں تو ان کے خون اور مال محفوظ ہو گئے سوائے اسلامی حق کے (یعنی کوئی ایسا جرم کریں جس کی سزا قتل ہو) اور ان کا حساب اللہ کے پاس ہے۔"

اس آیت اور حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا معاملہ دوسرے احکام سے قدرے مختلف ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بھی مانعین زکوٰۃ سے اسی بنیاد پر لڑائی جائز قرار دی تھی اور نماز اور زکوٰۃ دونوں کے بارے میں یکساں موقف اختیار کیا تھا۔

---

[1] ترمذی ۲۷۴/۲

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اعمال ایمان کا حصہ ہیں اور ان کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا، لیکن تمام اعمال ایمان کی کلی شکل نہیں۔ بعض اعمال کے چھوڑنے سے وہ دائرہ اسلام سے تو خارج نہیں ہوگا لیکن اسے جہنم کا عذاب ہو سکتا ہے اور بعض اعمال جیسے شرک کا ارتکاب ہے ان سے وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور منکر فرائض یا منکر حلال و حرام دائرہ اسلام سے خارج ہوگا۔ نماز زکوٰۃ کے تارک کا مسئلہ کافی نازک ہے لیکن ہمارے نزدیک راجح یہی ہے کہ وہ کفر کا کام کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ حساب کس عمر سے لیتے ہیں؟

سوال: برمنگھم سے عائشہ ملک (عمر ۷ سال) لکھتی ہیں: اللہ کتنی عمر سے حساب لینا شروع کرتا ہے؟

جواب:- دنیا میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی اسی وقت ضروری ہوتی ہے جب کوئی مرد یا عورت بالغ ہو جائے اور اسی بلوغت کی عمر کے اعمال کے متعلق قیامت کے دن باز پرس ہوگی اور حساب و کتاب لیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے کہ

"جب تمہارے بچے بالغ ہو جائیں تو وہ بھی گھروں میں اجازت لے کر داخل ہوں جیسے ان سے پہلے بڑوں کے لئے یہ حکم ہے۔" (سورہ نور: ۵۹)

اب یہاں بالغ ہونے سے پہلے بچوں کے لئے کوئی پابندی نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بہن کو جب باریک کپڑے پہنے دیکھا تو آپ نے فرمایا:

"اے اسماء جب کوئی لڑکی بالغ ہو جائے تو اس کے لئے روا نہیں کہ وہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے سوا کوئی چیز غیر مردوں کے سامنے ظاہر کرے"

بالغ یا جوان ہونے کے بارے میں عمر کی کوئی حد مقرر کرنا ممکن نہیں۔ بعض علاقوں میں ۱۲ یا ۱۳ سال کے بچے بالغ ہو جاتے ہیں اور بعض ملکوں میں اس سے کم عمر کے بچے بھی جوان ہو جاتے ہیں۔ یہ انفرادی اور طبعی مسئلہ ہے۔ والدین بچوں کے بالغ

ہونے کے بارے میں بہتر معلومات رکھ سکتے ہیں۔

شرک کی حقیقت ونوعیت کیا ہے؟

سوال: کونٹری سے محمد دین صاحب لکھتے ہیں میرے دو مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات آئندہ کسی شمارے میں تفصیل سے دے کر ممنون فرمائیں

ا۔شرک کیا ہے' اس کی نوعیت کیا ہے؟

۲۔شرک و بدعت کے مرتکب کس زمرے میں آتے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں مخلوق میں سے کسی کو شریک کرنا شرک ہے چاہے کوئی مخلوق میں سے کسی کو اللہ کے برابر سمجھے یا مد مقابل یا وہ کام جو اللہ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں وہ مخلوق کے لئے کرتا ہے تب بھی وہ شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔ شرک وہ سنگین جرم ہے جو ساری عبادات واعمال کو غارت کر دیتا ہے اور اگر کوئی شخص توبہ کے بغیر مر جاتا ہے تو یہ نا قابل معافی جرم ہے۔ارشاد ربانی ہے:۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرِكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذَالِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلاً بَعِيْدًا﴾ (النساء : ۱۱۶)

"اللہ تعالیٰ اس شخص کو نہیں بخشے گا جس نے اس کے ساتھ شرک کیا وہ بڑی دور کی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔"

اسی طرح قرآن حکیم میں اور بھی بہت سے مقامات پر شرک کے ظلم عظیم ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور مشرک کو ابدی جہنمی قرار دیا گیا ہے۔ شرک کی نوعیت معلوم کرنے کے لئے درج ذیل امور کا جاننا ضروری ہے:

(ا) سب سے پہلے اللہ کی ذات کی پہچان اور اس کی صفات کی معرفت اور توحید کا حقیقی مفہوم جاننا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ شرک توحید کی ضد ہے اور توحید کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں وحدہ لاشریک ہے اور کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد

رسول اللہ کے پہلے جز کا یہی مطلب ہے مثلاً توحید باری تعالیٰ یہ ہے کہ:

ا- کائنات کی کوئی چیز بھی اللہ کی ذات کی مانند نہیں۔

ب- اللہ کو کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی۔

ج- اللہ کے سوا کسی کی عبادت روا نہیں۔

د- وہ ذات نہ فنا ہو گی نہ ختم ہو گی۔

ھ- اس جہاں میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے حکم اور مشیت سے ہوتا ہے۔

و- وہ زندہ ہے اسے موت نہیں آئے گی اور نہ ہی اسے نیند آتی ہے۔

ز- موت اور زندگی کلی طور پر اس کے ہاتھ میں ہے۔

ح- کائنات کی ہر چیز اس کے ارادے کے مطابق چلتی ہے اور وہی نفع نقصان کا مالک و مختار ہے۔

یہ اور اس طرح کی متعدد دوسری صفات میں وہ واحد و یکتا ہے۔ اب مثلاً

(۱) کوئی شخص مخلوق میں سے کسی کے بارے میں (چاہے وہ کتنی ہی بلند ہستی کیوں نہ ہو) یہ کہتا ہو کہ اسے موت نہیں آتی یا وہ ہمیشہ زندہ ہے تو یہ شرک ہو جائے گا۔

یا یہ کہتا ہے کہ بتوں کی عبادت تو شرک ہے مگر اللہ کے نیک بندوں کی عبادت جائز ہے تو وہ غلطی پر ہے۔ اور شرک کا ارتکاب کر رہا ہے۔

(۲) دوسری بات جس کا جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ شرک کا معنی یہ نہیں کہ اللہ کا انکار کر دیا جائے۔ انبیاء کو جھٹلا دیا جائے تب ہی کوئی مشرک ہوتا ہے بلکہ اللہ کی ذات کو ماننے والے اور نبیوں کو ماننے والے بھی مشرک ہو سکتے ہیں۔

قرآن نے اسے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ اللہ پر ایمان کے باوجود لوگ مشرک ہیں اور ان کی اکثریت شرک میں مبتلا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ (یوسف: ۱۰٦)

"یعنی لوگوں میں سے اکثر ایمان کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں۔"

یہود و نصاریٰ کو جو مشرک قرار دیا گیا وہ اس لئے نہیں کہ ملحد اور منکرین وجود

باری تعالیٰ تھے بلکہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ کی مخلوق میں سے بعض برگزیدہ ہستیوں کو اللہ کی صفات میں شریک کر لیا تھا اور انہیں بھی نفع و نقصان کا مالک قرار دیا تھا حالانکہ وہ اللہ کو مانتے تھے اور ان میں بڑے بڑے بعض مذہبی پیشوا اور درویش موجود تھے جو ان کی مذہبی راہ نمائی کرتے تھے مگر اس کے باوجود مشرک ٹھہرائے گئے۔

(۳) تیسری بات جس کا علم ہونا ضروری ہے وہ یہ کہ مشرکین عرب یہ ہرگز نہیں کہتے تھے کہ وہ بتوں کی عبادت کرتے تھے یا یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ حضرت عزیز اور حضرت عیسیٰ کی عبادت کرتے تھے بلکہ مشرکین مکہ ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ ہم تو انہیں اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ اور ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیتے ہیں یا اس تک پہنچا دیتے ہیں اور یہ تصور اور عقیدہ ان کے ہاں پایا جاتا تھا کہ اللہ ہماری براہ راست نہیں سنتا ہم گنہگار ہیں اس لئے ہم ان تک اور یہ آگے اللہ تک ہماری التجائیں پہنچاتے ہیں۔

قرآن نے اس ماننے کو بھی عبادت قرار دیا ہے باوجود اس کے کہ وہ حقیقی عبادت اللہ ہی کی کرتے تھے۔ غیر اللہ کو تو مجازی سمجھتے تھے۔ قرآن نے اسے بھی عبادت قرار دیا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘمَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ (الزمر:۳)

”یعنی جن لوگوں نے اللہ کے سوا کچھ حمایتی اور دوست بنا لئے ہیں وہ یہ کہتے ہیں ہم تو ان کی عبادت اس لئے کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔“

اس لئے اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھ کر کسی مخلوق کا واسطہ اللہ کی عبادت کرتے ہوئے بیچ میں لاتا ہے کہ اللہ اس کی سنتا نہیں یا وہ بہت دور ہے درمیانی واسطے کے بغیر اس تک پہنچنا ممکن نہیں یا یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ اتنی بڑی ذات ہے کہ کوئی عام آدمی اس تک پہنچ نہیں سکتا تو یہ بھی شرک کے کاموں میں شمار ہوتا ہے۔ کیوں کہ قرآن نے واضح طور پر بیان کر دیا کہ:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾ (البقرة:۱۸۶)

کہ اے پیغمبر میرا بندہ جب آپ سے میرے بارے میں پوچھے تو اسے بتادیں کہ میں قریب ہوں اور دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب بھی وہ دعا مانگتا ہے۔ انہیں چاہئے میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ راہ راست پر آجائیں۔

دوسری آیت میں ہے:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ (ق:۱٦)

"کہ ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔"

اب اس کے بعد یہ خیال بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت دور ہے کہ اس تک کسی واسطے کے بغیر پہنچنا ممکن نہیں۔

(۴) شرک کے ضمن میں چوتھی بات جس کا جاننا ضروری ہے کہ بعض مشرکانہ ذہن کے لوگ جو یہ بات پھیلاتے ہیں کہ جس کام کو شرک قرار دیا گیا وہ بتوں سے متعلق تھا کہ اگر بت کو اللہ کی ذات یا صفات میں شریک کیا جائے تب شرک ہے اور اگر اللہ کے نیک اور متقی بندوں کو پکارا جائے ان کی نذر مانی جائے یا تعظیم کے طور پر سجدہ کیا جائے یا انہیں نفع و نقصان کا مالک سمجھا جائے تو یہ شرک نہیں کیونکہ یہ تو اللہ کے نیک بندے تھے بت تو نہیں تھے۔ یہ بھی ایک بہت بڑا دھوکہ اور فریب ہے۔ قرآن نے پوری طرح واضح کر دیا کہ وہ صرف بتوں کی نہیں نیک انسانوں کی بھی پرستش کرتے تھے۔ مشکل کے وقت انہیں پکارتے تھے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ (الاعراف:۱۹٤)

"یعنی اللہ کے سوا جنہیں تم پکارتے ہو وہ تمہارے جیسے انسان ہیں۔"

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا کہ:

﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (المائدہ:۱۱٦)

"اور جب اللہ کہے گا اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود مانو۔"

"اب ظاہر ہے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم اللہ کے برگزیدہ بندوں میں سے تھے بت نہیں تھے۔ اس سے ثابت ہوا کہ بتوں کے علاوہ انسانوں اور اللہ کے نیک بندوں کی بھی عبادت کی گئی اور یہ بھی من دون اللہ اور غیر اللہ میں شامل ہیں۔

(۵) اس بارے میں ایک پانچویں قابل ذکر بات یہ ہے کہ کیا اللہ نے اپنے نیک بندوں انبیاء اولیاء اور شہداء کو کچھ اختیارات دیئے ہیں یا کچھ معاملات ان کے سپرد کر دیئے ہیں کہ جس طرح وہ چاہیں تصرف کریں اور لوگوں کے درمیان فیصلے کریں؟ کیونکہ یہ شبہ بھی پھیلایا جاتا ہے کہ ہم تو انہی کو پکارتے ہیں مشکل کشا سمجھتے ہیں یا سفارشی مانتے ہیں جنہیں خود اللہ نے یہ اختیار دیا ہے اور وہ اللہ کے دیئے ہوئے اختیار ہی سے یہ کام کرتے ہیں۔

یہ بھی بالکل غلط اور قرآن وسنت کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں نہ کسی کو نائب بنایا اور نہ ہی اپنے بعض اختیارات کسی کو منتقل کیے کہ وہ اس کی طرف سے ان اختیارات کو استعمال کریں۔ اگر سرور دو عالم ﷺ یہ فرما رہے ہیں کہ مجھے بھی تصرف کا اختیار نہیں پھر کسی دوسرے کی کیا مجال ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِىَ السُّوْٓءُ﴾ (الاعراف:۱۸۸)

"اور آپ کہہ دیجئے کہ میں اپنے نفس کے لئے نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو کچھ چاہے اللہ اور اگر میں غیب جانتا تو بہت فائدہ حاصل کرتا اور مجھے کبھی کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔"

جب کسی کے پاس ایسی کوئی سند ہی نہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ نے کوئی اختیار سونپ دیا ہے یا اسے کائنات میں تصرف کرنے کی اجازت دی ہے یا اسے ایسے مقام پر

فائز کیا ہے کہ وہ لوگوں کی حاجتیں اور ضرورتیں پوری کرے تو یہ کیسے معلوم ہو گا کہ وہ کون ہے جسے یہ اختیار سونپا گیا ہے۔ محض خود اپنے دعوے سے تو ہر ایک بہروپیہ ولی قطب اور ابدال ہونے کا دعویٰ کرے گا مگر اصل دلیل قرآن وسنت سے چاہیے۔ اگر یہ نہیں تو ساری باتیں اور دعوے باطل ہوں گے۔

غیر اللہ کے نام کی نذر و نیاز کا شرعی حکم کیا ہے؟

سوال: ایس ایم سید پریسٹن سے لکھتے ہیں۔ کیا اللہ کے سوا کسی دوسرے بزرگ یا ولی کے نام نذر و نیاز دینا جائز ہے۔ تاکہ ان کا قرب حاصل ہو اور اپنی مشکلیں حل کرنا آسان ہو جائے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب: اس مسئلے پر ہم پہلے بھی صراط مستقیم میں مفصل جواب دے چکے ہیں۔ غیر اللہ کے نام کی نذر اسلام میں جائز نہیں اور یہ کام شرک ہے اور جن علماء نے نرم الفاظ استعمال کئے ہیں انہوں نے بھی اسے باطل اور حرام قرار دیا ہے اور قرآن کی آیت:

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ : ۱۷۳)

میں اس کی مکمل وضاحت موجود ہے۔ ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ کا اور مطلب بھی کیا ہو سکتا ہے مگر جن لوگوں کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہوں اور ضد و تعصب کی وجہ سے اندھے ہو چکے ہیں ان پر نہ کوئی آیت اثر کر سکتی ہے اور نہ کسی حدیث کو وہ ماننے کے لئے تیار ہیں اس لئے ہر جگہ ان کا نذر و نیاز کے نام پر کاروبار زوروں پر ہے۔ اس لئے واضح دلائل کے باوجود وہ اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹے چلے آرہے ہیں۔

ہمارے ہاں یعنی پاکستانی و ہندوستانی حلقوں میں جو لوگ اس بیماری میں مبتلا ہیں وہ اپنے آپ کو بڑے فخر سے حنفی کہتے ہیں لیکن جن بدعات و خرافات میں یہ لوگ مبتلا ہیں حنفی ائمہ و علماء نے ان کاموں کو غلط اور ناجائز قرار دیا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ ہدایت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے آج کے اس جواب میں ہم حنفی علماء وائمہ کے اقوال پر اکتفا کرتے ہیں شائد ان کی بات اثر کر جائے۔

(۱) فقہ حنفی کی معرکہ آراء کتاب فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ "اکثر عوام میں جو یہ رواج ہے کہ وہ کسی نیک آدمی کی قبر پر جا کر نذر مانتے ہیں کہ اے فلاں بزرگ اگر میری حاجت پوری ہو گئی تو اتنا سونا یا کوئی اور چیز تمہاری قبر پر چڑھاؤں گا یہ نذر بالا جماع باطل ہے۔" (فتاویٰ عالمگیری)

(۲) در مختار میں ہے: "اور معلوم ہونا چاہئے کہ اکثر عوام مردوں کے نام جو نذریں نیازیں دیتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں اولیاء کرام کا تقرب حاصل کرنے کے لئے مالی نذرانے پیش کرتے ہیں اور ان کی قبروں پر چراغ اور تیل جلاتے ہیں یہ سب چیزیں بالا جماع باطل اور حرام ہیں۔" (در مختار)

(۳) اس کے باطل اور حرام ہونے کی وجوہات درج ذیل ہیں:

ایک: یہ کہ قبروں کے چڑھاوے وغیرہ مخلوق کے نام کی نذریں ہیں اور مخلوق کے نام کی نذر جائز ہی نہیں اس لئے نذر بھی عبادت ہے اور عبادت کسی مخلوق کی جائز نہیں۔

دوسری: وجہ یہ کہ منذور لہ (جس کے نام کی نذر دی جاتی ہے) مردہ ہے اور مردہ کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔

تیسری: یہ کہ نذر دینے والا شخص مردوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کائنات میں تصرف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں حالانکہ مردوں کے متعلق ایسا عقیدہ رکھنا صریحاً کفر ہے۔ (فتاویٰ شامی)

(۴) شیخ قاسم شرح درر میں لکھتے ہیں: "وہ نذر جو عوام الناس مانتے ہیں جیسے کہ مشاہدہ ہے کہ کسی شخص کا کوئی آدمی گم ہو جائے یا بیمار ہو' یا اس کو کوئی ضرورت و حاجت پیش ہو پس وہ کسی نیک آدمی کے مزار پر جائے اور غلاف کو سر پر اٹھائے اور کہے اے میرے آقا (فلاں بزرگ) اگر میرا گم شدہ واپس آ جائے یا میرا مریض تندرست ہو جائے یا میری حاجت پوری ہو جائے تو آپ کو اتنا سونا اتنی چاندی یا اتنا کھانا یا اتنا پانی یا سبیل لگاؤں گا یا اتنی موم بتیاں قبر پر روشن کردوں گا یا اتنا تیل چراغ میں ڈالوں گا۔ یہ

تمام ائمہ کے اتفاق سے باطل ہے۔(بحرالرائق شرح کنزالدقائق ج دوم ص ۲۹۸)

یہ عبارتیں جو ہم نے نقل کی ہیں یہ فقہ حنفی کی مشہور کتابوں کی ہیں۔ ہمارے بھائی جو نذرونیاز کا کاروبار کرتے ہیں وہ ان کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اکثر مسائل میں ان کتابوں پر اعتماد کرتے ہیں بلکہ کچھ عرصہ پہلے اس گروہ کے ایک بزرگ نے تو "فتاویٰ عالمگیری" کو اسلامی قانون کی بنیاد بنانے کی تجویز پاکستان میں پیش کی تھی۔ اس لئے انہیں ان عبارتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کہ ان کے اپنے ائمہ اور علماء اس مسئلے کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

بہرحال جو عوام بزرگوں کے حوالے سے کوئی نذر دیتے ہیں تو ان سے معلوم کرنا چاہیئے کہ ان کا مقصد کیا ہے۔

اول: اگر وہ اس قبر یا مزار میں دفن بزرگ کا قرب اور خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے نام کی نذرونیاز دیتے ہیں تو یہ واضح شرک ہے۔

دوم: اگر مقصد حاجت روائی اور مشکل کشائی ہے تو یہ بھی باطل اور حرام ہے۔

☆☆☆

دعا میں واسطے یا وسیلے کی شرعی حیثیت؟

سوال: مانچسٹر سے محمد اسحاق پوچھتے ہیں

کیا اپنی دعا میں حضور نبی کریم ﷺ کے وسیلے یا صدقے سے دعا مانگنا جائز ہے؟ یا کسی بزرگ کے وسیلے سے دعا مانگنا جائز ہے؟ جیسا کہ آج کل اکثر یہی دعائیں مانگی جاتی ہیں کہ یا اللہ حضور پاک کے صدقے اور طفیل سے ہماری دعائیں قبول فرما۔ یا کسی مزار پر لوگ دعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ ان بزرگوں کے طفیل ہمارا یہ کام کر دے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دے کر مشکور فرمائیں۔

جواب: دعا میں حضور نبی کریم ﷺ کے وسیلے اور واسطے کا جو آپ نے پوچھا ہے تو اس سلسلے میں ایک بنیادی اصول ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ شریعت اسلامیہ میں حق و صداقت کا معیار کتاب و سنت ہے اور ہر وہ عمل جو بظاہر کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ معلوم ہوتا ہو اگر اس کا ثبوت قرآن یا رسول اللہ ﷺ کے عمل سے نہیں تو وہ ہمارے لئے دلیل یا حجت نہیں چاہے اس کا عام رواج کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ اس کے بعد اگر صحابہ کرام سے کسی چیز کا ثبوت مل جائے اور وہ قرآن و حدیث کے کسی حکم سے متصادم نہیں تو وہ بھی قابل قبول ہوگا۔ لیکن جس کام کا طریقہ واضح طور پر قرآن و سنت میں بیان کر دیا گیا ہو اور صحابہ کرامؓ کا عمل بھی اس کے مطابق ہو اسے چھوڑ کر دوسرا طریقہ نکالنا یا اس کے برعکس کوئی کام شروع کر دینا قرآن کے اس ارشاد کے مطابق اس نے رسولؐ کے طریقے کی مخالفت کر کے جہنم کا راستہ اختیار کیا ہے۔

ارشاد ہے "اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔" (انفال: ۱۳)

اب ظاہر ہے کہ دعا اللہ کے سامنے عاجزی اور پکار کا نام ہے اور عبادت کا

ماحصل اور نچوڑ دعا ہی ہے۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: "**الدعاء هو العبادة**" (مشکوۃ للالبانی ج ۲ کتاب الدعوات ص ۲۹۳ رقم الحدیث ۲۲۳۰) کہ دعا ہی عبادت ہے۔ ایک روایت میں ہے "**الدعاء مخ العباد**" کہ دعا عبادت کا نچوڑ ہے اب دعا جسے عبادت کا اصل نچوڑ قرار دیا گیا ہے اس کا کوئی طریقہ بھی آخر اللہ اور اس کے رسولؐ نے ضرور بتایا ہو گا۔ اللہ سے مانگنے اور اسے پکارنے کے طریقے آخر کیا ہیں؟ اس سلسلے میں یوں تو قرآن میں متعدد مقامات پر دعاء کا ذکر آتا ہے لیکن اختصار کے پیش نظر صرف دو آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔

پہلی آیت سورۂ بقرہ کی کہ اے نبیؐ جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو انہیں کہہ دیں کہ میں قریب ہوں اور جب بھی کوئی دعا کرنے والا دعا کرتا ہے میں سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں (البقرہ آیت ۱۸۶)

سورہ سباء کی آیت نمبر ۴ میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

دوسری آیت ہے سورہ مومن کی "اور تمہارے رب نے کہا مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا" (مومن آیت ۶۰)

اب ان دونوں آیتوں میں کسی جگہ بھی واسطے یا صدقے کا حکم تو کجا ذکر تک نہیں بلکہ اس کے برعکس یہ کہا گیا کہ اللہ قریب ہے' وہ جب پکارو سنتا ہے یعنی اتنا قریب ہے کہ اس کے لئے وسیلے کی حاجت ہی نہیں۔ جیسے سورہ ق میں ہے کہ میں تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہوں۔ ظاہر ہے یہاں کسی کے واسطے یا سیڑھی کی گنجائش ہی نہیں ہے اور جو قریب ہو ہر بات سنتا ہو دیکھتا ہو اور دل کی چھپی ہوئی باتوں کو جانتا بھی ہو اس تک پہنچنے یا اسے پکارنے کے لئے درمیان میں کسی واسطے کی بات کرنا عقل و بصیرت کے بھی خلاف ہے۔

پھر جب قرآن ہمارے لئے کتاب ہدایت ہے اور دین کے تمام مسائل و احکام کا اصل منبع ہے۔ اس قرآن میں آدم علیہ السلام سے لے کر سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک انبیاء کی دعائیں موجود ہیں' وہ کس لئے قرآن میں ذکر کی گئی ہیں؟ اس لئے کہ

ہمیں بھی اللہ سے دعا کرنے اور اس سے مانگنے کا طریقہ معلوم ہو جائے۔ تو کسی قرآنی دعا میں کسی نبی کسی فرشتے یا ولی کے واسطے اور وسیلے کا ذکر تک نہیں۔ اب چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) سورہ بقرہ کی آخری آیات پڑھ لیجئے وہاں رسول اللہ اور اہل ایمان کا ذکر کیا پھر اللہ پر فرشتوں پر کتابوں پر اور پہلے رسولوں پر ان کے ایمان کا ذکر کیا پھر نبی اور مومنین کی دعائیں ذکر کیں۔ **غفرانك ربنا' ربنا لا تواخذنا' ربنا ولا تحمل علينا'** آخر تک

کہ اے اللہ ہم تیری بخشش کے محتاج ہیں۔

اے اللہ ہم اگر بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو مواخذہ نہ کرنا۔

اے اللہ ہم پر وہ بوجھ نہ رکھنا جو ہم سے پہلے لوگوں پر رکھا گیا۔ (البقرہ: ۲۸۵-۲۸۶)

(۲) سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۲۶ کی تلاوت کریں تو نبی پاک ﷺ کو جو دعا سکھائی گئی ہے کہ "ملک و بادشاہی اور عزت و ذلت کا مالک اللہ ہی ہے" اس حقیقت کا اعتراف آپ نے کن الفاظ سے کیا اور امت کو کیا تعلیم دی سورہ آل عمران کی آیت ۱۹۰ تا ۱۹۵ دیکھیے۔ مومنین کی دعائیں بتائیں گئیں اور یہ بیان کیا گیا کہ یہ دعائیں جب اللہ کے بندے اس کے دربار میں اس قرآنی طریقے کے مطابق کرتے ہیں تو مرد ہو یا عورت اللہ ان کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ یہاں جتنی دعائیں ہیں ان میں کسی واسطے یا وسیلے کا کوئی ذکر نہیں۔

(۳) اب انبیاء کرام کی دعاؤں کا مطالعہ کیجئے کہ کسی نبی نے کسی دعا میں اپنے سے پہلے یا بعد میں آنے والے نبی کو وسیلہ یا واسطہ نہیں بنایا۔ ہمارے ہاں بعض حلقوں میں جو یہ مشہور ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی پہلی دعا کی تھی تو اس میں رسول اللہ ﷺ کے نور کا واسطہ دیا تھا جو قطب ستارے میں تھا یہ روایت بالکل غلط ہے۔ یہ سند کے اعتبار سے بھی ثابت نہیں اور قرآن کے بھی صریح خلاف ہے۔

قرآن میں حضرت آدم اور حضرت حوا کی دعا کے یہ الفاظ ثابت ہیں:

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾

"یعنی ان دونوں نے یہ کہا کہ اے اللہ ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے معاف نہ کیا تو ہم ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔" (اعراف: ۲۳)

اب یہاں کسی واسطے نور یا ستارے کا کوئی ذکر نہیں۔ مگر افسوس قرآن کی تعلیمات سے جہالت کی وجہ سے ہمارے ہاں بنیادی عقائد کے مسائل بھی اختلافی بنا دیئے گئے ہیں۔

(۴) دوسرے نبیوں میں حضرت موسیٰ کی دعا سورہ طہ میں آیت نمبر ۲۵، حضرت ابراہیمؑ کی دعا البقرہ آیت نمبر ۱۲۵ تا ۱۲۹، حضرت نوح کی دعا سورہ ہود آیت نمبر ۴۵، حضرت عیسیٰؑ کی دعا سورہ المائدہ آیت نمبر ۱۱۴، حضرت ایوب کی دعا سورہ الانبیاء آیت نمبر ۸۳ میں، حضرت یونس کی دعا سورہ الانبیاء آیت نمبر ۸۷ میں۔

اسی طرح اور بھی متعدد مقامات پر انبیاء اور اہل ایمان کی دعاؤں کے نمونے قرآن میں موجود ہیں اور ان تمام دعاؤں میں کسی جگہ کسی واسطے وسیلے یا طفیل کا ذکر تک نہیں۔ لہٰذا اللہ کو پکارنے یا دعا کرنے میں کوئی واسطہ یا وسیلہ ڈالنا غیر مشروع ہے۔

آخر میں دو چیزوں کی وضاحت بھی کر دوں کہ زندہ آدمی کی دعا یا نیک اعمال کے وسیلے میں کوئی اختلاف نہیں۔ کسی بھی آدمی سے آپ دعا کروا سکتے ہیں اور درحقیقت وہ اللہ ہی سے دعا کرے گا، اس سے کسی دوسرے کے وسیلے یا اللہ تک پہنچنے کے لئے کسی واسطے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ کوئی دوسرا کسی کے لئے دعا کرے یا سفارش کرے جب کہ وہ دنیا میں موجود اور زندہ ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں اسی طرح کسی سے علم حاصل کرنا، نیکی اور خیر کی باتیں سیکھنا اور ہدایت کا راستہ معلوم کرنا یہ اس وسیلے میں داخل نہیں جو ناجائز و غیر مشروع ہے۔ بلکہ یہ وہ اسباب ہیں جو دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تعلیم اور ہدایت کے لئے پیدا فرمائے ہیں۔

دراصل خطرناک اور ناجائز یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بات فلاں کے واسطے کے بغیر سنتا نہیں یا فلاں کے طفیل سے وہ جلدی سنتا یا قبول کرتا ہے۔اس عقیدہ کا کوئی ثبوت یا مثال نہ کسی قرآنی دعا میں ہے اور نہ ہی ان کے علاوہ جو دعائیں رسول اللہ ﷺ نے کیں ان میں اس واسطے اور طفیل کا کوئی ذکر ہے۔

ہاں احادیث میں اپنے نیک اعمال کا واسطہ دے کر اللہ سے مانگنے اور اسے پکارنے کا ثبوت موجود ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات کا واسطہ دے کر بھی دعا کر سکتے ہیں۔رسول اکرم ﷺ کی دعاؤں میں ایسے الفاظ موجود ہیں کہ آپ اللہ کی صفتوں کا ذکر کرنے کے بعد پھر اس سے دعا کرتے۔

کیا دعا میں غیر اللہ کا وسیلہ جائز ہے؟

سوال : منامہ (بحرین) سے سردار محمد انور لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جس نے میرے نیک بندے (ولی اللہ) سے عداوت رکھی میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں۔'' قرب الٰہی سے بندہ مومن کی سماعت و بصارت' پکڑ و رفتار' سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی خاص نگرانی میں آجاتی ہیں اور اس کی برکات کے باعث مومن کے اعضاء جسمانی میں گویا قوت الٰہی کام کرنے لگ جاتی ہے اب آپ ہی بتائیں کہ ایسے ولی اللہ کی سفارش یا وسیلے سے مانگی ہوئی دعا کو جائز کس طرح نہ کہا جائے اور یہ شان تو اس امتی کی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جب کہ ہمارے نبی ﷺ کی شان تو کہیں زیادہ ہے۔

جواب: جہاں تک شفاعت اور اس کے شرعی مفہوم کا تعلق ہے تو اس بارے میں ''صراط مستقیم'' کے گزشتہ شمارے میں مفصل جواب شائع ہو چکا ہے۔زیر نظر سوال بنیادی طور پر وسیلے کے بارے میں ہے۔اس لئے وسیلے کی شرعی حیثیت کے بارے میں

بحث سے پہلے لفظ ''الوسیلہ'' کا لغوی اور شرعی معنیٰ و مفہوم کی وضاحت ضروری ہے۔

امام راغب اصفہانی اپنی کتاب 'مفردات القرآن میں الوسیلہ کا جو معنیٰ تحریر کرتے ہیں' اس کا خلاصہ یہ ہے ''کسی شے تک رغبت سے پہنچنا''

امام ابن جریر طبری وسیلہ کا معنیٰ لکھتے ہیں: ''اللہ سے ایسے اعمال کے ساتھ تقرب چاہنا جو اس کی خوشنودی کا باعث ہو''

بعض لوگ سورہ مائدہ کی یہ آیت بھی بندوں کا وسیلہ پکڑنے کے جواز میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ﴾(المائدہ : ۳۵)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف جانے کے لئے وسیلہ تلاش کرو۔''

حالانکہ یہاں وسیلے سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ دعا میں کسی کا واسطہ یا وسیلہ ڈالا جائے یا پھر کسی کے واسطے یا وسیلے سے عذاب سے بچ جائے۔ یہاں بھی وسیلے سے مراد عمل سے قربت حاصل کرنا ہے۔ علامہ ابن جریر طبری' امام ابن کثیر' اور امام رازی سارے اس بات پر متفق ہیں کہ قرآنی آیت سے وسیلے سے مراد اعمال صالحہ کے ذریعے قرب الٰہی حاصل کرنا ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے وسیلے کے مفہوم پر جو بات کہی وہ زیادہ جامع اور مفصل ہے۔ ان کے پاس دو آدمی یہ جھگڑا لے کر آئے۔ ایک کہتا تھا کہ اللہ اور بندے کے درمیان کسی واسطے یا وسیلے کا ہونا ضروری ہے اور دوسرا یہ کہتا تھا کہ اللہ اور بندے کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔ اس پر امام موصوف فرماتے ہیں:

اگر اس شخص کی مراد یہ ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی ایسا واسطہ ضرور ہونا چاہئے جس سے بندوں کو یہ معلوم ہو کہ اللہ کن اعمال سے خوش ہوتا ہے اور کن اعمال کو پسند فرما کر اپنے تابعدار بندوں پر رحمتیں اور نوازشیں کرتا ہے اور وہ کون سے

برے اعمال ہیں جن کی وجہ سے بندے اس کے عذاب کی گرفت میں آجاتے ہیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی شان کے لائق کون سے نام ہیں۔ان چیزوں کو براہ راست جاننا عقل انسانی کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔اس لئے کسی واسطے یا وسیلے کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے رسول اور نبی بھیجے جن کے ذریعے سے یہ چیزیں معلوم کر کے لوگوں نے نیک اعمال معلوم کر کے ہدایت کا راستہ پایا۔

مگر جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کیا کسی غوث' قطب یا دوسرے یا فرد کے بغیر اللہ تک رسائی ممکن ہے تو یہ چیز پھیل گئی ہے کہ لوگ ان بے بنیاد باتوں کو اسلام کا جزو بنا رہے ہیں۔حالانکہ اللہ تک پہنچنے کے لئے یا اس سے کچھ مانگنے کے لئے کسی واسطے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں"

اصل میں اس مسئلے کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔یعنی وسیلے کی دو قسمیں ہیں ایک جائز اور ایک ناجائز۔

پہلی قسم جسے ہم جائز قرار دے سکتے ہیں اس میں درج ذیل صورتیں شامل ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی ذات کی پہچان' اس کی صفات کی معرفت اور اس کے احکام کا جاننا' یہ انبیاء اور رسولوں کے ذریعے ممکن ہے۔انسان اپنی عقل یا کسی دوسرے واسطے سے ان کا علم حاصل نہیں کر سکتا۔اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اس لئے بھیجے تاکہ وہ مخلوق الٰہی کو ان باتوں کی تعلیم دے سکیں۔

جیسا کہ ارشاد قرآنی ہے۔

﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الجمعه : ۲)

"وہ ذات جس نے ان پڑھوں کی طرف ان میں سے رسول بھیجا جو ان پر اس

کی آیات پڑھتا ہے' ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے واضح گمراہی میں تھے۔"

اب یہاں جن باتوں کا ذکر کیا گیا ہے' یہ رسول ہی کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہیں اور اس لحاظ سے رسول وسیلہ ہیں اللہ اور بندے کے درمیان اور جب رسول دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں تو پھر ان کی تعلیمات اس وسیلے کا کام دیتی ہے اور یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد اللہ کی ذات اور اس کی صفات کی پہچان کے لئے ہمارے پاس قرآن و حدیث اور ان کے ذریعے اس کی معرفت اور اس کی اطاعت کے طریقے ہم معلوم کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن و سنت بھی ہمارے لئے وسیلے کا کام دیتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ انبیاء کرام جب زندہ ہوتے ہیں تو ان کے ذریعے دین و شریعت کی باتیں اور احکام الٰہی حاصل کرتے ہیں اور جب وہ فوت ہو جاتے ہیں تو پھر ان کی تعلیمات ہمارے لئے اس وسیلے کا کام دیتی ہیں۔

(۲) جائز وسیلے کی دوسری قسم دعا ہے یعنی کسی بھی زندہ مسلمان کا دوسرے مسلمان کے لئے دعا کرنا یہ مسلمان کے اخلاقی فرائض میں بھی شامل ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے نیکی اور خیر کی دعا کرے اور ایک لحاظ سے اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگنے اور طلب کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ صحابہ کرام کے لئے دعا فرمایا کرتے تھے۔ صحابہ کرام ایک دوسرے کے لئے دعا کی درخواست بھی کرتے اور دعائیں بھی کیا کرتے تھے۔

مگر یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ دعا کا یہ وسیلہ صرف زندوں تک محدود ہے مرنے کے بعد کسی سے دعا کی امید رکھنا قرآن و سنت سے ثابت نہیں۔ بعض لوگ قرآن حکیم کی یہ آیت پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ انتقال کے بعد بھی لوگوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔

آیت قرآنی ہے :

﴿جَاءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ﴾ (النساء : ٦٤)

''کہ جب وہ آپ کے پاس آئیں تو وہ اللہ سے بخشش طلب کریں اور رسول ان کے لئے بخشش مانگے۔''

اب یہ رسول اکرم ﷺ کی حیات مبارکہ کی بات ہے کہ جب آپ کے پاس آکر وہ خود بھی بخشش مانگتے اور رسول بھی ان کے لئے بخشش کی دعا کرتے 'کیونکہ جب آپ اس دنیا سے رخصت ہوگئے تو اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ صحابہ کرام بخشش کی دعا کے لئے جوق در جوق آپ کے روضہ اقدس پر آتے ہوں یا اسکے بعد بھی آپ سے بخشش کی دعا کی درخواست کرتے ہوں۔ اس بات کا سیرت صحابہ میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

(۳) نیک اعمال کا وسیلہ بھی جائز ہے یعنی کوئی آدمی اللہ سے کچھ مانگنے کے لئے یا مصیبت کے ٹالنے کے لئے کسی نیکی اور اچھے عمل کا حوالہ دیتا ہے اور اسے بطور وسیلہ پیش کرتا ہے تو یہ جائز ہے۔ صحیح حدیث میں ان تین آدمیوں کا واقعہ مذکور ہے جو ایک غار میں پھنس گئے تھے تو انہوں نے اپنے اپنے نیک عمل جو انہوں نے خالص اللہ کی رضا کے لئے کئے تھے ان کا واسطہ دے کر اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی دعا کی تھی۔ اس سے نیک عمل کا وسیلہ ثابت ہو جاتا ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی صفات کا وسیلہ ڈالنا بھی جائز ہے یعنی کوئی آدمی یہ کہتا ہے کہ اے اللہ تو مجھے اپنی رحیمی و کریمی کے صدقے معاف کر دے۔ یا وہ کہتا ہے کہ اللہ میں تجھے تیرے غفور و رحیم ہونے کا واسطہ دے کر تجھ سے فلاں بات طلب کرتا ہوں یا فلاں چیز مانگتا ہوں 'تو یہ وسیلہ بھی جائز اور مشروع ہے۔

(۵) علم و ہنر حاصل کرنے کے لئے کسی استاد کے آگے زانوئے تلمذ طے کرنا یا کسی کتاب کا پڑھنا یہ بھی جائز وسائل ہیں۔ انسان جب تک کوئی استاد نہیں پکڑے گا علم حاصل نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح حصول علم و فن کے لئے کتابوں اور دوسرے

ذرائع کا استعمال کرنا بھی جائز و مشروع ہے۔ دینی و دنیاوی علوم کے حصول کے لئے مختلف وسائل کا مہیا ہونا بھی بہر حال ضروری ہوتا ہے۔

(۶) اللہ تعالیٰ نے اس نظام کائنات کو چلانے کے لئے جو وسائل پیدا فرمائے ہیں ان کا استعمال کرنا بھی جائز بلکہ بعض حالات میں ضروری ہے جیسے کھانا پکانے کے لئے آگ کا جلانا' سفر کے لئے سواری کا استعمال کرنا' پیاس بجھانے کے لئے پانی پینا' بچوں کی پیدائش کے لئے خاوند بیوی کا ملاپ' یہ اور اس طرح کے متعدد وسیلے ہیں جن سے دنیاوی معاملات میں ہم مستفید ہوتے ہیں۔ یہ وسیلے بھی جائز اور مشروع ہیں۔

یہ تو ہم نے وسیلے کی چند وہ صورتیں بیان کی ہیں جو جائز ہیں۔ مگر ان صورتوں کا بیان کرنا بھی ضروری ہے جو ناجائز اور غلط ہیں جن میں درج ذیل وسیلے کی مروجہ شکلیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے وقت کسی شخصیت کا درمیان میں واسطہ ڈالنا جائز نہیں چاہے وہ شخصیت نبی' ولی' فرشتہ اور کوئی بزرگ ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

ہمارے سامنے سب سے پہلے قرآن مجید ہے۔ قرآن میں جابجا انبیاء کرام کی دعائیں مذکور ہیں۔ کسی نبی کی کسی دعا میں کسی دوسرے برگزیدہ نبی کے واسطے یا وسیلے کا ذکر تک نہیں۔ اگر یہ کوئی مشروع یا جائز چیز ہوتی یا باری تعالیٰ اسے ضروری سمجھتے تو ایسی دعاؤں کا ذکر فرماتے جن میں کسی نبی کے واسطے کا ذکر ہوتا۔

پھر قرآن میں دوسرے مومنین اور اللہ کے نیک بندوں کی دعاؤں کے کئی نمونے اور مثالیں موجود ہیں مگر کسی دعا میں کسی وسیلے یا واسطے کا کوئی نشان تک نہیں اور ظاہر ہے سب سے بہترین دعائیں قرآنی دعائیں ہیں اور سب سے بہتر الفاظ قرآنی دعاؤں کے ہیں۔ جب قرآنی دعاؤں کے الفاظ میں وسیلہ اور واسطہ نہیں تو ہم اپنی طرف سے دعاؤں میں یہ اضافہ کیونکر کر سکتے ہیں۔

خود نبی کریم ﷺ جب اللہ سے مانگتے اور دعا کا طریقہ بتاتے تو اس میں بھی کسی

واسطے کا ذکر نہیں فرماتے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ایک صحابی سے فرمایا:

اذا سالت فاسئل الله و اذا استعنت فاستعن بالله (۱)

"کہ جب تو سوال کرے تو اللہ سے سوال کرو اور جب مدد چاہتا ہو تو اللہ سے مدد چاہو۔"

بلکہ اس وسیلے میں رسول اللہ ﷺ نے کسی دوسرے کی کیا اپنی شرکت یا واسطے کے معمولی شبہ کو بھی برداشت نہیں فرمایا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے آپ کے سامنے یہ الفاظ کہے کہ:

" ما شاء الله وما شاء محمد"(۲)

"کہ جیسے اللہ چاہے اور جیسے محمدؐ نے چاہا۔"

اس پر آپؐ نے فرمایا:

جعلت لله نِداً (۳)

"کیا تو نے مجھے اللہ کا شریک بنادیا؟"

پھر فرمایا:

لا تقولوا ماشاء الله وشاء محمد بل قولوا ما شاء الله وحده (۴)

"کہ یہ مت کہو کہ جو اللہ چاہے اور محمد چاہے بلکہ یہ کہو کہ جو صرف اللہ تعالیٰ چاہے"

۱۔ مشکوۃ للالبانی رقم الحدیث ۵۳۰۲ باب التوکل والصبر ۱۴۵۹۔

۲۔ سنن ابن ماجه للالباني ابواب الكفارات ج١باب النهي ان يقال ما شاء الله و ما شاء محمد ص ٣٩٢ رقم الحديث ٢١٣٠.

۳۔ الادب المفرد باب قول الرجل ما شاء الله و شئت ٨٠٤، نیز فتح الباري ٥٤٠/١١ كتاب الأيمان و النذور باب لا يقول ما شاء الله وشئت کے تحت اجعلتني و الله عدلا کے الفاظ ہیں۔

۴۔ مشکوۃ للالبانی ج٣ كتاب الادب باب الاسامی ص ١٣٤٩رقم الحديث ٤٧٧٩.

اور پھر یہ اہم نکتہ بھی ہمارے پیش نظر رہنا چاہئے کہ وسیلے اور واسطے کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی دوری یا فاصلہ ہو۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں کہ

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ (ق: ١٦)

"ہم تو بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔"

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البقرة: ١٨٦)

"جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو انہیں بتائیں کہ میں قریب ہوں۔ دعا کرنے والے کی دعا سنتا ہوں جب بھی وہ دعا کرتے ہیں۔"

ان دو آیتوں کے بعد اس امر کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ انسان اللہ کی ذات تک رسائی یا اس سے کچھ مانگنے کے لئے کسی دوسرے واسطے یا وسیلے کا محتاج ہے۔

ہمارے بعض نادان بھائی یہ مثال دے کر عوام کو شبہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر مکان کی چھت پر جانا ہو تو سیڑھی لگانے کی ضرورت پڑتی ہے' تو اللہ کی ذات تک رسائی یا اس سے کچھ مانگنے کے لیے یا اللہ تک پہنچنے کے لئے کسی واسطے کی کیوں ضرورت نہیں؟

(۱) پہلی بات تو یہ کہ اللہ کی ذات کے لئے اس طرح کی مثالیں دینا ہی جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ:

﴿وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ (النحل: ٦٠)

"اللہ کی ذات کے لئے تو بڑی بلند مثالیں ہیں۔"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ: ١١)

"اس کی مثل کوئی نہیں"

اس لئے سیڑھی کی مثال دینا ہی غلط ہے اور پھر ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ جو ذات انسان کی شہ رگ سے قریب ہے وہ اپنے بندے کی اونچی اور آہستہ پکار سنتا ہے اور بندے اور رب کے درمیان کوئی فاصلہ ہی نہیں ہے۔ تو پھر سیڑھی کہاں لگاؤ گے؟ کیا بندے اور شہ رگ کے درمیان سیڑھی لگائی جاسکتی ہے؟ اور پھر کیا دنیاوی اسباب کا استعمال جائز ہے؟

(۲) وسیلے کی ایک اور ناجائز شکل جو مروج ہے وہ کسی قبر پر جاکر قبر والے کا واسطہ دے کر دعا کرنا ہے۔ یہ بھی قرآن و سنت کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ ہمارے سامنے سب سے بڑی مثال سرورِ دو عالم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی ہے۔ صحابہ کرام نے مشکل سے مشکل دور اور نازک سے نازک تر حالات میں بھی کبھی یہ نہیں کیا تھا کہ آپ کے روضہ مبارک پر جاکر آپ سے مانگتے یا آپ کے وسیلے سے دعا کرتے۔

بلکہ اس کے برعکس یہ ثابت ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے انتقال کے بعد ایک موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے دعا کرائی ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ زندہ آدمی سے دعا کرانا بہر حال جائز ہے اور اگر کوئی اسے وسیلہ سمجھتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ سے دعا کراتے وقت توسل کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ سے تو دعا کی درخواست کی مگر روضہ رسولؐ کے قریب بیٹھ کر یہ ضرورت محسوس نہیں کر رہے کہ وہ اور دوسرے صحابہ حضور کے روضے پر جاکر آپؐ سے حاجت روائی یا مشکل کشائی کی درخواست کرتے یا آپؐ کا واسطہ دے کر وہاں کھڑے ہو کر دعا کرتے تو کیا حضرت عمرؓ اور اس وقت موجود تمام صحابہ کرامؓ کا عمل ہمارے لئے مثال نہیں ہے؟

یہاں ایک اور شبہ کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ جہلا کے ہاں یہ خیال بھی بہت

مشہور ہے کہ اگر کسی بڑے افسر کے پاس کسی کام کے لئے جانا ہو تو پہلے کلرک یا کسی چھوٹے افسر کے پاس جانا پڑتا ہے۔ اس طرح اگر بادشاہ کے پاس کوئی حاجت لے کر جانا ہو تو پہلے کسی وزیر یا مشیر کا واسطہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو سب سے بڑا بادشاہ اور حاکم اعلیٰ ہے۔ اس کے پاس یوں ہی چلے جائیں؟

یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے غلط مثال دی گئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیاوی افسروں اور بادشاہوں تک رسائی کے لئے کچھ واسطے ڈھونڈنے پڑتے ہیں اور بعض اوقات ان واسطوں اور سفارشوں کے بغیر ان صاحبوں تک رسائی ممکن بھی نہیں ہوتی مگر یہ کیوں؟ عام طور پر اس کی دو وجوہ ہوتی ہیں۔

اول یہ کہ جو آدمی ان تک رسائی چاہ رہا ہوتا ہے وہ حاکم یا افسر اسے جانتا نہیں کہ یہ کون اور کیسا آدمی ہے۔ اس لئے درمیان میں کسی ایسے واسطے کی ضرورت ہوتی ہے جو اس آدمی کو جانتا ہو اور بادشاہ سلامت کو اس شخص کا تعارف کرواسکے تو گویا کہ بادشاہ یا وہ افسر اس بات کا محتاج ہوتا ہے کہ جو اسے ملنا چاہتا ہے یا اس کے پاس آنا چاہتا ہے کوئی ایسا شخص درمیان میں ہو جو اس آدمی کے بارے میں بادشاہ کو باخبر کرے۔

دوم یہ کہ اس بادشاہ یا اس افسر کو یہ علم نہیں ہوتا کہ یہ شخص جو مسئلہ یا ضرورت لے کر اس کے پاس آرہا ہے اس میں وہ سچا ہے یا جھوٹا اور ضرورت مند ہے یا غیر ضرورت مند۔ اب یہاں دنیاوی حکمران کو اس بات کی محتاجی ہوتی ہے کہ درمیان کے کچھ واسطے اسے صحیح صورت حال سے آگاہ کر سکیں اور وہ مختلف وسیلوں سے یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے پاس جو شخص آرہا ہے وہ کس حد تک اپنے قول میں سچا ہے۔

اب ذرا ایمان داری سے غور فرمائیں کہ کیا اللہ تعالیٰ بھی ان باتوں کا محتاج ہے؟ معاذ اللہ ہرگز نہیں۔ وہ تو سب کچھ جانتا ہے اسے پہلے سے سب کچھ علم ہے۔ وہ ہرگز ہرگز اس بات کا محتاج نہیں کہ کسی سے مشورہ کرے پھر کسی سے ملنے یا نہ ملنے کا

فیصلہ کرے۔ یا کسی کی ضرورت اور حاجت کے بارے میں اپنے کسی وزیر یا مشیر کے ذریعے سے تحقیق کروائے پھر اس کی ضرورت پوری کرنے کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر فرمائے۔ اس کی ذات ان باتوں سے بے پرواہ ہے اس لئے ذات باری تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کی مثالیں دینا سراسر جہالت ہے۔

(۳) اس سلسلے میں ہمارے ہاں ایک اور غلط تصور بھی رائج ہے اور وہ یہ کہ اللہ کی ذات بڑی عظیم اور اعلیٰ ہے جب کہ ہم بڑے عاجز اور گناہ گار ہیں۔ ہماری رسائی اس ذات تک کہاں ہو سکتی ہے۔ بڑی بڑی مقدس اور نیک ہستیاں ہی اس کے سامنے آ سکتی ہیں اور وہ انہی کو سنتا ہے۔ گناہ گاروں اور سیاہ کاروں کی کہاں سنتا ہے۔ یہ تصور بھی اللہ تعالیٰ کی صفات سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تو کریم ہے وہ نیک و بد دونوں کی سنتا ہے۔ اس کے سامنے امیر و غریب سارے برابر ہیں۔ بلکہ بعض اوقات وہ گناہ گاروں کی جلدی سنتا ہے اور جب وہ اسے پکارتا ہے تو زیادہ خوش ہوتا ہے۔ وہ تو حیوانوں' پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں کی بھی سنتا ہے۔ وہ کتنا ناکارہ مسلمان ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اس کی نہیں سنے گا جب تک کہ وہ کسی واسطے کے ذریعے اس تک اپنی درخواست نہیں پہنچائے گا۔

قرآن تو بار بار گناہ گاروں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:

اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنے گناہوں کی معافی طلب کرو۔ اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ وہ تو سارے گناہ معاف کر دیتا ہے بشرطیکہ کوئی سچے دل سے اس کے سامنے توبہ کرے۔

اس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ کوئی گناہ گار میرے دربار میں کسی وسیلے کے بغیر نہیں آ سکتا۔

یہاں تک ہم نے "وسیلے" کے موضوع پر ضروری مسائل کا ذکر کر دیا ہے اور بعض اہم پہلو تحریر کیے ہیں جن کے ذریعے اس مسئلے کی شرعی حیثیت پوری طرح

واضح ہو جاتی ہے۔اب ہم اس حدیث کا اختصار سے جائزہ لیتے ہیں جس کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے نیک بندوں یعنی اولیاء اللہ کی دشمنی کو حدیث میں اللہ کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا۔ اسی طرح یہ بھی درست ہے کہ نیک بندوں کے اعضاء جسمانی اللہ کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں۔ کوئی جتنا نیک ہوتا ہے اس کے اعضاء اتنے ہی اُس کی مرضی کے تابع اور اُس کے احکام کے پابند ہوتے ہیں اور جس طرح اللہ چاہتا ہے ایسے ہی وہ بولتا ہے جیسے اللہ کا حکم ہوتا ہے ویسے وہ چلتا ہے۔ غرض ساری حرکات و سکنات میں وہ ذات واحد کی قائم کردہ حدود کی پوری اور مکمل پابندی کرتا ہے تو یہ درست نہیں کہ اس بندے میں قوت الٰہی منتقل ہو جاتی ہے یا اسے ایسی قوت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ ایسے کام کرنے لگ جاتا ہے جو عام بندے نہیں کر سکتے اور نہ ہی مذکورہ حدیث میں ایسے الفاظ آئے ہیں۔

اس بارے میں درج ذیل باتوں پر غور کرنے سے مسئلے کی نوعیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

(۱) ہر مسلمان کا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو قرب سرور کائنات ﷺ کو حاصل ہوا' وہ کسی دوسرے کو نہیں مل سکا۔ اس طرح اللہ کی عبادت اور تقوے و پاکیزگی اور مقام کی رفعت و بلندی میں ساری مخلوق الٰہی میں آپ کا کوئی ہم سر نہیں۔ آپ کے اعضاء مبارکہ سب سے زیادہ اللہ کی مرضی کے تابع تھے' اسی طرح آپ کی سماعت و بصارت بطور خاص اللہ کی نگرانی میں تھیں۔

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ﴾ (النجم : ۳)

”وہ تو اپنی خواہش سے بولتے بھی نہ تھے۔“

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آپ کو کوئی ایسی قوت الٰہی حاصل ہو گئی تھی کہ آپ نے یہ فرمایا ہو کہ میرا وسیلہ پکڑو' یا میرے وسیلے سے دعا کرو یا میں کسی کو بخشوانے یا چھڑوانے کی گارنٹی دیتا ہوں۔ ہرگز کسی ایسی بات کا ذکر قرآن و سنت میں نہیں ہے

بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ آپ تو یہ فرما رہے ہیں کہ:

مانگو تو اللہ سے مانگو۔ پکارو تو اللہ کو پکارو اور مدد طلب کرو تو اللہ سے طلب کرو۔

جب خود حضور یہ نہیں فرما رہے تو ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ آپ کا وسیلہ ڈال کر اللہ کو پکاریں۔ ہمارے لئے اصل دلیل تو حضور اکرم ﷺ کا ارشاد اور عمل ہے نہ کہ اپنا اندازہ یا قیاس۔

(ب) حدیث میں ہے کہ آپ نے اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ الزہرا اور اپنی پھوپھی حضرت صفیہؓ سے بار بار یہ فرمایا کہ:

میرے ساتھ تعلق کی وجہ سے نیک اعمال ترک نہ کرنا' یا میرے سہارے کی امید پر نہ رہنا بلکہ اپنی عملی زندگی کا خیال رکھنا' اس کے بغیر نجات نہ ہو گی۔ میں وہاں تمہارے کسی کام نہ آؤں گا اگر تمہارے اعمال درست نہ ہوئے تو۔

اب اس حدیث کے بعد رسول اللہ ﷺ یا کسی بزرگ ولی اللہ کے بارے میں کون سی قوت الٰہی کا عقیدہ رکھ کر وسیلہ بنائیں گے؟

(ج) قرآن کریم میں سورہ بنی اسرائیل پارہ ۱۵ کی آیات ۱۹ سے لے کر ۹۵ تک کا مطالعہ کیجئے کہ:

جب کفار نے آپؐ سے یہ کہا کہ آپ چشمے جاری کر کے دکھائیں۔ باغات آپ کی ملکیت میں ہوں۔ آسمان سے عذاب الٰہی ہم پر گرائیں۔ آپ کے پاس خوبصورت محلات ہوں' خود ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ کر وہاں سے کتاب لا کر دکھاؤ۔ اس طرح کی باتیں دکھاؤ تو پھر ایمان لائیں گے۔ اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا "میں تو ایک انسان رسول ہوں"۔۔۔۔۔ یعنی تم جن قوتوں کا مطالبہ کر رہے ہوں یہ تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔

اس لئے بھائی صاحب سوال یہ نہیں کہ کسی بڑے بزرگ انسان یا برگزیدہ نبی کے وسیلے سے مانگی ہوئی دعا کو ہم جائز کریں۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ قرآن و سنت میں اس

کا ثبوت ہے یا نہیں۔ ورنہ انبیاء کرام کی شان اور اولیاء اللہ کے مقام کی بلندی اور قرب الٰہی کا انکار کوئی مسلمان کیسے کر سکتا ہے۔

امام بخاریؒ سے قبولیت دعا کی سفارش کی حقیقت؟

سوال: میڈ سٹون جیل سے محمد اسلم صاحب لکھتے ہیں:

"میرے پاس بخاری شریف جلد اول ہے اس کتاب میں امام بخاریؒ کی زندگی کے حالات بعنوان "حرف آغاز" میں بتائے گئے ہیں اور اس کے آخر میں مزار بخاری کی برکات کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ کی نماز جنازہ کے بعد جب ان کی قبر پر مٹی ڈالی گئی تو مدت تک اس سے مشک کی مہک آتی رہی اور عرصہ دراز تک لوگ اس مٹی کو بطور تبرک لے جاتے رہے۔

ابوالفتح سمرقندی بیان کرتے ہیں کہ امام بخاری کے انتقال کے دو سال بعد ثمرقند میں خشک سالی کی وجہ سے قحط نمودار ہو گیا۔ لوگوں نے بار ہا نماز استسقاء پڑھی دعائیں مانگیں مگر بارش نہ ہوئی۔ آخر ایک مرد صالح قاضی شہر کے پاس گیا اور اس کو مشورہ دیا کہ تم شہر کے لوگوں کو امام بخاری کی قبر پر لے جاؤ اور وہاں جا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو' شاید اللہ تعالیٰ قبول کر لے۔ قاضی نے مشورہ قبول کر لیا۔ شہر کے لوگوں نے قبر پر جا کر گریہ وزاری کی اور خشوع و خضوع سے دعا مانگی اور امام بخاری سے قبولیت دعا کی سفارش کی درخواست کی۔ اسی وقت بادل اٹھ آئے اور سات دن تک لگاتار بارش ہوتی رہی۔

اب اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر دعا قبول نہ ہو تو کسی ولی کی قبر پر دعا مانگی جا سکتی اور اس سے سفارش کی درخواست کی جا سکتی ہے۔ جب کہ آپ کے "صراط مستقیم" میں اکثر پڑھا ہے کہ قبروں پر جانا' وہاں دعا کرنا اور وسیلہ بنانا ناجائز ہے۔ مجھ

سے میرے دوست بحث کرتے ہیں کہ تم تو قبروں پر جانے کے خلاف ہو جب کہ حدیث کی کتاب میں یہ بات لکھی ہے کہ قبروں پر جاکر دعا مانگ سکتے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں کہ کتاب ضرور حدیث شریف کی ہے مگر مزار کا واقعہ کوئی حدیث نہیں ہے۔اگر لوگوں نے مزار پر جانا شروع کر دیا تو اس سے یہ بات کوئی جائز نہیں ہو جاتی۔

اس لئے براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرمائیں۔

جواب: امام بخاریؒ کے بارے میں اسلم صاحب نے جو واقعہ نقل کیا ہے۔اس واقعے کے بارے میں یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ یہ واقعہ بخاری شریف کا نہیں اور نہ ہی اسے حدیث کہا جاسکتا ہے۔ بلکہ جن لوگوں نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت لکھی ہے اور ان کی زندگی سے متعلق مختلف واقعات بیان کئے ہیں۔انہوں نے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے جس کا تعلق ان کی وفات کے بعد ان کی قبر سے ہے۔

دوسری یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ دین اور شریعت میں کسی مسئلے کے ثبوت کے لئے اصل دلیل اور حجت کے طور پر قرآن و حدیث ہی پیش کئے جاسکتے ہیں۔ان کے علاوہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی وہ بات قابل قبول ہوگی جو قرآن و سنت کے مطابق ہوگی ان کی جو بات دین کے ان دو بنیادی سرچشموں یعنی قرآن و حدیث سے متصادم ہوگی وہ شرعی طور پر قابل قبول نہ ہوگی۔ چاہے اس بات کا تعلق کسی کی زندگی سے ہو یا ان کے مرنے کے بعد وہ واقعہ ظہور پذیر ہوا ہو۔

اب بخاری کی جلد اول کے مقدمے میں امام بخاری کی سیرت کے ضمن میں جو واقعہ نقل کیا گیا ہے اور مراسلہ نگار نے بھی تحریر کیا ہے اس میں دو باتوں کا ذکر ہے

اول: امام بخاریؒ کی قبر کی مٹی سے خوشبو کا آنا۔

دوم: امام بخاری کی قبر پر جاکر لوگوں کا دعا کرنا اور امام بخاری کی سفارش سے دعا کا قبول ہونا۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ دونوں ہی تاریخی واقعات ہیں۔ان کی صحت تسلیم بھی

کر لی جائے تو یہ قرآن وحدیث کی طرح ہمارے لئے دلیل اور سند نہیں بن سکتے۔ قبر کی مٹی سے خوشبو کا آنا ناممکنات میں سے بھی نہیں ہے لیکن اس سے یہ بھی ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ جس قبر کی مٹی سے خوشبو کی مہک آئے یا کوئی دوسری اچھی بات ظاہر ہو وہاں جاکر حاجتیں طلب کی جائیں۔ اگر کسی اچھی بات کا ظہور ہوتا ہے تو اس کا تعلق اس شخصیت کے اعمال سے ہے جو اس قبر میں دفن ہے اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جس قبر سے خوشبو نہیں آتی اس میں دفن ہونے والا نیک نہیں یا اس کے اعمال اچھے نہیں ہوں گے۔ ایسے معاملات کی صحیح حکمتیں اللہ تعالیٰ کی ذات ہی بہتر جانتی ہے۔ دنیا میں بے شمار نیکوکار اور صالحین کی قبریں اور مزارات ہیں جہاں سے خوشبو نہیں آتی یا وہاں جاکر دعا کرنے سے بارش نہیں ہوتی تو نعوذ باللہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لوگ نیک نہیں تھے یا ان کے اعمال صالح نہیں تھے نیز مقصد یہ ہے کہ یہ باتیں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی بنیاد اور دلیل نہیں بن سکتیں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ قبر پر دعا کرنے سے جو بارش ہوئی اس واقعے کو اگر سچا بھی مان لیا جائے تو یہ ہمارے لئے شرعی دلیل نہیں۔ ایسے واقعات تو ہر مذہب کے ماننے والے اپنے بزرگوں' مذہبی پیشواؤں' متبرک مقامات اور دوسری چیزوں کے حوالے سے سنائیں گے اور وہ آپ کو بتائیں گے کہ ہمارا فلاں کام فلاں جگہ جانے سے ہوا یا فلاں ضرورت فلاں بزرگ کی سفارشی دعا سے پوری ہوئی۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان جگہوں پر دوڑنا شروع کر دیں۔ ہمارے دین کی اساس ان واقعات پر نہیں ہے بلکہ قرآن وسنت کے حقائق پر ہے مگر بدقسمتی سے آج سچے یا جھوٹے بعض واقعات کو بنیاد بنا کر مسلم معاشروں میں شرک پرستی کی بے شمار شکلیں پیدا کر دی گئی ہیں۔ مذکورہ واقعہ بھی ایسے واقعات میں سے ایک ہے۔ کسی قاضی شہر کے کہنے یا بادشاہ کے کرنے سے یا لوگوں کے امام بخاری کے مزار پر جانے سے شریعت کا کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہو جاتا اور بعض اوقات یہ لوگوں کے لئے آزمائش بھی ہوتی ہے اور اللہ کی

طرف سے ان کے عقائد کا امتحان بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک اللہ کے در پر دھونی مار کر بیٹھتے ہیں یا ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیں گے۔ ہمارے لئے دلیل تو تب بنتی جب نبی کریم ﷺ کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ بیان کیا جاتا یا کم از کم صحابہ کرام کے دور کے واقعات بتائے جاتے کہ وہ بارش کے لئے یا دوسری ضرورتوں کے لئے آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک پر جا کر دعائیں کیا کرتے تھے بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ امام بیہقی نے اپنی سنن میں اور امام ابن تیمیہؒ نے "اقتضاء الصراط المستقیم" میں یہ واقعہ ذکر فرمایا ہے کہ:

"حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں جب تستر فتح ہوا تو ہرمز کے خزانے میں ایک نعش تھی (جو دانیال کی طرف منسوب تھی) اور اسے قحط کے ایام میں باہر نکالا جاتا تھا تو بارش ہو جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ کے حکم سے ایک دن میں تیرہ قبریں نکالی گئیں۔ رات کے وقت انہیں دفن کر کے سب قبریں برابر کر دیں گئیں تاکہ کوئی ان قبروں کو پہچان نہ سکے اور ان کی پرستش شروع نہ ہو جائے۔"

جہاں تک اہل حق پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تعلق ہے تو وہ زندوں پر بھی ہوتی ہے اور مردوں پر بھی۔ دانیال پر بھی ہو سکتی ہے اور آنحضرت ﷺ پر بھی۔ تمام انبیاء اور صلحاء اس رحمت سے فائدہ مند ہوتے ہیں بلکہ ہم جیسے گنہگار بھی اسی رحمت کے سہارے جی رہے ہیں۔ جہاں تک قبر پرستی کے لئے استدلال کا تعلق ہے' دانیال سے نہ اس وقت کسی نے استغاثہ کیا اور نہ اب درست ہے۔ بلکہ حضرت عمر نے اس قبر کو اس قدر مخفی فرما دیا کہ نہ اس وقت کوئی اسے معلوم کر سکا اور نہ آج ہی کسی کو اس کا علم ہے۔ اسے گم کر دینا دلیل ہے کہ صحابہ قبر کے ساتھ استعانت اور استغاثہ کے تعلق کو ناجائز سمجھتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے حکم سے ایسا ہوا اور ایک صحابی نے بھی اس کے خلاف آواز نہ اٹھائی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے مشرکانہ افعال کے خلاف صحابہ کرامؓ کا اجماع

ہے ورنہ وہ جب کسی چیز کو ناپسندیدہ فرماتے تھے تو حضرت عمرؓ سے بھی کھلے طور پر کہہ دیتے تھے۔ (بحوالہ "زیارت قبور" از: مولانا سلفیؒ)

اس لئے قبروں پر مدد طلب کرنے اور حاجتیں پوری کرنے کے لئے مشکلیں حل کروانے کے لئے جانا ہرگز جائز نہیں ہے۔ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے جس قسم کی زیارتیں بتائی ہیں ان میں موت یاد کرنے کے لئے قبروں کی زیارت' قبر میں دفن شخص کے لئے بخشش کی دعا کرنا شامل ہیں۔

زیارت قبور کی جو شکلیں سنت سے ثابت نہیں' انہیں جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔

سفارش کون کرے گا؟

سوال: بحرین سے سردار محمد انور خان لکھتے ہیں۔ اس سے قبل آپ نے نبی پاکؐ کے وسیلے سے دعا مانگنے کے جواب میں قرآن مجید میں انبیاء کرام کی دعاؤں کا ذکر کیا اور صحابہ کرام کی دعاؤں کا ذکر کیا کہ اس میں کسی وسیلے کی نشان دہی نہیں۔ لہذا یہ جائز نہیں ہے۔ یہ ثبوت اپنی جگہ درست ہے لیکن قرآن پاک کے پارہ ۲۵ (سورہ زخرف: ۸۶) میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

"اور جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ ان کی سفارش نہیں کر سکتے البتہ جس نے علم و یقین کے ساتھ حق کی گواہی دی وہ سفارش کر سکتے ہیں۔"

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ جس نے میرے نیک بندوں (ولی اللہ) سے عداوت رکھی میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں۔ قرب الٰہی حاصل ہونے کے بعد بندہ مومن کی سماعت و بصارت' پکڑ و رفتار سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی خاص نگرانی میں آجاتی ہیں اور اس کی برکات کے باعث مومن کے اعضاء جسمانی میں گویا قوت الٰہی کام کرنے

لگتی ہے اب آپ ہی بتائیں کہ ایسے ولی اللہ کی سفارش یا وسیلے سے مانگی ہوئی دعا کو جائز کس طرح نہ کہا جائے اور یہ شان تو اس امتی کی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جب کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کی مثال تو کہیں زیادہ ہے؟

جواب: آپ کے دونوں سوال شفاعت اور وسیلے کے بارے میں ہیں اور ہم دونوں مسئلوں کی الگ الگ وضاحت کیے دیتے ہیں۔

پہلا سوال جس کی بنیاد آپ نے سورہ زخرف کی ایک آیت پر رکھی ہے وہ شفاعت کے بارے میں ہے۔ جہاں تک شفاعت کے ثابت ہونے کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ قرآن وسنت سے ثابت ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سفارش کرے گا؟ کس بات کی کرے گا؟ اور کس کی کرے گا؟

ان تینوں چیزوں کا جاننا ضروری ہے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں جب ہم ان تینوں باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیں گے تو شفاعت کا مسئلہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔

پہلی: بات یہ کہ سفارش کون کرے گا؟ اس بارے میں قرآن حکیم میں جا بجا اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سفارش کے لئے وہی لوگ زبان کھولیں گے جن کی وہ اجازت دے گا آیت الکرسی کے یہ الفاظ کتنے واضح ہیں

﴿مَنْ ذَالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ (البقرہ : ۲۵۵)

"اس کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کون کرے گا؟"

دوسری: بات یہ کہ جو سفارش کی اجازت حاصل کر کے سفارش کریں گے وہ کن لوگوں کی سفارش کریں گے؟ قرآن نے اس کی بھی وضاحت کر دی کہ وہ ان لوگوں کے بارے میں سفارش کرنے کی جرات کریں گے جن کے بارے میں اللہ انہیں اجازت دے گا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِیَ لَهٗ

قَوْلًا﴾(طه : ۱۰۹)

"اس کی شفاعت کسی کو نفع نہیں پہنچائے گی مگر جس کے لئے اللہ اجازت دے اور اس کے لئے کوئی بات کہنے کو پسند کرے۔"

تیسری: یہ چیز کہ صحیح بات میں سفارش کرے گا یعنی غلط کام کی سفارش نہیں ہوگی ارشاد ربانی ہے:

﴿یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَةُ صَفًّا لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾ (نباء : ۳۸)

"یعنی جس دن جبرائیل سمیت فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ رحمٰن کی اجازت کے بغیر کوئی بات نہیں کرے گا اور وہ بات بھی ٹھیک کہے"

قرآن میں یہ بھی ذکر موجود ہے کہ سفارش کرنے والے بات وہی کریں گے جو ان کے علم میں ہوگی۔ جو بات ان کے بعد ہوئی یا ان کے علم میں نہیں اس کے بارے میں کوئی سفارش نہیں چلے گی۔

جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ وہ قیامت کے دن فرمائیں گے۔

﴿وَکُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ الخ﴾ (المائدہ:۱۱۷)

کہ میں ان پر گواہ رہا جب تک ان میں خود رہا اور جب تو نے مجھے اٹھالیا تو پھر ان کے بارے میں تو ہی خبر رکھنے والا تھا۔

یہ اور اس طرح کی متعدد آیات قرآنی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کرے گا اور جو کریں گے وہ حق بات میں اپنے علم کی حد تک کریں گے اس لئے قرآن میں جابجا یہ لفظ آیا کہ انہیں کوئی سفارش نفع نہیں دے گی۔

اب اس کے بعد آپ نے جو آیت تحریر کی ہے اس کا مفہوم سمجھنا زیادہ آسان ہے۔

امام قرطبیؒ اپنی عظیم تفسیر میں سورہ زخرف کی اس آیت ۸٦ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"اللہ کے سوا جن کو وہ پکارتے تھے ان میں عیسیٰؑ عزیرؑ اور فرشتے شامل تھے اور ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ ان کی سفارش کریں گے۔ قرآن نے اس کی نفی کرتے ہوئے کہا کہ اللہ کے سوا سفارش کا کوئی مالک نہ ہوگا۔ ہاں الا من شهد بالحق سوائے اس کے جس نے حق کی گواہی دی"

آگے فرماتے ہیں:

والمعنى لا يملك هئولاء الشفاع الا لمن شهد بالحق وامن على علم و بصير. [1]

"اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی سفارش کی طاقت نہیں رکھتا مگر جس نے حق کی شہادت دی اور علم و بصیرت کے ساتھ ایمان لائے (انہیں اللہ اس کی اجازت دے گا)"

آگے فرماتے ہیں:

وقيل اى لا يملك هئولاء العابدون من دون الله ان يشفع لهم احد الا من شهد بالحق فان من شهد بالحق يشفع له ولا يشفع لمشرك۔

"یعنی ایک قول اس میں یہ بھی ہے کہ جو اللہ کے سوا غیروں کی پرستش کرنے والے ہیں ان کے لئے کوئی سفارش نہیں کریں گے ہاں ان میں سے جو حق قبول کریں گے ان کے لئے سفارش کی جائے گی مشرک کے لئے سفارش نہیں ہوگی۔"

امام ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں اس آیت کی تفسیر یوں کرتے ہیں

"کسی کی سفارش کام نہیں آئے گی اس بات کا استثناء منقطع ہے لیکن جو شخص

---

[1] تفسیر قرطبی ج ١٦ ص: ١٢٢

[2] تفسیر قرطبی ص: ١٢٢ ج ١٦

حق کا اقرار اور شاہد ہو اور خود بھی علم و معرفت والا ہو (یعنی صحیح مسلمان ہو) ایسے شخص کے لئے سفارش کار آمد ہو گی۔ (ابن کثیر ج ۵ ص ۴۶)

امام طبری نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ:

"وہ حضرت عیسیٰؑ اور عزیر کو اپنا سفارشی سمجھ بیٹھے ہوں گے، مگر ان کی سفارش ان کے لئے ہو گی جو حق کو قبول کریں اور حق بات کو جانتے ہوں کہ اللہ حق ہے۔" (طبری جلد ۲۴-۲۷-ص ۶۲)

بہر حال اس دن سفارش کا اختیار کسی کو نہ ہو گا البتہ اللہ تعالیٰ جنہیں اجازت دے گا وہ حق بات کی گواہی دیں گے یعنی حق بات میں سفارش کریں گے اجازت ملنے کے بعد۔

احادیث میں بھی رسول اکرم ﷺ نے اپنے اقرباء کے بارے میں واضح فرمایا کہ میری سفارش پر بھروسہ نہ کرنا بلکہ اپنے اعمال درست کرنا۔

اب ظاہر ہے کہ جب پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کرے گا اور یہ معلوم ہی نہیں کہ اللہ کس کس کو اجازت دے گا اور کس کو نہیں دے گا۔ تو اگر ہم بزرگوں کو ابھی سفارش کے لئے منتخب کر لیں یا کہیں کہ فلاں بزرگ میری سفارش کر دے گا جب کہ اس بزرگ کے بارے میں فیصلہ تو قیامت کے دن ہو گا کہ اسے سفارش کی اجازت ملے گی بھی کہ نہیں۔ ہاں نبی کریم ﷺ یقیناً شفاعت فرمائیں گے۔ آپ بھی پہلے اجازت لیں گے لیکن ان کے حق میں سفارش کریں گے جنہوں نے حق کی گواہی دی اور قرآنی تعلیمات پر عمل کیا ورنہ آپ کچھ لوگوں کے خلاف بھی سفارش کریں گے۔ ارشاد قرآنی ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴾ (الفرقان: ۳۰)

"کہ اے اللہ! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔"

اب ظاہر ہے جو قران کو پس پشت ڈال دیں اور پھر شفاعت کی توقع رکھیں وہ بڑی جہالت اور گمراہی میں ہیں۔ اللہ کے نیک بندے اللہ کے دین کے باغیوں کی کیسے شفاعت فرما سکتے ہیں۔

اور اللہ کی طرف سے اجازت کے بغیر اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے اور لوگوں سے کہتا ہے کہ قیامت کے دن میں تمہاری سفارش کروں گا تو وہ بھی جاہل اور دشمن دین ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ہرگز اجازت نہیں دیں گے جو ناجائز سفارش کریں گے۔ اس طرح نبی کریم ﷺ کسی کی ناجائز شفاعت ہرگز نہیں کریں گے

کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ مشکل کشا ہیں؟

سوال: اوڈنس ڈنمارک سے طلعت محمود صاحب لکھتے ہیں

(ا) کیا حضرت علیؓ کو علی مولا اور ''مشکل کشا'' کہنا درست ہے؟

جواب: عربی زبان میں ''مولیٰ'' کے مختلف معانی ہیں مثلاً مالک وسردار' غلام' انعام دینے والا' محبت کرنے والا' پڑوسی' مہمان' ساتھی' آزاد شدہ غلام وغیرہ۔

اس لئے اگر کوئی شخص حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو اپنے ساتھی' محبت کرنے والا' یا پیارے کے معنی میں ''مولیٰ'' کہتا ہے تو یہ جائز ہے لیکن اگر کوئی انہیں آقا و مالک سمجھ کر پکارتا اور بلاتا بھی ہے تو یہ جائز نہیں ہے کیونکہ حقیقی مالک و مختار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے۔

''مشکل کشا'' یعنی مشکل یا مصیبت دور کرنے والا' یہ کہنا' پکارنا یا عقیدہ رکھنا بالکل ناجائز ہے اور اگر کوئی شخص حضرت علیؓ کا نام اس عقیدے کے ساتھ پکارتا ہے کہ وہ مشکل دور کرنے پر قادر ہیں تو یہ واضح شرک ہے کیونکہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ نہ زندگی میں (اسباب کے بغیر) مشکلیں حل کرنے پر قادر تھے اور نہ

موت کے بعد وہ اس کی طاقت رکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں قرآن کی درج ذیل آیات پر اگر غور کر لیا جائے تو "مشکل کشائی" کا یہ مسئلہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی گی۔

﴿وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (الانعام: ۱۷)

"اور اگر اللہ تمہیں مصیبت سے دوچار کر دے تو اس کے سوا اس مصیبت کو ٹالنے والا اور کوئی نہیں وہ کسی کو بھلائی پہنچائے تو وہ ہر بات پر قادر ہے۔"

﴿وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ﴾ (یونس: ۱۰۷)

"اور اگر اللہ کسی کو تنگی میں ڈال دے تو اس تنگی کو اس کے سوا اور کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر کسی کے ساتھ وہ بھلائی کا فیصلہ کر لے تو اس کے فضل کو کوئی رد بھی نہیں کر سکتا۔"

﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾(آل عمران: ۱۶۰)

"اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو پھر تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اگر اس نے تمہیں رسوا کر دیا تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور مومنوں کو چاہئے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔"

اب ان آیات کے بعد "یا علی مدد" کہنا اور "علی مشکل کشا" کہنا کس زمرے میں آتا ہے۔ قرآنی احکام کی روشنی میں اس کا تعین کرنا چنداں مشکل نہیں۔

حضرت علیؓ کے دور میں جو فتنے پیدا ہوئے اور حضرت معاویہؓ کی الگ خلافت کی جو مشکل پیش آئی وہ زندگی میں اس مشکل کو حل نہ کر سکے پھر خود اچانک شہید کر دیے گئے ان کے لخت جگر حضرت حسینؓ کو ظالمانہ طریقے سے شہید کیا گیا مگر وہ

کسی کی بھی مدد نہ کر سکے اور نہ ہی مشکل حل کر سکے تو آج وہ کسی کے پکارنے پر اس کی مشکل حل کرنے یا مدد کرنے پر آخر کس طرح قادر ہو سکتے ہیں؟

اس طرح کے عقائد و خیالات قرآنی تعلیمات سے جہالت کی بنا پر ہی پیدا ہوتے ہیں۔

کیا مرشد پکڑنا جائز ہے؟ وسیلہ کی حقیقت کیا ہے؟

سوال: ہیلی فیکس سے محمد یونس صاحب لکھتے ہیں کہ

(۱) کیا کوئی مرشد پکڑنا جائز ہے؟ اور وسیلہ کی کیا حقیقت ہے؟

(۲) کیا قصداً سفر کر کے کسی ولی اللہ کی قبر پر جانا جائز ہے؟ کہ وہاں جا کر اس کے لئے دعا کریں گے۔

(۳) چلہ کشی جائز ہے؟

جواب: (۱) "مرشد" عربی لفظ ہے جس کا معنی ہے ہدایت کرنے والا' سیدھا راستہ دکھانے والا۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص کسی کو اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے' اسے غلط راستے سے موڑ کر نیکی کے راستے پر چلاتا ہے تو وہ گویا کہ اس کا مرشد ٹھہرا اور اس قسم کے مرشد کے لئے نہ تو یہ ضروری ہے کہ وہ کسی بہت بڑی گدی کا مالک ہو یا کوئی بڑی خانقاہ اس کے کنٹرول میں ہو یا خاص قسم کا لباس پہنتا ہو یا کسی خاص شکل و صورت کو اختیار کئے ہوئے ہو۔ اس لغوی مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص بھی علم ہدایت اور نیکی کی باتیں بتاتا ہو یا کسی شخص کو اس کی وعظ و نصیحت سے فائدہ ہوا ہو تو وہ اس کا مرشد ہے۔

جہاں تک مرشد پکڑنے کی اصطلاح کا تعلق ہے تو قرآن و حدیث میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ تم مرشد تلاش کر کے اسے پکڑ لو۔ ہاں قرآن میں یہ ضرور آیا ہے کہ

﴿فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الانبیاء:۷)

"یعنی علم والوں سے وہ باتیں پوچھ لیا کرو جو تم نہیں جانتے۔"

اس آیت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ دین و ہدایت کی جن باتوں کا خود علم نہ ہو ان کے بارے میں دوسروں سے راہنمائی حاصل کیا کریں۔ یعنی اگر مرشد کی ضرورت پڑ جائے تو کسی ایسے شخص کے پاس جائیں جو علم دین سے واقف ہو اور دین کی تعلیمات کی روشنی میں وہ تمہاری راہنمائی کرے۔ تو گویا کہ کسی جاہل کے پاس رشد و ہدایت کے لئے جانا ہرگز درست نہیں۔ لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب بھی کسی دینی مسئلے کی ضرورت محسوس ہو یا کسی مسئلے کو سمجھنے میں دقت پیش آئے تو اہل علم کی طرف رجوع کیا جائے اور ان سے استفادہ کیا جائے۔

رسول اکرم ﷺ سے بھی ایسی کوئی بات ثابت نہیں حالانکہ آپ کائنات کے مرشد اعظم ہیں آپ سے بڑا کوئی مرشد نہیں لیکن آپ نے اپنے الوداعی خطبے میں امت کو جو وصیت کی وہ یہ تھی کہ "میرے بعد دو چیزوں کو مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت۔" ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ میرے بعد میرے صحابہ کے طریقے پر مضبوطی سے قائم رہنا۔ جب آپ دنیا سے رخصت ہوتے وقت یہ تاکید فرما رہے ہیں کہ میرے بعد تمہاری رشد و ہدایت کا ذریعہ کتاب و سنت ہوں گے اب اگر موجودہ مروجہ شکل میں کسی مرشد کا پکڑنا ضروری ہوتا تو آپ اس کی ضرور وضاحت فرماتے۔

بہر حال کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف بلانے والے علماء اور صلحاء ہی مرشدین حق ہیں نیکی اور خیر کے کاموں میں ان سے راہنمائی حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن مرشد بنانے یا مرشد پکڑنے کی جو شکل اس وقت ہمارے ہاں لوگوں میں رائج ہے یہ دو لحاظ سے ہمارے نزدیک درست اور جائز نہیں ایک تو اس لئے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس کو مرشد پکڑ لیا اب یہ قیامت کے دن بھی ہمارے کام آئے گا اور عذاب سے چھڑائے گا اور بعض جاہل لوگ تو اس خیال سے منکرات کرتے رہتے ہیں کہ ہم نے فلاں کو مرشد بنا لیا ہے وہ جانے اور اللہ ہمیں نمازیں پڑھنے کی کیا

ضرورت ہے اور ایسے لوگ فرائض ترک کر دیتے ہیں' کبائر تک کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن مرشد کو نذرانے اور شیرینیاں پیش کرتے ہیں اس خیال سے کہ وہ قیامت کے دن چھڑا لے گا۔ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی سے تو نہیں ڈرتے لیکن خود ساختہ پیر یا مرشد کی نافرمانی سے گھبراتے ہیں اور اس کی خدمت میں کوئی نذرانہ پیش نہ کرنا اسے بھی اپنے لئے خطرہ سمجھتے ہیں اور اس کو ہر قیمت پر راضی رکھتے ہیں جب کہ نماز روزے جیسے فرائض کی پرواہ تک نہیں کرتے۔ اگر مرشد پکڑنے کا یہ مفہوم ہے یا یہ طریقہ ہے تو یہ سراسر باطل ہے اور شرک کے کاموں میں سے ہے۔ کیونکہ اللہ کے ہاں انسان کے اعمال اس کا اصل سرمایہ ہوں گے۔ کوئی اللہ کے عذاب سے کسی کو نہ چھڑائے گا اور اس خیال سے نافرمانیاں کرنا کہ فلاں مرشد چھڑا لے گا یہ سراسر جہالت ہے۔ رسول اکرم ﷺ جب اپنی پیاری بیٹی حضرت فاطمہ الزہرہؓ اور اپنی پھوپھی حضرت صفیہؓ سے یہ کہتے ہیں کہ عمل کر لو عمل کر لو۔ عمل کے بغیر اللہ کے یہاں کامیابی نہ ہو گی تو آج کسی خود ساختہ ولی کو یہ اختیار کس نے دیا ہے کہ وہ ششماہی یا سالانہ نذرانے وصول کرنے کے بدلے میں لوگوں کو اللہ کے عذاب سے بچانے کے وعدے کرلے۔

مرشد پکڑنے کا موجودہ انداز اس لئے بھی جائز نہیں کہ اس کے لئے لوگ علم و فضل یا تقوی و نیکی نہیں دیکھتے بلکہ وہ دیکھتے ہیں کہ وہ کتنی بڑی گدی پر بیٹھا ہے۔ وہ کس پیر یا مرشد کی نسل سے ہے یا اس کے تعویذ پھونکیں کیا کرشمے دکھاتی ہیں جبکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرامین کے مطابق جو اللہ سے زیادہ سے زیادہ ڈرنے والا نیکی کرنے والا برائیوں سے رکنے والا اور لوگوں سے نیکی اور بھلائی کرنے والا ہو گا وہ اللہ کا مقرب' متقی اور ولی ہو گا مگر اس دور میں یہ مرشدین کے پجاری نہ نماز روزہ دیکھتے ہیں نہ عمل و کردار کی ان کے نزدیک اہمیت ہوتی ہے بلکہ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا دم اور پھونک یا بعض شعبدے لوگوں میں کس قدر مشہور یا مقبول ہیں اور شرکیہ اعمال کے

عادی یہ لوگ بعض اوقات اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ اگر کوئی غیر مسلم بھی اسی طرح کرشمہ دکھادے تو اس کے ہاں بھی حاضری دینا شروع کردیتے ہیں۔ یہ سب جہالت اور گمراہی کے کام ہیں اور مرشد پکڑنے کا یہ تصور سراسر غیر اسلامی ہے۔ ایسے اعمال سے بچنا ضروری ہے۔

وسیلہ : جہاں تک وسیلے کا تعلق ہے تو اس کی دو قسمیں ہیں ایک مشروع اور ایک ممنوع۔

اگر وسیلہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی ایسا وسیلہ ہونا چاہئے جس کے ذریعے یہ پہچان ہو کہ کون سے کام اللہ کو پسند اور کون سے ناپسند ہیں اور کن کاموں کے کرنے کا اس نے حکم دیا اور کن کاموں سے اس نے روکا۔ یہ پہچان کرانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول دنیا میں بھیجے اور ان پر کتابیں بھی نازل کیں تاکہ لوگوں کے سامنے حق و باطل کا فرق واضح ہو جائے گویا اللہ کی کتاب اور اللہ کے نبی کی تعلیمات' یہ وسیلہ اور ذریعہ ہیں دنیا میں صحیح اور کامیاب زندگی گزارنے کے لئے۔ وسیلے کا یہ مفہوم جائز اور مشروع ہے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ کی تعلیمات سے راہنمائی کے بغیر کوئی شخص بھی نیکی کا راستہ معلوم کر سکتا ہے نہ برائی سے بچنے کی اسے پہچان ہو سکتی ہے اور اس وسیلے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں نبی اور رسول بھیجے جنھوں نے مخلوق کو خالق تک پہنچنے کا راستہ بتایا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے صحیح طریقے بتائے۔

وسیلے کی دوسری شکل جو ممنوع ہے اور ناجائز ہے اور اس وقت رائج بھی ہے وہ یہ سمجھنا کہ اللہ تک کسی واسطے یا وسیلے کے بغیر رسائی ممکن نہیں نہ وہ دعا سنتا ہے اور نہ ہی براہ راست اس تک کوئی بات پہنچائی جا سکتی ہے جب تک کہ کسی نیک یا بزرگ کا درمیان میں واسطہ نہ ڈالا جائے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۸۶ میں فرمایا کہ "اے نبیؐ جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو بتادیں کہ میں قریب ہوں

ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارتا ہے" یہاں اللہ سے مانگنے یا اس کی عبادت کے لئے کسی وسیلے کو ضروری قرار نہیں دیا گیا۔

بعض جہلا یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر کسی حاکم یا بادشاہ تک کسی واسطے یا وسیلے کے بغیر کوئی آدمی نہیں پہنچ سکتا تو اللہ تو احکم الحاکمین ہے اتنی بڑی ذات تک بغیر وسیلے کے پہنچنا کیسے ممکن ہے یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور پہچان نہ ہونے کی دلیل ہے کہ دنیا کے بادشاہوں اور افسروں سے اس ذات کو ملاتے ہیں۔ یہ بادشاہ اور افسر بے خبر ہیں جبکہ اللہ کی ذات باخبر ہے۔ یہ دوسرں کے بتانے کے محتاج ہیں جب کہ اللہ کی ذات کسی کے بتانے کی ہرگز محتاج نہیں۔ یہ تو اپنے قریب کی باتوں کو بھی نہیں جانتے جب کہ اللہ دلوں کے بھید بھی جانتا ہے' وہ کسی وسیلے کا ہرگز محتاج نہیں' وہ ان واسطوں سے بے نیاز ہے۔ وہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے- وہاں کسی سیڑھی یا واسطے کی نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ وسیلہ کا یہی وہ غیر مشروع طریقہ ہے جو انسان کو شرک میں مبتلا کر دیتا ہے۔

(۳) جہاں تک قصداً ثواب کی نیت سے کسی مزار یا قبر کی زیارت کے لئے سفر کرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں رسول اکرم ﷺ کا یہ فرمان سامنے رہنا چاہیے

كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها فانها تزهد في الدنيا وتذكر الاخرة-[1]

آپؐ نے فرمایا"میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے روکا تھا ان کی زیارت کرو۔ اس سے دنیا کی رغبت کم ہوتی ہے اور آخرت یاد آتی ہے۔"

بلاشبہ اس حدیث میں قبروں کی زیارت کی اجازت دی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے جو کڑی شرط لگائی ہے وہ انتہائی اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ قبر کی زیارت سے غرض اور مقصود یہ ہونا چاہئے کہ دنیا کی بے ثباتی کا یقین پختہ ہو' اس سے رغبت کم ہو اور آخرت یاد آجائے۔

---

[1] جامع الترمذی ج ۱ کتاب الجنائز باب زیارة القبور ۳۷۶

دوسری حدیث میں یہ دعا پڑھنے کا حکم ہے۔

السلام علیکم اهل دیار قوم مئومنین وانا ان شاء الله بکم لاحقون.[1]

”اے قبروں میں بسنے والے مومنین تم پر اللہ کی سلامتی ہو بلا شبہ اگر اللہ نے چاہا تو ہم بھی تم سے ملنے والے ہیں“

معلوم ہوا قبر کی جائز زیارت کی پہلی شرط یہ ہے کہ آخرت یاد کرنا مقصود ہو اور دوسری قبر والوں کے لئے مغفرت وسلامتی کی دعا کرنے کی نیت ہو۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ مزاروں کی جو زیارت کی جاتی ہے اس میں یہ دو شرائط کہاں تک پوری کی جاتی ہیں؟ اس وقت جن مزاروں پر لوگ جاتے ہیں تو ان میں اکثریت اس قصد یا خیال سے نہیں جاتی کہ وہاں آخرت یاد آئے گی یا بزرگوں کے لئے دعا کریں گے بلکہ یہ لوگ ان سے مرادیں مانگنے چڑھاوے چڑھانے نذریں دینے بلکہ سجدے کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ لوگ سینکڑوں میل کا سفر اس لئے کرتے ہیں کہ وہاں کچھ ملتا ہے اور ان کے ذریعے مشکلیں حل ہوتی ہیں اور وہاں حاضری دیتے ہی مصائب ٹل جاتی ہیں۔ یہ مشرکانہ خیالات ہیں۔ قبر کی زیارت کی یہ شکل بالکل ناجائز ہے۔ یہ غلط ہے کہ یہ لوگ وہاں دعا کے لئے جاتے ہیں اس کی پہلی دلیل تو یہ ہے کہ اپنے عزیز واقارب کے قبرستان ان کے نزدیک ہوتے ہیں۔ برس ہا برس گزر جاتے ہیں مگر ان لوگوں کو ان کی قبروں کی زیارت یا دعا کی توفیق نہیں ہوتی اس لئے دعا کے لئے کوئی نہیں جاتا بلکہ پوجا کے لئے جاتے ہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ کے اولیاء اور بزرگان دین سے زیادہ گناہ گار اور اپنے فوت شدہ عزیز واقارب دعا کے محتاج ہوتے ہیں ان کے لئے تو ہم دعا نہیں کرتے لیکن جنہیں پہلے ہی بخشے ہوئے اور مقربین سمجھتے ہیں ان کے لئے دور دراز کے سفر بھی کرتے ہیں اس لئے یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ لوگ وہاں ان کے لئے دعا کرنے جاتے ہیں اور پھر دعا کے لئے کسی طویل سفر کی

---

[1] مسلم مترجم ج۱ کتاب الجنائز ص ۳۰٤

بھی ضرورت نہیں۔ اللہ ہر جگہ سے دعا سنتا اور قبول کرتا ہے اور پھر رسول اکرم ﷺ نے یہ تو فرمایا کہ مسجد الحرام، مسجد نبویؐ اور مسجد اقصیٰ کا قصد زیارت کے لئے کریں اور وہاں دعائیں بھی کی جائیں۔ باقی کسی جگہ کے لئے یہ ضروری قرار نہیں دیا کہ وہاں دعا کے لئے سفر کر کے جاؤ۔ بلکہ ایک لحاظ سے قصد اسفر زیارت ان تینوں جگہوں کے لئے خاص کر دیا گیا ہے۔

بہر حال کسی بھی قبر پر دعا کرنا مسنون طریقے سے جائز ہے اور آخرت یاد کرنے اپنے اندر فکر آخرت پیدا کرنے کی غرض سے قبروں کی زیارت مشروع اور جائز ہے جب کہ باقی جو شکلیں آج کل رائج ہیں ان کا قرآن وحدیث میں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

(۳) چلہ کشی کے بارے میں سوال واضح نہیں ہے۔ قرآن یا سنت میں چلہ کشی کے مفہوم کی کوئی اصطلاح نہیں ملتی۔ اعتکاف کی شکل موجود ہے اگر کوئی شخص دنیاوی دھندوں سے کچھ دن کے لئے الگ تھلگ ہو کر اللہ کی عبادت یاذکر کرتا ہے تو اس کی شکل اعتکاف کی ہے۔ باقی دریاؤں کے کناروں پر چلے کاٹنا، کئی کئی مہینے کمروں میں بند ہو جانا، بھوکے رہنا، ایک ٹانگ پر کھڑے ہونا، ان شکلوں کا کوئی ثبوت نہیں۔ یہ رہبانیت کی شکلیں ہیں جنہیں اسلام پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ مفصل جواب تو سوال کی وضاحت کے بعد ہی دیا جاسکتا ہے کہ چلہ کشی سے کیا مراد لیتے ہیں اور موجودہ دور میں چلہ کشی کی کونسی شکل ہے جس کے بارے میں آپ دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

کیا اولیاء مرتے نہیں؟

سوال: میڈ سٹون جیل سے محمد اسلم نے پوچھا ہے

(۱) یہاں جیل میں ہمارے ساتھیوں کے درمیان اولیاءاللہ کے مرنے کے بعد کی زندگی کے بارے میں بحث ہوتی رہتی ہے۔ ایک صاحب نے ہمارے ایک ساتھی کو ایک خط لکھا ہے جس میں تحریر ہے:

"دراصل مرتا کوئی بھی نہیں، صرف اس دنیا سے عالم برزخ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ عالم برزخ کے احوال اس دنیا سے مختلف ہیں۔ شہداء کی طرح صدیقین بھی زندہ ہیں مگر ان کی زندگی اس قسم کی ہے جس کا شعور ہمیں نہیں۔ اولیاء اللہ صدیقین میں سے ہیں وہ ہمیں توجہ دے سکتے ہیں، ہمارے لئے دعا کر سکتے ہیں اور ان کی توجہ اور دعا سے دلوں میں پاکیزہ جذبات اور اچھے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ طبیعت اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہوتی ہے۔ دنیوی امور میں ان سے نہیں مانگنا چاہئے نہ انہیں یہ بات پسند ہے۔"

جواب: اولیاء اللہ کا مقام اللہ کے ہاں انتہائی ارفع و اعلیٰ ہے اس میں کوئی کلام نہیں اور اللہ کے نیک بندوں کا ادب و احترام نہ کرنے والے لوگ یقیناً قابل مذمت ہیں۔ جہاں تک وفات کے بعد ان کی زندگی یا دعا سننے اور توجہ کرنے کا مسئلہ ہے تو ان مسائل میں وہی راستہ صحیح اور بہتر ہو گا جو ہمیں قرآن و حدیث کی روشنی میں ملتا ہے۔ اپنی رائے اور خواہش کے ذریعے کسی مسئلے کو ثابت کرنے کا رجحان درست نہیں۔ آپ کے دوست کو جو کسی صاحب نے خط لکھا ہے اس میں چار باتیں کہی گئی ہیں:

اول، یہ کہ مرتا کوئی بھی نہیں۔

دوم، یہ کہ شہداء کی طرح صدیقین بھی زندہ ہیں۔

سوم، یہ کہ وہ توجہ دے سکتے ہیں اور دعا کر سکتے ہیں۔

چہارم، یہ کہ دنیوی امور میں ان سے نہیں مانگنا چاہئے۔

ان کا یہ کہنا کہ مرتا تو کوئی بھی نہیں صرف اس دنیا سے عالم برزخ میں منتقل ہو جاتے ہیں، یہ بات عجیب اور مضحکہ خیز سی معلوم ہوتی ہے۔ اس بزرگ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ برزخ کی طرف جانے کو ہی مرنا کہا جاتا ہے۔ ان کا یہ فرمان قرآن کے بالکل خلاف ہے۔

قرآن کہتا ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ (آل عمران: ١٨٥)

"کہ ہر جان نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔"

اور یہ حضرت فرما رہے ہیں کہ دراصل مرنا تو کسی نے بھی نہیں۔

قرآن کہتا ہے:

﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ (الزمر: ٣٠)

"آپ کو بھی فوت ہونا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔"

ایک اور جگہ برگزیدہ نبی کے بارے میں فرمایا:

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ﴾ (البقرہ: ١٣٣)

"کیا تم اس وقت حاضر تھے جب یعقوب کو موت حاضر ہوئی۔"

اور ایک مقام پر حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ﴾ (سبا: ١٤)

"کہ حضرت سلیمانؑ پر جب ہم نے موت کا فیصلہ کیا۔"

یہ اور اس طرح کی متعدد آیات قرآنی ہیں جن میں ہر ذی روح کے لئے موت کے برحق ہونے کا ذکر آیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا بالکل جہالت کی بات ہے کہ "مرتا کوئی بھی نہیں" بے شک قرآن و حدیث کی رو سے اللہ تعالیٰ کے سوا ہر ایک نے مرنا ہے۔ رہی عالم برزخ کی طرف منتقل ہونے کی بات تو یہ درست ہے۔ موت کے بعد عالم برزخ میں رہنا ہے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ ہمارے لئے دعا اور توجہ کر سکتے ہیں اور اس کا دلوں پر اثر ہوتا ہے۔ یہ بھی بے سند بات ہے۔ اس پر قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں۔ دعا اور پکار تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ مافوق الاسباب اللہ کی ذات کے سوا کسی زندے یا مردے دونوں سے دعا کرنا یا کچھ مانگنا جائز نہیں۔ اولیاء اللہ کا مقام اپنی جگہ لیکن سرور کائنات رہبر انسانیت ﷺ نے بھی کسی جگہ ارشاد نہیں

فرمایا کہ مجھ سے دعا کیا کرو۔ آپ نے تو یہ حکم دیا کہ مجھ پر درود و سلام کثرت سے پڑھا کرو۔ مگر کسی جگہ نہیں فرمایا کہ میرے بعد مجھ سے مانگا کرو۔ میں تمہارے لئے دعا کروں گا یا مجھے پکارا کرو میں تمہاری طرف توجہ کیا کروں گا اور نہ ہی صحابہ کرام سے یہ ثابت ہے کہ وہ دعا اور توجہ کے لئے حضور ﷺ کے روضہ اقدس پر حاضری دیتے ہوں۔ صحابہ پر مشکل دور آئے' پریشانیوں سے دوچار ہوئے مگر ایک بھی ایسا واقعہ نہیں کہ وہ ان کے حل کے لئے روضہ مبارک پر گئے ہوں اور پھر حضور ﷺ کو پکارا ہو۔

رشتہ داروں سے مدد لینا جائز ہے؟

سوال: گلاسگو سے الطاف حسین صاحب پوچھتے ہیں

اپنے رشتہ داروں سے یہ امید رکھنا کہ وہ کسی کام میں مدد کریں گے یا فلاں کام کر دیں گے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

اگر کوئی شخص مجھ پر حملہ کرتا ہو اور میں کسی ساتھی یا دوسرے آدمی کو مدد کے لئے پکاروں' کیا یہ پکارنا جائز ہے؟

جواب: مومن بھروسہ اور توکل تو کامل طور پر اللہ ہی پر کرتا ہے مگر دنیاوی اسباب کا استعمال کرنا یہ قطعی توکل کے خلاف نہیں اور باہمی تعاون کے طور پر رشتہ داروں کا ایک دوسرے کی مدد کرنا یا کام آنا یہ کوئی بری بات نہیں۔ قرآن حکیم میں عزیز و اقارب سے نیک سلوک کرنے کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ اب اگر مساکین رشتہ دار کسی آسودہ حال رشتہ دار سے تعاون و خیر خواہی کی امید رکھتے ہیں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ہاں کسی پر کامل بھروسہ کر بیٹھنا یا رشتہ داروں کو معبود حاجت روا کی طرح بنا لینا یہ درست نہیں ہے۔

دنیاوی اسباب کو استعمال کرنا بھی ایمان کے تقاضوں میں سے ہے۔ جس طرح آگ' پانی اور ہوا کے اسباب مختلف ضرورتوں میں انسان استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح دوسرے موجود اور زندہ دنیاوی اسباب استعمال کرنے جائز ہیں۔ کسی زندہ اور موجود آدمی سے کوئی چیز طلب کرنا' تعاون کے لئے بلانا یا اس کی مدد حاصل کرنا' یہ اسباب دنیا میں سے ہے۔ اس میں کوئی مخالفت نہیں اور نہ ہی یہ غیر اللہ کی پرستش و عبادت کے زمرے میں آتا ہے۔

کیا شراب سے تر مصلے پر نماز جائز ہے؟

سوال: یہاں نماز عصر کے وقت ایک امام صاحب تعلیم کے وقت بتا رہے تھے کہ اگر شیخ کامل یعنی پیر ہو اور وہ کہے مصلی شراب میں بھگو کر نماز پڑھو تو اس کی بات پوری کرنا ہوگی۔ کیونکہ اس میں کوئی اچھا راز ہی ہوگا۔ اس پر بھی روشنی ڈالیں۔

جواب: یہ غلط اور بے ہودہ بات ہے کہ اگر کامل پیر یا شیخ کہے کہ شراب میں مصلی بھگو کر نماز پڑھو تو اس کی تعمیل کرنا ہوگی۔ کامل شیخ یا بزرگ ایسی بات نہیں کہہ سکتا کوئی شیطان کا چیلا ہی ایسی بات کر سکتا ہے کیونکہ شراب ایک گندی اور حرام چیز ہے جسے شیطان ہی پسند کر سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو شراب اٹھانے اور پکڑنے والے پر بھی لعنت کی ہے تو یہ شیخ کامل کون ہے جو لوگوں کو شراب میں جائے نماز بھگونے کی تلقین کرتا ہے۔ ایسی تعلیم دینے والوں کی اصلاح کرنی چاہئے یا ان کی مجلس سے الگ رہنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو شراب حرام ٹھہرائے جانے کے بعد اسے گھروں سے باہر پھینکنے کا حکم دیا۔ کیا نعوذ باللہ آج کوئی حضور اکرم ﷺ سے بھی زیادہ کامل بزرگ پیدا ہو گیا ہے جو اس طرح کی خرافات کی تعلیم دے رہا ہے؟ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ کوئی مسلمان اس طرح کی تعلیم دے سکتا ہے کجا کوئی شیخ کامل؟

جو افراد یا جماعتیں قرآن و حدیث اور توحید و سنت کی تبلیغ کریں، نیکیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں اور یہ سارے کام اللہ اور اس کے رسول کے احکام اور صحابہ کرام کے عمل کی روشنی میں کریں تو ان سے تعاون کرنا چاہئے۔ اصول یہی ہونا چاہئے کہ:

﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدۃ : ۲)

"نیکی اور تقوے کے کاموں میں تعاون کرو اور گناہ و ظلم کے کاموں میں

تعاون نہ کرو۔"

جو لوگ اللہ کی عبادت کی بجائے اپنی پرستش پر زور دیں اور رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں اشخاص کی پیروی کی تلقین کریں ایسی دعوت میں بھی تعاون نہیں کرنا چاہیے۔

هذا ما عندی و الله اعلم بالصواب

رسالت

کیا سب سے پہلے حضور ﷺ کا نور پیدا ہوا ہے؟

سوال: لیسٹر سے ابرار صاحب پوچھتے ہیں کہ امام عبدالرزاق کی کتاب مصنف عبدالرزاق کی جو روایت پیش کی جاتی ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو پیدا کیا' کیا یہ صحیح ہے؟ اور حضور ﷺ نے یہ دعا کی تھی کہ و اجعل لی نوراً کہ اللہ مجھے نور ہی بنادے۔ اور پھر قرآن کی یہ آیت بھی ﴿قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُورٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِينٌ﴾ (المائدة : ۱۵) بھی حضور کے نور ہونے کی دلیل ہے۔ ایک مولوی صاحب یہ دلائل دیتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: جس آدمی نے نور کے ثبوت میں جو روایت تحریر کی ہے' اس میں اس بات کو بیان کر کے اپنی دلیل کو مضبوط بنانے کی کوشش کی ہے کہ امام عبدالرزاق کی کتاب میں یہ روایت ہے اور یہ امام موصوف امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امام عبدالرزاقؒ کا مقام ائمہ دین میں بڑا اونچا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جو روایت ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے وہ ثابت بھی ہے یا نہیں اور پھر امام موصوف نے خود اس روایت کے بارے میں کیا کوئی وضاحت کی ہے؟ ہمارے نزدیک یہ روایت غیر ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت جابرؓ سے کہا کہ اے جابر اللہ نے تمام اشیاء سے قبل تیرے نبی کے نور کو اپنے نور سے پیدا فرمایا۔

(۱) اول اس لئے کہ جتنے لوگ یہ روایت پیش کرتے ہیں وہ اس کی سند پیش نہیں کرتے اور علم حدیث کے ساتھ تھوڑا سا تعلق رکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ بغیر

سند کے کوئی روایت چاہے کتنا ہی بڑا امام کیوں نہ پیش کرے اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔ خاص طور پر ایک اختلافی موضوع میں تو ٹھوس اور ثقہ راویوں کی بات ہی قبولیت و ترجیح کا درجہ حاصل کرے گی اور یہ مسئلہ چونکہ عقیدے سے تعلق رکھتا ہے اس لئے یہاں ایسی بے سند روایت کا سہارا نہیں لیا جا سکتا۔

(۲) دوم یہ کہ جو آدمی یہ روایت پیش کرتا ہے اور حوالہ امام عبدالرزاق کی کتاب مصنف کا دیتا ہے اسے چاہئے کہ سند کا حوالہ دے اور بتائے کہ یہ روایت سند سمیت مصنف عبدالرزاق کی کونسی جلد کون سے باب اور کس صفحے پر ہے۔ اس کے بعد ہم اس روایت کی سند کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ہمیں تلاش کے باوجود یہ روایت سند کے ساتھ کسی جگہ نہیں مل سکی۔ جو لوگ یہ روایت پیش کرتے ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ اس کا مکمل حوالہ پیش کریں بلکہ ہو سکے تو اس کی فوٹو اسٹیٹ ہمیں بھیج دیں تاکہ ہم بھی اس کی سند ملاحظہ کریں۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ جامع ترمذی (باب القدر) اور حدیث کی کتابوں میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایت ہم پیش کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ((اول ما خلق اللہ القلم))[1] کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اب ایک طرف یہ صحیح حدیث ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک بے سند روایت کو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کیا نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ دو متضاد چیزوں کو بیان کر سکتے ہیں؟

(۴) دوسری حدیث میں سے یہ ٹکڑا پیش کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ نے دعا فرمائی کہ و اجعل لی نوراً ترجمہ یہ کیا گیا کہ اے اللہ مجھے نور ہی بنا دے۔

پہلی بات یہ ہے کہ ترجمہ بالکل غلط کیا گیا اور جس آدمی نے یہ ترجمہ کیا ہے یا تو وہ جاہل ہے اور یا اس نے جان بوجھ کر بددیانتی سے کام لیا ہے اور معمولی عربی جاننے والا بھی "لی" کا ترجمہ کر سکتا ہے "لی" کا معنی ہوتا ہے میرے لئے اور پورا ترجمہ ہوگا "اے

---

[1] جامع الترمذی مترجم ج ۱ ابواب القدر باب لاتسلموا علی اھل القدر ص ۷۷۲

اللہ ''میرے لئے ''نور (روشنی) پیدا فرمادے یا نور کر دے ''یعنی آپؐ نور' روشنی اور ہدایت اللہ کی بارگاہ سے طلب کر رہے ہیں جیسا کہ متعدد مقامات پر وہ دعائیں آئی ہیں جو آپ کیا کرتے تھے کہ اَللّٰھُمَّ اغفرلی اے اللہ مجھے بخش دے۔ اللھم اھدنی اے اللہ مجھے ہدایت دے دے

اسی طرح یہاں فرمایا اے اللہ میرے لئے نور کر دے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضورؐ نے نور بننے کی دعا کی اور اللہ نے وہ دعا قبول کر کے آپ کو نور بنا دیا' تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دعا سے پہلے آپ کیا تھے؟ اور اگر اس دعا کے بعد اللہ نے آپ کو نور بنا دیا تھا تو پھر یہ عقل کے اندھے جو دوسری (اوپر والی) حدیث پیش کرتے ہیں کہ اللہ نے سب سے پہلے پیدا ہی آپ کے نور کو کیا تھا۔ اس حدیث کی حیثیت کیا ہے کیونکہ خود ہی یہ لکھ دیا کہ دعا کے بعد آپ نور ہوئے کیونکہ اللہ نے آپ کی دعا قبول کر لی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تو آپ نور نہیں تھے اور یہ روایت غلط ہے کہ سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا۔

(۵) جہاں تک قرآن کی اس آیت کے سلسلے میں مفسرین کے اقوال کا تعلق ہے کہ ﴿قَدْ جَآءَكُم مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ﴾ (المائدة : ۱۵) اس سے مراد حضور اکرم ﷺ ہیں تو اس امر میں تو کسی کا بھی اختلاف نہیں کہ آپ کی ذات اقدس کفر' ظلم' جہالت و گمراہی کے لئے نور تھی اور اس نور سے ہر قسم کے اندھیرے چھٹ گئے اور ان کی جگہ ایمان اور ہدایت کی روشنی نے لے لی۔ لیکن قرآن میں ایک بھی ایسی آیت نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ آپ اللہ کے نور میں سے نور ہیں۔ اگر صرف نور کے لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نور من اللہ ہیں تو پھر سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۵۷ میں قرآن کو بھی نور کہا گیا سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۴۶ میں تورات کی اصلی تعلیمات کو نور کہا گیا۔ سورہ توبہ کی آیت نمبر ۳۲ میں دین اسلام کو نور کہا گیا۔ تو قرآنی آیات میں متعدد مقامات پر لفظ نور آیا ہے۔ وہ قرآن' دین' ایمان' اسلام' سچائی اور

ہدایت کے لئے استعمال کیا گیا اور اس طرح صاحب رسالت و صاحب قرآن ﷺ کے لئے بھی نور کا لفظ استعمال کیا گیا۔ خود اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں لفظ نور آیا کہ ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (نور : ۳۵) بعض مقامات پر سورج اور چاند کو بھی نور کہا گیا ہے جیسے سورہ یونس کی آیت ۴ میں لیکن اکثر مقامات پر نور کا لفظ دراصل ہدایت کے معنی میں گمراہی کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا اگر کتاب کو نور کہا جائے گا تو مراد ہوگی کتاب ہدایت اور اگر رسولؐ کو نور کہا جائے گا تو مراد رسول ہدایت ہوگا۔ اس میں نہ کوئی اختلاف ہے نہ جھگڑا۔ لیکن اللہ کے نور میں سے نور خدا ہونے کے لئے کوئی دلیل قرآن و حدیث سے پیش نہیں کی جاسکتی۔ جو ایک روایت یہ لوگ اس بارے میں جگہ جگہ پیش کرتے ہیں اس کی حیثیت کے بارے میں ہم نے شروع میں تحریر کر دیا ہے۔

نور و بشر کے مسئلے کی حقیقت؟

سوال: محمد رفیق لندن سے لکھتے ہیں میرے ایک دوست حضور اکرم ﷺ کے نور ہونے کی دلیل پیش کرتے ہیں یہ کہنے لگے کہ جب حضورؐ کی وفات ہوئی تو آپؐ کی نماز جنازہ کسی نے نہیں پڑھائی' کیونکہ حضورؐ نور تھے اور نور کی نماز جنازہ میں امام نہیں ہوتا بلکہ بشر کی نماز جنازہ امام پڑھاتا ہے جو کہ خود بشر ہوتا ہے جب میں نے یہ دلیل پیش کی کہ حضورؐ اگر نور تھے تو پھر حضرتؐ نے شادیاں کیں' لڑائیوں میں زخمی بھی ہوئے' کھانا کھاتے تھے تو انہوں نے کہا کہ حضورؐ بشر کے لبادے میں تھے۔ میں نے دوسرا سوال کیا کہ کیا دوسرے تمام اور رسول بھی نور تھے؟ تو کہنے لگے اور کوئی نبی نور نہ تھا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نور ہیں اور نور کے سامنے نور ہی نے ملاقات کی۔ اللہ سے صرف دو نبیوں نے ملاقات کرنے کی کوشش کی ایک حضرت موسیٰ نے تجلی دیکھی تو بے ہوش ہو گئے چونکہ

حضورؐ نور تھے اس لئے حضورؐ ہوش میں رہے اور معموں سے فاصلے کی دوسری ملاقات کی اور دوسری دلیل انہوں نے یہ دی کہ حضرت آدم اور حضرت حوا نے غلطی سے پھل کھایا اور حضرت آدم نے اللہ سے حضور کے وسیلے سے معافی مانگی کیونکہ انہوں نے واضح طور پر حضور کا نام لکھا ہوا پایا تھا۔

جواب: آپ کے سوال کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور اس کے مطابق ہم بالترتیب جواب تحریر کرتے ہیں۔

(۱) نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ کیسے پڑھائی گئی اور کوئی امام تھا یا نہیں اگر نہیں تھا تو اس کی وجہ کیا تھی؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ ایک امام کی اقتدا میں نہیں پڑھی گئی بلکہ الگ الگ اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں صحابہ کرام حجرہ مبارکہ میں داخل ہوتے اور نماز ادا کرتے۔ اس کا سبب کیا تھا؟ اس سلسلے میں حافظ ابن کثیرؒ نے امام بیہقی کے حوالے سے جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود نبی کریم ﷺ نے وصیت فرمائی تھی کہ آپؐ کے اہل بیت آپ کو غسل دیں۔ پھر فرمایا کہ میرے انہی کپڑوں میں مجھے کفن پہنایا جائے۔ اور جب مجھے کفن پہنایا جائے تو پھر مجھے قبر کے کنارے پر رکھ دینا اور تم باہر چلے جانا تاکہ فرشتے نماز پڑھیں' اس کے بعد اہل بیت کے مرد نماز پڑھیں' اس کے بعد باقی لوگ الگ الگ نماز پڑھیں۔

امام ابن کثیرؒ نے ہی ایک دوسری وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ اس طرح ہر شخص براہ راست آپؐ کی نماز پڑھتا اور پھر مرد' عورتیں اور بچے الگ الگ اسی طریقے سے نماز پڑھ سکتے تھے۔ اس طرح تکرار بھی مقصود تھا' تاکہ یہ سلسلہ جاری رہتا۔

ابن کثیر نے یہ بھی فرما دیا کہ "ویکون باب التعبد الذی یعسر تعقل معناہ" یعنی ان امور تعبدیہ میں سے ہے جن کی حکمت عملی طور پر معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ جس طرح ہمارے سامنے صورت حال آئے اسی کے مطابق اسے قبول کر لینا چاہئے۔

اب یہاں نور و بشر کی تو کوئی بات ہی نہیں اور نہ جنازے کے اس طریقے کا تعلق اس بات سے ہے کہ چونکہ آپؐ نور تھے اس لئے کوئی بشر آپ کی نماز جنازہ نہیں پڑھا سکتا تھا۔ پھر تو یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ جو بشر تھے پھر وہ نور کی نماز پڑھ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ بالکل جاہلانہ بات ہے' ائمہ دین میں سے کسی نے بھی یہ وجہ بیان نہیں کی ہے۔

(ب) دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نور تھے یا بشر کے لبادے میں نور تھے۔ آپ کے دوست کا یہ کہنا بھی عجیب ہے کہ آپؐ کھانا اس لئے کھاتے تھے کہ بشر کے لبادے میں نور تھے' یا لڑائیوں میں زخمی اس لئے ہوئے کہ بشر کے "لبادے" میں نور تھے آخر قرآن و سنت کے دلائل کے بغیر یہ کس طرح فرض کر لیا گیا ہے اور یہ "لبادے" کی شرط اپنی طرف سے کیوں گھڑ لی گئی ہے۔

قرآن حکیم میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جہاں بھی لفظ عبد یا بشر آیا ہے وہاں کیا "لبادے" کی شرط بھی ساتھ آئی ہے' دیکھئے سورہ کہف آیت ۱۱۰' سورہ انبیاء آیت ۲۴' سورہ فصلت آیت ۶' سورہ شوریٰ آیت ۵۱۔

اور اس سلسلے میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت فیصلہ کن ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص رسول اکرم ﷺ کو بشریت سے خارج کرتا ہے اور مقام عبدیت سے نیچے لاتا ہے تو پھر قرآن کے بارے میں اس کے اس سلوک کا انجام اسے بہر حال معلوم ہونا چاہئے۔ سو بنی اسرائیل کی آیت ۹۳ کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

"اور انہوں نے (کافروں نے) کہا' ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ ہمارے لئے زمین سے چشمہ جاری کرو۔ یا پھر تمہارے لئے کھجور اور انگور کے ایسے باغات ہوں جن کے درمیان نہریں جاری ہوں' یا پھر آسمان سے ہم پر کوئی ٹکڑا گرا دے۔ یا پھر اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آؤ۔ یا پھر آپ کے لئے سنہری گھر ہو یا آسمان پر چڑھو اور آسمان پر چڑھنا بھی قابل قبول

نہیں' یہاں تک کہ ہمارے سامنے وہاں سے کتاب لاؤ پھر ہم اسے پڑھیں' اے پیغمبران سے کہہ دیجئے کہ اللہ پاک ہے میں تو ایک انسان ہو جو رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔" (بنی اسرائیل:۹۰-۹۳)

یعنی انسانی لبادے میں نہیں بلکہ فرمایا

میں انسان ہوں اور جو مطالبے تم کر رہے ہو یہ تو اللہ ہی پورے کر سکتا ہے مجھ میں انہیں پورا کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

اسی طرح قرآن میں رسول اللہ ﷺ کے لئے دوسرا جو لفظ سب سے زیادہ استعمال کیا گیا اور جس لفظ کے ساتھ آپ کو عزت و شرف عطا کی گئی' وہ لفظ "عبد" ہے معراج کے واقعہ کا ذکر کیا ہے' تو فرمایا

"پاک ہے وہ ذات جو اپنے عبد (بندے) کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی۔"

قرآن کے نزول کا ذکر آیا اور کفار کو اس جیسی کتاب' دس آیتیں یا ایک آیت ہی لا کر پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا تو وہاں بھی لفظ "عبد" کا استعمال کیا گیا۔ فرمایا

"اگر تم اس چیز کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے عبد (بندے) پر نازل کی تو اس جیسی ایک سورت ہی بنا کر لے آؤ" (البقرہ: ۲۳)

میرے خیال میں مسلمانوں کا کوئی ایسا فرقہ نہیں جو نبی کریم ﷺ کی بشریت یا عبدیت کا انکار کرتا ہو۔ کیونکہ قرآن کی صریح آیات کا انکار کوئی مسلمان کیسے کر سکتا ہے۔ ہاں یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ آپ خیر البشر افضل البشر و سید البشر ﷺ ہیں۔ کوئی انسان آپ کے مقام کو نہیں پہنچ سکا اور نہ اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے جو شخص مقام و مرتبے میں حضور اکرم ﷺ کو اپنی طرح یا اپنے جیسا یا بڑے بھائی کے برابر سمجھتا ہے وہ مردود و کافر ہے لیکن اس کے ساتھ بشریت و عبدیت انبیاء کا انکار بھی کفر ہے۔

ہمارے بریلوی حضرات کی معرکۃ آراء کتاب "بہار شریعت" میں بھی واضح طور پر یہ فتویٰ دیا گیا ہے کہ:

"نبی اس بشر کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے لئے وحی بھیجی ہو اور رسول بشر ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ملائیکہ بھی رسول ہیں۔"

آگے پھر لکھتے ہیں:

"انبیاء سب بشر تھے اور مرد۔ نہ کوئی جن نبی ہوا نہ کوئی عورت"

(بہار شریعت حصہ اول ص ۹)

کوئی دوسرا "بشر" کا لفظ استعمال کر دے تو گستاخ اور بے ادب ٹھہرتا ہے مگر آپ کے اپنے اکابر لکھ دیں تو ان کے بارے میں بھی کچھ فرمائیے۔ اس کے بعد تو یہ نور اور بشر کی بحث ختم ہو جانی چاہیے تھی۔

(ج) تیسری بات یہ کہ حضرت موسیٰؑ اپنے رب کی تجلی برداشت نہ کر سکے اور حضورؐ نے اپنے رب کو دیکھا' لہٰذا ثابت ہو گیا کہ آپؐ نور تھے۔ یہ بھی عجیب و غریب قسم کا ثبوت ہے۔ نور اگر نور کو دیکھ لیتا ہے تو یہ کوئی کمال نہیں۔ جیسے اگر کوئی انسان کسی انسان کو دیکھ لیتا ہے تو اس میں کون سی بڑائی یا عجوبہ ہے۔ ہاں اگر بشر اپنے رب کا دیدار کر لیتا ہے تو یہ ہے اصل مقام ہمارے جو نادان دوست اپنے آقا و مولی ﷺ کو بشریت سے خارج کرتے ہیں وہ ایک لحاظ سے آپ کا مقام گھٹا رہے ہیں۔ نور کا نور کے پاس چلے جانا یا نور کی جھلک دیکھ لینا کمال کی بات نہیں کمال تو یہ ہوا کہ سید خلق آدم نے وہ مقام بلند حاصل کیا اور وہاں تک پہنچے جہاں تک کوئی دوسرا نہ پہنچ سکا اور نہ وہاں تک رسائی کا تصور بھی کر سکتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ نبی کریم ﷺ نے معراج کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی زیارت کی' یہ بات اپنی جگہ بحث طلب ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو جو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوا' وہ قلبی تھا یا آنکھوں کے ساتھ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ائمہ کی ایک بڑی تعداد کی رائے ہے کہ

قیامت کے دن سے پہلے کوئی بھی ان آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی زیارت نہیں کر سکتا۔ ان کی سب سے بڑی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے:

﴿لاتدرکه الابصار﴾

"یعنی آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔"

جو اہل علم اس بات کے قائل ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دیدار الٰہی کیا' ان میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں کہ یہ اس لئے تھا کہ آپؐ نور تھے اور نور نے نور کی زیارت کی۔ یہ ساری بے علمی اور جہالت کی باتیں ہیں۔

(د) چوتھی بات یہ کہ حضرت آدم اور مائی حوا نے حضور اکرم ﷺ کے نور کے وسیلے سے دعا مانگی۔ یہ بھی بے اصل و بے ثبوت بات ہے۔ یہ لوگ بالکل من گھڑت اور جھوٹی روایات پیش کر کے عقیدہ توحید کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب ایک بات قرآن حکیم میں واضح طور پر آگئی ہے' اب اس کے بعد اس میں بھلا کسی اختلاف کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔

قرآن نے حضرت آدم کا یہ واقعہ ایک سے زیادہ مقامات پر بیان کیا اور کسی جگہ جو معافی مانگی اس میں انہوں نے نہ تو حضور نبی کریم ﷺ کا ذکر کیا اور نہ آپؐ کا نام کسی ستارے میں لکھا ہوا دیکھا۔ اسکے برعکس قرآن نے حضرت آدم اور حضرت حوا کی وہ دعا لفظ بہ لفظ نقل کی ہے جو انہوں نے اللہ سے معافی طلب کرتے ہوئے کی اور وہ یہ ہے۔

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾ (الاعراف : ۲۳)

"ان دونوں نے کہا اے رب ہمارے ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔"

اب اگر حضرت آدم اور ان کی بیوی نے دعا میں حضورؐ کا حوالہ دیا ہوتا یا آپ کے نور کے وسیلے سے دعا کی ہوتی' تو کیا نعوذ باللہ قرآن میں جان بوجھ کر اسے چھوڑ دیا

گیااور اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ یہ عقیدے کا مسئلہ ہے اور اس میں قرآن نے ہر بات واضح طور پر بیان کی ہے اور پھر حضرت آدم کی توبہ اور اس کی قبولیت کا دوسرے مقامات پر بھی ذکر کیا ہے کسی جگہ بھی اس بات کا اشارہ نہیں اس لئے من گھڑت بات پر عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔

حضورؐ کا نام سن کر انگوٹھے چومنے کا حکم؟ پیری مریدی کی مروجہ شکل کی شرعی حیثیت؟

سوال: ساؤتھ آل لندن سے قیوم صاحب لکھتے ہیں: میں اپنے عزیزوں سے ملنے کراچی گیا تھا۔ میرے محلے میں دو مسجدیں ہیں ایک بریلوی' ایک بھوپالی۔ میرے سارے گھر والے بریلوی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔ بریلوی مسجد میں میں نے پہلی بار دیکھا کہ جمعہ کی نماز میں خطبہ کے بعد امام صاحب بیٹھ گئے اور جب اقامت کہی گئی اور جماعت کھڑی ہوئی تو امام صاحب اور چند آدمی اس وقت تک کھڑے نہ ہوئے جب تک اشہدان محمد رسول اللہ نہ کہا گیا۔ میرے پوچھنے پر امام صاحب نے بتایا کہ احادیث سے ثابت ہے کہ حضورؐ کا یہی طریقہ تھا- کچھ لوگ حضور کا نام سن کر انگوٹھے چومتے ہیں اور آنکھوں کو لگاتے ہیں۔ نماز کے بعد سلام بھی پڑھا گیا۔ یہاں ساؤتھ آل کی جامع مسجد میں بھی سلام پڑھا جاتا ہے لیکن امام صاحب شریک نہیں ہوتے۔

میرے عزیزوں میں پیری مریدی کا بہت زور ہے اور سارے عزیز ایک صاحب کے مرید ہیں جن کا نام شاید محمد سلطان ہے کیونکہ ان کے مرید اپنے کو "سلطانی" کہلاتے ہیں۔ان کی خانقاہ شاید ناظم آباد نمبر ۴ کے قریب ہے۔ وہاں مہینہ کی کسی جمعرات کو حلقہ ہوتا ہے اب کے میں بھی گیا وہاں جو کچھ ہوا اس کی تفصیل لمبی ہے۔ جو چیز مجھے عجیب لگی وہ یہ تھی کہ جب مرید نذرانہ پیش کرتے تو "حضرت صاحب" (پیر صاحب اپنے آپ کو اسی نام سے کہلواتے ہیں) کے پاؤں چومتے اور

آنکھوں سے لگاتے۔ میں جب ان باتوں پر اعتراض کرتا ہوں تو میرے عزیز مجھے "وہابی" کا خطاب دیتے ہیں۔

متذکرہ بالا باتوں پر روشنی ڈالئے کہ وہابی کون ہیں؟ بریلوی کون ہیں؟ ان دونوں فرقوں میں کیا اختلاف ہے؟ پیری مریدی میں کون کون سی باتیں صحیح ہیں اور کون کون سی غلط؟ وغیرہ وغیرہ۔

جواب: ہم نے قیوم صاحب کا سوال من وعن نقل کر دیا ہے۔ دراصل یہ ایک سوال نہیں بلکہ متعدد سوالات ہیں جن کا الگ الگ اور مفصل جواب دیا جائے گا۔

ان کے سوالات کا خلاصہ یہ ہے۔

ا۔ جمعہ کی نماز کے لئے تکبیر کے کن الفاظ پر امام کو یا مقتدیوں کو نماز کے لئے اٹھنا چاہئے؟

ب۔ حضور ﷺ کا نام سن کر انگوٹھے چومنے کا حکم۔

ج۔ نماز کے بعد کھڑے ہو کے صلوٰۃ والسلام پڑھنا۔

د۔ پیری مریدی کی مروجہ شکل کی شرعی حیثیت

ہ۔ وہابی اور بریلوی کی تعریف یا فرق

ا۔ نماز کے لئے جب تکبیر یعنی اقامت کہی جائے تو مقتدیوں کے لئے نماز کے لئے اٹھنے کے بارے میں کوئی واضح شکل احادیث میں نہیں آئی۔ ایک یہ قول ہے کہ جب قد قامت الصلوٰۃ کا لفظ کہا جائے اس وقت مقتدی اٹھیں۔ دوسرا یہ قول ہے کہ جب تکبیر کہنے والا "حی علی الفلاح" کے الفاظ کہے تو مقتدی نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ جب امام کو مصلے کی طرف جاتے ہوئے دیکھیں تو مقتدی بھی جماعت کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ اس آخری قول کے موافق ایک روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتی ترونی"[1] یعنی

---

[1] فتح الباری ج ۲ کتاب الاذان باب متی یقوم الناس ص ۳۳۱ رقم الحدیث ۶۳۷ و ۶۳۸ و ۹۰۹ ۔ نسائی ج ۱ باب قیام الناس اذا رأو الامام۔

اقامت کے وقت اس وقت تک کھڑے نہ ہو جب تک مجھے دیکھ نہ لو۔

جمعہ کے خطبہ کے بارے میں آپ نے کراچی کے امام صاحب کا جو طریقہ بیان کیا ہے اس بارے میں کوئی حدیث یا کسی امام کا کوئی قول میری نظر سے نہیں گزرا کہ امام یا مقتدی دونوں اس وقت کھڑے ہوں جب اشھد ان محمد رسول اللہ کہا جائے۔ آپ ان امام صاحب سے یہ معلوم کریں کہ وہ حدیث کس کتاب میں ہے جس کی آپ پیروی کرتے ہیں۔ جمعہ کے دن مسنون طریقہ یہی ہے کہ امام خطبے کے بعد منبر سے سیدھا مصلے پر جائے اور اقامت شروع ہونے کے بعد مقتدی بھی کھڑے ہو جائیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے کہ مقتدی کب کھڑے ہوں اس بارے میں کوئی صحیح حدیث منقول نہیں۔ لہٰذا گنجائش ہے کہ مقتدی تکبیر کے بعد کسی وقت بھی کھڑے ہو سکتے ہیں اور بہتر یہی ہے کہ امام کے تکبیر تحریمہ کہنے سے پہلے پہلے مقتدی نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں۔

(۲) حضور ﷺ کا اسم گرامی سن کر انگوٹھے چومنے کا رواج عام طور پر ہندوستان پاکستان کے بعض لوگوں میں ہے۔ احادیث پاک یا ائمہ دین کے ارشادات میں کوئی ایسا ثبوت نہیں کہ آنحضرت ﷺ سے محبت و عقیدت کے اظہار کے لئے وہ یہ طریقہ اختیار کرتے ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ محبت و عقیدت یا اجر و ثواب کے خیال سے کوئی ایسا فعل کرنا جو رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام سے ثابت نہ ہو وہ بدعت ہے اور آپ نے بدعت کو بے حد خطرناک قرار دیا ہے۔ یہ انگوٹھے چومنے کی عادت اس لئے بھی غیر مشروع معلوم ہوتی ہے کہ ایک حدیث میں واضح طور پر آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص میرا نام سن کر مجھ پر درود نہیں بھیجتا وہ سب سے بڑا بخیل ہے۔ اگر انگوٹھے چومنے کی بھی کوئی فضیلت ہوتی تو آپ ضرور ارشاد فرماتے کہ درود پڑھنے کے ساتھ ساتھ انگوٹھے بھی چوم لیا کرو اور پھر عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایسے لوگ آپ کا نام نامی سن کر ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں پر لگانے کی تو شدت سے پابندی کرتے ہیں مگر سرور دو عالم کا نام سن کر آپ پر درود بھیجنا اس کا قطعی خیال نہیں کرتے۔ جو چیز

ایک ثابت سنت کو ترک کرنے کا موجب بنے وہ کسی حالت میں بھی جائز قرار نہیں دی جاسکتی۔ اور عقلاً بھی یہ چیز عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے کہ جب ایک شخص کے منہ سے آپ کا اسم مبارک محمد نکلتا ہے تو اپنے انگوٹھے چومے جائیں۔ چاہئے تو یہ کہ اس منہ کو چوما جائے جس سے یہ پیارا نام نکلا ہے' اپنے انگوٹھوں کو چومنے کی کوئی تک ہمیں نظر نہیں آتی۔

(۳) نماز کے بعد کھڑے ہو کے درود و سلام پڑھنے کا رواج ہمارے ہاں چند سالوں سے شروع ہوا ہے۔ یہ شکل ابھی تک دوسرے کسی اسلامی ملک میں ہمیں نظر نہیں آئی۔ کسی بھی چیز کو خاص شکل اور کیفیت سے خصوصی اہمیت کے ساتھ اجر و ثواب کی نیت سے کرنا اسی وقت جائز ہو سکتا ہے جب اس کا ثبوت قرآن و حدیث یا عمل صحابہؓ سے ملے' اس کے بغیر وہ عمل بدعت کے زمرے میں آئے گا اور اللہ کے ہاں قابل قبول نہ ہوگا۔ ظاہر ہے صحابہ کرام اللہ کے رسولؐ پر درود و سلام ہم سے زیادہ اور بہتر پڑھتے تھے۔ ان کے دلوں میں محبت و عقیدت بھی ہم سے زیادہ تھی اگر وہ نماز کے بعد کھڑے نہیں ہوتے تھے تو پھر ہمیں اس طریقے کو ایجاد کرنے کی آخر ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ نماز کے بعد جو مسنون ذکر یا وظیفے احادیث میں آئے ہیں ان کی تو ہم پرواہ نہیں کرتے مگر جو چیز نہ حضورؐ سے نہ صحابہؓ سے اور حتی کہ "چاروں اماموں" سے بھی ثابت نہیں ہے اس کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ ایسے کام کو ہم کیسے جائز قرار دے سکتے ہیں جس کا ثبوت کوئی نہ ہو جو محض رسماً یا ضد و تعصب کی بنا پر کیا جاتا ہو۔ کسی مولوی صاحب یا پیر صاحب کے کرنے سے کوئی کام دین یا شریعت نہیں بن جاتا۔ بلکہ اس کے لئے شریعت کے صافی چشموں قرآن و سنت سے یا سلف صالحین کے عمل سے ثبوت مہیا کرنا ضروری ہے۔

(۴) جہاں تک اولیاء کرام کی کرامتوں کا تعلق ہے تو یہ برحق ہے۔ بزرگوں کا احترام بھی ان کے علم و تقویٰ کی مناسبت سے ضروری ہے لیکن پیری مریدی کی موجودہ مروجہ شکل ہمیں صحابہ کرام یا ان کے بعد خیر القرون میں کہیں نہیں ملتی۔ اللہ

کے حقیقی نیک بندوں نے نذرانے کے طور پر کبھی مال نہیں بٹورا۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو خیر و بھلائی کی تعلیمات دیں۔ نیکی کی راہوں پر چلایا مگر ان سے کبھی دنیاوی فائدہ نہیں اٹھایا اور نہ ہی مریدوں کے اپنے دام میں پھنسانے کے لئے خاص قسم کے لباس اور القاب مقرر کیے۔ ان کے پاس جو آتا وہ نصیحت و ہمدردی کا پیغام بن کر جاتا جب کہ آج کل صورت حال بالکل مختلف ہے۔ جیسا کہ آپ نے بھی لکھا ہے کہ نذرانہ پیش کرنے کے بعد لوگ حضرت صاحب کے پاؤں چومتے اور آنکھوں سے لگاتے ہیں اور پھر سلطانی کہلاتے ہیں۔ یہ سب کاروباری پیری مریدی ہے۔ اگر صحابہ کرام نے دو جہاں کے سردار اور کائنات کے پیر و مرشد ﷺ کے ادب و احترام میں یہ انداز اختیار نہیں کیا تو آج کسی پیر کو یہ کیسے حق حاصل کہ وہ لوگوں کو پاؤں میں گرائے یا ان کے سر اپنے سامنے جھکائے اور پھر ان بے چاروں سے یہ سب کچھ کروانے کے بعد نذرانہ بھی وصول کرے۔ قرآنی اور اسلامی زندگی کے تصور ہی کے خلاف ہے۔ اس طرح کی پیری مریدی یا دوسری خرافات اس دور کی پیداوار ہیں۔ خیر القرون کے دور کی تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔ آپ کو اس طرز ولایت کا نام و نشان تک نہ ملے گا۔

(۵) ہم کسی جگہ یا شخصیت کے نام پر مذہب یا مسلک چلانے کے بنیادی طور پر خلاف ہیں۔ قرآن و حدیث کی موجودگی میں کسی دوسری نسبت کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہابی نام کا کوئی فرقہ یا مکتب فکر نہیں ہاں چونکہ ''وہاب'' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جیسا کہ قرآن میں ہے۔

﴿وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ (آل عمران : ۸)

﴿اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ﴾ (ص : ۹)

تو اس لحاظ سے ہر مسلمان ''وہابی'' ہے اور ہر شخص اس طرف نسبت کر سکتا ہے مگر اس نام کا کوئی مخصوص مذہب یا فکر نہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سعودی عرب میں جو ایک عالم شیخ محمد بن عبدالوہاب ہوئے ہیں جو ان کے پیروکار ہیں انہیں وہابی کہا جاتا ہے۔ یہ غلط ہے اس لئے کہ اس شیخ کا نام محمد تھا نہ کہ عبدالوہاب۔ لہٰذا ان کی طرف

نسبت ہوتی تو پھر "محمدی" کہا جاتا نہ کہ "وھابی" شیخ محمدؒ بن عبدالوہاب کے افکار و نظریات سے اتفاق بھی کیا جا سکتا ہے اختلاف بھی جیسا کہ ہر امام یا عالم سے ہو سکتا ہے انبیاء کرام کے سوا کوئی بھی غلطی سے معصوم نہیں۔ہاں ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ شیخ محمد بن عبدالوہاب نے بدعات خرافات اور توہم پرستی کے خلاف قدم اٹھایا ہے تو جہلا اور اہل بدعت اسے وہابی کہہ کر بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ انگریز نے اس لفظ کو پروپیگنڈے کا ذریعہ بنا کر مسلمانوں میں افتراق ڈالنے کی سازش کی تھی۔ آپ تحریک آزادی کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان تمام لوگوں کو وہابی کہہ کر پکارا گیا جو انگریز کے خلاف تحریک میں پیش پیش تھے۔اسی طرح بریلوی بھی کوئی مکتب فکر نہیں مگر جہالت سے آج کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو سنی بریلوی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ لوگ شاید مولانا احمد رضا خان بریلوی کے پیروکار ہیں اور امام ابو حنیفہ کی تقلید کے بعد وہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کی پیروی بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ نئی نئی رسمیں نکالنے اور پیری مریدی کا کاروبار کرنے والے حضرات عام طور پر اپنے آپ کو بریلوی کہتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی نسبتیں مسلمانوں میں خلفشار کا باعث بنتی ہیں۔ اگر سب لوگ کتاب و سنت کا دامن سختی سے تھام لیں تو شخصیت پرستی سے نجات مل سکتی ہے۔

چاند کے دو ٹکڑے ہونے کا واقعہ کیسے رونما ہوا؟

سوال: نارتھ ہمسٹن سے واجد علی صاحب تحریر کرتے ہیں۔

کئی بار یہ مسئلہ سنا ہے کہ پیغمبر خدا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ نے اپنی انگلی چاند کی طرف کی اور چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ کیا آپ اس مسئلہ کو وضاحت سے بتا سکتے ہیں، مجھے سائنس سے تعلق نہیں ہے اور اگر اسلام ایک بات بتاتا ہے تو میں اس کو مانوں گا۔ سائنس کے مطابق چاند نبی کریم ﷺ کے آنے سے پہلے بھی آدھا نظر آتا رہا ہے اور پورا بھی دکھائی دیتا رہا ہے۔

جواب: انبیاء کرام سے جن خوارق عادت (خلاف عادت) امور کا ظہور ہوتا ہے انہیں معجزات کہا جاتا ہے' جو ایک طرف ان کی سچائی اور حقانیت کی دلیل ہوتے ہیں اور دوسری طرف اللہ کی جانب سے ان کے لئے اکرام وانعام۔ مومن کا ہر دور میں یہ عقیدہ رہا ہے کہ کائنات کی ہر شے کا مکمل کنٹرول صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ جیسے چاہتا ہے امور کائنات میں تصرف کرتا ہے کوئی دوسرا اس پر نہ معترض ہو سکتا ہے اور نہ ہی دخل دے سکتا ہے اسی طرح مختلف چیزوں کو جو خصوصیات یا طاقتیں دی ہیں وہ بھی اللہ نے دی ہیں اور وہ ان سے چھیننے پر بھی قادر ہے۔ پانی کی گہرائی میں ڈوب جانا' آگ میں داخل ہو تو جل جانا۔ پہاڑ سے چھلانگ لگائے تو ہڈیوں پسلیوں کا ٹوٹ جانا۔ اللہ اگر چاہے تو یہ قوتیں ان سے چھین بھی سکتا ہے کہ آگ جلانے کی صفت سے محروم ہو جائے اور پانی ڈبونے کی قوت سے خالی ہو جائے۔ انبیاء کرام کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس طرح عادت کے خلاف امور ظہور پذیر ہوئے۔

سائنس کا تعلق عقل و علم سے ہے جو محدود ہیں اور ان میں ترقی و اضافہ اور تغیر و تبدل بھی ہوتا رہتا ہے اس لئے یہ قرآن سے متصادم نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی قرآن سائنسی علوم کی نفی کرتا ہے لیکن خود سائنس دانوں کے نزدیک کوئی چیز آخری یا حتمی نہیں ہوتی۔ چند برس پہلے ایک چیز ترقی کی علامت تھی آج وہ بے کار ہے۔ آج کے سائنس دانوں نے پہلے سائنس دانوں کی بے شمار تھیوریز اور خیالات کو باطل ثابت کردیا ہے اور نہ معلوم کل آنے والے سائنس دان آج کے سائنس دانوں کی کن کن باتوں کو غلط یا فرسودہ قرار دیں گے کیونکہ کامل علم صرف اللہ کی ذات کا ہے' باقی ہر شے میں نقص کا امکان واحتمال ہے۔ نبی کریم ﷺ کا زندہ و تابندہ معجزہ قرآن کریم ہے جس کی نظیر نہ کوئی پہلے لا سکا ہے نہ قیامت تک کوئی لا سکے گا اور مسلمانوں کے تنزل و زوال کے باوجود یہ معجزہ پوری شان سے موجود ہے اور اپنے اندر بھٹکی ہوئی انسانیت کی راہ نمائی کی وہ صلاحیت آج بھی اپنے اندر اسی طرح رکھتا ہے جس طرح چودہ سو سال

پہلے رکھتا تھا۔اس کے علاوہ بھی آپ کے متعدد معجزے قرآن وحدیث میں مذکور ہیں۔
جن میں قرآن نے "شق القمر" کے معجزے کا ذکر بھی کیا ہے۔
سورہ قمر آیت نمبر ا میں ارشاد ہے ﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ قیامت قریب آگئی چاند ٹکڑے ہو گیا۔

بخاری شریف کی حدیث ہے کہ مکہ والوں نے رسول اللہ ﷺ سے کوئی نشانی طلب کی تو آپؐ نے ان کو چاند کے دو ٹکڑے دکھائے یہاں تک کہ حراء کا پہاڑ ان دو ٹکڑوں کے درمیان نظر آیا (یعنی دونوں کے درمیان اتنا فاصلہ تھا)

مسند احمد کی روایت ہے کہ یہ دیکھ کر کفار نے کہا "محمدؐ نے ہم پر جادو کر دیا۔" مگر انہی میں سے بعض نے کہا کہ باہر سے آنے والوں نے بھی شق القمر کی تصدیق کی ہے وہ آخر سب پر تو جادو نہیں کر سکتا تھا۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتی ہے اسی طرح چاند کا دو ٹکڑے ہونا بھی جہاں رسول اللہ ﷺ کے رسول برحق ہونے پر دال تھا وہاں ذات باری تعالیٰ کی قدرت و طاقت کا مظہر بھی۔ سورج' چاند' ستارے اور رات و دن کا یہ نظام اس کے اختیار و کنٹرول میں ہے۔ یہ سب اس کے حکم سے ایک خاص نظام کے تحت چل رہے ہیں۔ وہ جب چاہے ان میں کوئی تبدیلی لا سکتا ہے اور جب چاہے گا اس سارے نظام کو ختم بھی کر دے گا۔ لہٰذا اس میں حیرانی یا پریشانی کی کوئی بات نہیں۔اس طرح کے واقعات سے ایک مومن کا اللہ کی ذات پر ایمان اور زیادہ راسخ ہوتا ہے۔

آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ چاند حضورؐ کے زمانے سے پہلے بھی تو کبھی آدھا اور کبھی پورا نظر آتا تھا یہ درست ہے۔ چاند اپنی روٹین کے مطابق مہینے کے مختلف دنوں میں مختلف اشکال میں نظر آتا ہے اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی بھی واقع نہیں ہوتی لیکن حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں چاند کے دو

ٹکڑے اس طرح نہیں ہوئے تھے کہ کچھ دن آدھا اور کچھ دن مکمل نظر آیا' بلکہ ایک ہی دن ایک وقت میں تمام لوگوں نے چاند کے حصے دیکھے۔ دونوں ٹکڑے جدا جدا تھے اور احادیث میں دونوں کے درمیان فاصلے کا بھی ذکر کیا گیا اور بتایا کہ حرا پہاڑ دونوں ٹکڑوں کے درمیان آ گیا تو یہ شق القمر ایک خاص وقت میں کچھ دیر کیلئے دکھایا گیا تھا۔

حضور ﷺ کی تجہیز و تکفین میں تاخیر کیوں ہوئی؟

سوال: مغربی جرمنی سے محمد ابراہیم صاحب لکھتے ہیں۔ کیا نبی کریم ﷺ کا جنازہ تین دن تک رہا؟ اگر ایسا ہوا تو کیوں ہوا؟ جب کہ آپ ﷺ کا حکم ہے کہ جنازہ جلدی لے جایا کرو۔ پھر صحابہ کرامؓ نے آپ کو جلد دفن کیوں نہ کیا جواب تحریر کریں۔

جواب: یہ غلط ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تجہیز و تکفین تین دن تاخیر سے ہوئی بلکہ اصل صحیح بات یہ ہے کہ آپؐ کی رحلت پیر کے دن ہوئی اور آپ کی تدفین دوسرے دن رات کو ہوئی۔ اس طرح تقریباً رحلت پاک سے ۳۲ گھنٹے بعد تدفین مبارک عمل میں آئی۔ اب یہ جو تاخیر ہوئی اس کی دو تین وجوہ ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے جس حجرے میں وفات پائی تھی جنازہ اس حجرے سے باہر نہیں نکالا گیا اور جب اہل ایمان نماز کے لئے ہر طرف سے ٹوٹ پڑے تو جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے انہوں نے باری باری اندر جانا شروع کیا۔ نماز میں امام بھی کوئی نہیں تھا پہلے اہل خاندان نے جنازہ پڑھا۔ پھر مہاجرین نے' پھر انصار نے۔ اسی طرح مردوں' عورتوں اور بچوں نے الگ الگ اندر جا کر جنازہ پڑھا۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک رات اور دن برابر جاری رہا۔

(۲) دوسری وجہ یہ تھی کہ محبت و عقیدت کی شدت کی بنا پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ آپؐ نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا تو شدت غم سے یہ حال تھا اور

جذبات محبت و عقیدت کی یہ کیفیت تھی کہ تلوار کھینچ لی اور فرمانے لگے جو یہ کہے آنحضرت ﷺ وفات پا گئے ہیں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ اس بارے میں صحابہ کرام میں کافی اضطراب اور پریشانی تھی۔ اسی اثناء میں حضرت ابو بکر صدیقؓ تشریف لائے۔ لوگوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں بتایا کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے چہرہ مبارک سے چادر ہٹا کر آپ کا بوسہ لیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگے میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں - اے اللہ کے نبیؐ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اللہ آپ پر دو موتیں کبھی نہیں جمع کرے گا - بس ایک ہی موت تھی جو آپ کے لئے لکھی گئی تھی اور آپ کو حاصل ہو چکی۔ آپؐ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں پاکیزہ ہیں۔

اس کے بعد صدیق اکبرؓ باہر تشریف لائے تو دیکھا حضرت عمر لوگوں میں تقریر کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ آپؐ کو پھر زندہ کرے گا اور آپ مفسد لوگوں کے ہاتھ پیر کاٹیں گے - حضرت ابو بکرؓ نے ان سے کہا اے قسم کھانے والے بیٹھ جاؤ - حضرت عمرؓ نے کوئی توجہ نہ دی۔ حضرت ابو بکرؓ نے دوبارہ کہا مگر وہ پھر بھی نہ بیٹھے - اس پر سیدنا صدیق اکبرؓ نے اپنا خطاب شروع کر دیا تو لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور تھوڑی دیر کے بعد حضرت عمرؓ بھی بیٹھ گئے اور حضرت صدیق اکبرؓ کی تقریر سننے لگے۔ حضرت صدیق اکبر نے حمد و ثنا کے بعد وہ تاریخی الفاظ کہے جو وفات النبی ﷺ کے بارے میں ہمیشہ کے لئے سند قرار پائے۔ فرمایا:

من کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات و من کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت[1] جو کوئی محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو آپ وفات پا چکے ہیں اور جو کوئی اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا تو اس کا معبود آج بھی زندہ ہے اور کبھی وفات نہیں پائے گا اور اللہ عزوجل فرماتا ہے۔ ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ﴾ (الزمر: ۳۰) آپ بیشک وفات پانے والے ہیں اور یہ بھی مرنے والے ہیں - پھر یہ آیت کریمہ پڑھی -

---

[1] ابن ماجہ مترجم ج-۱ کتاب الجنائز باب وفات النبی ص ۸۰۶

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْئًا﴾(آل عمران: ۱٤٤)

اور محمد اللہ کے رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جو (کفر کی طرف) الٹے پاؤں پھر جائے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اللہ شکر گزاروں کو اجر عظیم دیتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں اللہ کی قسم اس وقت شدت غم اور پریشانی کے عالم میں لوگوں کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ کسی کو یہ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھی نازل فرمائی۔ جب حضرت ابو بکرؓ نے یہ آیت تلاوت کی تو ان سے سن کر لوگوں کو یہ آیت یاد آئی۔ پھر ہر شخص کی زبان پر یہی آیت تھی۔ تمام صحابہ کرامؓ اس کی تلاوت کر رہے تھے اور بے اختیار رو رہے تھے۔

(یہ واقعہ صحیح بخاری شریف کتاب الجنائز مناقب ابی بکر اور کتاب المغازی میں موجود ہے)

جب حضرت عمر فاروقؓ نے یہ آیت سنی اور انہیں بھی یقین آگیا کہ رسول اکرم ﷺ کا انتقال ہو گیا تو وہ کھڑے نہ رہ سکے شدت غم سے نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑے (بخاری شریف)

لہٰذا تاخیر کا سبب یہ واقعہ بھی بنا۔

(۳) سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ صحابہ کرامؓ کی اس موقع پر اس کیفیت اور مصروفیت کے باعث قبر کنی کا کام بھی غسل و کفن کے بعد شروع ہوا۔ اس لئے بھی کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔

☆☆☆

یا محمد (ﷺ) کہنا جائز ہے؟

سوال: براکل جرمنی سے محمد اشفاق نعیم صاحب لکھتے ہیں

"یارسول اللہ ﷺ یا "یا محمد" ﷺ کہنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: رسول اللہ ﷺ کا اسم گرامی محبت و عقیدت سے لینا یہ ایمان کی نشانیوں میں سے ہے اور آپ پر کثرت سے درودو سلام پڑھنا درجات کی بلندی کا سبب اور نجات کا ذریعہ ہے۔ جہاں تک آپ کے نام کے ساتھ یا کے لفظ کا تعلق ہے اور اس لفظ کے ذریعے آپ کو پکارنے کا مسئلہ ہے تو اگر کوئی شخص "یا رسول اللہ" اور یا محمد کہہ کر آپ کو پکارتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ آپ اس کی ہر پکار سنتے ہیں بلکہ مدد بھی کرتے ہیں اور آپ ہر جگہ موجود یا حاضر ناظر ہیں۔ یہ عقیدہ قرآن وحدیث کے خلاف ہے اور خود صحابہ کرام نے آپ کے بعد اس انداز سے آپ کو کبھی نہیں بلایا یا پکارا۔ ہاں درودو سلام کی حد تک وہ آپ کو مخاطب کر لیا کرتے تھے لیکن اس سے زیادہ کسی کام میں مدد طلب کرنے یا مصیبت کے وقت پکارنے کا عمل صحابہ کرامؓ میں بالکل رائج نہیں تھا۔

یہاں ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ آپ کے نام کے ساتھ یا لگا کر یعنی یا محمدؐ کہہ کر پکارنا تو کسی بھی صورت میں پسندیدہ معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ خود قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو کسی ایک جگہ بھی یا محمد کہہ کر نہ مخاطب کیا ہے اور نہ ہی کسی صحابی نے کبھی یا محمدؐ کے الفاظ کو درود وظیفے کا ذریعہ بنایا ہے قرآن نے **یاایھا النبی** . **یاایھا الرسول** . **یاایھا المزمل** اور **یاایھا المدثر** کے الفاظ تو بیان کیے ہیں مگر یا محمد کی ایک مثال بھی نہیں ہے اس لیے اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے لیے اس لفظ کو پسند نہیں کیا اور صحابہ کرام کو بھی یہ عادت نہیں تھی کہ نام لے کر آپ کو بلاتے یا پکارتے، تو ہمیں بھی اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

رسول اللہ کے ارشاد کا منکر مسلمان نہیں ہو سکتا

سوال: آکسفورڈ سے محمد طارق بنارس صاحب تحریر کرتے ہیں

لاہور کے پرویز صاحب جن کو "پرویزی" فرقے کا بانی کہتے ہیں کی تقاریر کی کئی ایک ویڈیو فلمیں اس ملک میں دیکھی جاتی ہیں' پچھلے دنوں ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ کیا ان کے عقائد اسلامی ہیں؟

تقدیر کا مسئلہ' زکوٰۃ کا مسئلہ' حدیث شریف کی صداقت کا مسئلہ اور اس طرح کی بہت سی چیزوں کی وہ نفی کرتے ہیں۔ دلیل یہ کہ قرآن میں یہ چیزیں نہیں ہیں۔ قرآن اصل ہے مگر پرویز صاحب نے قرآن کا ترجمہ بھی نہیں کیا۔ تو پھر یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ چیز قرآن میں نہیں ہے اور یہ قرآن کے خلاف ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ سنی مسلمان' جیسے حنفی' شافعی' مالکی' اہل حدیث یہ سب کیسے مسلمان ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہمارا کوئی فرقہ نہیں' صرف حق کو مانتے ہیں۔ آپ حقیقت سے آگاہ فرمائیں۔ جو تحریر فرمائیں حق و سچ ہو جس کی دلیل بھی پیش کر سکیں۔

جواب: جو شخص اسلام کے بنیادی ارکان و فرائض کا انکار کرتا ہے یا اسلامی احکام کے ادا کرنے کا تعین اپنی مرضی سے کرتا ہے اور نبی کریم ﷺ کے صحیح اور ثابت شدہ ارشادات کا انکار کرتا ہے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ وہ پرویز صاحب ہوں یا کوئی دوسرا شخص' تقدیر کا مسئلہ ہو یا زکوٰۃ کا' یہ بنیادی اسلامی مسائل ہیں ان کا انکار کفر ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جو چیز قرآن میں نہیں وہ گویا کہ ثابت ہی نہیں یہ مفروضہ ہی غلط ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے قرآن کے بعض احکام کی وضاحت فرمائی اور ان کے ادا کرنے کا طریقہ متعین فرمایا اور خود قرآن آپ کی بعثت کی غرض و غایت بھی یہی بیان کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے

"ہم نے آپ کی طرف وحی نازل کی تاکہ آپ لوگوں کیلئے اس چیز کو وضاحت سے بیان کریں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے (النمل:۴۴)

اب جس حکم کا بیان اور وضاحت آپؐ فرمائیں گے ظاہر ہے وہ اصل حکم کے علاوہ ہوگا کیونکہ اللہ نے جو کچھ نازل کیا صرف اس کو پڑھنا یا دہرانا اسے بیان یا وضاحت نہیں کہا جاتا۔ اب اصل حکم کی جو آپ نے وضاحت فرمائی یہی حدیث ہے۔

مثلاً قرآن نے صلوۃ کا حکم دیا تو آپ نے اس کا بیان فرمایا اور بتایا کہ نماز کیسے، کتنی اور کب پڑھنی ہے۔ قرآن میں تو ان کا کوئی ذکر نہیں تھا اور اب اگر صلوٰۃ کا مفہوم ہر آدمی اپنی مرضی اور مزاج کے مطابق بیان کرنا شروع کردے تو پھر ایک تو اس کا مفہوم واضح نہ ہوگا اور دوسرے نبی کی آمد کا مقصد بھی فوت ہو جائے گا۔

اور دوسرے مقام پر اس کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ:

"کہ ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان دے کر بھیجا تاکہ وہ ان کے لئے صحیح صحیح واضح کرسکے" (ابراہیم:۴)

اس طرح کی متعدد آیات ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آیات کے مفہوم اور الفاظ کے معانی ہیں۔ جب اختلاف ہو جائے یا سمجھ میں نہ آئے تو اس وقت وہی تعبیر اور تشریح قابل قبول ہوگی جو خود نبی کریم ﷺ نے فرمائی ہے اور اسے حدیث شریف کہا جاتا ہے جو خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے محفوظ ہے۔

قرآن میں نہ تو نماز کی تفصیل ہے نہ حج کے احکام اور طواف وسعی کے طریقے موجود ہیں اس کی وضاحت حضور ہی نے فرمائی ہے اسی طرح متعدد ایسے جانور اور پرندے ہیں جن کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں قرآن خاموش ہے مگر نبیؐ نے ان کے بارے میں وضاحت فرمادی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم واضح طور پر کہتا ہے کہ:

"کہ جو رسولؐ تمہیں دیں اسے قبول کریں اور جن سے وہ روکیں ان سے باز رہیں" (حشر: ۷)

اور قرآن میں بیس سے زیادہ مقامات پر رسولؐ کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اگر رسول نعوذ باللہ محض ڈاکیے یا پیغام رساں کی طرح ہے تو پھر اطاعت رسول کا مفہوم کیا ہے؟

بلکہ ایک مقام پر تو یہاں تک فرمادیا کہ:

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰)

''کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی''

کیونکہ رسولؐ قرآن کے علاوہ بھی جو کچھ بیان کرتا ہے وہ اللہ کی مرضی اور منشا کے مطابق ہوتا ہے۔ ارشاد قرآنی ہے

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (النجم: ۳'٤)

''نبی اپنی مرضی سے بولتا ہی نہیں وہ جو کچھ بولتا ہے وہ وحی الٰہی ہوتا ہے۔''

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ لوگ خود کو فرقہ نہیں کہتے بلکہ حق کو ماننے والے کہتے ہیں تو دعویٰ تو ہر فرقے کا یہی ہے کہ وہ حق کو ماننے والے ہیں مگر دعویٰ کرنا یا خود اپنی زبان سے کہنا یہ کافی نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ نے بھی لکھا ہے کہ وہ خود پرویزی فرقہ ہیں جس کے بانی غلام احمد پرویز صاحب ہیں۔

کیونکہ ہمارے نزدیک نبیؐ کے علاوہ کسی بھی امتی اور بڑی سے بڑی شخصیت کی غلو کے ساتھ عقیدت اور اس کی باتوں کو بلاچوں چرا مان لینا اور اس کے نام کی طرف نسبت کرنا یہی فرقہ بندی ہے۔ شخصیت کے نام پر ہی ہمیشہ فرقے بنتے ہیں۔

پرویز صاحب کے عقیدت مندیوں تو شخصیت پرستی کی تردید کرتے ہیں مگر وہ پرویز صاحب کی شخصیت پرستی میں اس حد تک مبتلا ہیں کہ وہ ان کے علاوہ کسی بڑے سے بڑے امام یا عالم کی نہ تو کتاب پڑھتے ہیں اور نہ اس کی بات سننے یا ماننے کے لئے تیار ہیں۔ پرویز صاحب کی بات ان کے لئے حرف آخر ہے اور یہی بدترین قسم کی فرقہ بندی یا فرقہ پرستی ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن' رسول' حدیث یا سنت کی طرف جب کوئی مسلمان اپنی نسبت کرتا ہے تو اسے فرقہ بندی نہیں کہا جائے گا کیونکہ یہی دین کے مصادر و مراجع ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ اگر ابو بکرؓ عمرؓ عثمانؓ و علیؓ کے نام پر بھی فرقے یا گروہ بنیں گے تو وہ بھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔

حضور ﷺ کی اولاد

سوال: برمنگھم سے خواجہ عارف صاحب لکھتے ہیں

حضور ﷺ کی اولاد کی کل تعداد کتنی ہوئی ان کے نام کیا ہیں اور کتنا عرصہ زندہ رہے؟ کیا وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں صرف حضرت بی بی فاطمہؓ کا ذکر کثرت سے موجود ہے۔ باقی کا ذکر کیوں نہیں؟

جواب: آپ کا سوال رسول اکرم ﷺ کی اولاد کی تعداد کے بارے میں ہے آپؐ کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کے نام حضرت ابراہیم حضرت قاسم اور حضرت عبداللہ تھے۔ حضرت عبداللہ کا لقب طیب و طاہر تھا۔ بیٹیوں کے نام حضرت زینب' حضرت رقیہ' حضرت ام کلثوم اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہم ہیں۔

حضرت ابراہیمؓ کی والدہ کا نام حضرت ماریہ قبطیہؓ تھا۔ باقی ساری اولاد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطن سے تھی۔ بیٹے سارے بچپن میں فوت ہو گئے لیکن بیٹیاں ساری جوان ہوئیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ اسلامی تاریخ میں حضرت فاطمہؓ کا ذکر کثرت سے ہے۔ باقی کا ذکر کیوں نہیں؟ اصل بات تو یہ ہے کہ صحیح اسلامی تاریخ اور سیرت کی معتبر کتابوں میں آپؐ کی ساری اولاد کا ذکر موجود ہے اور جس سے متعلق جو حالات اور واقعات ہیں وہ پوری طرح ذکر کیے گئے ہیں۔

ہاں! بہت بعد میں جو تاریخ کی کتابیں آئیں یا اہل بیت کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا

اس میں واقعی ایسے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے سوا کسی اور کا ذکر نہیں۔
دراصل شیعہ حضرات نے ایسا انداز اختیار کیا ہے اور اس کے پیچھے ان کے بعض سیاسی مقاصد کار فرما تھے اور اس کا نتیجہ ہے کہ اہل سنت کے چھوٹے موٹے رسائل یا کتابچوں میں بھی یہی صورت حال نظر آتی ہے اور پھر ہمارے لوگ بھی معتبر اور مستند تاریخی مراجع پر اعتماد کرنے کی بجائے قصے کہانیوں اور غیر ثقہ یا عام قسم کے لوگوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر انحصار کر لیتے ہیں اور عوام میں تو خاص طور پر غیر شعوری طور پر مختلف رسائل میں یہ شیعی اثرات داخل ہوئے ہیں۔ بلکہ بعض شیعہ حضرات تو حضرت فاطمہؓ کے علاوہ باقی بیٹیوں کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی صرف ایک بیٹی حضرت فاطمہؓ ہی تھی۔ حالانکہ یہ واضح تاریخی حقائق کے خلاف ہے جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ اصل تاریخی مراجع اور سیرت کی کتابوں میں آپ کی ساری اولاد کا درجہ بدرجہ باقاعدہ ذکر موجود ہے۔

ہاں! ان تاریخوں میں بھی حضرت فاطمہؓ کے مقابلے میں دوسری اولاد کے حالات زندگی کا ذکر نسبتاً کم ہے اور اس کی درج ذیل وجوہ ہو سکتی ہیں۔

۱۔ لڑکوں کا تو اس لئے کم ہے کہ وہ سارے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ اس لئے ان کی زندگی کے حوالے سے جو واقعات احادیث میں ہیں وہ سیرت نگاروں نے محفوظ کر لئے ہیں۔

۲۔ لڑکیوں میں حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ حضرت عثمانؓ بن عفان کے نکاح میں آئیں لیکن دونوں رسول اکرم ﷺ کی زندگی میں ہی فوت ہو گئیں۔

۳۔ حضرت زینبؓ کا نکاح خالہ زاد ابوالعاص بن ربیع سے ہجرت سے پہلے ہوا تھا۔ حضرت زینب کا ۸ ہجری میں انتقال ہو گیا۔ ان کی ایک بیٹی حضرت امامہؓ تھی جن سے حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد نکاح کیا تھا۔

۴۔ لیکن صرف حضرت فاطمہؓ ہیں جو آپ کے بعد زندہ بھی رہیں اور ان کی اولاد سے

آگے نسل بھی چلی، باقی کسی کی اولاد سے آگے نسل نہیں چلی اس لئے بھی ان کا زیادہ ذکر نہیں ملتا۔

حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا اور ان کے ہاں دو بیٹے حضرت حسنؓ و حسینؓ اور دو بیٹیاں زینبؓ اور ام کلثومؓ پیدا ہوئیں۔

کیا صحابہ کرام نے حضور ﷺ کا خون پیا تھا؟

سوال: ساؤتھ آل (لندن) سے قیوم عظیمی صاحب پوچھتے ہیں

"حضورؐ سے محبت کے چند مختصر واقعات کے عنوان کے تحت مضمون میں پڑھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور مالک بن سنانؓ نے حضور ﷺ کا خون پی لیا تھا۔ میں اب تک سنتا چلا آیا ہوں کہ خون حرام ہے پھر ان صحابہ نے خون کیسے پی لیا؟ ذرا اس کی وضاحت کریں۔

جواب: مذکورہ فتوے کے ضمن میں حضور اکرم ﷺ کے خون پینے کی جو دو روایتیں بیان کی گئی ہیں ان کی طرف آپ نے بالکل درست توجہ دلائی ہے۔ سیرت و تاریخ کی بعض کتابوں میں اس قدر رطب و یابس جمع کر دیا گیا ہے کہ غلط و صحیح کا امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ روایات میں بھی فضائل کے نام سے بعض لوگوں نے ایسی ایسی باتیں جمع کر دی ہیں جو نقل و عقل دونوں کے خلاف ہیں مگر جہاں کچھ لوگوں نے اس سلسلے میں لاپرواہی کرتے ہوئے سب کچھ درج کیا اور فضیلت و عقیدت کے نام سے سب کچھ جائز قرار دے دیا وہاں اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے ان محدثین اور علمائے امت کو جنہوں نے علم حدیث کی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کیں اور رسول اکرم ﷺ کے صحیح ارشادات معلوم کرنے کے لئے ایسے اصول و ضوابط بنائے کہ کسی غلط بات کا آپؐ کی طرف نسبت کرنا ممکن نہ رہا اور انہوں نے ایسی موضوع، ضعیف اور منکر روایات کو

چھانٹ کر الگ کر دیا جو مختلف طریقوں سے پھیلائی گئی تھیں۔

رسول اکرم ﷺ کا خون پینے کی روایات بھی صحیح نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ احادیث کی کسی معتبر کتاب میں نہیں۔

امام بیہقی اور دوسرے جن لوگوں نے ان روایات کو بیان کیا ہے اکثر محدثین نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے۔

عبداللہ بن زبیرؓ والی روایت میں ایک راوی ہنید بن القاسم کا ذکر ہے جو دراصل عنید ابن القاسم ہے اور اسے حافظ ابن کثیر' امام بخاری' ابن ابی حاتم' ابوداؤد' نسائی اور دوسرے ائمہ نے ضعیف' متروک الحدیث قرار دیا ہے اور اس حدیث کو بعض نے موضوع و منکر بھی کہا ہے۔

مالک بن سنانؓ والی روایت کا بھی یہی حال ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک یہ اور اس طرح کی دوسری روایات صحیح نہیں ہیں۔

کیا کوئی عورت نبی بن کر آئی ہے؟

سوال: ساؤتھ آل لندن سے عبدالحق صاحب دریافت کرتے ہیں کیا یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی عورت کو نبی اور رسول بنا کر نہیں بھیجا۔ اگر یہ درست ہے تو اس کی وجہ کیا ہے اور مرد اور عورت کے درمیان پھر مساوات کا دعویٰ کیسا ہے؟

جواب: اللہ رب العزت نے قرآن حکیم میں یہ بالکل واضح فرمادیا ہے کہ انسانوں کی ہدایت اور راہ نمائی کے لئے آسمانی تعلیمات لے کر جس قدر بھی انبیاء اور رسل مبعوث کئے گئے وہ سب کے سب مرد تھے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ﴾ (یوسف: ۱۰۹)

"یعنی ہم نے تجھ سے پہلے جنہیں وحی کی اور انہیں رسول بنا کر بھیجا وہ مرد ہی

تھے۔"

دوسری جگہ فرمایا

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ﴾(الروم : ٤٧)

"ہم نے رسولوں کو (مرد) تجھ سے پہلے ان کی قوموں کی طرف بھیجا اور وہ واضح دلیلیں لے کر ان کے پاس آئے۔"

اس کی وجہ کیا ہے یا اس میں کون سی حکمت ربانی پوشیدہ ہے کہ اس نے کسی عورت کو نبی بنا کر نہیں بھیجا تو اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہئے کہ کسی کو نبی اور رسول بنانا یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے کسی انسان کے لئے اپنی قابلیت یا صلاحیت کی بنا پر نبی بننا ممکن نہیں اور نہ ہی کسی طور کوئی نبی بن کر آیا ہے۔ خود رب العزت نے اس کو یوں بیان فرمایا کہ :

﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ﴾ (حج: ٧٥)

"اللہ تعالیٰ خود چن لیتے ہیں رسول فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے۔"

اور ظاہر ہے اس کے اختیارات اور انتخاب کو نہ کوئی چیلنج کر سکتا ہے اور نہ ہی کسی کے لئے کوئی اعتراض کی گنجائش ہے۔

لا يسئل عما يفعل وهم يسئلون

"جو کچھ وہ کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جا سکتا۔ اور لوگ جو کچھ کرتے ہیں ان سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جس نے مرد اور عورت دونوں کو پیدا کیا وہی بہتر جانتا ہے کہ کس منصب کے لئے کون اہل ہے' بظاہر یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ نبی جو نازک ذمہ داری اور کٹھن فریضہ لے کر آتا ہے اس میں مشکلات رکاوٹوں اور جسمانی اذیتوں کے راستے سے بہر حال گزرنا پڑتا ہے اور عورت فطری طور پر ایسی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہونے کے قابل نہیں ہوتی۔ یہ تو ممکن ہے کہ بعض عورتیں

بعض مردوں سے زیادہ طاقتور اور دلیر ہوں لیکن ایسی چند مثالیں ہی ہوتی ہیں۔ اکثر و بیشتر عورتیں مشکل صبر آزما کام کے قابل نہیں ہوتیں اور پھر قدرتی طور پر اسے لاحق بعض جسمانی عوارض بھی نبوت جیسے عظیم بوجھ کو اٹھانے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں جیسے حیض' نفاس اور حمل کا عرصہ یا بچے کو دودھ پلانے کی مدت ان عوارض کے دوران تو عورت معمول کے کام کرنے کے قابل بھی نہیں رہتی کجا نبوت جیسی بھاری ذمہ داری کو اٹھا کر قوم کے سامنے آنا۔ اسی طرح رسولوں کو اپنے مخالفین کی جانب سے بعض اوقات انتہائی ذلیل قسم کے ہتھکنڈوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر عورت نبی ہوتی تو اس کے لئے کردار و پاک دامنی کے تحفظ کے لئے انتہائی نازک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا جب کہ مرد سے اس طرح کا کوئی جبر ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا عقلاً یہ منصب مرد ہی کے شایان شان ہے' عورت اسے اپنی فطری کمزوریوں کے باعث نہیں نبھا سکتی۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اس طرح ہمارے اس دعوے کا کیا بنے گا کہ اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان صحیح مساوات قائم کی ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں مساوات کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ مرد اور عورت ہر میدان میں ہر لحاظ سے اور ہر کام کے لئے برابر ہیں کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

ہمارے بعض مغرب زدہ یا نام نہاد ترقی یافتہ سکالر یہ کہتے ہیں کہ عورت مرد ہر میدان میں مساوی ہیں۔ یہ محض ایک پر فریب نعرہ ہے حقیقت کی دنیا میں اس کا کسی جگہ بھی وجود نہیں ہے۔ بلکہ اسلام میں مساوات کا مفہوم یہ ہے کہ خالق کائنات نے مرد و عورت دونوں کے لئے جو حقوق متعین کئے ہیں ان کے حصول کے لئے دونوں برابر کے حق دار ہیں۔ عورت اپنے حقوق سے اس لئے محروم کر دی جائے کہ وہ عورت ہے' یہ ظلم اور زیادتی ہے اور اپنے اپنے دائرہ عمل میں کام کرنے کے دونوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ مساوات کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ جو کام مرد کرے وہ عورت بھی کرے اور مرد کو اپنے میدان میں جو حقوق حاصل ہیں عورت اپنے دائرہ کار

سے نکل کر ان میں برابری کی کوشش کرے اس طرح مرد کو بھی اپنے دائرہ عمل سے نکل کر عورت کے حقوق میں مداخلت کرنے کا اختیار نہیں۔

دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے ہاں عورت کے مساوی حقوق اور اس کی آزادی کا سب سے زیادہ چرچا ہے اور جن کی نقل اور تقلید میں ہمارے ہاں بھی آزادی نسواں کا نعرہ لگایا جاتا ہے' وہ مساوات اور آزادی جو ہمارے یہ ماڈرن حضرات لیتے ہیں وہ تو ان کے ہاں بھی نہیں۔ امریکہ' برطانیہ' فرانس اور دوسرے صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں کے مختلف شعبوں کا جائزہ لیجئے تو وہاں بے شمار ایسے شعبے ہیں جہاں عورت کے مساوی ہونے کا مسئلہ تو دور کی بات ہے عورت کا سرے سے کوئی دخل ہی نہیں۔

پارلیمنٹ میں عورتوں کی تعداد' کابینہ میں خواتین وزراء کا تناسب' بڑے بڑے سرکاری و سول اداروں کی سربراہی میں عورت کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح بری' فضائی اور بحری فوج میں عورتوں کے تناسب کا مطالعہ کر لیجئے تو شاید بعض مراحل میں ان محکموں میں عورتوں کا وجود ہی نظر نہ آئے۔

اب اس کا سبب یہ نہیں کہ ان مغربی ملکوں نے عورت کے مساوی حقوق کو تسلیم نہیں کیا یا وہ عورت کو ہر شعبہ میں جانے کی اجازت نہیں دیتے یا اسے مذکورہ بالا محکموں اور شعبوں میں جانے کی اجازت نہیں۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ان مذکورہ ذمہ داریوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے عورت کو وہ صلاحیتیں ہی عطا نہیں کیں جو درکار ہوتی ہیں یا جو مرد کو عطا کی گئی ہیں۔ اس میں ناانصافی اور عدم مساوات کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو عورت کے حق میں اس کی ذہنی و جسمانی ساخت کی وجہ سے بہتر و مناسب ہے اور حکمت الٰہی کا تقاضا بھی یہی ہے اور وہ ایسا حکیم ہے جو مرد اور عورت دونوں کو بنانے والا ہے۔ دونوں کے دائرہ کار کو اس سے بہتر اور کون متعین کر سکتا ہے وہ بہتر جانتا ہے کہ رسالت و نبوت کے منصب کا اہل کون ہے؟

کیا حضرت خضرؑ زندہ ہیں؟

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام ابھی تک زندہ ہیں اور کچھ بزرگ لوگ ضرورت کے وقت ان کی زیارت بھی کرتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

(م۔ح۔ برمنگھم)

جواب: بعض صوفیاء اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام بقید حیات ہیں اور کچھ لوگوں کو کبھی کبھی نظر بھی آجاتے ہیں لیکن اس عقیدے کے لوگوں کے پاس قرآن و حدیث سے کوئی قوی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ بعض خوابوں اور احکامات کا سہارا لیتے ہیں جب کہ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ خضر علیہ السلام وفات پاچکے ہیں' ان کے دلائل قوی اور واضح ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ سب سے قاطع اور مضبوط دلیل قرآن کی یہ آیت ہے ﴿وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ﴾ (انبیاء: ۳٤)

اور ہم نے کسی بشر کو (اے پیغمبرؐ) تجھ سے پہلے ہمیشہ کے لئے زندگی نہیں دی۔

خلد کا یہاں معنی ہوگا رہتی دنیا تک باقی رہنا۔ یہاں نکرہ نفی کے سیاق میں عموم کا فائدہ دے گا یعنی کوئی بشر بھی خواہ خضرؑ ہوں اور اس عموم سے خضر علیہ السلام کو خاص کرنے کے لئے محض حکایت یا مکاشفہ کافی نہیں ہوگا بلکہ واضح نص کا ہونا ضروری ہے۔

۲۔ دوسری دلیل صحیح بخاری شریف کی یہ حدیث ہے کہ ارایتم یومکم هذا فانه لا یبقی بعد مائة عام احد هو علی ظهرها الیوم[1] رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ کیا

[1] بخاری کتاب العلم باب السمر فی العلم (۱۱٦) و کتاب مواقیت الصلاة باب ذکر العشاء و العتمة من راه واسعا (٥٦٤) و باب السمر فی الفقه و الخیر بعد العشاء (٦٠١) میں الفاظ یوں ہیں ارئیتکم لیلتکم هذه فان رأس مائة سنة منها لا یبقی ممن هو علی ظهر الارض احد نیز دیکھیں مسلم فضائل صحابه (رقم ۲٥۳۷) =

تمہیں معلوم ہے کہ آج جو اس زمین پر موجود ہے سو سال بعد اس کا وجود نہیں ہوگا۔ اس میں کوئی بھی ایسا اشارہ نہیں کہ خضر علیہ السلام اس سے مستثنیٰ ہیں۔

۳۔ اور پھر کسی بھی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ خضر علیہ السلام کی رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملاقات ہوئی اور اگر زندہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ وہ کس شریعت پر عمل پیرا ہیں؟ اگر وہ خود نبی ہیں تو ان کی اتباع کس پر لازم ہے؟

حضرت عیسیٰ دوبارہ کس حیثیت سے آئیں گے؟

سوال: برمنگھم سے جواد ملک (عمر ۱۰ سال) لکھتے ہیں کہ آخری نبی محمد ﷺ ہیں تو جب حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں آئیں گے تو انہیں کیا کہیں گے؟

جواب: حضرت عیسیٰؑ جب دنیا میں آئیں گے تو وہ نبی کریم ﷺ کے امتی کی حیثیت سے آئیں گے اور شریعت اسلامیہ کے مطابق عمل کریں گے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی نبوت ختم ہوگی وہ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر ہیں اور ان کا وہ اعزاز برقرار رہے گا۔ ہم کہہ سکتے ہیں شریعت کے احکام کے لحاظ سے وہ امتی ہوں گے جب کہ منصب و مقام کے لحاظ سے وہ اللہ کے جلیل القدر نبی ہیں۔

☆☆☆

= شرح السنۃ باب تعجیل الصلوات (۳۵۲) مزید تفصیل کے لیے "الزھد النضر فی حال الخضر" لابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ملاحظہ ہو۔

مسائل وضو

سگریٹ نوشی اور وضو؟

سوال: برمنگھم سے عارف خواجہ صاحب لکھتے ہیں "میں ایک عرصے سے سگریٹ نوشی کا عادی ہوں اور اسے ترک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ابھی عادت سے مجبور ہوں تو اگر وضو کرنے کے بعد سگریٹ یا تمباکو پی لوں تو کیا اس صورت میں وضو ختم ہو جائے گا۔ میں تو نیا وضو کرتا ہوں لیکن بعض لوگ کہتے ہیں وضو نہیں ٹوٹتا کلی کر لینا کافی ہے' اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالیں؟

جواب: سگریٹ نوشی کے ناجائز اور بری عادت کے ہونے کے بارے میں تو کوئی اختلاف نہیں لیکن اس کے حرام ہونے کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ علماء کی ایک بڑی تعداد اسے حرام بھی کہتی ہے۔ ہم اس موضوع پر اس وقت بحث نہیں کر رہے ہیں کہ یہ حلال ہے یا حرام؟ لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ سگریٹ نوشی کسی کے نزدیک بھی جائز یا کوئی اچھی عادت شمار نہیں ہوتی اور طبی اور معاشرتی نقطہ نظر سے جو اس کے نقصانات ہیں اس کی وجہ سے تو اب غیر مسلم ملکوں میں بھی اس پر مختلف پابندیاں عائد ہو رہی ہیں۔

سگریٹ نوشی سے وضو ٹوٹنے کے مسئلے کا جہاں تک تعلق ہے تو بنیادی طور پر ایسی کوئی دلیل قرآن و سنت میں نہیں جس کی وجہ سے اسے نواقض وضو میں شمار کیا جا سکے کیونکہ حدیث میں جن چیزوں سے وضو ٹوٹتا ہے ان میں تمباکو یا دھوئیں وغیرہ کا کوئی ذکر یا اشارہ نہیں۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ آگ کی پکی ہوئی کوئی بھی چیز اگر استعمال کر لی جائے تو

اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن رسول اکرم ﷺ کی آخری عمر کے عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اس کی اجازت دے دی گئی تھی کہ ایسی چیزیں کھانے کے بعد وضو کرنے کی ضرورت نہیں اور زیادہ صحابہ کرامؓ اور ائمہ کا یہی خیال ہے لیکن اس کے باوجود اگر احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی آدمی وضو کر لیتا ہے تو یہ بہر حال بہتر ہے اور کلی کرنا تو انتہائی ضروری ہے۔ ایک تو منہ کی صفائی کے لئے اور دوسرا نماز میں ساتھ کھڑے آدمی کو بدبو سے بچانے کے لئے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے بدبودار چیزیں جیسے لہسن پیاز وغیرہ کھا کر مسجد میں آنے سے منع کیا ہے جبکہ زیادہ سگریٹ نوشی کی بدبو جو منہ میں پیدا ہوتی ہے اس کی بعض اوقات بدبو شدید ہوتی ہے خاص کر ان لوگوں سے جو منہ صاف نہیں کرتے۔

خلاصہ کلام یہی ہے کہ تمباکو نوشی سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

(واللہ اعلم بالصواب)

استعمال شدہ پانی سے وضو؟

سوال: نشفیلڈ سے عبدالحق صاحب پوچھتے ہیں

ایک برتن جیسے سنک واش بیسن (Sink Wash Basin) میں پانی ڈال کر اس پانی سے وضو کیا جائے جب کہ پانی کے نکاس کو بند کر دیا جائے' لیکن تازہ پانی پہلے جمع شدہ پانی سے آتا رہے کیا وضو جائز ہے؟

جواب: (۱) استعمال شدہ پانی سے وضو کرنے کا مسئلہ ان چند مسائل میں سے ہے جن کے بارے میں علماء اور فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس مسئلے میں ایک رائے یہ ہے کہ ایسے پانی سے کسی صورت میں وضو جائز نہیں ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ایسے پانی سے وضو جائز ہے مگر مکروہ ہے۔

تیسری رائے یہ ہے کہ یہ عام پانی کی طرح ہے اس سے وضو بالکل جائز ہے۔

تحقیق کے بعد جو بات سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر یہ عام پانی کی طرح ہے اس سے وضو جائز ہے لیکن اس میں چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے

اول یہ کہ پانی اتنا کم ہے یا برتن اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں جو پانی جمع ہوتا ہے اس میں نجاست شامل ہو گئی تو ایسے پانی سے وضو جائز نہیں ہوگا جیسے کسی آدمی کے جسم پر پلیدی تھی یا نجس شے تھی اسی میں اس کی صفائی کی تو ایسا پانی قابل استعمال نہیں رہے گا۔ اس کی تائید حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **لا یغتسلن احدکم فی الماء الدائم وھو جنب**[1] یعنی تم میں سے کوئی شخص جب جنبی ہو (اس پر غسل فرض ہو) تو وہ کھڑے پانی میں غسل نہ کرے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ کھڑے پانی میں نجاست شامل ہو جائے خاص طور پر جب کہ پانی تھوڑی مقدار میں ہو اسی طرح اگر کسی نجاست یا گندگی کی وجہ سے اس پانی کے مزے، رنگ اور بو میں تبدیلی آ جاتی ہے تو ایسے استعمال شدہ پانی سے وضو کرنے سے بھی پرہیز کرنا چاہئے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے تو بنیادی طور پر ایسے پانی سے وضو کرنا جائز ہے اور اس جواز کی تائید رسول اکرم ﷺ کی درج ذیل احادیث سے بھی ہوتی ہے

حضرت ابوجحیفہؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے۔ آپؐ کے وضو کے لئے پانی لایا گیا۔ آپ نے وضو فرمایا۔ ہم نے دیکھا کہ لوگ آپؐ کے وضو سے بچے ہوئے پانی کو لے کر اپنے چہروں پر ملتے تھے۔

(بحوالہ نیل الاوطار کتاب الطہارۃ)

دوسری حدیث حضرت ابوموسیٰؓ کی ہے۔ وہ کہتے ہیں

نبی کریم ﷺ نے پانی کا برتن منگوایا آپ نے اپنے ہاتھ اور چہرہ اس پانی میں دھوئے اور پھر حضرت ابوموسیٰؓ اور حضرت بلالؓ سے کہا کہ یہ پانی لو اور باقی اپنے چہروں اور سینوں پر ڈال دو۔ (نیل الاوطار ایضاً)

---

[1] مسلم مترجم ج ۱ باب النہی عن الاغتسال فی الماء الراکد ص ۴۰۹

تیسری حدیث حضرت سائب بن یزیدؓ کی ہے' وہ فرماتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے پاس میری خالہ حاضر ہوئی اور عرض کیا میرا بھانجا بیمار ہے۔اس کے لئے خیر و برکت کی دعا فرمائیں' تو آپؐ نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا کی۔ پھر آپ نے وضو فرمایا اور میں نے آپ کے وضو کا پانی پیا اور پھر نماز کے لئے آپ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے' جس پانی سے وضو کیا جائے وہ پاک ہے اور اسے دوبارہ وضو کے لئے یا پینے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ناخن پالش پر وضو ہو جاتا ہے؟

سوال: بہاول پور (پاکستان) سے حاجی محمد صادق لکھتے ہیں: ایک سوال پیش خدمت ہے آپ موزوں پیرائے میں جواب لکھ کر ماہنامہ ''صراط مستقیم'' میں شائع فرمادیں۔

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر ناخنوں پر ناخن پالش چڑھا ہو تو کیا وضو ہو جاتا ہے؟ (یاد رہے کہ حافظ عبداللہ محدث روپڑی فتاویٰ اہل حدیث جلد دوم مسئلہ نمبر ا میں رقمطراز ہیں کہ وضو ہو جاتا ہے) جبکہ جمہور علماء کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔

نمبر (۱) اگر وضو ہو جاتا ہے تو کتاب سنت کی رو سے دلیل؟

نمبر (۲) اگر وضو نہیں ہوتا تو یقینی امر ہے کہ انہی دلائل کی روشنی میں جو وضو کو مانع ہیں' غسل جنابت کیسے ہو سکتا ہے؟

ایسی صورت میں جب کہ غسل جنابت کے باوجود عورت پاک نہ ہو تو اس کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کس زمرے میں ہو گی جب کہ نہا لینے کے باوجود وہ ناپاک ہے اور اسے طہارت شرعی حاصل نہیں۔

جواب: وضو کے بارے میں احادیث سے صاف طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ جسم

کے ہر اس حصے کا تر ہونا ضروری ہے جس کا وضو میں دھونا ضروری ہے۔ اگر معمولی جگہ بھی خشک رہ جائے گی تو وضو نہیں ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے اپنے پاؤں اچھی طرح نہیں دھوئے تھے اور کچھ جگہ خشک نظر آتی تھی' فرمایا ویل للعقاب من النار[1] کہ ان ایڑیوں کے لئے جہنم کی سزا ہے۔

اور ظاہر ہے ناخن پالش کی جب ناخن پر تہہ جم جائے تو اسے دھویا نہیں جا سکتا اور وہ جگہ خشک رہ جاتی ہے اس لئے صحیح وضو نہیں ہوگا۔ حضرت حافظ محدث روپڑیؒ کے فتوے کی دلیل آپ نے تحریر نہیں کہ انہوں نے کس دلیل سے اسے جائز قرار دیا ہے۔ اگر آپ تحریر کر دیتے تو شاید ہمارے لئے مفید ثابت ہوتی۔ بہر حال احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ناخن پالش اتار کر وضو کیا جائے ورنہ شک و شبہ کی حالت میں بھی کوئی عمل صحیح طور پر ادا نہیں ہوتا۔ جہاں تک ایسی عورت کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کا تعلق ہے اگر اسلامی شریعت کے مطابق نکاح کیا گیا تو وہ اولاد جائز اور حلال ہوگی۔ اس کے بارے میں کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں البتہ غسل جنابت یا صحیح طہارت کے بغیر ان کی عبادت مقبول نہیں ہوگی مگر اولاد کو ناجائز قرار دینے کی کوئی دلیل ہمارے سامنے نہیں ہے۔

سوال: ویمبلے سے نذیر احمد صاحب لکھتے ہیں ایسی مسلمان خاتون جو ناخن پالش استعمال کرتی ہے' غسل جنابت کی صورت میں پالش اتارے بغیر ایسی عورت شرعی اعتبار سے طہارت حاصل کر سکتی ہے؟ اگر نہیں تو اس حالت میں عبادت کے علاوہ اسے کن امور سے اجتناب کرنا چاہئے؟

جواب: ناخن پالش کی موجودگی وضو اور غسل کے صحیح ہونے میں رکاوٹ ہے کیونکہ وہ حصہ تر نہیں ہوتا جس پر پالش ہوتی ہے اور یہ ضروری ہے کہ وضو یا غسل سے پہلے ایسی خاتون پالش اتارے۔ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو سخت تنبیہ فرمائی جو بے

---

[1] مسلم مترجم جلد ۱ کتاب الطهارة باب وجوب غسل الرجلين بكمالها ص ۳۷۷

احتیاطی سے وضو کر کے بعض اعضاء کے کچھ حصے خشک رہنے دیتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ وضو کے وقت اپنے ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کے درمیانی فاصلوں کو بھی اچھی طرح دھوتے اور پاؤں کی انگلیوں کے درمیان اپنے ہاتھ مبارک کی چھوٹی انگلی کے ساتھ باقاعدہ خلال کرتے۔

جب تک ایسی عورت ناخن پالش اتار کر غسل نہیں کرتی' اس وقت تک نماز' تلاوت اور عبادت کا کوئی کام نہیں کر سکتی۔ باقی گھر کے کام کاج بہر حال کر سکتی ہے۔

مصنوعی دانت اور وضو؟

سوال: بریڈفورڈ سے منیر احمد لکھتے ہیں

کوئی آدمی مصنوعی دانتوں کو وضو سے پہلے نکال کر مسواک کرلے اور بعد میں دوبارہ لگا کر نماز ادا کی جا سکتی ہے کہ نہیں؟ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ مصنوعی دانتوں کو نکالے بغیر کلی اور مسواک کر لیتے ہیں قرآن و حدیث میں ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب: وضو سے پہلے مسواک کرنا اہم سنت نبویؐ ہے جس کا مقصد منہ اور دانتوں کو صاف رکھنا ہے اگر مصنوعی دانت نکالے بغیر بھی مسواک کا مقصد پورا ہو سکتا ہو' تو دانتوں کا نکالنا ضروری نہیں اصل مقصد دانتوں کی صفائی ہے۔

کیا درود شریف پڑھنا ضروری ہے؟

سوال: لوٹن سے مقبول کاظمی پوچھتے ہیں

کیا درود شریف کا پڑھنا تکمیل وضو کے لئے ضروری ہے؟

جواب: وضو سے پہلے یا درمیان میں یا آخر میں کسی جگہ بھی درود شریف پڑھنا ثابت

نہیں۔ لہٰذا تکمیل وضو کے لئے اس کے ضروری ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وضو سے پہلے بسم اللہ پڑھنا اور آخر میں کلمہ شہادت اور یہ دعا پڑھنی چاہئے

اللھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین[1]

اے اللہ مجھے توبہ کرنے والوں اور پاک رہنے والوں میں سے بنا دے۔

احتلام کے بعد

سوال: میڈ سٹون جیل سے محمد اسلم لکھتے ہیں

احتلام کے بعد جو کپڑے پہنے ہیں غسل سے قبل اس سے نماز ہو جائے گی؟

جواب: احتلام کے بعد جو کپڑے پہنے گئے غسل کرنے کے بعد انہیں پہنا جا سکتا ہے اس میں کوئی ممانعت نہیں اور ان میں نماز بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ ہاں اگر کپڑوں کو کوئی ناپاک چیز لگ گئی ہے تو اسے صاف کر لینا چاہئے۔

کھڑے ہو کر پیشاب کرنا؟

سوال: لندن سے محمد سعید اللہ لکھتے ہیں

(ا) اس ملک میں گھروں جو ٹائلٹ ہوتے ہیں ان پر بیٹھ کر حاجت سے فارغ ہونا پڑتا ہے بجائے اس کے کہ اپنے پاؤں پر بیٹھے۔ اس طرح اکثر احتیاط رکھی جاتی ہے مگر دفتروں میں یا بچوں والے گھروں میں بہت مشکل آن پڑتی ہے خواہ بیٹھنے والی جگہ پانی ہو مگر نجاست کا گمان گزرتا ہے۔

کیا پیشاب بیٹھ کر کرنا ضروری ہے' جب کہ معلوم ہے کہ کھڑے ہو کر پیشاب

---

[1] مسلم مترجم ج ۱ کتاب الطھارۃ باب الذکر المستحب عقب الوضوء ص ۳۷۳

کرنے سے آپ کا بدن اور کپڑے ناپاک ہونے سے بچ جائیں گے اور بعض جگہوں پر تو بیٹھنے والی جگہ ہوتی ہی نہیں' صرف پیشاب کرنے کی سہولت میسر ہوتی ہے۔

جواب: (ا) پیشاب کے وقت صفائی کا خیال رکھنا اور پیشاب کے چھینٹوں سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو عذاب کی وعید سنائی ہے جو پیشاب کے چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتے۔ صحیح طریقہ تو یہی ہے کہ پوری احتیاط کے ساتھ بیٹھ کر پیشاب کیا جائے۔ لیکن اگر مجبوری ہو تو کھڑے ہو کر پیشاب کرنا بھی جائز ہے۔ آپ نے جو تحریر کیا ہے یہ بھی ایک طرح کی مجبوری ہے اسلئے اگر کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے زیادہ احتیاط برتی جاسکتی ہے اور کھڑے ہو کر پیشاب کرنے سے زیادہ اچھے طریقے سے طہارت حاصل کی جاسکتی ہے تو یہ بالکل جائز ہے اس میں کوئی حرج نہیں اور جیسی صورت آپ نے ذکر کی ہے اس میں کھڑے ہو کے پیشاب کرنا جائز ہے۔

سوال: کھڑے ہو کر پیشاب کرنا گناہ ہے یا نہیں؟ حضور پاک ﷺ نے اس کے متعلق کیا فرمایا ہے؟ (محمد صدیق ۱۶۔ ہنری اسٹریٹ' پیٹر برا)

جواب: کسی عذر اور مجبوری کے بغیر کھڑے ہو کر پیشاب کرنا جائز نہیں۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ **رانی رسول الله ﷺ وانا ابول قائما فقال یا عمر لاتبل قائما فما بلت قائماً بعد** (ترمذی ج ۱ ابواب الطهارة ص ٤) رسول اللہ ﷺ نے مجھے کھڑے ہو کے پیشاب کرتے دیکھا تو آپ نے مجھے منع کیا۔ اس کے بعد میں نے کبھی کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا۔ عذر کی شکل میں رسول اکرم ﷺ سے بھی کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا بعض روایات میں ذکر آتا ہے اس لئے بیماری یا کسی دوسری مجبوری کی وجہ سے کھڑے ہو کے پیشاب کرنا جائز ہے بعض اوقات ایسے بھی ہوتا ہے کہ بیٹھ کر کرنے سے صفائی نہیں رہ سکتی جب کہ ایسے مقامات پر کھڑا ہو کر کرنے سے گندگی سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں بھی جائز ہے کیونکہ اسلام کا اصل مقصد طہارت و نظافت ہے۔ جس طرح یہ قائم رہ سکیں وہ طریقہ بہتر ہے لیکن بنیادی اور فطری طریقہ تو بیٹھ کر پیشاب کرنے کا ہے۔ لہٰذا اسی کو عادت بنانا چاہیے۔

جرابوں پر مسح

جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے؟

محترم مولانا صاحب سلام مسنون!

موزوں (جرابوں) پر مسح کرنے کے متعلق رہنمائی فرمائیں چونکہ اس ملک میں ہم روزی کمانے کے لئے آئے ہوئے ہیں اور اکثریت فیکٹریوں اور دفتروں میں کام کر رہی ہے۔ لہٰذا کام کے دوران کئی نمازیں آجاتی ہیں۔ توجہ رکھنے والے حضرات کام کے دوران نماز کے لئے چند منٹ نکال کر نماز ادا کر لیتے ہیں۔ لیکن بعض حضرات پاؤں دھونے کی سہولت نہ ہونے کی وجہ سے فرائض ادا کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ انگریزی تہذیب میں سنک بیسن منہ دھونے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا اس میں پاؤں دھونا معیوب سمجھا جاتا ہے اگر کوئی مسلمان عوامی جگہوں پر سنک میں پاؤں دھوتا ہوا پکڑا جاتا ہے تو کافی تلخ کلامی ہو جاتی ہے۔

اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالیں کیونکہ مسلمانوں کو اس ملک میں کام اور سفر کے دوران پاؤں نہ دھونے کی وجہ سے نماز کی ادائیگی سے محروم رہنا پڑتا ہے۔

میں ذاتی طور پر کام کے دوران جرابوں پر مسح کرتا رہا ہوں۔ لیکن ایک کتاب جس کا نام "نماز کی کتاب مکمل از اکرام الحق" ہے موزوں پر مسح کرنے کا بیان کے عنوان کے تحت یہ شرائط پڑھ کر کچھ الجھن میں مبتلا ہو گیا ہوں:

"مسئلہ موزوں اور عام جرابوں پر (خواہ اونی ہوں یا سوتی) مسح جائز نہیں (در مختار)

کیونکہ موزوں پر مسح جائز ہونے کے لئے سات شرائط ہیں۔

(۱) موزے وضو کی حالت میں پہنے گئے ہوں۔

(۲) وہ ٹخنوں سمیت دونوں پیروں میں پہنے گئے ہوں۔

(۳) ایسے مضبوط ہوں کہ ان کو پہن کر تین میل شرعی یا اس سے زیادہ چل سکے۔

(۴) کم از کم پیر کی چھوٹی تین انگلیوں کے برابر پھٹے ہوئے نہ ہوں۔

(۵) بغیر کسی چیز کے باندھے ہوئے پیروں کے ساتھ لگے ہوئے ہوں۔

(۶) پانی کو جذب نہ کرتے ہوں۔ یعنی اگر ان پر پانی ڈالا جائے تو ان کے نیچے کی سطح تک نہ پہنچے۔

(۷) ایسے موٹے ہوں کہ ان کے نیچے کی جلد دکھائی نہ دے۔

اس میں چھ شرائط تو جرابوں پر ٹھیک بیٹھ سکتی ہے۔ لیکن شرط نمبر ۶ (پانی کو جذب نہ کرتے ہوں) پوری نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس پر شرعی بحث فرمائیں تاکہ الجھن دور ہو سکے اور پرچے میں شائع فرمائیں۔

سائل محمد امین

اسپارک بروک' برمنگھم

جواب: آپ نے جرابوں پر مسح کے بارے میں جن سات شرائط کا ذکر کیا ہے' ان کے بارے میں کچھ کہنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ اصل مسئلے پر روشنی ڈالی جائے کہ جرابوں پر مسح کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ اس کے بعد ہم شرائط پر بحث کریں گے۔

جرابوں پر مسح کا مسئلہ ان فقہی اور فروعی مسائل میں سے ہے جن میں فقہاء اور علماء کے درمیان علمی اختلاف پایا جاتا ہے اور دونوں طرف کے علماء اپنی رائے کے حق میں کچھ دلائل رکھتے ہیں' ہم دونوں طرف کے دلائل ذیل میں ذکر کرتے ہیں اور پھر ان دلائل پر تبصرہ بھی کر دیں گے جس کے بعد آپ کو یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جائے گا کہ کون سی رائے یا موقف راجح یا بہتر ہے۔

ا۔ جن کے ہاں جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے ان کی سب سے بڑی دلیل یہ دو حدیثیں ہیں- پہلی حدیث حضرت ثوبانؓ کی ہے۔

عن ثوبان قال بعث رسول اللہ ﷺ سریة فاصابھم البرد فلما قدموا علی النبی ﷺ شکوا الیه ما اصابھم من البرد فامرھم ان یمسحوا علی لعصائب والتساخین[1]

حضرت ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر بھیجا۔ اپنے قیام کے دوران میں اس میں شامل لوگوں کو سردی کی تکلیف ہوئی۔ واپسی پر انہوں نے حضور کے سامنے اس تکلیف کی شکایت کی تو آپ نے انہیں پگڑیوں اور تساخین (موزے و جرابوں) پر مسح کرنے کے لئے کہا۔

لفظ تساخین کا لغوی اعتبار سے موزے اور جراب دونوں پر اطلاق ہو سکتا ہے۔

دوسری حدیث حضرت مغیرہ بن شعبہ کی ہے۔

عن المغیرة بن شعبة ان رسول اللہ ﷺ توضا و مسح علی الجوربین و النعلین.[2]

مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا اور جرابوں اور جوتیوں پر مسح کیا۔ (ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ)

(۲) جواز کے قائلین کی دوسری دلیل صحابہ کرامؓ کا عمل ہے کہ چودہ ممتاز صحابہ کرامؓ جرابوں پر مسح کرتے تھے جن میں کچھ کے نام درج ذیل ہیں: عمر بن خطاب' علی ابن ابی طالب' عمرو بن حریث' ابن عباس' عبداللہ بن عمرؓ سعد بن ابی وقاص' عمار' بلال' ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہم۔

بعض نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا نام بھی ذکر کیا ہے۔

(۳) تیسری دلیل یہ دی گئی ہے کہ جب موزوں پر مسح کرنے کے سب قائل

---

[1] سنن ابو داود مترجم ج ۱ ص ۹۳ باب المسح علی العمامة

[2] جامع الترمذی ج ۱ باب المسح علی الجوربین ص ۱۵

ہیں تو پھر جرابوں پر مسح کرنے میں کون سا امر مانع ہے۔ کیونکہ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ دونوں کو سردی سے بچاؤ کی خاطر پہنا جاتا ہے اور دونوں کے اوپر جوتی پہنی جاتی ہے۔ معمولی فرق کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

یہ وہ تین بڑی دلیلیں ہیں جو مسح کو جائز کرنے والے پیش کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں جن کے ہاں جرابوں پر مسح کرنا درست نہیں' ان کا موقف یہ ہے کہ

۱۔ مسح کے ثبوت میں جو مرفوع حدیث پیش کی جاتی ہے اس میں انقطاع ہے کیونکہ راشد بن سعد اور ثوبان کے درمیان ایک راوی ساقط ہے جب کہ دوسری روایت میں شذوذ پایا جاتا ہے۔

۲۔ چونکہ روایات میں جرابوں کے بارے میں وضاحت نہیں ہے کہ وہ کس قسم کی ہوں اور کس چیز سے بنی ہوئی ہوں' لہٰذا ان روایات سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

جائزہ: مندرجہ بالا دلائل کا انصاف سے جائزہ لینے کے بعد با آسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ جرابوں پر مسح کرنا بہر حال ثابت ہے اور صحابہ کرامؓ کی بڑی تعداد اس پر عمل پیرا رہی ہے۔ جہاں تک روایات میں انقطاع و شذوذ کا تعلق ہے تو اس بارے میں نامور محدثین نے ان اعتراضات کو قبول نہیں کیا جو ان روایتوں کے منقطع یا شاذ ہونے کے بارے میں کئے گئے ہیں۔ دور حاضر کے عظیم محدث الشیخ محمد ناصر الدین البانی نے ان دونوں روایتوں کے حسن اور صحیح ہونے کے بارے میں مدلل بحث کی ہے یہاں اس کا مقام نہیں کیونکہ بحث خالص علمی اور دقیق ہے۔ لیکن یہ بات بہر حال تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ مذکورہ دونوں روایتیں قابل حجت ہیں اور پھر اس سے قطع نظر چودہ صحابہ کرامؓ کا عمل تو سب کے نزدیک ثابت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جرابوں پر مسح کرنے کے لئے ان کا عمل ہی ثبوت کے لئے کافی ہے۔

اس کے علاوہ ائمہ اربعہ میں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ دونوں کے قول جرابوں پر مسح کے جواز میں بالکل واضح ہیں۔ جب کہ امام مالکؒ کا ایک قول بھی جواز کے بارے میں

نقل کیا گیا ہے۔ احناف میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ جواز کے قائل ہیں اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں بعض لوگوں نے رجوع نقل کیا ہے۔

باقی آپ نے جو سات شرائط نقل کی ہیں وہ بعض فقہاء نے محض احتیاط کی خاطر ذکر کی ہیں' ورنہ احادیث میں یہ شرائط ثابت نہیں ہیں' اس لئے کہ حدیث میں لفظ جورب آیا ہے جس کے معانی عربی کی معتبر ڈکشنریوں میں یہ مذکور ہیں: پاؤں کا غلاف ا۔ پاؤں کا غلاف جو اون کا بنا ہو اور سردی سے بچنے کے لئے پہنا جائے ۲۔ موزے کی شکل کا وہ غلاف جو سوتی ہو یا اونی ۳۔ موزے کی طرز کی وہ چیز جو پاؤں پر پہنی جائے اور جو چمڑے کے علاوہ کسی اور چیز کی بنی ہو۔

جراب کے یہ معانی قاموس' لسان العرب اور بعض دوسری مشہور ڈکشنریوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس سے آپ باسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ شرائط کی جو پابندیاں لگائی جاتی ہے ان کی کتنی اہمیت ہے۔

آخر میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ شریعت اسلامیہ میں تمام احکام میں آسانی اور سہولت کو ہمیشہ ترجیح دی گئی ہے اور تنگی و حرج سے ہمارا دین مبرا ہے۔ اس لئے ہمیں احکام پر عمل کرنے کے لئے جو آسانیاں اور رخصتیں دی گئی ہیں' ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہمیں اپنی طرف سے شرائط لگا کر اس میں تنگی پیدا نہیں کرنی چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ پابندی نہیں لگائی کہ وہ جراب موٹی ہو یا باریک' سفید ہو یا سرخ' نئی ہو یا پرانی تو پھر ہمیں آخر تخصیص کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بس جو چیز آپ نے اپنے پیروں پر سردی سے بچاؤ کے لئے پہنی ہے اور اس کا وجود اس قابل ہے کہ اس پر ہاتھ پھیرے جائیں تو اطمینان کے لئے کافی ہے رہی بات احتیاط کی تو اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ ہر آدمی کے احتیاط کرنے کا معیار اور انداز الگ الگ ہوتا ہے۔

بہر حال پانی جذب نہ کرنے کی شرط کا حدیث میں کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے آپ کو

شریعت میں دی گئی اس رخصت سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ جس کی قدر و منزلت شاید گرم علاقوں میں رہنے والوں کو تو نہ ہو لیکن سرد مقامات پر رہنے والے مریضوں اور مسافروں کے لئے ایسی رخصتیں واقعی بہت بڑی نعمت ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **ان اللہ تعالیٰ یحب ان تقبل رخصته کما یحب العبد مغفرة ربه** یعنی اللہ تعالیٰ یہ پسند فرماتے ہیں کہ اس کے بندے اس کی طرف سے دی گئی رخصتیں قبول کریں جس طرح بندہ اللہ کی طرف سے بخشش کو پسند کرتا ہے۔

سوال: مانچسٹر سے محمد اسحاق صاحب لکھتے ہیں۔ میں سردی کی وجہ سے صبح کی نماز کا وضو کر کے اونی یا سوتی جراب پہن لیتا ہوں اور پھر مسح کرتا ہوں میں جب مسجد میں وضو کرتے وقت پاؤں پر مسح کرتا ہوں تو کئی آدمی کہتے ہیں کہ جراب پر مسح کرنے سے وضو نہیں ہوتا۔ چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا جائز ہے سوتی یا اونی جرابوں پر نہیں ہوتا۔ جب کہ میں نے سنا ہے کہ جراب پر مسح جائز ہے بعض لوگ کہتے ہیں جس جراب میں پانی چلا جائے اس پر مسح نہیں ہو سکتا اور بعض کہتے ہیں کہ جس جراب کو پہن کر دو میل پیدل چلے اور وہ پھٹ جائے تو اس پر جائز نہیں۔

حدیث کی رو سے مسح کی حقیقت سے آگاہ کریں' نوازش ہو گی۔

جواب: جرابوں اور موزوں پر مسح کرنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ جہاں تک چمڑے کے موزوں کا تعلق ہے تو اس بارے میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ ان پر مسح کرنا جائز ہے۔ جرابوں پر بھی بنیادی طور پر تمام ائمہ اور علماء کے نزدیک مسح کرنا جائز ہے فرق اتنا ہے کہ بعض نے کچھ شرطیں لگائی ہیں کہ اگر وہ شرائط پوری ہوں تو پھر جرابوں پر مسح کرنا جائز ہو گا ورنہ نہیں۔ جیسا کہ آپ نے بھی اپنے خط میں بعض شرائط کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ جرابوں پر مسح کرنے کے بارے میں جو احادیث ہیں ان میں کسی قسم کی شرائط کا ذکر نہیں۔

ذیل میں ہم وہ مرفوع احادیث پیش کرتے ہیں جن کے عموم یا خصوص سے

جرابوں پر مسح ثابت ہوتا ہے۔

پہلی حدیث: امام احمد نے اپنی مسند میں اور امام ابوداؤد نے اپنی سنن میں یہ حدیث صحیح سند کے ساتھ بیان کی ہے کہ

بعث رسول الله ﷺ سرية فاصابهم البرد فلما قدموا على النبي ﷺ شكوا اليه ما اصابهم من البرد فامرهم ان يمسحوا على العصائب و التساخين [1]

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ایک قافلہ بھیجا تو سرد موسم کی وجہ سے انہیں تکلیف پہنچی جب وہ واپس نبی ﷺ کے پاس آئے تو سردی کی تکلیف کی شکایت آپ سے کی تو آپؐ نے انہیں پگڑیوں اور تساخین پر مسح کرنے کا حکم دیا۔

عربی میں "تساخین" ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے پاؤں گرم رکھے جائیں، جس میں موزے اور جراب دونوں شامل ہیں۔

دوسری حدیث: یہ حدیث امام احمدؒ نے اپنی مسند اور امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے اپنی اپنی سنن میں اس کی تخریج کی ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ روایت کرتے ہیں کہ

ان رسول الله ﷺ توضاء ومسح على الجوربين و النعلين [2]

"نبی کریم ﷺ نے وضو فرمایا اور جرابوں اور جوتوں پر مسح کیا

مذکورہ حدیث کی کتابوں کے "باب المسح على الجوربين" میں یہ حدیث روایت کی گئی ہے

تیسری حدیث: حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت امام ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں بیان کی ہے۔

ان رسول الله ﷺ توضاء و مسح على الجوربين و النعلين [3]

---

[1] سنن ابی داود مترجم ج ۱ ص ۹۳ باب المسح على العمامة

[2] ترمذی ج ۱ باب المسح على الجورب ص ۱۵

[3] ابن ماجه ج ۱ كتاب الطهارة باب ما جاء في المسح على الجوربين و النعلين ص ۲۹۰ ۔ رقم الحديث ۵۶۰

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے وضو فرمایا اور جرابوں اور موزوں پر مسح کیا۔

ان احادیث میں ایک تو واضح طور پر جرابوں کے الفاظ آئے ہیں اور دوسرا ان کے ساتھ کسی قسم کی شرائط کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ میں سے ممتاز شخصیتوں سے جرابوں پر مسح کرنا ثابت ہے۔ جیسے عمر بن خطاب' علی بن ابی طالب' ابو مسعود' ابن عباس' ابن عمر' بلال' ابو موسیٰ اشعری رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اور تابعین میں قتادہ' ابن المسیب' عطاء' نخعی' ابن جبیر اور نافع رحمہم اللہ اجمعین کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

اس مسئلے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وہ وضاحت مفید ثابت ہوگی جو انہوں نے ایک طالب علم کے سوال کے جواب میں فرمائی تھی۔ اس طالب علم نے اسکاٹ لینڈ سے درج ذیل سوال مولانا مرحوم کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔

"موزوں اور جرابوں پر مسح کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے میں آج کل تعلیم کے سلسلے میں اسکاٹ لینڈ کے شمالی حصے میں مقیم ہوں۔ یہاں جاڑے کے موسم میں سخت سردی پڑتی ہے اور اونی جراب کا ہر وقت پہننا ناگزیر ہے۔ کیا ایسی جراب پر بھی مسح کیا جا سکتا ہے؟ براہ کرم اپنی تحقیق احکام شریعت کی روشنی میں تحریر فرمائیں۔"

مولانا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"جہاں تک چمڑے کے موزوں پر مسح کرنے کا تعلق ہے اس کے جواز پر قریب قریب تمام اہل سنت کا اتفاق ہے مگر سوتی اور اونی جرابوں کے بارے میں عموماً ہمارے فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ موٹی ہوں اور شفاف نہ ہوں کہ ان کے نیچے سے پاؤں کی جلد نظر آئے اور وہ کسی قسم کی بندش کے بغیر خود قائم رہ سکیں۔

میں نے اپنی امکانی حد تک یہ تلاش کرنے کی کوشش کی کہ ان شرائط کا ماخذ کیا ہے مگر سنت میں کوئی ایسی چیز نہ مل سکی۔ سنت سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا ہے۔ نسائی کے سوا کتب سنن میں اور مسند احمد میں مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت موجود ہے کہ نبی ﷺ نے وضو کیا اور اپنی جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا۔ ابوداؤد کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، براء بن عازبؓ، انس بن مالکؓ، ابوامامہؓ، سہل بن سعدؓ، ور عمرو بن حریثؓ نے جوابوں پر مسح کیا ہے۔ نیز حضرت عمرؓ اور ابن عباسؓ سے بھی یہ فعل مروی ہے بلکہ بیہقی نے ابن عباسؓ اور انس بن مالکؓ سے اور طحاوی نے اوس بن ابی اوسؓ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ حضورؐ نے صرف جوتوں پر مسح فرمایا ہے اس میں جرابوں کا ذکر نہیں اور یہی عمل حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے۔ ان مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف جراب اور صرف جوتے اور جرابیں پہنے ہوئے جوتے پر مسح کرنا بھی اسی طرح جائز ہے جس طرح چمڑے کے موزوں پر مسح کرنا۔ ان روایات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ نبی ﷺ نے فقہا کی تجویز کردہ شرائط میں سے کوئی شرط بیان فرمائی ہو اور نہ ہی یہ ذکر کسی جگہ ملتا ہے کہ جن جرابوں پر حضورؐ نے اور مذکورہ بالا صحابہؓ نے مسح فرمایا وہ کس قسم کی تھیں۔ اس لئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ فقہاء کی عائد کردہ ان شرائط کا کوئی ماخذ نہیں ہے اور فقہاء چونکہ شارع نہیں ہیں اس لئے ان کی شرطوں پر اگر کوئی عمل نہ کرے تو وہ گنہگار نہیں ہو سکتا۔

امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ جرابوں پر اس صورت میں آدمی مسح کر سکتا ہے کہ جب آدمی جوتے اوپر سے پہنے رہے۔ لیکن اوپر جن صحابہؓ کے آثار نقل کئے گئے ان میں سے کسی نے بھی اس شرط کی پابندی نہیں کی ہے۔

مسح علی الخفین کے مسئلے پر غور کر کے میں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ دراصل تیمّم کی طرح ایک سہولت ہے جو اہل ایمان کو ایسی حالتوں کے لئے دی گئی ہے

جبکہ وہ کسی صورت سے پاؤں ڈھانکے رکھنے پر مجبور ہوں اور بار بار پاؤں دھونا ان کے لئے موجب نقصان یا وجہ مشقت ہو۔اس رعایت کی بنا پر اس مفروضے پر نہیں ہے کہ طہارت کے بعد موزے پہن لینے سے پاؤں نجاست سے محفوظ رہیں گے اس لئے ان کے دھونے کی ضرورت باقی نہ رہے گی بلکہ اس کی بنا اللہ کی رحمت ہے جو بندوں کو سہولت عطا کرنے کی مقتضی ہوئی۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو سردی سے یا راستے کے گرد و غبار سے بچنے کے لئے یا پاؤں کے کسی زخم کی حفاظت کے لئے آدمی پہنے اور جس کے بار بار اتارنے اور پھر پہننے میں آدمی کو زحمت ہو۔ اس پر مسح کیا جاسکتا ہے خواہ وہ اونی جراب ہو یا سوتی' چمڑے کا جوتا ہو یا کرمچ کا یا کوئی کپڑا ہی ہو جو پاؤں پر لپیٹ کر باندھ لیا گیا ہو۔"

(بحوالہ رسائل و مسائل جلد دوم ص ۲۵۸)

مولانا کی اس وضاحت کے بعد ان شرائط کی حیثیت معلوم ہو جاتی ہے جن کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے۔ بعض لوگ ان مسائل میں خواہ مخواہ الجھتے ہیں' اور لوگوں پر سختی کرتے ہیں۔ حالاں کہ جن کاموں میں اللہ نے رخصت دی ہے لوگوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دینا چاہیے۔

جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے؟

سوال: گلاسگو سے ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ ہماری مسجد میں کچھ لوگ تبلیغ کے لئے آئے اور امام صاحب سے کہا کہ اگر آپ جرابوں پر مسح کرتے ہیں تو پھر ہم آپ کے پیچھے نماز نہیں پڑھیں گے -- اس لئے جرابوں پر مسح کا مسئلہ قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح کر کے بتائیں کہ جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: (ضروری وضاحت: سائل کے جواب میں محترم شیخ میری پوریؒ نے وہی جواب دہرلیا ہے جو اس سے قبل اس عنوان کے تحت سب سے پہلے سوال میں تفصیل سے دے چکے ہیں۔ اس لئے اس کی تکرار مناسب نہیں سمجھی گئی۔ البتہ جرابوں پر مسح کا انکار کرنے والوں کے تشدد اور تنگ نظری کی مولانا مرحوم نے اس طرح مذمت کی)

جو لوگ اس مسئلے میں اس حد تک شدت کے قائل ہیں وہ شاید مسئلے کی علمی نوعیت سے واقف نہیں' ورنہ ایسے عمل کے بارے میں ان کے اس سخت موقف کا کوئی جواز نہیں جس پر صحابہ کرامؓ اور ائمہ دینؒ نے عمل کیا ہو اور صحیح احادیث سے وہ ثابت ہو۔ ویسے بھی یہ جہالت کی بات ہے کہ ایک فرعی مسئلے میں اختلاف رائے کی وجہ سے امام کے پیچھے نماز پڑھنا چھوڑ دیا جائے' دین کے مسائل میں اس قدر تنگ نظری قابل مذمت ہے۔

جرابوں پر مسح ہو یا اس طرح کی کوئی دوسری رخصت' یہ اللہ کی طرف سے بہت بڑی نعمتیں ہیں اس کا صحیح احساس مسافروں' مریضوں اور ان لوگوں کو ہوتا ہے جو سخت سرد علاقوں میں رہتے ہیں یا جنہیں فیکٹریوں اور کام کی جگہوں پر پاؤں دھونے کی دقت پیش آتی ہے۔

رخصت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان اللہ تعالیٰ یحب ان تقبل

رخصتہ کما یحب العبد مغفرۃ ربہ یعنی اللہ تعالیٰ یہ پسند فرماتے ہیں کہ بندے اس کی طرف سے دی گئی رخصتیں قبول کریں جس طرح بندہ اللہ کی طرف سے بخشش کو پسند کرتا ہے۔

مسح کی مدت

سوال: لیوٹن سے مقبول کاظمی صاحب لکھتے ہیں۔

(۱) کیا جرابوں پر مسح کے لئے کوئی مدت متعین ہے؟

(۲) یہ بات تو احادیث سے ثابت ہے کہ جرابوں پر مسح جائز ہے۔ کیا وضو کرنے کے بعد پیروں کو خشک کر کے جرابیں پہنی جا سکتی ہے یا حالت تر میں پہن لی جائیں؟

جواب: جرابوں پر مسح کرنے کے مسئلے پر اس سے قبل ہم تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ مدت کے بارے میں ایک بار پھر وضاحت کر دیتے ہیں کہ مسح کی مدت ایک دن اور ایک رات مقیم کے لئے ہے جب کہ مسافر کے لئے تین دن اور تین راتیں ہیں اور مدت کا حساب وضو ٹوٹنے کے وقت سے لگایا جائے گا۔ یعنی جرابیں پہننے کے بعد جب وضو ٹوٹا تو وہاں سے مدت شروع ہو گی۔

(۲) وضو مکمل کرنے کے بعد اس کے ٹوٹنے سے پہلے پہلے کسی وقت بھی جرابیں پہنی جا سکتی ہیں پاؤں تر ہوں یا خشک' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی سنت میں اس طرح کی کسی پابندی کا ذکر ہے۔

وگ (WIG) پر مسح ہو جاتا ہے؟

سوال: منیر احمد صاحب بریڈ فورڈ سے لکھتے ہیں

بعض آدمیوں کو وگ پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے آیا وگ لگانا اور پھر اس پر مسح کرنا جائز ہے؟ جبکہ معلوم نہیں وگ کون سے جانور کے بالوں کی بنائی جاتی ہے۔

جواب: وگ یعنی سر پر مصنوعی بالوں کا لگانا یا اصلی بالوں کے ساتھ ان کو ملانا یہ بنیادی طور پر ہی ناجائز ہے اور رسول اکرم ﷺ نے مصنوعی بال استعمال کرنے والی عورتوں کے بارے میں سخت الفاظ ارشاد فرمائے۔ آپؐ نے فرمایا:

لعن الله الواصلة والموصولة[1]

"کہ اللہ تعالیٰ نے بال جوڑنے والی اور جس کے بال مصنوعی طریقے سے جوڑے گئے ہوں دونوں پر لعنت کی ہے۔" (بخاری و مسلم)

اب ظاہر ہے کہ عورتوں کے لئے تو سر کے بال زینت ہیں اور عورتوں کے لئے اظہار زینت و جمال ایک فطری تقاضا ہے اور اسلام شریعت کی حدود میں اس کی اجازت بھی دیتا ہے لیکن اس کے باوجود جعلی یا مصنوعی بال استعمال کرنے والی عورتوں کو رسول اللہ ﷺ نے ملعون قرار دیا ہے جب عورت کو اس کی اجازت نہیں تو مرد کو وگ استعمال کرنے کی اجازت کس طرح ہو سکتی ہے۔ اس لئے وگ کسی بھی جانور کے بالوں کی ہو وہ ناجائز ہے اور اس کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔ وگ پر مسح کرنا جائز نہیں۔ اگر سر پر پگڑی ہو تو اس کے اوپر سے مسح کرنے میں بھی اختلاف ہے اور زیادہ صحیح اور افضل یہی ہے کہ سر کا مسح پگڑی اتار کر کیا جائے اور وگ کو تو پگڑی کے قائم مقام

---

[1] فتح الباری ج ۱۱ کتاب اللبس باب الموصولۃ ص ۵۷۵ رقم الحدیث ۹۵۴۱۔

ہی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اور اگر اسے پگڑی کی طرح شمار بھی کیا جائے تب بھی اس پر مسح کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک مصنوعی چیز ہے جس کے ذریعے ایک دھوکا اور فریب دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

☆☆☆

تیمّم کا بیان

جیل میں تیمّم کا حکم کیا ہے؟

سوال: پریسٹن جیل سے ایک صاحب تحریر کرتے ہیں کہ جیل کی تنہائی میں جب کمرے سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہو اور وضو کے لئے بروقت پانی میسر نہ ہو تو کیا تیمم کیا جاسکتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو آسان بنایا ہے' اس میں کسی قسم کی کوئی تنگی نہیں ہے اور نہ ہی بندے کو ایسے کاموں کا مکلّف بنایا گیا جو اس کی طاقت سے باہر ہوں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج : ۷۸)

''دین میں اللہ نے تم پر کسی قسم کی تنگی ضروری قرار نہیں دی۔''

اور جگہ پر ارشاد ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ: ۲۸۶)

''اللہ کسی نفس کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔''

اس لئے جیل میں اگر پانی میسر نہیں اور نماز ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو تیمّم بالکل جائز ہوگا اور پھر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مختلف مواقع پر مختلف مسائل میں جو آسانیاں عطا کی ہیں' ان سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس کی طرف سے دی گئی رخصتوں کو قبول کرنا' ان سے فائدہ اٹھانا بھی اطاعت احکام الٰہی ہے۔ اس لئے جیل کی تنہائی میں پانی اگر آسانی کے ساتھ میسر نہ ہو تو تیمّم کر کے نماز ادا کی جاسکتی ہے۔

جنبی آدمی تیمّم کر سکتا ہے

سوال: برمنگھم سے فرید احمد صاحب دریافت کرتے ہیں

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و حامیان شرع متین بیچ اس مسئلے کے کہ زید رات کو جنبی ہوا اور کسی سبب سے پانی گرم نہیں کر سکا اور یہ تو معلوم ہے کہ ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے سے وہ یقیناً بیمار ہو جائے گا یا بیماری بڑھ جانے کا خطرہ ہے نماز فجر کے عین سات آٹھ منٹ رہتے ہوئے بیدار ہوا اب اگر پانی گرم کرے تو وقت گزر جائے گا۔ دریں حالت کیا زید پانی گرم کرنے کے لئے نماز قضا کرے یا تیمّم کر کے نماز پڑھ لے۔

جواب: اگر زید نے فجر تک یہ تاخیر جان بوجھ کر نہیں کی بلکہ مجبوراً ایسے ہوا تو اس کے لئے تیمّم کرنا جائز ہے اور گناہ گار بھی نہیں ہوگا اور اگر اس نے جان بوجھ کر غفلت کی۔ بروقت طہارت حاصل کرنے کا انتظام نہ کیا اور سویا رہا اور فجر سے ۷۔۸ منٹ پہلے بیدار ہوا تو ایسی صورت میں بھی تیمّم کرنا درست ہے۔ گرم پانی کے انتظام میں نماز قضا کرنا جائز نہیں لیکن اس نے جان بوجھ کر غسل کرنے میں جو تاخیر کی اس کا گناہ اسے ضرور ہوگا۔

پانی گرم نہ کرنے کا گناہ اس لئے نہیں کہ شرعی طور پر وہ اس کا مکلف ہی نہیں کہ پہلے گرم پانی کرے بلکہ شرعی طور پر رخصت یہ ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جائے اور پانی نہ ملے یا مرض ہے اور مرض کے بڑھنے کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں اسے فوری طور پر تیمّم کرنے کا حکم ہے تاکہ نماز بروقت ادا کر سکے۔

آپ نے جو دو عبارتیں برائے ترجمہ تحریر کی ہیں ان میں پہلی عبارت ہدایہ کی ہے اس کا ترجمہ ہے:۔

"اگر وہ پانی لیتا ہے لیکن وہ مریض ہے اگر پانی استعمال کرے تو اسے ڈر ہے کہ مرض بڑھ جائے گا تو وہ تیمّم کر لے اور اگر جنبی اس بات سے ڈرے کہ اگر اس نے غسل کیا تو سردی یا اسے ہلاک کر دے گی یا بیمار کر دے گی تو وہ بھی مٹی سے تیمّم کر لے۔" (ہدایہ ص ۵۲ جلد اول)

دوسری عبارت فتاویٰ عا ی کی ہے اس کا ترجمہ بھی ذیل میں دیا جاتا ہے:

"اور تیمّم جائز ہے جب جنبی کو یہ خوف ہو کہ اگر اس نے پانی سے غسل کیا تو سردی اسے ہلاک کر دے گی یا بیمار کر دے گی۔ اگر شہر سے باہر ہے تو ایسی صورت میں تیمّم کرنے پر اجماع ہے اور اگر شہر کے اندر ہو تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک پھر بھی تیمّم جائز ہے بخلاف صاحبین کے یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک پھر جائز نہیں اور اختلاف اس میں ہے جب وہ حمام میں جانے کے لئے کوئی چیز (پانی) نہ پائے ہاں جب پانی مل جائے تو پھر بالاتفاق پانی گرم کرنے کی طاقت نہیں اور جب پانی گرم کر سکتا ہے تو پھر بھی تیمّم جائز نہیں (انتہی)

یہ حکم عمومی حالت میں ہے لیکن جب نماز قضا ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر گرم پانی کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔

احکام مساجد

سود کی رقم سے مسجد بنائی جا سکتی ہے؟

سوال: کارڈف سے غلام حسین پوچھتے ہیں کیا مسجد سود کی رقم سے بنائی جا سکتی ہے؟
جواب: حرام مال سے مسجد بنانا بالاتفاق ممنوع و ناجائز ہے۔ کیونکہ حرام مال اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مسلم شریف میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "**ان اللہ طیب لا یقبل الا طیبا**"[1] اللہ پاک ہے اور پاک چیزیں قبول کرتا ہے۔ اس طرح سودی قرض لے کر مسجد بنانا بھی ناجائز ہے کیونکہ وہ بھی حرام مال ہے۔ بعض ائمہ نے ایسی مساجد کو مسجد ضرار کی قسم سے شمار کیا ہے جیسا کہ تفسیر کشاف اور مدارک میں اس کی وضاحت ہے کہ

کل مسجد بنی مباھاۃ او ریاء او سمعۃ او لغرض سوی ابتغا وجہ اللہ او بمال غیر طیب فھو لاحق بمسجد الضرار

یعنی ہر وہ مسجد جو فخر، ریاکاری، شہرت یا اللہ کی رضامندی کی بجائے کسی اور غرض کے لئے تعمیر کی جائے یا ناپاک (حرام) مال سے بنائی جائے وہ مسجد ضرار کی طرح ہے۔ اگر کسی مسجد میں حرام کے ساتھ حلال مال بھی خرچ کیا گیا ہے تب بھی مخلوط ہونے کی وجہ سے اس کی طہارت باقی نہیں رہتی اور اصولی طور پر اذا اجتمع الحلال و الحرام غلب الحرام جب حلال و حرام اکٹھے ہو جائیں تو حرام غالب آ جاتا ہے۔ مندرجہ بالا دلائل سے یہی واضح ہوتا ہے کہ ایسی جگہیں جو حرام کمائی سے بنائی جائیں

---

[1] مسلم مترجم ج ۳ کتاب الزکاۃ باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف ص ۴۳

وہ مسجد کا حکم نہیں رکھتیں اور ان میں نماز صحیح نہیں ہو گی۔

مسجد کی انشورنس کا کیا حکم ہے؟

سوال: لیڈز سے حافظ محمد صاحب دریافت فرماتے ہیں

۱۔ کیا مسجد اور اسلامک سینٹر کے مشترکہ فنڈ سے طلبہ کو بطور تحفہ کتب دی جا سکتی ہیں یا کسی تقریب اور جلسے کے موقع پر مہمانوں کو اس فنڈ سے کھانا کھلایا جا سکتا ہے اور علماء کرام کو اس فنڈ سے کرایہ وغیرہ دیا جا سکتا ہے؟

۲۔ مسجد یا اسلامک سینٹر کی انشورنس کا کیا حکم ہے؟

جواب: ۱۔ کسی مسجد اور اسلامک سینٹر کا جو مشترکہ فنڈ ہے اگر فنڈ دینے والے اس میں خاص شرط نہیں لگاتے تو پھر کسی بھی دینی کام میں اس فنڈ سے خرچ کیا جا سکتا ہے اور اگر چندہ دینے والے پہلے یہ شرط لگا دیں کہ ان کی رقم فلاں مد میں خرچ کی جائے اور فلاں مد میں خرچ نہ کی جائے ایسی شکل میں اس کی شرط کے مطابق خرچ کرنا چاہئے اور اگر وہ شرط نہیں لگاتے اور ان کے علم میں بھی ہے کہ ہمارے چندے سے سینٹر کے تمام اخراجات اور پروگرام چلتے ہیں جس میں تحفہ میں دی جانے والی کتب بھی شامل ہیں تو ایسی صورت میں کسی بھی مد میں خرچ کی جا سکتی ہیں۔ ایسے حالات میں منتظمین کے لئے بہتر یہ ہوتا ہے کہ وہ فنڈ جمع کرتے وقت خرچ کرنے کی جگہوں کی اچھی طرح وضاحت کر دیا کریں قرآن کی سورہ توبہ کی آیت نمبر ۵ میں جو فی سبیل اللہ کی مد بتائی گئی ہے اس کے تحت دین کے تمام کام جن میں بچوں کو کتابوں کا انعام دینا یا وعظ و ارشاد کی مجالس کا انتظام کرنا شامل ہے خرچ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ چندہ دینے والے کی طرف سے کوئی شرط یا تخصیص نہ ہو۔

۲۔ جہاں تک مسجد میں یا سینٹر کی انشورنس کا تعلق ہے اگر اس میں سود کی رقم کی

آمیزش کا کوئی امکان نہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ مسجد اور اسلامک سینٹر کے سلسلے میں ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ ان کے نقصان کی شکل میں کوئی ایک آدمی ذمہ دار نہیں بنتا اس لئے اگر ایک کمپنی اس کا نقصان پورا کرنے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے اور اس کے عوض آپ اسے کچھ ادا کرتے رہتے ہیں تو اس میں جواز کی گنجائش ہے بشرطیکہ سود کی کوئی شکل نہ بنے۔ اس کے علاوہ عام طور پر مشتبہ کاموں میں احتیاط بہر حال بہتر ہوتی ہے۔

حلال و حرام کی ملی جلی کمائی سے مسجد کے لئے چندہ لینا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس بارے میں کہ بعض مسلمان شراب اور سور کے گوشت کو فروخت کرتے ہیں اور ساتھ ہی حلال چیزوں کی تجارت بھی کرتے ہیں ان سے مسجد کے لئے چندہ لینا کیسا ہے؟ ان کی کمائی کیسی ہے؟ براہ کرم قرآن و سنت کی روشنی میں بیان فرمائیں۔ (حافظ محمد حسین' لیڈز)

جواب: سوال مذکورہ میں تین امور کے بارے میں استفسار کیا گیا ہے۔

اول یہ کہ ایک مسلمان کا شراب اور سور کے گوشت کی تجارت کرنا کیسا ہے؟

دوم یہ کہ اس سے مسجد کے لئے چندہ لینا جائز ہے؟

سوم یہ کہ اگر وہ ساتھ میں حلال چیزوں کی تجارت بھی کرتا ہے تو اس سے چندہ برائے مسجد جائز ہے؟

(۱) سب سے پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کسی مسلمان کے لئے یہ ہرگز جائز نہیں کہ شراب یا خنزیر کے گوشت جیسی حرام اشیاء کی تجارت کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو ایسے لوگوں پر لعنت فرمائی جو شراب جیسی نجس چیز پیتے ہیں اس کا کاروبار کرتے ہیں یا اس کے پینے پلانے یا لینے دینے میں کسی قسم کا حصہ لیتے ہیں۔ اس لئے جو مسلمان

اس طرح کا کاروبار کرتے ہیں انہیں اللہ اور اس کے رسول کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ایسے کاروبار کو خیر باد کہہ دینا چاہیئے اور کوئی حلال کاروبار شروع کرنا چاہیئے۔

(۲) جس آدمی کا کاروبار حرام اشیاء کا ہو ایسی حرام چیزوں کا جن کی حرمت کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ بھی نہ ہو اس سے مسجد جیسی مقدس جگہ کے لئے چندہ لینا جائز نہیں۔ قرآن حکیم نے حرام چیزوں کو پلید اور خبیث کہا ہے اس لئے جان بوجھ کر مقدس مقامات میں ایسی کمائی لگانا ہرگز روا نہیں۔ ارشاد قرآنی ہے۔

﴿وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ﴾ (اعراف: ۱۵۷)

اللہ نے ان کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال کیا اور خبیث اشیاء کو حرام قرار دے دیا۔

دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ (البقرہ: ۲۶۷)

اے ایمان والو! اللہ کی راہ میں اس کمائی سے خرچ کرو جو پاک ہو۔

ظاہر ہے جب خرچ کرنے والوں کے لئے یہ حکم ہے تو جو مسجد کے لئے چندہ جمع کرتے ہوں ان کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس مال سے قبول نہ کریں جس کے بارے میں انہیں علم ہے کہ یہ حرام ذریعے سے کمایا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

ان الله طيب لا يقبل الا الطيب[1]

یعنی "اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاک چیزوں ہی کو قبول کرتا ہے۔" اس سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے گھروں (مسجدوں) کیلئے پاک وحلال مال ہی کو قبول کرنا چاہیئے۔

(۳) اب رہا یہ مسئلہ کہ جس آدمی کا مخلوط کاروبار ہے یعنی وہ شراب اور خنزیر کا گوشت فروخت کرنے کے ساتھ ساتھ حلال چیزیں بھی بیچتا ہے اور پاکیزہ اشیاء کی

[1] مسلم مترجم ج۳ کتاب الزکاۃ باب بیان أن اسم الصدقة يقع على كل نوع من المعروف ص ۴۳

تجارت بھی کرتا ہے تو ایسا شخص اگر مسجد کے لئے چندہ دیتے وقت یہ یقین دلائے کہ وہ مسجد کے لئے جو کچھ دے رہا ہے وہ حلال ہے اور اس میں اس کمائی کا کوئی دخل نہیں جو اسے شراب وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے تو ایسی صورت میں اس سے چندہ لینا جائز ہے لیکن اگر وہ اپنی کمائی خلط ملط کرتا ہے اور حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتا اور نہ ہی یہ یقین دہانی کراتا ہے کہ وہ چندہ اپنی حلال کی کمائی سے دے رہا ہے تو ایسے شخص سے بھی چندہ لینے سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے شبہات والے کاموں سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اس لئے اولیٰ و افضل یہی ہے کہ مسجد کی تعمیر خالص حلال کی کمائی کے ذریعے کی جائے اور حرام مال اس کے بنانے میں ہرگز استعمال نہ کیا جائے۔ ہاں اگر کسی کی کمائی کے بارے میں آپ کو علم ہی نہیں تو یہ الگ بات ہے۔ ایسے آدمی کے بارے میں زیادہ کرید کرنے کی بھی ضرورت نہیں اور اس سے چندہ وصول کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ (هذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب)

بنک سے قرضہ لیکر بنائی ہوئی مسجد میں نماز جائز ہے؟

سوال: کارڈف سے محمد دین صاحب لکھتے ہیں۔ یہاں کارڈف شہر میں پہلے سے تین مسجدیں منظور شدہ ہیں لیکن ہمارے اس علاقے میں مسجد کی ضرورت تھی چنانچہ اس ضرورت کے پیش نظر قریباً ساڑھے تین سال سے ایک مکان کو مسجد میں تبدیل کرکے اس میں عبادت کی جارہی ہے لیکن اب تک اس کی بحیثیت مسجد منظوری نہیں ملی۔ چنانچہ یہاں کی مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی آف ویلز نے قریباً ایک سال پیشتر مسجد کے لئے ایک بڑی جگہ کا ۵۱ ہزار پونڈ میں سودا کیا۔ سودا کرتے وقت یو ایم او نے پوری عمارت کی رقم بطور قرض حسنہ دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ اس امید پر سوسائٹی مذکورہ نے عمارت کا دس فی صد بیعانہ قریباً چھ ہزار پونڈ ادا کردیا اور باقی رقم کا یو۔ ایم۔ او

کی طرف سے انتظار کرنے لگے۔ عین موقع پر جب بقایا قیمت کی ادائیگی کا وقت آیا تو یو۔ ایم۔ او نے اپنی مجبوریاں ظاہر کر کے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ سوسائٹی مذکور نے ممبران سے صلاح و مشورہ کر کے میٹنگ بلائی جس میں ممبران کی اکثریت نے سود پر رقم لینے سے منع کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ سود پر رقم لینے سے چھ ہزار بیعانہ کا نقصان بہتر ہے۔ کچھ دیر بعد سوسائٹی مذکور کے عہدے داروں نے اپنی ذمہ داری پر بینک سے سود پر رقم لے کر عمارت خرید لی۔ اس پر بہت سے لوگوں نے سخت اعتراض کیا اور آج تک اس عمارت میں سود کی وجہ سے نماز بھی ادا نہیں کی۔ اب زیادہ رقم ادا ہو چکی ہے اور باقی کی بھی چند ہفتوں میں ادا ہونے کی امید ہے۔ پہلی شش ماہی کا پانچ ہزار پونڈ کا سود ایک تاجر نے ادا کیا۔ کیا یہ ساری رقم ادا ہو چکنے کے بعد اس عمارت کو مسجد کا درجہ دیا جا سکتا ہے؟

جواب: یہ بات بڑی افسوس ناک ہے کہ اس ملک میں اکثر مسلمان سود کے بارے میں ہرگز احتیاط نہیں کرتے اور سود ادا کرنے کے سلسلے میں ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے اور اس سے بھی زیادہ شرمناک بات یہ ہے کہ مساجد کی تعمیر پر لی گئی رقم پر سود ادا کیا جائے۔ یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے جس کا کچھ لوگ ارتکاب کر رہے ہیں۔ سود کے بارے میں قرآن حکیم میں کتنی سخت وعید آئی ہے اور اتنے شدید الفاظ کسی دوسرے حرام کام کے بارے میں شاید نہیں آئے۔ ارشاد ربانی ہے:

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈر جاؤ اور باقی سود کی وصولی ترک کر دو اگر تم واقعی مومن ہو اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کرو۔" (البقرۃ:۲۷۸'۲۷۹)

اس شخص کو کہاں اور کیسے پناہ ملے گی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلان جنگ کرے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ مساجد کمیٹیوں اور اسلامی تنظیموں کی زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہرگز نہ دیں جو حرام و حلال کی تمیز نہیں کرتے بلکہ

حرام کھانے یا کھلانے پر اتنے دلیر ہوں کہ مساجد کے تقدس کی پرواہ بھی نہ کریں۔ بہر حال سود دینے کا سارا گناہ سوسائٹی کے عہدے داروں کے سر ہے اور اگر انہوں نے بینک کا سود اس چندے سے ادا کیا جو مسلمانوں سے مسجد کے نام پر اکٹھا کیا گیا تھا تو جرم اور زیادہ سنگین ہے۔

باقی جہاں تک اس مسجد میں نماز پڑھنے کا تعلق ہے تو اس میں بظاہر کوئی شرعی رکاوٹ نہیں بلکہ یہ بوجھ ان لوگوں پر ہو گا جو اس فعل بد کے مرتکب ہوئے ہیں۔ لیکن یہ مسجد کسی کی ملکیت تو نہیں بنی۔ اللہ کے نام پر وقف ہے اس لئے اس میں نماز پڑھنا عبادت کرنا اور ہر قسم کے دینی شعار کی ادائیگی جائز و درست ہے

(هذا ما عندي و الله اعلم بالصواب)

حرام کاروبار کرنے والے سے مسجد کے لئے چندہ لیا جا سکتا ہے؟

سوال: اگر مسجد و دینی مدرسہ کے لئے چندہ دینے والے حضرات حرام یا مکس کاروبار کرتے ہوں جیسے شراب و سود تو اس کاروبار سے چندہ لیا جا سکتا ہے اور اس رقم سے کارپٹ لیا جائے یا کپڑا خریدا جائے تو اس پر نماز جائز ہے؟

جواب: حدیث میں آتا ہے کہ اللہ پاک ہے اور وہ پاک مال ہی قبول کرتا ہے اس لئے مساجد کے سلسلے میں پاکیزہ اور حلال کمائی سے ہی چندہ لینا چاہئے۔ ہاں اگر کسی شخص کے بارے میں علم نہ ہو تو اس کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں زیادہ کرید بھی نہیں کرنی چاہئے۔ حرام مال سے خریدی ہوئی کوئی چیز بھی مسجد میں استعمال نہیں کرنی چاہئے۔ ایسے کپڑے یا قالین پر نماز پڑھنا مکروہ ہو گا' احتیاط کرنی چاہئے۔

مساجد کے لئے غیر مسلم حکومت سے گرانٹ؟

سوال: کینیڈا سے عابد نعیم پوچھتے ہیں
مساجد کی تعمیر میں غیر اسلامی حکومت کی طرف سے دی گئی گرانٹ استعمال کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اگر لی جاسکتی ہے تو وضاحت فرمائیں کہ کن شرائط کو مدنظر رکھنا چاہیے؟

جواب: غیر مسلم حکومت کی طرف سے مساجد کے لئے دی جانے والی گرانٹ جائز ہے اور اس رقم سے مساجد تعمیر کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے اور یہ درست ہے کہ مسلمان اگر اس ملک کے باشندے ہیں ٹیکس ادا کرتے ہیں تو یہ ان کا حق بھی ہے کہ وہ یہ گرانٹ حاصل کریں۔ ہاں اگر حکومت کسی ایسے فنڈ سے گرانٹ دیتی ہے جس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں جیسے جوئے یا شراب کی کمائی وغیرہ تو ایسی رقم مسجد کے لئے وصول نہیں کرنی چاہیے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ مسجد صرف مسلمان کی کمائی سے تعمیر کی جائے۔ بیت اللہ کی جو تعمیر کفار مکہ نے کی تھی حضور ﷺ نے اسے اس بنیاد پر ناجائز قرار نہیں دیا تھا کہ اس میں کفار کی کمائی لگی ہوئی ہے۔ ہاں البتہ حلال حرام کی تمیز ضروری ہے۔ حرام کمائی اگر مسلمان کی ہے تو اسے بھی مساجد کی تعمیر میں نہیں لگایا جاسکتا۔

مسجد کے میناروں کا شرعی حکم

سوال: ساؤتھ آل لندن سے محمد اشرف لکھتے ہیں "برطانیہ میں مسلمان کے مسائل

میں مساجد کے مینار تعمیر کرنا بھی ایک مسئلہ ہے۔ بعض اوقات مقامی حکام سے مسلمانوں کے اس مسئلے کے بارے میں اختلاف بھی پیدا ہوئے۔ اس بارے میں وضاحت کریں کہ ان میناروں کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کیا ان کا بنانا ضروری ہے؟

جواب: مساجد کے مینار تعمیر کرنے کی بنیادی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ اذان کی آواز دور تک پہنچائی جاسکے یہاں تک کہ مسلمان اذان کی آواز سن کر آگاہ ہو جائیں کہ نماز کا وقت ہو گیا اور اس کی تیاری کر لیں کیونکہ جتنی اونچی اور بلند جگہ سے اذان دی جائے گی اتنی ہی دور اس کی آواز جائے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں مسجدوں کے مینار نہیں ہوتے تھے لیکن اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں بھی اونچی جگہ سے اذان دینے کا اہتمام موجود تھا۔ ایک روایت کے مطابق حضرت زید بن ثابتؓ کی والدہ بیان کرتی ہیں کہ

کان بیتی اطول بیت حول المسجد فکان بلال یوذن فوقه من اول ما اذنه الی ان النبی ﷺ مسجده فکان یوذن بعد علی ظهر المسجد و قد رفع له شئی فوق ظهره

وہ فرماتی ہیں کہ میرا گھر مسجد کے قریب کے گھروں میں سے سب سے اونچا تھا اس لئے حضرت بلالؓ اس کے اوپر چڑھ کر اذان دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مسجد نبوی کی باقاعدہ تعمیر ہو گئی تو اس کے بعد حضرت بلالؓ مسجد کی چھت پر چڑھ کر اذان دیتے تھے اور ان کے لئے مسجد کی چھت پر ایک بلند جگہ بھی بنائی گئی تھی۔

اس روایت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ اذان کے لئے بلند جگہ کا انتخاب حضور کے زمانے میں کیا گیا اور اس لحاظ سے اسے سنت قرار دیا جاسکتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ حضرت بلالؓ کے لئے مسجد کی چھت پر مخصوص جگہ اس غرض سے بنائی گئی تھی اور اس جگہ کو مینار کا قائم مقام قرار دیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک

مسجد کے ساتھ مینار کی موجودہ شکل کا تعلق ہے اس کا آغاز حضرت معاویہؓ کے زمانے میں ہوا۔ ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت شرحبیل بن عامرؓ نے حضرت معاویہؓ کے حکم سے باقاعدہ مینار اور اس کی سیڑھیاں تعمیر کیں۔ ان دلائل سے اس کا سنت یا استحباب تو بہرحال ثابت ہوتا ہے لیکن اسے فرض اور ضروری بھی قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی اس کا کوئی واضح حکم موجود ہے۔ جہاں تک موجودہ دور میں میناروں کا تعلق ہے تو ان سے اذان کی آواز دور تک پہنچانے کا کام لیا جاتا ہے اس غرض کے لئے عام طور پر اکثر مسلم ملکوں میں لاؤڈ سپیکر بھی میناروں پر نصب کیے جاتے ہیں لیکن اب اس کے ساتھ ساتھ مینار ایک روایت بھی بن گئی ہے اور مسلم عبادت گاہوں کو دوسری عبادت گاہوں سے ممتاز کرنے کے لئے بھی مینار اہم کردار ادا کرتے ہیں یا آبادی اور بستی کے دوسرے مکانات سے مسجد کو نمایاں ممتاز کرنے اور اس کی پہچان کے لئے بھی مینار ایک ذریعہ بن چکے ہیں۔ اس لئے اس کی یہ روایتی افادیت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے تاہم مینار کی تعمیر یا اس کی بلندی کو برطانیہ میں ایک مسئلہ بنا کر مقامی حکام سے جھگڑنا بھی ضروری نہیں ہے۔ اس کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے اور یہ ان بنیادی مسائل ہے نہیں ہے جن کی وجہ سے کمیونٹی میں کوئی کھچاؤ پیدا کیا جائے۔ اس سے بھی اہم مسائل موجود ہیں جن کو بنیاد بنا کر ہم جدوجہد کر سکتے ہیں اور مقامی حکام پر دباؤ ڈال کر اپنے حقوق منوانے کے لئے انہیں قائل کر سکتے ہیں۔ لیکن آسانی کے ساتھ اور پرامن ذرائع استعمال کر کے اگر مینار بنانے کے لئے کوششیں کی جائیں تو اس میں قباحت بھی کوئی نہیں بلکہ بہتر وافضل ہے۔

گم شدہ چیز کا مسجد میں اعلان؟

سوال: کیا کسی شخص کا مسجد میں اپنی گم شدہ چیز کی تلاش کے لئے اعلان کرنا شرعاً

ناجائز ہے؟ اسی طرح کیا کوئی شخص مسجد میں تجارت کر سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص اس تاجر کو روکنا چاہے تو کیا شرعاً یہ جائز ہے؟

جواب: فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز (رحمہ اللہ) نے ان سوالات کے جواب اس طرح بیان فرمائے ہیں۔

سب سے اہم چیز تو یہ ہے کہ مسجدیں نماز اور ذکر اللہ کے لئے بنائی گئی ہیں ایسے میں سب سے اہم ضرورت اس بات کی ہے کہ مسجدوں میں ایسی فضا پیدا کی جائے جس میں مسلمان نہایت اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ یادالٰہی میں مصروف ہو سکیں۔ علاوہ ازیں مسجد کے اندر سکون اور وقار کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے۔ ہر اس کام سے منع کیا جائے جس سے مسجد کے وقار اور اس کے اعلیٰ مقام میں خلل واقع ہوتا ہو۔

اس کے بعد جیسا کہ سائل نے دریافت کیا ہے کسی گم شدہ چیز کے متعلق مسجد میں اعلان کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ نے ایک شخص کو اپنی کسی گم شدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنا تو آپ نے فرمایا اس سے کہو کہ اللہ تمہیں وہ چیز نہ لوٹائے کیونکہ مسجدیں اس غرض کے لئے نہیں بنائی گئی ہیں۔

اسی طرح مسجد میں تجارتی اعلان سے بھی گریز کیا جائے کیوں کہ یہ چیزیں مسجد کے مقام اور اس کے وقار کے شایان شان نہیں۔ مسجد خرید و فروخت کرنے کی جگہ نہیں ہے بلکہ عبادت کا مقام ہے۔ اگر کوئی تجارت کرنے والے کو روکنا چاہے تو شرعاً روک سکتا ہے۔

مسجد میں سونا جائز ہے؟

سوال: لیڈز سے محمد یٰسین لکھتے ہیں

کونسی حدیث سے ثابت ہے کہ آدمی مسجد میں نہیں سو سکتا؟

جواب: جمہور ائمہ کے نزدیک مسجدوں میں سونا جائز ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے اصحاب صفہ مسجد نبویؐ میں رہتے اور سوتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں

كنا في زمن رسول الله ﷺ ننام في المسجد ونقيل فيه و نحن شباب[1]

"کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مسجد میں سوتے اور قیلولہ کرتے تھے اور ہم نوجوان تھے۔"

ایک دوسری حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت سعد بن معاذؓ جب جنگ خندق میں شدید زخمی ہو گئے تو حضورؐ نے ان کے لئے مسجد میں ایک الگ جگہ رہنے کے لئے بنائی تاکہ لوگ قریب سے ان کی تیمارداری کر سکیں (بخاری و مسلم)

ان دلائل سے یہ بات واضح ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ مساجد میں سوتے تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی روایات کا ثبوت ملتا ہے جبکہ مسجد میں نہ سونے کے بارے میں کوئی صحیح حدیث ہماری نظروں سے نہیں گزری۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپؐ کے زمانے میں یہ اجازت ایک مجبوری اور ضرورت کی وجہ سے تھی' آج کل جائز نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو صحابہ کرام گاہے گاہے مسجد میں سوتے یا قیلولہ کرتے تھے ان کے لئے ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی کہ ان کے اپنے مکان نہیں تھے اور دوسری بات یہ ہے کہ آج بھی ایک ضرورت کے تحت کچھ لوگ مساجد میں سوتے ہیں۔ بلا ضرورت مسجدوں میں ڈیرے لگا لینا یا اسے مستقل رہائش گاہ میں تبدیل کر لینا اس کی تو کوئی بھی اجازت نہیں دیتا۔

مسجد ضرار کی تعریف کیا ہے؟

سوال: گلاسٹر سے جناب ابراہیم یوسف رنگونی دریافت کرتے ہیں

(۱) مسجد ضرار کسے کہتے ہیں' اس کے بنانے والے کون لوگ تھے اور مسجد کیوں جلا

[1] بخاری جلد ۱ کتاب الصلاۃ باب نوم الرجل فی المسجد۔ فتح الباری ج ۱٤ ص ٤٥٥ نسائی کتاب الصلاۃ باب النوم فی المسجد۔

دی گئی تھی؟

(۲) کسی مسجد یا اسلامی ادارے کا ذمہ دار اپنے ٹرسٹ یا ادارہ کے دستور میں ایسے قوانین درج کرے جو غیر شرعی ہوں' مسلمانوں میں نااتفاقی اور بے چینی پیدا ہو اور بینک سے سودی قرض لے کر مسجد کی عمارت خریدے' مسجد میں شریعت کے مطابق کام نہ ہونے دے بلکہ اخبار میں یہ بیان دے کہ ہمارا ٹرسٹ چاہتا ہے کہ مسجد کو دوسرے مذاہب اور دیگر ادارے والوں کو مفت استعمال کے لئے دیا جائے۔ ایسی مسجد یا ادارے کا کیا حکم ہے؟ ایسی مسجد میں جانے سے ایسے ذمہ داروں کی ہمت افزائی ہوتی ہے تو ایسی مسجد میں نماز باجماعت کے لئے کیا حکم ہے؟

(۳) کسی مسجد یا اسلامی ادارے کی نقد رقم بینک کے سودی اکاونٹ میں رکھ کر سود وصول کرنا کیسا ہے؟ اگر کوئی ایسا کرے تو مقامی مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے؟

(۴) ایک نو مسلم نے مسئلہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے ایک مسجد والوں کو پچاس ہزار پونڈ زکوٰۃ دے دی ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ میری زکوٰۃ ادا ہو گئی ہے۔ شرعی مسئلہ اس بارے میں کیا ہے؟ واضح رہے کہ مسجد والوں کے پاس وہ رقم جمع ہے ابھی تک استعمال نہیں کی۔ کیا وہ مسجد والوں کو واپس ادا کرنی چاہئے یا نہیں۔ اگر وہ یہ رقم مسجد بنانے پر خرچ کر دیں تو ایسی مسجد کی کیا حیثیت ہو گی؟

جواب: (۱) قرآن میں جس مسجد ضرار کا ذکر ہے یہ مسجد قبا کے پاس منافقین کے ایک گروہ نے ایک دشمن اسلام ابو عامر راہب کے اشارے پر بنائی تھی اور رسول اللہ ﷺ کو اس میں نماز پڑھنے کی دعوت دی تھی۔ اس موقع پر سورہ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی "اور وہ لوگ جنہوں نے مسلمانوں کو ضرر پہنچانے' کفر کے کام کرنے اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف ڈالنے اور اس شخص کے لئے پناہ گاہ بنانے جو اللہ اور اس کے رسول کا دشمن ہے ان کاموں کے لئے مسجد بنائی آپ اس مسجد میں ہرگز قیام نہ کریں (کبھی بھی نماز نہ پڑھیں)" تو اس آیت میں مسجد ضرار کی تعریف بیان کر دی گئی

ہے یعنی جو شخص فاسد اغراض کے لئے مسجد کے نام پر کوئی مکان تعمیر کرے تو وہ مسجد ضرار ہو گی۔ یعنی اس مسجد کی تعمیر سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانا مقصود ہو۔ کفر کو تقویت دینا مقصد ہو مسلمانوں کے شیرازے کو منتشر کرنے کی نیت ہو اور ایسے لوگوں کی کمین گاہ بن جائے جو اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کر رہے ہوں تو یہ مسجد ضرار ہو گی۔ اس کے برعکس جو مسجد اللہ کی رضا کے لئے بنائی جائے اور اس کی بنیاد تقویٰ اور ایمان پر ہو' وہ صحیح اور درست ہے- اس مسجد ضرار کو اس لئے جلا دیا یا منہدم کر دیا گیا تھا تاکہ یہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا اڈہ اور دشمنان اسلام کی پناہ گاہ نہ بن سکے۔

(۲) مسجد کمیٹیوں کے دستور میں غیر شرعی قوانین داخل کرنا ناجائز ہے اور بینک سے سود پر قرض لے کر مسجد بنانا بہت خطرناک رجحان ہے۔ اس کی شدید مخالفت کرنی چاہئے۔ اسی طرح شریعت کے مطابق مسجد میں کام کرنے سے جو روکے وہ ظالم ہے۔ سورہ بقرہ کی یہ آیت واضح ہے کہ اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکتا اور انہیں غیر آباد کرنے کی کوشش کرتا ہے- (آیت نمبر ۱۱۴)

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اسلام عیسائی مذہب کے بہت قریب ہے- اس بات کو اگر اس طرح کہا جائے کہ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں عیسائیوں کا رویہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بہتر ہے- اس کی وضاحت قرآن نے سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۸۲ میں کر دی ہے اس لئے اگر عیسائیوں یا دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مسجد میں آنے کی اجازت دے دی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اس شرط پر کہ وہ مساجد میں جب آئیں تو مساجد کا تقدس ملحوظ رکھیں اور اس کے آداب پوری طرح بجالائیں نیز کوئی غیر اسلامی حرکت وہاں نہ کریں یا پھر ان کے آنے کی غرض مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہو' تب بھی ان کا مساجد میں آنا اور وہاں بیٹھنا جائز ہے۔

باقی جو شخص مساجد کے بنانے یا آباد کرنے میں غیر شرعی اور حرام طریقے استعمال

کرے اس سے ہرگز تعاون نہیں کرنا چاہئے بلکہ مقامی مسلمانوں کا فرض ہے کہ ایسے شخص کو اس مسجد یا ادارے کی انتظامیہ سے الگ کر کے شریعت کے پابند آدمی کے سپرد یہ ذمہ داری کریں۔ ایسی مساجد میں نماز کے لئے جانا جائز ہے بشرطیکہ وہاں کسی غیر اسلامی یا غیر شرعی کام میں شریک اور ملوث نہ ہو۔

(۳) مسجد کے چندے سودی اکاؤنٹ میں رکھ کر سود وصول کرنا سنگین جرم ہے مقامی مسلمانوں کو ایسے شخص کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے اور اسے اس حرکت سے باز رکھنا چاہئے۔ کیونکہ وہ شخص اللہ اور رسول کے خلاف اعلان جنگ کئے ہوئے ہے۔ اس لئے اس کے اس فعل پر خاموش رہنا گناہ عظیم ہے۔

(۴) زکوٰۃ فقراء اور مساکین کا حق ہے اسے مساجد کی تعمیر میں نہیں لگانا چاہئے۔ بعض لوگوں نے قرآن میں "فی سبیل اللہ" کے لفظ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اللہ کی راہ میں مساجد بھی شامل ہیں۔ لیکن صحیح بات یہی ہے کہ زکوٰۃ کے اصل مصارف وہی ہیں جو قرآن نے بیان کئے ہیں اور "فی سبیل اللہ" سے مراد جہاد کی تیاری کے لئے زکوٰۃ دینا ہے۔ مسجد والوں کو چاہئے کہ یہ رقم واپس کر دیں اور اگر انہوں نے استعمال کر لی ہے تو دینے والے کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ جہاں تک مسجد میں نماز پڑھنے کا تعلق ہے تو اس میں کوئی ممانعت نہیں، نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

چرس کی رقم اور مفتی صاحب کا فتویٰ

سوال: بریڈ فورڈ سے سلیم خاں لکھتے ہیں:

آج کل چرس، افیون اور ہیروئن (پاؤڈر) کا کاروبار زوروں پر ہے اور اس ضمن میں کئی لوگوں نے کافی رقوم بھی کمائی ہیں۔ ایسے ہی ایک شخص نے گزشتہ دنوں پاؤڈر بیچ کر کافی رقم کمائی اور پھر اس رقم سے چند لاکھ روپے مسجد کے لئے دینے کا وعدہ کیا۔ اس پر

لوگوں میں کچھ بحث مباحثہ بھی ہوا۔ جس کے نتیجے میں سنا ہے ایک مفتی صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ اس آدمی سے یہ رقم لے کر مسجد بنانا جائز ہے۔ تو براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں رہ نمائی فرمادیں کہ کیا ایسے کاروبار سے حاصل شدہ رقم دین کے کاموں خصوصاً مسجد کی تعمیر میں استعمال کرنی جائز ہے؟

جواب: چرس اور افیون کا کاروبار ہو یا کسی دوسرے حرام طریقے سے کمائی ہوئی دولت ہو ایسی رقم اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ اجر وثواب اور حرام مال پلید ہوتا ہے اور اللہ پلید مال کو نہ پسند کرتا ہے اور نہ قبول اس لئے مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں اگر علم ہو کہ یہ مال حرام کی کمائی کا ہے تو اسے تعمیر مسجد میں استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ حدیث شریف میں ہے۔

ان اللہ طیب لا یقبل الا طیبا[1]

"اللہ پاک ہے اور پاکیزہ چیز ہی پسند کرتا ہے۔"

مساجد کی تعمیر میں حلال مال کا اہتمام انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں اسلام سے پہلے کفار مکہ نے بھی بیت اللہ کی تعمیر کے وقت پورا اہتمام کیا تھا کہ اس کی تعمیر میں حلال مال خرچ ہو اور جب ان کے پاس حلال مال کی کمی واقع ہو گئی تو اتنی جگہ انہوں نے خالی چھوڑ دی جواب بھی خالی ہے اور حطیم کہلاتی ہے۔

جن مفتی صاحب نے حرام مال سے مسجد تعمیر کرنے کو جائز قرار دیا ہے اگر وہ قرآن وحدیث کے دلائل تحریر فرمادیں تو شاید ہمیں بھی فائدہ ہو گا اور ہمارے ناقص علم میں اضافہ بھی ہو جائے گا۔ بہر حال ہمیں قرآن وحدیث یا بزرگان دین کے اقوال سے ایسی کوئی دلیل نہیں ملی کہ ہم اسے جائز قرار دے سکیں۔

---

[1] مسلم مترجم ج ۳ کتاب الزکاۃ باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف ص ۴۳

ایک امام دوسرے امام کو کم تنخواہ دے کر امام رکھ سکتا ہے؟

سوال: برمنگھم سے محمد امین لکھتے ہیں

(۱) ایک امام صاحب کو اگر ایک مسجد کی طرف سے نمازیں اور بچے پڑھانے کے عوض معقول معاوضہ دیا جا رہا ہو اور وہ امام صاحب خفیہ طریقے سے کسی اور ادارے سے بھی معاوضہ منظور کروالیں تو ان کا یہ فعل جائز ہے اور وہ امامت کے قابل ہیں؟

(۲) ایک امام صاحب کو مثلاً ڈیڑھ سو پونڈ ماہوار تنخواہ ملتی ہے وہ کچھ عرصے کے لئے پاکستان جاتے ہیں اور اپنی جگہ ایک اور امام کو مقرر کرتے ہیں اور ان کو وہ سو پونڈ دیتے ہیں ۵۰ پونڈ پہلے امام صاحب خود رکھ لیتے ہیں۔ کیا ان کا یہ فعل جائز ہے؟

جواب: امام صاحب اگر کسی دوسرے ادارے سے جھوٹ یا غلط بیانی کر کے کوئی رقم یا تنخواہ منظور کرا لیتے ہیں یہ جائز نہ ہوگا۔ لیکن اگر ان کی خدمات کے صلے میں کوئی ادارہ ان کی مزید تنخواہ مقرر کرتا ہے مسجد کمیٹی کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہ ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(۲) اگر امام صاحب اپنی طرف سے اپنی عدم موجودگی میں جو امام مقرر کر کے گئے ہیں، مسجد کی انتظامیہ اسے قبول کر لیتی ہے اور تنخواہ وغیرہ کا مسئلہ وہ امام صاحب پر چھوڑ دیتی ہے کہ وہ پوری دیں یا آدھی یا بالکل کچھ نہ دیں۔ مسجد کمیٹی کو اس سے کوئی سروکار نہ ہو تو پھر امام صاحب کا یہ فعل جائز ہوگا اور اگر کمیٹی سے یہ کہا کہ میں اسے پوری تنخواہ دیتا ہوں مگر پچاس پونڈ خود رکھ لیتے ہیں تو یہ جائز نہیں اور جو شخص جھوٹ یا دھوکہ بازی میں ملوث پایا جائے اسے مستقل امام نہیں بنانا چاہئے۔

انگلینڈ میں کوئی جگہ ہے جہاں ستر ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے؟

سوال: کارڈف سے غلام حسین دریافت کرتے ہیں کہ ایک صاحب ایک دینی مجلس میں بیان کر رہے تھے اور اس دوران انہوں نے انگلینڈ میں ایک جگہ کا نام لے کر کہا کہ وہاں نماز کا ثواب ستر ہزار ہے پھر مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا ۷ لاکھ تک ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

ج: جو لوگ اس طرح کی چیزیں بیان کرتے ہیں کہ انگلینڈ میں بھی کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ایک نماز پڑھنے کا ثواب ۷۰ ہزار یا ۷ لاکھ تک ہے' وہ بہت بڑا بہتان تراشتے ہیں۔ انگلینڈ کا کوئی شہر کس قطار میں ہے جب کہ کسی اسلامی ملک کے کسی شہر کو یہ حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ رسول اللہ ﷺ نے مسجد حرام' مسجد اقصیٰ اور مسجد نبویؐ کے علاوہ کسی اور جگہ کو اس طرح کی فضیلت عطا نہیں کی اور نہ کسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی طرف سے ثواب کی یہ تقسیم جاری کرے۔ ہمارے علم کے مطابق شریعت میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے کسی دوسری جگہ کی اس طرح کی فضیلت ثابت ہو۔

اللہ کی راہ میں پاک چیزیں' پاک کمائی اور پاکیزہ عمل قبول ہوتے ہیں

سوال: بین بری سے عبدالحفیظ لکھتے ہیں اگر کوئی آدمی ویڈیو فلموں کا کاروبار کرتا ہے اور اس کاروبار سے کچھ پونڈ مسجد کے لئے چندہ دیتا ہے کیا اس سے چندہ لینا جائز ہے؟

جواب: رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ

ان اللہ طیب لا یقبل الا طیبا[1]

---

[1] مسلم مترجم ج ۳ کتاب الزکاۃ باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف ص ۴۳

"اللہ پاک ہے اور پاک چیزوں ہی کو قبول کرتا ہے"

اور یہی حکم اس نے اہل ایمان کو دیا جیسا کہ اپنے رسولوں کو یہ حکم دیا تھا کہ

﴿يَآيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ (المومنون : ۵۱)

اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اس کا مجھے اچھی طرح علم ہے۔ (مسلم ' ترمذی)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی راہ میں حلال وپاک کمائی ہی قبول ہوگی۔ حرام اور پلید کمائی اللہ قبول نہیں کرتے۔ جہاں تک وڈیو فلموں کا تعلق ہے اگر ایسی فلمیں خریدی اور کرائے پر دی جاتی ہیں جن کے ذریعے بے حیائی و فحاشی پھیلتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حدود توڑی جاتی ہیں تو ایسی فلموں کی کمائی جائز نہیں اور ایسے لوگوں کے بارے میں اگر معلوم ہو جائے کہ وہ حرام کی کمائی سے چندہ دیتے ہیں تو قبول نہیں کرنا چاہئے اور اگر ایسی فلمیں جن میں دین کے خلاف کوئی بات نہیں اور نہ ہی وہ بے حیائی و بدکاری پھیلنے کا ذریعہ بنتی ہیں تو ایسی کمائی کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔

نماز کے مسائل

کیا عورت اپنے خاوند کے ساتھ نماز باجماعت پڑھ سکتی ہے؟

سوال: محمد اسلم خاں لندن سے لکھتے ہیں "کیا عورت اپنے خاوند کے ساتھ باجماعت نماز پڑھ سکتی ہے؟ اور کیا عورت کی آمین کی آواز یا دوسری کوئی آواز پردے میں داخل ہے؟ اس بارے میں شریعت کا موقف واضح کریں۔"

جواب: عورت گھر پر اپنے خاوند یا کسی بھی محرم کے ساتھ نماز باجماعت ادا کر سکتی ہے۔ حدیث میں اس طرح کے متعدد واقعات و شواہد موجود ہیں۔

جہاں تک عورت کی آواز کا تعلق ہے تو اس بارے میں ائمہ دین اور فقہاء اسلام کے مختلف اقوال و آراء ہیں لیکن صحیح بات یہی ہے کہ عمومی حالات میں عورت کی آواز پردے میں شامل نہیں ہے۔ خاص طور پر تعلیم و تدریس کی ضرورت کے پیش نظر تو اس کے جواز میں کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔

حدیث میں آتا ہے کہ صحابہ کرامؓ دینی مسائل دریافت کرنے کے لئے ازواج مطہرات کے پاس آتے اور ان سے دین کا علم بھی حاصل کرتے۔ اس لئے نماز میں اونچی آواز سے آمین کہنا یا کبھی قرأت کرنا عورتوں کے لئے جائز ہے۔

ہاں اگر عورت کی آواز کسی فتنے یا خرابی کا باعث بنے تو ایسی صورت میں غیر محرموں کے لئے اس کی آواز سننا جائز نہیں ہوگا۔ چاہے وہ قرآن کی تلاوت ہی کیوں نہ ہو اور عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ غیر محرم مردوں کے سامنے ایسی نرم گفتگو یا سریلی آواز سے تلاوت یا شعر گوئی سے پرہیز کریں جس سے شیطانی وسوسے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ جہاں تک عام گفتگو کا تعلق ہے تو یہ جائز ہے اور یہ آواز پردے میں شامل نہیں ہے۔

عورتیں مسجد میں نماز پڑھ سکتی ہیں؟

سوال: حافظ داؤد آکسفورڈ سے سوال کرتے ہیں

عورتوں کو (پردے میں) آدمیوں کے پیچھے مسجد میں نماز پڑھنے آنا چاہئے یا گھر میں نماز پڑھنی چاہئے؟

جواب: عورتیں برطانیہ میں ہوں یا کسی دوسرے ملک میں وہ مردوں کے پیچھے نماز پڑھ سکتی ہیں۔ اگر وہ صحیح اسلامی لباس پہن کر زیب وزینت کے اظہار کے بغیر نماز کے لئے مسجد میں آئیں تو یہ بھی جائز ہے۔ ویسے عورتوں کا گھر میں نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ ہاں دینی علم حاصل کرنے اور خطبہ یا وعظ سننے کے لئے عورتوں کا مسجد میں آنا مفید ہو سکتا ہے۔ اس مسئلے میں مندرجہ ذیل احادیث کا ذکر فائدے سے خالی نہ ہو گا۔

پہلی حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

اذا استاذنت امراءة احدکم الی المسجد فلا یمنعھا[1]

"تم میں سے جس کی عورت مسجد میں جانے کی اجازت طلب کرے تو اسے روکنا نہیں چاہئے" (بخاری و مسلم)

دوسری روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی زوجہ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرمایا

"تم (عورتوں) میں سے جو مسجد میں جائے اسے خوشبو نہیں لگانی چاہئے۔ (مسلم)

تیسری روایت بھی عبداللہ بن عمرؓ کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

لا تمنعوا نسائکم المساجد و بیوتھن خیر لھن[2]

تم اپنی عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے روکا نہ کرو اور ان (عورتوں) کے

---

[1] بخاری ج ۲ باب استیئذان المرأة زوجها فی الخروج الی المسجد۔ فتح الباری ج ۱۰ باب المذکور رقم الحدیث ۵۲۳۸ ص ۴۲۳

[2] سنن ابی داؤد ج ۱ کتاب الصلاة باب ماجاء فی خروج النساء الی المسجد ص ۹۱

لئے ان کے گھر بہتر ہیں۔

کیا ٹائی پہن کر نماز ہو جاتی ہے؟

سوال: آج کل یہ ایک مسئلہ ہے کہ ٹائی پہن کر نماز پڑھنا نا جائز ہے اور کچھ لوگ یعنی مولوی صاحبان تو کہتے ہیں کہ عیسائی مذہب کا خاص راز ہے۔ لیکن میری معلومات (عیسائی لوگوں سے) کے مطابق عیسائی مذہب میں اس کا کوئی REASON نہیں ہے۔اب آپ ہی بتائیں کہ ٹائی پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ تفصیلات کے ساتھ جواب دے کر دل کا شک و شبہ دور کریں۔

جواب: ٹائی کے بارے میں علماء اور اہل علم کی دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ یہ عیسائیوں کا کوئی مذہبی نشان ہے اور دوسری یہ کہ عام لباس کی طرح ہے اس میں مذہب کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اب پہلی رائے کے مطابق اگر یہ ثابت ہو جائے کہ عیسائیوں کے نزدیک اس کی کوئی مذہبی حیثیت ہے تو نماز اور نماز کے علاوہ دونوں حالتوں میں اس کا پہننا جائز نہیں ہے اور اگر اس کے بارے میں یہ یقین ہو جائے کہ مذہبی طور پر اس کی کوئی اہمیت نہیں تو پھر عیسائیوں کا خصوصی شعار ہونے کے لحاظ سے اس کو نا جائز نہیں کہا جائے گا۔ لیکن ایک بات بہر حال قابل غور ہے کہ اس کی ابتدا کیوں اور کیسے ہوئی۔ لباس میں تو اس کی خاص ضرورت نہیں۔اب تو یورپ والے بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ خواہ مخواہ کا بوجھ ہے اور اس سے تنگی محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے محض لباس سمجھ کر اس کو پہننا نا قابل فہم ہے۔اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی کہ اسے اس طرز پر رائج کیا گیا۔ایک اور بات بھی متفق علیہ ہے کہ اس کی ابتداء عیسائیوں نے کی۔ مسلمانوں کے لباس کا کسی دور میں بھی ٹائی حصہ نہیں رہی اور یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ مسلمانوں نے اس کو نہ کسی ضرورت کے تحت اختیار کیا ہے اور نہ لباس سمجھ کر بلکہ ہمارے لوگوں نے عیسائیوں کی تقلید اور دیکھا دیکھی میں اس کو پہننا

شروع کردیا ہے اس لئے میری رائے میں اگر کوئی شخص کسی مجبوری کے بغیر محض انگریز کی تقلید میں اسے پسند کر کے اختیار کرتا ہے تو یہ جائز نہیں ہوگا کیونکہ کسی چیز کو بھی دوسری قوم سے مرعوب یا متاثر ہو کر قبول کرنا اسلام میں جائز نہیں (سوائے شدید ضرورت یا مجبوری کے) اس سلسلے میں مندرجہ ذیل احادیث قابل غور ہیں۔

من تشبه بقوم فهو منهم[1]

جس شخص نے کسی دوسری قوم کی تقلید کی وہ ان ہی میں سے سمجھا جائے گا۔

یعنی جو شخص کسی دوسری قوم کی عادات واطوار کو اپناتا ہے یا پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے تو اس کا شمار بھی انہی لوگوں میں سے ہوگا۔ اسی طرح دوسری حدیث کے الفاظ

خالفوا اليهود والنصرى

(یہود اور نصاریٰ کی مخالفت کرو) یعنی یونہی بلا ضرورت، محض ان کی ترقی اور شان و شوکت سے مرعوب ہو کر ان کے پیچھے نہ لگیں بلکہ اس کے برعکس ایسے کاموں میں ان کی مخالفت کریں۔ تیسری حدیث ہے

"دع ما يريبك الى مالا يريبك"[2]

یعنی جس چیز کے جائز یا ناجائز ہونے میں شک ہو بہتر یہ ہے کہ اس کو چھوڑ کر ایسی چیز اختیار کی جائے جس میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔

چوتھی حدیث ہے

ان الحلال بين وان الحرام بين و بينهما مشتبهات لا يعلمهن كثير من الناس فمن اتقى الشبهات فقد استبراء لدينه و عرضه و من وقع فى الشبهات وقع فى الحرام.[3]

---

[1] المعجم الأوسط للطبرانی ج ۹ ص ۱۵۱ رقم الحديث ۸۳۲۳

[2] مشکوۃ للألبانی ج۲ کتاب البیوع باب الکسب و طلب الحلال ص ۸۴۵ رقم الحدیث ۲۷۷۳

[3] سنن ابی داود ج ۲ کتاب البیوع باب اجتناب الشبهات ص ۱۱۷۔

یعنی حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ ان کے درمیان کچھ ایسے کام بھی ہیں جو واضح نہیں ہیں بلکہ ان میں شبہ ہے اور اکثر لوگوں کو ان کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں جو شبہات سے دور رہا اس نے دین اور عزت کو محفوظ کر لیا اور جس نے شبہات کی پرواہ نہ کی تو اس کے حرام میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔

لہٰذا اس طرح کے مسائل میں احتیاط بہر حال بہتر ہے' خصوصاً غیر مسلموں کے ایسے کام جن میں علمی سائنسی یا فوجی فوائد بھی نہیں ہیں۔ محض دیکھا دیکھی اور شان و شوکت کے لئے ان کو اپنا لینا درست نہیں ہے۔ جو قومیں دوسروں کی تہذیب و ثقافت کو بغیر کسی دینی یا دنیاوی مقصد اور بغیر کسی ضرورت کے قبول کر لیتی ہیں وہ کبھی بھی دنیا میں ترقی ورفعت کی منازل طے نہیں کر سکتیں۔

(هذا ما عندي والله اعلم بالصواب)

نقش والے جائے نماز برائے فروخت کیوں؟

سوال: ساؤتھ آل (لندن) سے قیوم عظیمی لکھتے ہیں:

دسمبر کے شمارے میں ان جاء نمازوں پر جن پر کعبہ شریف یا روضہ شریف وغیرہ کے نقش بنے ہوں نماز نہ پڑھنے کے متعلق مضمون پڑھا۔ اس مضمون کو پڑھنے کے بعد ذہن میں دو سوال ابھرے اول یہ کہ اگر یہ فتویٰ مان لیا جائے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سعودی گورنمنٹ جو کہ اسلام سے قریب ترین حکومت سمجھی جاتی ہے' نے ایسی جاء نمازوں کی فروخت کی اجازت کیوں دے رکھی ہے۔ دوم یہ کہ جن لوگوں کے پاس ایسا جاء نماز ہو وہ اس کو کیا کریں کیونکہ میرے پاس ایسی ایک مخملی جاء نماز ہے؟

جواب: آپ کا پہلا سوال یہ ہے کہ سعودی حکومت نے ان مصلوں کی پھر اجازت کیوں دے رکھی ہے۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں کسی کام کے حلال و حرام یا جائز و ناجائز ہونے کا معیار کسی حکومت کا عمل نہیں بلکہ کتاب و سنت ہے کوئی حکومت چاہے کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو اگر کسی ایک مسئلے میں وہ غلطی کرتی ہے تو ہمارے لئے ضروری نہیں کہ اس کو بھی جائز قرار دیں۔

سعودی حکومت بلاشبہ ایسے گئے گزرے دور میں بھی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اسلام کی بہت بہتر خدمت کر رہی ہے اور اسلامی احکام پر وہاں عمل در آمد بھی ہو رہا ہے اور اسلامی قوانین کا عملی نفاذ بھی وہاں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض معاملات میں ان سے کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں اور خود سعودی علماء اس طرف حکومت کو توجہ دلاتے رہتے ہیں اور متعدد امور میں علماء کی نصیحت پر حکومت نے اصلاحی اقدامات بھی کیئے ہیں۔ مصلوں پر بیل بوٹے اور مسجدوں میں نقش و نگار کے بارے میں جید سعودی علماء کرام کا بھی وہی موقف ہے جس کا اظہار مذکورہ فتوے میں کیا گیا ہے۔ حکومت کی

طرف سے اس سلسلے میں اگر نرمی برتی جا رہی ہے یا سستی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے تو اس میں علماء ہرگز قصوروار نہیں۔

اور پھر ایسے مصلوں کے حرام ہونے یا بالکل نماز نہ ہونے کا فتویٰ بھی نہیں دیا۔ یہی کہا گیا کہ ایسے مصلوں پر نماز پڑھنا ٹھیک نہیں اور جو لوگ رسول اکرم ﷺ کے واضح ارشادات معلوم ہونے کے بعد بھی اس کی پرواہ نہیں کرتے وہ گناہ گار ہو سکتے ہیں۔ نماز کے بارے میں اور بھی کئی ایسی باتیں ہیں جو آدمی کرتا ہے اور ان کے کرنے کی وجہ سے گناہ گار بھی ہوتا ہے لیکن نماز ادا ہو جاتی ہے۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ جب حدیث میں آ گیا تو اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ اسے عملی جامہ پہنائیں اور اگر کوئی رکاوٹ نہیں ہے تو پھر ایسے مصلے تبدیل کر لیں تاکہ شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔

اگر رسول اکرم ﷺ ان چیزوں کو پسند نہیں کرتے اور حضرت عائشہؓ سے فرماتے ہیں کہ ایسی چیزوں کو میرے آگے سے ہٹادو' یہ مجھے نماز میں مشغول کر دیتی ہیں تو پھر ہم کون ہیں کہ یہ بیل بوٹے اور ساری تصویریں سامنے دیکھنے کے باوجود ہمارے خشوع و خضوع میں کوئی فرق نہیں پڑتا- نماز میں توجہ اور خشوع و خضوع ضروری ہے اور جو کام یا چیز اس میں رکاوٹ بنے اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ اسلام تو یوں بھی سادگی پسند کرتا ہے اور مساجد تو خالص اللہ کی عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ ان میں گرجوں اور مندروں کی طرح تصویریں لٹکانا نقش و نگار اور بیل بوٹے بنانا (خاص طور پر سامنے قبلہ کی طرف) ہرگز مستحسن عمل نہیں۔

گزشتہ دنوں برطانیہ کے ایک شہر میں ہم نے ایک مسجد میں نماز پڑھی تو وہاں سامنے محراب ہے۔ دونوں طرف اشتہارات' سینریوں اور کتبوں کی اتنی بھرمار تھی جیسے یہ کوئی عجائب گھر یا نمائش گاہ ہے۔ اب یہ تو کسی کے نزدیک بھی سنت نہیں بلکہ بدعت کے زمرے میں آتی ہیں۔ کل لوگ اپنے بزرگوں پیروں اور مولویوں کی تصاویر بھی مساجد میں لٹکانا شروع کر دیں گے تو اس پر آپ کیا کہیں گے؟ اس لئے شریعت

میں معیار قرآن و حدیث ہے۔ جو چیز اس کے خلاف ہے وہ بہر حال ناجائز ہے چاہے حکمران اس پر عمل کریں اور چاہے مفتی حضرات اس کی اجازت دے دیں یا علماء اس پر خاموشی اختیار کرلیں لیکن ناجائز کام پھر بھی ناجائز ہے۔

آپ کا یہ کہنا کہ اب جاء نماز کا کیا کریں۔ اگر آپ مسئلے کو درست سمجھتے ہیں تو پھر اس جاء نماز کی فکر نہ کریں۔ شک و شبہ میں پڑنے کی بجائے کسی سادہ کپڑے پر نماز پڑھ لیا کریں اور اس جاء نماز کو بھی ضائع نہ کریں۔ اس پر کوئی سادہ غلاف چڑھا کر اسے استعمال کر سکتے ہیں یا الٹی جانب سے استعمال کرلیں۔ تکلف زیب و زینت اور چمک دمک سے سادگی اور سنجیدگی بہر حال بہتر ہے۔

جاء نمازوں پر تصویروں کا حکم کیا ہے؟

سوال: BODELWYDDA سے ڈاکٹر صلاح الدین لکھتے ہیں

(۱) بہت سے جاء نمازوں پر مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ اور بیت المقدس کی تصویر بنی ہوتی ہے اور ان تصویروں پر پیر پڑ جاتا ہے جس سے ان کی بے حرمتی ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر جان بوجھ کر آدمی پیر ڈال دیتا ہے تو کیا گناہ ہوگا؟ اسی طرح ڈاک کے ٹکٹوں پر کعبہ کی تصویر بنی ہوتی ہے جسے ہم ادھر ادھر ڈال دیتے ہیں تو کیا اس کا گناہ ہوگا؟

جواب: (۱) پہلا سوال جاء نمازوں اور ڈاک کے ٹکٹوں پر مقامات مقدسہ کی تصویروں اور ان کے احترام سے متعلق ہے اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تینوں مقامات مقدسہ (بیت اللہ' مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ) کا ادب و احترام نہ صرف یہ کہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے بلکہ اس کے ایمان کا جزء ہے اور پھر نبی کریم ﷺ نے ان تینوں کے مقام اور ان میں عبادت کی فضیلت بھی بیان فرمائی ہے۔

دوسری بات یہ جاننا ضروری ہے کہ اصل اور تصویر میں بہر حال فرق ہے جو کام اصل سے لیا جا سکتا ہے وہ تصویر سے نہیں لیا جا سکتا۔ اس لئے دونوں کے مقام میں

بہر حال فرق ہوگا۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کے نزدیک یہ انتہائی محترم مقامات ہیں اس لئے ان کی تصویر بھی ان کے لئے عقیدت و محبت کی چیز ہے اور ظاہر ہے اگر کوئی شخص بے حرمتی اور بے ادبی کی نیت سے ان تصویروں کی اہانت کرے گا تو یقیناً مجرم ہوگا۔ مثلاً کوئی انہیں پھاڑ کر پاؤں تلے روندتا ہے یا پھر ان پر تھوکتا ہے یا انہیں گندی جگہ پھینک دیتا ہے تو ہر گز جائز نہیں ہوگا۔

تیسری بات ہے ان تصویروں پر پاؤں رکھنے کی تو اگر کوئی شخص توہین کی نیت سے انہیں پاؤں تلے روندتا ہے تو وہ یقیناً مجرم ہوگا۔ لیکن نماز کے لئے ان پر کھڑے ہونے کو توہین نہیں قرار دیا جاسکتا۔ جب ہم ان اصل جگہوں پر جاتے ہیں تو وہاں ظاہر ہے پاؤں رکھتے ہیں' ان کے اوپر چلتے ہیں۔ حتیٰ کہ بیت اللہ شریف کی چھت پر چڑھنا صحابہ کرام سے ثابت ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ پاؤں رکھ کر ہی اوپر چڑھتے تھے آج کل بھی بیت اللہ کو غسل دینے یا اس کو غلاف پہنانے کے لئے اوپر پاؤں رکھے جاتے ہیں مگر اسے بے ادبی یا ناجائز قرار نہیں دیا جاتا۔ ہاں جس بات کا جاننا ضروری ہے وہ یہ کہ قرآن و سنت کی روشنی میں نماز کے لئے ان پر کھڑے ہونا یا پاؤں رکھنے کو تو بے ادبی گناہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن اس کے دوسرے بعض پہلو ضرور قابل غور ہیں:

ایک یہ کہ اگر ایک آدمی نماز پڑھتے وقت اس اندیشے میں مبتلا رہتا ہے کہ میں شاید ان مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کا ارتکاب کر رہا ہوں شاید میں گناہ کر رہا ہوں تو ظاہر ہے یہ بات نماز سے اس کی توجہ ہٹانے کا باعث بنے گی۔ لہٰذا ایسے آدمی کے لئے ان جاء نمازوں کا استعمال جائز نہیں ہوگا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ ان تصویر کو دیکھ کر ان میں ہی گم ہو جاتا ہے یا ان کے معیار اور فن کے بارے میں سوچنے لگ جاتا ہے اور نماز سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے تو ایسے شخص کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ ان پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرے' اس سلسلے میں بخاری شریف کی یہ حدیث واضح دلیل ہے

عن انس قال كان قرام لعائشة سرت به جانب بيتها فقال لها النبي ﷺ اميطي عني فانه لا تزال تصاويره تعرض لي في صلاتي[1]

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ کے گھر کے ایک حصے میں پردہ تھا جس کے بارے میں رسول اکرم ﷺ نے ان سے کہا کہ اسے میرے آگے سے ہٹا دو کیوں کہ اس کی تصویریں میری نماز کے دوران میرے سامنے آجاتی ہیں۔" (فتح الباری' جلد اول' ص ۱۰۹۱)

اب ظاہر ہے کہ یہ جاندار جانوروں کی تصاویر نہیں تھیں بلکہ عام نقش و نگار تھے کیوں کہ جانداروں کی تصاویر تو نماز کے علاوہ بھی آپؐ نے گھروں میں لٹکانے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ ان تصویروں کو اس لئے آگے سے ہٹانے کا حکم فرمایا کہ نماز میں خلل ہو رہا تھا۔ اس لئے اگر نماز میں خلل واقع ہوتا ہو تو پھر مصلے ہوں یا پردے وہ پاؤں کے نیچے ہوں یا سامنے ہوں ان کا استعمال درست نہیں ہوگا۔

ڈاک کے ٹکٹوں پر ان تصویروں کو بھی بے حرمتی سے ادھر ادھر نہیں پھینکنا چاہئے اور حتی الامکان ان کا احترام کرنا چاہئے یا جلا کر ان کی راکھ دفن کر دینی چاہئے' زیادہ بہتر اور احتیاط کا تقاضا یہی ہے۔

اول وقت پر نماز

سوال: مانچسٹر سے محمد اسحاق صاحب لکھتے ہیں

(۱) صبح کی نماز گھر پر اول وقت میں پڑھنا بہتر ہے یا آخری وقت میں مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھنا بہتر ہے آج کل مانچسٹر میں صبح کی نماز کا اول وقت ۲۰۔۶ ہے

---

[1] فتح الباري ج ۱۱ كتاب اللباس باب كراهية الصلاة في التصاوير رقم الحديث ۵۹۵۹ ص ۵۹۲ و ج ۲ كتاب الصلاة باب ان صلي في ثوب مصلب او تصاوير رقم الحديث ۳۷۴۔

(۲)اول وقت نماز سے کتنی دیر پہلے تہجد کی نماز ختم کر دینی چاہیے۔

جواب: عبادات میں سب سے افضل عمل اول وقت نماز پڑھنے کا عمل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کہ اعمال میں افضل عمل کون سا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ:

"الصلوة علی وقتها"[1]

"نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا۔"

اس لئے اگر کسی مسجد میں نماز جان بوجھ کر اول وقت سے دیر کر کے پڑھی جاتی ہے تو پھر آپ اکیلے اول وقت میں پڑھ سکتے ہیں یہی بہتر ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذرؓ سے رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تمہارا طرز عمل اس وقت کیا ہوگا جب حکام نمازیں چھوڑ دیں گے یا وقت سے دیر کر کے پڑھیں گے ؟ تو حضرت ابوذر کہتے ہیں میں نے عرض کیا اللہ کے رسولؐ ایسے حالات میں آپ کا کیا حکم ہے؟ تو آپ نے فرمایا تم اپنی نماز وقت پر پڑھنا اور اگر پھر ان کے ساتھ جماعت مل جائے تو بھی پڑھ لینا تمہارے نفل ہو جائیں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ جب تو مسجد میں ہو اور نماز کھڑی ہوگئی تو پھر ان کے ساتھ پڑھ لینا۔ (مسلم۔ نسائی)

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز اول وقت میں پڑھنی چاہیے۔ ہاں اگر مسجد میں آکر دیر سے نماز پڑھنے والے امام کے ساتھ نماز باجماعت مل جائے تو پھر اس کے ساتھ بھی پڑھ لینی چاہیئے اس طرح نفل کا ثواب مل جائے گا یعنی اصل نماز فرض وہی ہوگی جو اول وقت میں پڑھی ہے لیکن مسجد میں پڑھنے سے مسجد کا اور جماعت کا ثواب الگ سے ملے گا اور اگر ایک آدمی جماعت کے انتظار سے پہلے جانا چاہتا ہے اور اس کے پاس وقت نہیں تو اسے اول وقت میں پڑھ لینی چاہیئے اور جماعت کا انتظار نہیں کرنا

[1] فتح الباری ج ۲ کتاب مواقیت الصلاۃ باب فضل الصلاۃ لوقتها ص ۱۹۰ رقم الحدیث ۵۲۷, ۲۷۸۲ ۔ ۵۹۷۰ ۔ ۷۵۳٤

چاہئے۔اس کے لئے یہی افضل ہے۔

(۲) جب صبح صادق طلوع ہو جائے تو نماز تہجد ختم کر دینی چاہئے۔ یہاں عام طور پر جب نماز کا وقت شروع ہو تا ہے تو وہی اول وقت ہو تا ہے اس سے پہلے نماز تہجد ختم کر دینی چاہئے لیکن طلوع فجر تک نماز تہجد جاری رکھ سکتا ہے۔

سوال: بلیک برن سے علی اصغر پوچھتے ہیں کہ یہاں بعض مسجدوں میں نماز فجر بہت تاخیر سے پڑھی جاتی ہے بعض اوقات سورج نکلنے سے آدھ گھنٹہ پہلے پڑھی جاتی ہے اور بعض دفعہ تو سورج نکلنے کے بالکل قریب ہو تا ہے۔اس وقت جماعت کھڑی ہوتی ہے۔کیا یہ جائز ہے؟ تفصیل سے روشنی ڈالئے۔

جواب: نماز اول وقت پر پڑھنا ہی افضل ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بہتر اعمال کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا:

الصلوٰة لوقتها[1]

کہ افضل اعمال میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نماز صحیح وقت پر پڑھی جائے اس لئے بغیر عذر کے نماز لیٹ کر کے پڑھنا جائز نہیں۔ برطانیہ میں موسم گرما کے کچھ مہینوں میں رات بہت مختصر ہوتی اور عشاء و فجر کے درمیان بہت تھوڑا وقفہ رہ جاتا ہے۔ایسی صورت میں اگر نماز فجر کی جماعت طلوع آفتاب سے ۳۰، ۴۰ منٹ پہلے کرائی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن ایسے حالات میں بھی اگر ایک شخص فجر کی نماز اول وقت میں پڑھ سکتا ہے تو اسے لیٹ جماعت کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ بالکل سورج نکلنے کے قریب نماز پڑھنا درست نہیں۔

مغرب اور عشاء کا وقت

سوال: ایک صاحب پوچھتے ہیں مغرب اور عشاء کی نمازوں کے اوقات کیا ہیں؟

---

[1] فتح الباری ج ۲ کتاب مواقیت الصلاة باب فضل الصلاة لوقتها رقم الحدیث ۵۲۷, ۲۷۸۲ - ۵۹۷۰ - ۷۵۳۴

جواب: (الف) مغرب کی نماز کا وقت سورج غروب ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے اور اول وقت میں نماز پڑھنا ہی افضل ہے اور مغرب کا وقت شفق کی سفیدی غائب ہونے تک رہتا ہے یعنی تقریباً ایک گھنٹہ ہوتا ہے جب کہ عشاء کی اذان کا وقت شفق کی سفیدی غائب ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے تو اس طرح گویا کہ مغرب کا وقت عشاء تک باقی رہتا ہے یعنی عشاء کا وقت شروع ہونے سے پہلے پہلے مغرب پڑھ سکتے ہیں مگر بطور احتیاط ۱۵ منٹ پہلے ختم کر لینی چاہئے۔

(ب) عشاء کی نماز کا وقت جو حدیث میں بیان کیا گیا ہے **واذا غاب الشفق**[1] جب شفق غائب ہو جائے تو عشاء کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ شفق سے عام طور پر مراد وہ روشنی لی جاتی ہے جو سورج غروب ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ یہ سرخی مائل روشنی کتنی دیر رہتی ہے اس سے عشاء کے وقت کا صحیح طور پر تعین کیا جاسکتا ہے۔ چاہے مغرب سے ایک گھنٹہ بعد ہو یا اس سے زائد۔ ویسے احتیاطاً مغرب و عشاء کے درمیان ڈیڑھ یا دو گھنٹے کا وقفہ رکھنا چاہئے تاکہ شفق اچھی طرح غائب ہو جائے۔

آدھی آستین والی قمیض میں نماز ہو جاتی ہے؟

سوال: میڈ سٹون جیل سے محمد سلم پوچھتے ہیں۔

آدھی آستین کی قمیص پہن کر نماز پڑھی یا پڑھائی جاسکتی ہے؟

جواب: آدھی آستین والی قمیص میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ کندھے ننگے نہ ہوں اور ستر ڈھانپے ہوئے ہو تو نماز ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے سنا آپؐ نے فرمایا:

من صلی فی ثوب واحد فیخالف بین طرفیه[2]

---

[1] مسلم مترجم ج ۱ کتاب المساجد باب اوقات الصلاۃ الخمس ص ۱٦٤

[2] فتح الباری ج۲ کتاب الصلاۃ باب اذا صلی فی ثوب الواحد رقم الحدیث ۳۵۹۔ ۳٦۰)

یعنی جس آدمی نے ایک کپڑے میں نماز پڑھی وہ اپنے دونوں کندھوں پر اس کپڑے کو ضرور ڈالے۔

اس لئے آدھی آستین والی قمیص میں نماز پڑھنے سے نماز میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ نماز کے لئے جتنا اچھا، خوبصورت اور مکمل لباس ہوگا وہ بہر حال بہتر ہے۔

نماز میں ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں؟

سوال: میڈسٹون جیل سے محمد اسلم تحریر کرتے ہیں ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں؟

جواب: نماز میں ہاتھ باندھنے کے طریقے روایات کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہیں۔ ایک حدیث جو وائل بن حجرؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپ نے دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینے پر ہاتھ باندھے۔ ہاتھ باندھنے کے سلسلے میں جتنی بھی احادیث وارد ہوئی ہیں ان سب میں سب سے زیادہ صحیح حدیث یہی ہے جس میں سینے پر ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے۔

جان بوجھ کر نماز قضا کرنا درست ہے؟

سوال: نیلسن سے افتخار احمد پوچھتے ہیں یہاں ہماری فیکٹری والوں نے باقاعدہ نماز کیلئے اجازت دی ہوئی ہے مگر اس کے باوجود کچھ لوگ نماز نہیں پڑھتے اور قضا کر دیتے ہیں۔ آپ کا ایسے لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو جان بوجھ کر نماز قضا کر دیتے ہیں۔

جواب: جان بوجھ کر بغیر کسی شرعی عذر کے نماز قضا کر دینا - یا تاخیر سے پڑھنا بہت بڑا گناہ ہے۔ حضور ﷺ نے تو بلا وجہ نماز لیٹ پڑھنے پر بھی سخت وعید فرمائی ہے اور کجا نماز

قضا کر دینا جو شخص جان بوجھ کر مسلسل نمازیں قضا کرتا ہے اسے اس بات کی فکر کرنی چاہیئے کہ کہیں وہ نمازی ہونے کے باوجود اللہ کی گرفت میں نہ آجائے۔ قرآن حکیم کی ان دو آیتوں کے ذیل میں بھی بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ یہاں نماز میں بلاوجہ تاخیر کرنے والے مراد ہیں۔ پہلی آیت کے یہ الفاظ کہ

﴿وَإِذَا قَامُوْآ اِلَی الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى﴾

اور وہ نماز کے قیام میں بڑے سست ہیں۔

دوسری سورہ الماعون کی یہ آیت کہ

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ﴾ (الماعون: ٤)

اور ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔

اس لئے فیکٹری میں نماز کی وقت پر اجازت ہونے کے باوجود اسے لیٹ کر دینا یا قضا کر کے پڑھنا گناہ ہے اور ایک نمازی مسلمان گناہ کے ہر کام سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

سوال: ڈارٹ موروڈیون جیل سے ایم آئی خان تحریر کرتے ہیں

جیل میں کام کے اوقات کچھ ایسے ہیں کہ کچھ نمازیں قضا ہو جاتی ہیں اور قضا نماز پڑھنا پڑتی ہے۔ قضا نماز میں سنت پڑھی جاتی ہیں کہ نہیں؟

جواب: نماز کسی شدید بیماری یا مجبوری کے بغیر قضا کرنا درست نہیں ہے اور بغیر کسی عذر یا مجبوری کے نماز قضا کرنے والا سخت گناہ گار ہوتا ہے۔ اصل نماز چونکہ فرض ہے اس لئے قضا نماز پڑھ لینا ہی کافی ہے۔ بعض فقہاء کے نزدیک نماز جو قضا ہوا سے جب ادا کیا جائے تو اسی حالت میں ادا کیا جائے جس میں قضا ہوئی تھی یعنی مکمل نماز پڑھی جائے گی۔ بہر حال صرف فرض پڑھ لئے جائیں تو نماز ادا ہو جائے گی۔

سوال: میں ایسی جگہ کام کرتا ہوں جہاں بعض اوقات میری نماز قضا ہو جاتی ہے جو بعد میں پڑھ لیتا ہوں لیکن نماز جمعہ بھی پڑھنا میرے لئے ناممکن ہے اس کی قضا کی کیا

شکل ہوگی؟ وضاحت کریں؟

جواب: نماز ایک ایسا فرض ہے جو کسی حالت میں بھی معاف نہیں ہو سکتا۔ عذر کی شکل میں تقدیم و تاخیر کی اجازت ہے یعنی دو نمازیں پڑھ لی جائیں یا بعد میں قضا پڑھ لے لیکن ترک ہرگز جائز نہیں۔ اسی طرح جمعہ کی نماز بغیر عذر کے چھوڑنے پر سخت وعید آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لینتهن اقوام عن ودعهم الجمعات او یختمن الله علی قلوبهم ثم لیکونن من الغافلین[1]

"لوگ جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہریں لگا دے گا پھر وہ غافل ہو جائیں گے۔

دوسری ابوداؤد کی حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من ترك ثلث جمع تهاونا بها طبع الله علی قلبه[2]

"جس نے سستی کی وجہ سے تین جمعے متواتر چھوڑ دیئے' اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دے گا۔"

آپ کوشش کریں کہ ایسی جگہ ملازمت مل جائے جہاں آپ کو جمعہ پڑھنے کی اجازت ہو یا ڈیوٹی کے اوقات ایسے ہوں کہ آپ کی نماز جمعہ ضائع نہ ہو جب تک آپ کو متبادل کام نہیں ملتا اس وقت تک مجبوری کی وجہ سے آپ جمعہ کی بجائے نماز ظہر پڑھ لیا کریں لیکن متبادل کام کیلئے آپ کوشش جاری رکھیں۔

سجدہ سہو کا سنت طریقہ

سوال: بریڈفورڈ سے محمد سلیم کامل پوری دریافت کرتے ہیں سجدہ سہو کا صحیح سنت

---

1. مسلم مترجم جلد اول کتاب الجمعة ص ۳۲۳
2. سنن أبی داود ج ۱ کتاب الصلاة باب التشدید فی ترك الجمعة ص ۱۵۸

سے ثابت طریقہ تحریر فرمائیں۔ کیا سجدہ سہو کرتے ہوئے ایک طرف سلام پھیرنا کتاب و سنت سے ثابت ہے؟

جواب: نماز میں بھول جانے کی وجہ سے سجدہ سہو لازم آتا ہے۔ مختلف احادیث کی روشنی میں اس کے متعدد طریقے اور اس بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں جن میں بعض مشہور اقوال درج ذیل ہیں

(۱) سجدہ سہو سلام پھیرنے کے بعد کیا جائے گا۔

(۲) سجدہ سہو ہر حال میں سلام پھیرنے سے پہلے کیا جائے۔

(۳) اگر نماز میں کمی کی وجہ سے سجدہ لازم آیا تو سلام سے پہلے کرنا ہوگا اور اگر زیادتی کی وجہ سے ہے تو پھر سلام کے بعد سجدہ سہو کیا جائے گا۔

(۴) جن نمازوں میں رسول اکرم ﷺ نے سلام پھیرنے سے پہلے سجدہ کیا ان میں پہلے کیا جائے اور جن میں آپؐ نے بعد میں کیا ان نمازوں میں بعد میں کیا جائے گا۔

ان کے علاوہ بھی کچھ اقوال نقل کئے گئے ہیں، لیکن مشہور یہ چار اقوال ہیں۔ ان میں بھی زیادہ مشہور اور معمول یہ دو طریقے ہیں یعنی ایک سلام سے پہلے اور دوسرا سلام کے بعد سجدہ سہو کرنے کا۔

جو لوگ سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کرنے کے قائل ہیں ان میں حضرت علیؓ ابن ابی طالب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ عمار بن یاسرؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ کے نام آتے ہیں۔ ائمہ اربعہ میں امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی قول منقول ہے۔

اس قول کے قائلین کی دلیل حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے جس میں ذوالیدین کے حوالے سے آپ کے نماز میں بھولنے کا ذکر ہے اور اس طویل حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کیا۔

دوسرا جو مشہور اور معمول طریقہ ہے وہ سلام پھیرنے سے قبل سجدہ سہو کرنا

ہے۔ اس قول کے قائلین میں حضرت ابو سعید خدریؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ عبداللہ بن زبیرؓ اور بعض دوسرے صحابہؓ کے علاوہ امام شافعیؒ بھی شامل ہیں۔ ان کی دلیل حضرت ابو سعید خدریؓ کی وہ حدیث ہے جس میں ہے کہ تم میں سے جب کوئی یہ بھول جائے کہ اس نے تین رکعت پڑھی ہیں یا چار تو جس کا اسے یقین ہے اس پر بنیاد رکھ کر سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کرے۔ متعدد دوسری احادیث بھی اس کی تائید کرتی ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں طریقے درست اور صحیح ہیں اور احادیث دونوں کی تائید کرتی ہیں۔

اب جہاں تک ایک طرف سلام پھیرنے کا تعلق ہے تو اس بارے میں سجدہ سہو کے سلسلے میں کوئی حدیث ہمارے علم میں نہیں ہے۔ جو حضرات سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کرنے کے قائل ہیں' وہ جس حدیث سے استدلال کرتے ہیں اس میں بھی ایک طرف سلام پھیرنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں اس طرح الفاظ آئے ہیں کہ:

فتقدم فصلی ما ترك ثم سلم ثم كبر و سجد مثل سجوده او اطول ثم رفع راسه و كبر ثم كبر و سجد مثل سجوده او اطول ثم رفع راسه و كبر فربما سالوه ثم سلم[1]

"جس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جب بتایا گیا کہ آپ نے دو رکعت کے بعد سلام پھیر دیا ہے تو آپ آگے بڑھے بقایا رکعت پڑھیں پھر سلام پھیر دیا اس کے بعد دو سجدے کئے۔"

اب اس میں ایک سلام پھیرنے کا کوئی ذکر نہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ مذکورہ بالا سجدہ سہو کے دونوں طریقے صحیح ہیں۔ ہم دوسرے طریقے کو بہتر و افضل اس لئے

[1] مشکوۃ کتاب الصلاۃ باب السہو الفصل الاول (۱۰۱۷)

سمجھتے ہیں کہ اس کی تائید میں زیادہ احادیث مروی ہیں۔

سجدہ سہو کس طرح کیا جاتا ہے؟

سوال: ڈارٹ مورڈیون جیل سے ایم آئی خان صاحب تحریر کرتے ہیں۔

سجدہ سہو کس طرح کیا جاتا ہے؟ نماز پڑھنے کے دوران اگر شبہ ہو جائے کہ میں نے چار کی جگہ پانچ رکعت پڑھی ہیں یا چار کی جگہ تین پڑھی ہیں یا کوئی چیز نماز میں رہ گئی ہے یا زیادہ پڑھ لی ہے (جس کا صرف شک ہے یقین نہیں) ایسی صورت میں سجدہ سہو واجب ہے یا نہیں؟

جواب: سہو کے معنی ہیں بھول جانا۔ یعنی نماز میں بھول کر کوئی کمی یا زیادتی ہو جائے تو اس کا ازالہ سجدہ سہو کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ رکعات کے بارے میں شبہ ہو جائے کہ کتنی پڑھی ہیں تو ایسی صورت میں سجدہ سہو ضروری ہے۔ مثلاً اگر یہ شک ہے کہ تین پڑھی ہیں یا چار تو ایک رکعت مزید پڑھ کر سجدہ سہو کرلے۔ اس سے یا تو اس کی چار پوری ہو جائیں گی اور یا ایک زیادہ یعنی پانچ ہو جائیں گی۔ دونوں صورتوں میں سجدہ سہو کر لینا کافی ہے۔ سجدہ سہو کرنے کی صحیح اور بہتر شکل یہ ہے کہ آخری تشہد میں التحیات درود شریف اور دعا پڑھنے کے بعد سلام پھیرنے سے پہلے دو زائد سجدے کرے جس طرح کہ عام رکعات میں دو سجدے کئے جاتے ہیں اور پھر مزید کچھ پڑھے بغیر سلام پھیر دے۔

سوال: سری نماز میں اگر جہری قرأت ہو تو سجدہ سہو لازم ہو گا؟

جواب: سری نماز میں جہری قرأت کے بارے میں ایک سوال کا جواب ”صراط مستقیم“ میں شائع ہوا تھا جس پر جامعہ ابی بکر الصدیق کراچی کے مدرس مولانا شبیر احمد نورانی کا درج ذیل مراسلہ وصول ہوا:

"پچھلے دنوں ساتویں سال کے شمارہ نمبر ۱۰ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کے صفحہ نمبر ۳۶ کالم نمبر ۲ میں آپ کے قلم سے یہ فتویٰ درج ہے:

(۵) سری نماز میں کسی نے اگر جہری قرات کی تو سجدہ سہو واجب ہوگا' الخ

یہ فتویٰ دیکھنے سے مجھے تعجب ہوا جب تحقیق کی تو اس تعجب میں مزید اضافہ ہو گیا کہ یہ فتویٰ خلاف حدیث نظر آیا۔ اپنی معلومات آپ کی خدمت میں پیش کیے دیتا ہوں اگر ان کو صحیح سمجھیں تو شائع کر دیں اور اگر آپ کی تحقیق سے مختلف ہوں تو بذریعہ خط اطلاع کر دیں تا کہ اطمینان ہو سکے۔

باب القراة فی الظهر۔

عن ابی قتادة قال کان النبیﷺ یقراء فی الرکعتین الاولیین من صلوة الظهر ...... ویسمع الایة احیانا۔[1]

و فی حدیث آخر۔ "کنا نصلی خلف النبیﷺ الظهر فتسمع منه الایة بعد الایة من سورة اللقمان و الذاریات۔[2]

وقال ایضاً "واستدل به علی جواز الجهر فی السریة و انه لا سجود سهو من فعل ذالك۔[3]

(شبیر احمد نورانی' کراچی)

میں نورانی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی تحقیق سے مستفید فرمایا۔ زیر بحث مسئلے میں ان کے موقف کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن میں ذکر ہوا ہے کہ نبی کریم ﷺ ظہر کی پہلی دو رکعت میں بعض اوقات قرأت میں اتنا جہر کرتے کہ صحابہ کرامؓ آپ کی آواز سن لیتے لیکن اس میں ہرگز صراحت نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ سری نماز میں یہ جہر بھول کر کرتے تھے یا سری نماز میں آپ نے کبھی بھول کر اونچی آواز سے

---

[1] فتح الباری ج ۲ کتاب الأذان باب القراءة فی الظهر رقم الحدیث ۷۵۹

[2] فتح الباری ج ۲ ص ۲٤٥

[3] ایضا

قرأت کرلی ہو اور پھر سجدہ سہو نہ کیا ہو۔ صحابہ کرامؓ جو بعض اوقات آیات کی آواز سن لیتے تو یہ آپ کا قصداً جہر نہیں ہوتا تھا بلکہ قرأت کے دوران جو خشیت اور رقت آپ پر طاری ہوتی اس کی وجہ سے یہ آواز سنائی دیتی اور اس پر سجدہ سہو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے ان الفاظ کے ساتھ اس مذکورہ مقام پر اس امر کی طرف اشارہ بھی کردیا ہے۔ غیر قصد للاستغراق فی التدبر

اور پھر احوط بھی یہی ہے کہ سری نماز میں بھول کر قرات جہری کرنے پر سجدہ سہو کرلیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

سنن موکدہ کی حیثیت کیا ہے؟

سوال: بریڈفورڈ سے سلیم خاں لکھتے ہیں:

تارک سنت موکدہ (سنت موکدہ کو چھوڑنے والا یا بسبب غفلت ادا نہ کرنے والا) گناہ کا مرتکب ہوگا یا نہیں؟

مثال کے طور پر فرض نمازوں کے ساتھ ہم جو سنتیں (موکدہ) پڑھتے ہیں۔ اگر صرف فرض پڑھے جائیں اور سنتوں کو چھوڑدیں تو کیا ایسا اقدام باعث گناہ ہوگا یا نہیں؟

جواب: صحیح احادیث میں سنن ونوافل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور خاص طور پر سنن موکدہ کی نبی کریم ﷺ نے بہت زیادہ ترغیب بھی دلائی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل احادیث خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

عن عائشة رضى الله عنها قالت كان النبى ﷺ يصلى قبل الظهر اربعا و بعدها ركعتين و بعد المغرب ثنتين و بعد العشاء ركعتين و قبل الفجر ركعتين[1]

---

[1] ابوداؤد کتاب الصلاۃ باب تفریع ابواب التطوع (۱۲۵۱) مسلم كتاب صلاة المسافرين باب جواز النافلة قائما و قاعدا (۱۰۵ ـ ۷۳۰)

"حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ ظہر سے پہلے چار اور بعد میں دو رکعت پڑھتے اور مغرب کے بعد دو عشاء کے بعد دو اور فجر سے پہلے دو رکعت پڑھتے تھے۔"

ایک دوسری حدیث میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ نے ان مذکورہ بارہ رکعات کے بارے میں فرمایا کہ جس نے ان کی پابندی کی اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا۔

حضرت ام حبیبہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا جس شخص نے فرضوں کے علاوہ بارہ رکعت پڑھیں اللہ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا۔

مسلم شریف کی ایک اور روایت ہے کہ جس نے فجر کی دو رکعت پڑھیں تو یہ اس کے لئے دنیا اور اس میں جو کچھ ہے ان سب سے بہتر ہے۔

اس کے علاوہ مختلف نمازوں کے ساتھ سنن ونوافل کی فضیلت کا الگ ذکر بھی احادیث میں آتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ان سنن راتبہ کی حیثیت کیا ہے اور کیا انہیں چھوڑنے والا گناہ کا مرتکب ہوگا؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بڑی فضیلت اور اجر کے باوجود یہ سنتیں فرض اور واجب بہر حال نہیں ہیں اس لئے ان کے ترک کرنے پر وہ گناہ ہرگز لازم نہیں آتے جیسے فرض یا واجب کے ترک کرنے سے آتا ہے۔

اس مسئلے کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنے اور سمجھانے کے لئے ہم اسے تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ عذر یا بغیر عذر کے ان سنتوں کا کبھی کبھی ترک کر دینا۔

۲۔ عذر یا بغیر عذر کے ان سنتوں کو اکثر وبیشتر یا ہمیشہ ترک کر دینا۔

۳۔ ان سنتوں کو حقیر یا معمولی سمجھ کر ترک کر دینا۔

(۱) جہاں تک پہلی شرط کا تعلق ہے یعنی کبھی کسی مجبوری جیسے وقت کی قلت وغیرہ یا محض غفلت کی بنا پر ان سنتوں کا ترک کر دینا بلاشبہ ایسا شخص ایک افضل عمل سے محروم تو ضرور ہو گا مگر اسے گناہ گار قرار دینے کے لئے ہمارے پاس کوئی شرعی دلیل نہیں ہے کیونکہ نمازیں پانچ ہیں۔ ان پانچ نمازوں سے مراد فرض ہیں نہ کہ سنن و نوافل۔

جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ نجد کا ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور پوچھا: اللہ نے مجھ پر کتنی نمازیں فرض کی ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا پانچ۔ اس نے عرض کیا کہ هل علي غيرها؟[1] کہ کیا ان کے علاوہ بھی مجھ پر کچھ ہے؟ تو آپ نے فرمایا: لا الا ان تطوع کہ نہیں الا یہ کہ تو اپنی مرضی سے سنتیں یا نفل پڑھے۔ ظاہر ہے اگر سنتیں لازمی ہوتیں اور ان کے ترک سے گناہ لازم آتا تو آپ اس موقع پر اس کی ضرور وضاحت فرماتے۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جب حضرت معاذ کو یمن بھیجا تو انہیں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی بتایا کہ ان الله افترض عليهم خمس صلوت في اليوم والليلة[2] کہ اللہ نے ان لوگوں پر (یعنی مسلمان ہونے والوں پر) دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ یہاں بھی سنن و نوافل کا ذکر نہیں۔

اور حضرت معاذؓ کا یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری ایام کا ہے۔

یہ مذکورہ دونوں حدیثیں بخاری و مسلم میں ہیں۔ ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سنن کے تارک کو گناہ گار یا معصیت کا مرتکب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور اسے گناہ کا مرتکب ثابت کرنے کے لئے کوئی واضح دلیل ہمارے سامنے نہیں ہے۔

---

[1] سنن ابو داؤد مترجم ج ۱ کتاب الصلاۃ باب فرض الصلاۃ ص ۱۸۹ رقم الحدیث ۳۹۰

[2] ابن خزيمة كتاب الصلوة ج ۱ باب فرض الصلاة الخمس و الدليل علي ان لا فرض من الصلاة الا الخمس ص ۱۵۷ ابوداؤد ج ۱ كتاب الصلاة ص ۶۲

مولانا اشرف علی تھانوی نے "بہشتی زیور" میں لکھا ہے کہ قضا فقط فرض نمازوں اور وتر کی پڑھی جاتی ہے 'سنتوں کی قضا نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی سنتوں کا ترک گناہ نہیں ورنہ ان کی قضا لازم ہوتی۔

ہمارے ہاں بعض لوگوں میں یہ عجیب روایت چل نکلی ہے کہ وہ سنن و نوافل کی پابندی بھی فرض نماز کی طرح کرتے اور نفلوں کی مختلف نمازوں کے ساتھ تعداد مقرر کر کے ان کو ہر حال میں ادا کرتے ہیں اور پھر بیٹھ کر پڑھتے اور انہیں چھوڑنا گناہ خیال کرتے ہیں۔

حالانکہ نوافل کے بارے میں تو خاص طور پر یہ چیز بالکل بے اصل اور غیر ثابت ہے پھر اس کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ نماز کی شکل اور اس کی صحیح ادائیگی کے بجائے تعداد رکعات پوری کرنے کے چکر میں رہتے ہیں اور اطمینان و سکون سے پڑھنے کی بجائے جلدی جلدی رکعات پوری کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ مثلاً عشاء کی نماز کی برصغیر کے لوگوں نے ۱۷ رکعات اس طرح مقرر کی ہوئی ہیں جس طرح یہ ۱۷ کا عدد فرض ہے اور پھر جلدی جلدی اس تعداد سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسرا نقصان یہ بھی ہے کہ بچے یا نئے نمازی تو ۱۷ کا نام سن کر ہی گھبرا جاتے ہیں۔ اس لئے بہتر و افضل یہی ہے کہ فرائض کے بعد ان سنن و نوافل کو ان کے مقام کے لحاظ سے ہی ادا کیا جائے۔

(۲) دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو عذر یا بغیر عذر کے ان سنتوں کو اکثر و بیشتر ترک کر دیتے ہیں اور بہت کم ادا کرتے ہیں۔ قرآن و حدیث کی کوئی ایسی دلیل تو ہمارے پاس نہیں کہ ان لوگوں کو ہم گناہ کا مرتکب قرار دے سکیں لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ یہ لوگ خیر کثیر اور اجر جزیل سے محروم رہتے ہیں اور یہ محرومی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ خاص طور پر نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں جس میں آپ نے فرمایا کہ

فرض نماز کے ادا کرنے والے کے فرض میں جو نقص اور کمی رہ جاتی ہے' اسے سنتوں اور نفلوں کے ذریعے پورا کیا جاتا ہے۔

اور ہم میں سے کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس کے فرض کامل اور مکمل ہیں اور نقص و کمی سے خالی ہیں؟ ہم میں سے ہر ایک اس کمی کو پورا کرنے کا محتاج ہے اور اگر وہ سنن ونوافل سے بھی محروم ہو گیا تو پھر اس کی یہ کمی کیسے پوری ہو گی؟ اس لئے بہتر اور افضل یہی ہے کہ ان سنن کا اہتمام کیا جائے تاکہ یہ نقصان اسے گناہ کے قریب نہ لے جائے۔

(۳) جس طرح بعض لوگوں نے نفلوں کو فرض کا درجہ دے رکھا ہے اور وہ نفل کی پابندی بھی فرض کی طرح کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک تیسری قسم ان لوگوں کی بھی ہے جو ان سنن کو حقیر اور معمولی سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کیا ہوا سنتیں ہی تو تھیں۔ ان کی کیا حیثیت ہے؟ سنت کی تحقیر واستخفاف جرم ہے اور ایسا شخص یقیناً گناہ کا مرتکب ہو گا بلکہ سنت کو خاطر میں نہ لانے والا یا اس کا مذاق اڑانے والا کفر تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ اسلئے جو شخص نماز کی ان سنتوں کو حقیر و معمولی سمجھ کر ان کی ناقدری کرتا ہے اور انہیں ترک کر دیتا ہے ایسا شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی ناراضگی مول لیتا ہے۔ اس حد تک جانے سے احتراز کرنا چاہئے اور معصیت سے بچنا چاہئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ فرض نمازیں پانچ ہی ہیں وتر کے وجوب کے بارے میں اختلاف ہے بعض نے واجب کہا بعض نے سنت کہا لیکن وتر کے بارے میں احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس کی پابندی کی جائے۔ جہاں تک سنتوں کا تعلق ہے تو ترک کی تینوں اشکال کی شرعی حیثیت اپنے علم کے مطابق ہم نے تحریر کر دی ہے۔

سنت غیر موکدہ میں پہلے قعدہ میں التحیات کے علاوہ بھی کچھ پڑھ سکتے ہیں؟

سوال: لیڈز سے محمد یٰسین لکھتے ہیں (الف) سنت غیر موکدہ میں چار رکعت کی نیت

باندھے تو جب دو رکعت پڑھ کر بیٹھے اس وقت التحیات کے بعد درود شریف اور دعا بھی پڑھے پھر بغیر سلام پھیرے اٹھ کھڑا ہو۔ پھر تیسری رکعت پھر ثناء پڑھ کر تعوذ تسمیہ اور الحمد سے شروع کرے اور چاہے صرف التحیات پڑھ کر اٹھ کھڑا ہو اور تیسری رکعت پر تسمیہ تحمید سے شروع کرے اس مسئلے پر پوری وضاحت کے ساتھ جواب دیں۔

جواب: احادیث میں جن غیر مؤکدہ سنتوں کا ذکر آیا ہے ان میں عصر سے پہلے چار رکعت' مغرب سے پہلے دو رکعت اور عشاء سے پہلے دو رکعت کا ذکر ہے۔

ابوداؤد کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

رحم الله امراء صلى قبل العصر اربعا[1]

اس آدمی پر اللہ کی رحمت ہو جس نے عصر سے پہلے چار رکعت پڑھیں۔

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ

صلوا قبل المغرب[2]

مغرب سے پہلے نماز پڑھو۔

ابن حبان کی روایت ہے کہ

ان النبی ﷺ صلى قبل المغرب ركعتين[3]

کہ نبی ﷺ نے مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھیں۔

---

[1] سنن ابو داود مترجم جلد ۱ ابواب التطوع باب الصلاة قبل العصر ص ۵۱۸ رقم الحديث ۱۲۵۷

[2] (سنن أبي داود مترجم ج ۱ كتاب الصلاة باب الصلاة قبل المغرب ص ۵۲۱ رقم الحديث ۱۲۶۷)

[3] ابن حبان ـ موارد الظمآن الي زوائد ابن حبان باب الصلاة قبل المغرب (۶۱۷) ما من صلاة مفروضة موارد الظمآن باب الصلاة قبل الصلوات و بعدها(۶۱۵).

عشاء کی دو رکعت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کی روایت سے استدلال کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے

بین کل اذانین صلوة[1]

کہ دو اذانوں (یعنی اذان و تکبیر) کے درمیان نماز ہے

اور ابن حبان میں عبداللہ بن زبیرؓ کی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ما من صلوة فریضة الا و بین یدیھا رکعتان کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر فرض نماز سے پہلے دو رکعت ہیں۔

ان دو احادیث سے مذکورہ بالا غیر مؤکدہ سنتیں ثابت ہوتی ہیں۔

عبداللہ بن مغفلؓ کی حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ لمن شاء یعنی جو چاہے یہ رکعت پڑھ سکتا ہے جس کا مطلب ہے پڑھنا بھی ضروری نہیں ہے۔

جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق ہے تو وہ پوری طرح واضح نہیں ہے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں تو شاید آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ چار رکعات والی نماز میں دوسری رکعت یعنی پہلے تشہد کے بعد اٹھ کر جب تیسری رکعت شروع کرے تو اعوذ اور بسم اللہ پڑھے یا نہ پڑھے اور پہلے تشہد میں صرف التحیات پڑھے یا درود شریف اور دعا بھی۔

نماز شروع کرنے کے بعد یعنی دعائے استفتاح سبحانک اللہ وغیرہ کے بعد اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھنا تو احادیث سے ثابت ہے لیکن اس کے بعد دوسری تیسری یا چوتھی رکعت شروع کرنے سے پہلے تعوذ اور تسمیہ (اعوذ باللہ اور بسم اللہ) پڑھنے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جو لوگ اعوذ باللہ پڑھنے کے قائل ہیں ان کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے کہ ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ﴾ کہ جب قرآن پڑھو تو اس سے پہلے اعوذ پڑھا کرو۔ اب جب سورہ فاتحہ قرآن میں سے ہے تو جب بھی یہ پڑھی جائے گی اس کے ساتھ اعوذ پڑھی جائے گی۔ اسی طرح بسم اللہ کا ذکر بھی آتا ہے۔

---

[1] فتح الباری ج ۲ کتاب الاذان باب کم بین الاذان و الاقامة رقم الحدیث ۶۲۴

لیکن جو لوگ پہلی رکعت کے علاوہ دوسری رکعات میں الحمد شریف کے ساتھ کچھ اور پڑھنے کے قائل نہیں ان کی دلیل حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں ہے کہ

کان رسول اللہ ﷺ اذا نھض فی الرکعۃ الثانیۃ افتتح القراۃ با الحمد للہ رب العالمین ولم یسکت[1]

کہ رسول اللہ ﷺ جب دوسری رکعت کے لئے اٹھتے تو آپ قرأت سورہ فاتحہ سے شروع کرتے اور سکوت نہ فرماتے' یعنی اس سے پہلے کوئی چیز خاموشی سے نہ پڑھتے۔

دونوں طرف کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد اس مسئلے میں دونوں طرح سے جواز معلوم ہوتا ہے یعنی پڑھ بھی سکتے ہیں اور نہ بھی پڑھیں تو جائز ہے بلکہ امام شوکانیؒ نے نہ پڑھنے کو افضل واحوط قرار دیا ہے کیونکہ حدیث میں یہ پہلی رکعت کے علاوہ کسی جگہ پڑھنا ثابت نہیں ہوتا۔

جماعت میں مل کر کھڑے ہونا ضروری ہے؟

سوال: کارڈف سے علی اکبر تحریر کرتے ہیں۔ کچھ عرب بھائیوں کو دیکھا گیا کہ وہ نماز کی صف میں جب کھڑے ہوتے ہیں تو پاؤں بہت ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ کچھ مسجدوں میں دیکھا ہے کہ لوگ فاصلے پر بھی کھڑے ہوتے ہیں۔ صحیح مسئلہ کیا ہے اور جماعت کے اندر صف بندی کے وقت کیا پاؤں کے ساتھ پاؤں ملانا ضروری ہے ؟

جواب: نماز دین اسلام کا ایک اہم ستون ہے جہاں اس کی ادا ▯ ضروری ہے وہاں صحیح طریقے سے ادا کرنا اور زیادہ اہم ہے۔ ایک شخص اگر نماز کے لئے وضو کرتا ہے

[1] مسلم مترجم ج ۱ کتاب المساجد باب ما یقال بین تکبیرۃ الاحرام و القراۃ ۱۵٤

وقت بھی دیتا ہے اور دوسرے تکلفات بھی کرتا ہے لیکن نماز حضور ﷺ کے طریقے کے مطابق ادا نہیں کرتا تو ایسے شخص کی ساری محنت رائیگاں جاسکتی ہے۔ کیونکہ نماز وہی قبول ہوگی جو حضور ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ادا ہوگی۔

آپ کا ارشاد ہے:

صلوا كما رائيتمونى اصلى [۱]۔

"کہ نماز اس طرح پڑھو جیسے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔"

ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

ارجع فصل انك لم تصل [۲]۔

"واپس جا کر نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی۔"

اس نے واپس جا کر دوبارہ نماز پڑھی' جب دوبارہ خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے پھر نماز پڑھنے کے لئے فرمایا۔

تیسری بار جب وہ نماز پڑھ کر آیا تو کہنے لگا: اللہ کے رسول مجھے تو یہی طریقہ آتا ہے' آپ میری راہ نمائی فرمائیں۔

تو پھر آپؐ نے اسے آرام سے رکوع و سجود کرنے اور تمام ارکان و سنن نماز کو اطمینان سے ادا کرنے کا طریقہ بتایا کیونکہ وہ آدمی تیز تیز نماز پڑھ رہا تھا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جو آدمی نماز تسلی سے ادا نہیں کرتا اور رکوع' قیام' سجدہ اور تشہد میں سنت نبوی کی پابندی نہیں کرتا اور تیز تیز ٹکریں مار کر چلا جاتا ہے تو نماز اس کے لئے بددعا کرتی ہے اور کہتی ہے۔

---

[۱] فتح البارى ج ۲ كتاب الاذان المسافر اذا كانوا جماعة و كذالك بعرفة و جمع رقم الحديث ۶۳۱

[۲] فتح البارى ج ۲ كتاب الاذان باب امر النبى ﷺ الذى لا يتم ركوعه بالاعادة رقم الحديث ۷۹۳۔

ضيعك الله كما ضيعتني[1]

جس طرح تو نے مجھے خراب کیا ہے اللہ تیرا استیاناس کر دے۔

صف کے اندر کھڑا ہونا اور جماعت کی صورت میں صفیں برابر اور سیدھی کھڑی کرنا ان اہم کاموں میں سے ہے جن میں سستی نماز کے اجر و ثواب کو ضائع کر سکتی ہے۔ صف بندی میں مل کر کھڑے ہونا اور صفوں کو برابر کرنے کے سلسلے میں درج ذیل احادیث خاص طور پر قابل ذکر ہیں

۱۔عن انس قال قال رسول الله ﷺ سووا صفوفكم فان تسوية الصف من تمام الصلوة[2]

حضرت انسؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صفیں سیدھی اور برابر کھڑی کیا کرو اس لئے کہ صفوں کا درست کرنا نماز کو مکمل کرتا ہے (صحیح بخاری)

۲۔عن ابی امام قال قال رسول الله ﷺ سووا صفوفكم وحاذوا بين مناكبكم ولينوا في ايدى اخوانكم و سدوا الخلال فان الشيطان يدخل فيما بينكم بمنزلة الحذف۔[3]

حضرت ابی امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صفیں سیدھی کیا کرو اور کندھے ایک دوسرے کے برابر رکھو اور اپنے مسلم بھائیوں کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ اور صفوں کے درمیان خالی جگہ پر کیا کرو کیونکہ شیطان ان جگہوں سے بھیڑ کے بچے کی طرح تمہارے درمیان داخل ہوتا ہے۔

۳۔ و عن جابر بن سمرة قال خرج علينا رسول الله ﷺ فقال الا تصفون كما تصف الملائكة عند ربها قال يتمون الصف الاول يتواصفون في

---

[1] طبرانی اوسط (٣١١٨) ٤/٨٦ مجمع الزوائد ١/٣٠٧ ترغیب و ترهيب ١/٢٥٨

[2] فتح الباری ج ٢ كتاب الاذان باب اقامة الصف من تمام الصلاة ص ٤٤٤ رقم الحديث ٧٢٣

[3] مسند امام احمد ٥/٢٦٢

الصف[1]

حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اس طرح صفیں کیوں نہیں بناتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے پاس بناتے ہیں وہ پہلے صف اول مکمل کرتے ہیں اور پھر بالکل ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑے ہوتے ہیں۔

۴۔ ایک اور روایت میں ہے کہ

ان النبی ﷺ رای رجلا یصلی خلف الصف فوقف حتی انصرف الرجل فقال استقبل صلاتك فلا صلوۃ لمنفرد خلف الصف[2]

کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جو صف سے الگ اکیلے نماز پڑھ رہا ہے جب وہ فارغ ہوا تو آپؐ نے فرمایا تم قبلہ رو ہو کر نماز پڑھو کیونکہ صف چھوڑ کر اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی۔

ان تمام احادیث سے نماز میں صفوں کی درستی' مل کر کھڑے ہونے اور کندھوں سے کندھے ملا کر اور برابر کر کے کھڑے ہونے کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ صفوں کو ٹیڑھا رکھنا دور دور کھڑے ہونا' درمیان میں خالی جگہ چھوڑنے کے بارے میں جو وعید آئی ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایسی نمازیں صحیح نہیں ہوں گی جن میں ان باتوں کی رعایت نہیں کی جاتی جن کا ذکر ان احادیث میں آیا ہے

بد قسمتی اور افسوس کا مقام ہے کہ آج کل اکثر مساجد میں صفوں کو برابر کرنے اور مل کر کھڑے ہونے کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ بعض اوقات جماعت میں نمازی ایک دوسرے سے ہٹ کر کھڑے ہوتے ہیں کہ درمیان میں ایک آدمی کے کھڑا ہونے کی گنجائش ہوتی ہے یہ طریقہ شیطان کو اپنے پاس آنے کی دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں علماء اور مسجد کے اماموں کا رویہ انتہائی افسوسناک ہے۔ وہ ہرگز اس

[1] مسلم ۴۳۰' ابن ماجه ج ۱ باب اقامة الصفوف رقم الحديث ۹۷۸۔

[2] سنن ابن ماجه للالبانی ج ۱ ابواب اقامة الصلاة باب صلاة الرجل خلف الصف وحده رقم الحديث ۹۸۹۔

کی پروا نہیں کرتے کہ صفوں کے ٹیڑھے پن سے کس قدر خسارہ اور نقصان ہے۔ حضور ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ:

”جو لوگ نماز میں صفوں کو ایک دوسرے سے دور رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کے درمیان بھی دوری ڈال دے گا“

اور آج یہ کیفیت مسلمانوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ مساجد کے ائمہ کرام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہونے کی تلقین کریں اور اس وقت تک جماعت کھڑی نہ کریں جب تک انہیں اطمینان نہ ہو جائے کہ صفیں برابر اور سیدھی ہیں اور نمازی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑے ہوئے ہیں اور درمیان میں خالی جگہ نہیں ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ کوئی اختلافی مسئلہ بھی نہیں ہے بلکہ ایک لحاظ سے متفق علیہ مسئلہ ہے کہ صفیں درست سیدھی اور برابر کھڑی کی جائیں۔ مگر کچھ جہلا نے اسے بھی اختلافی مسئلہ بنا لیا ہے اس لئے جب انہیں صفیں درست کرنے کے لئے کہا جاتا ہے تو بعض اوقات یہ جواب بھی دیا جاتا ہے کہ یہ تمہارا مسلک ہوگا ہمارے مولوی صاحب نے تو کبھی اس مسئلے میں ہمیں روکا ٹوکا نہیں اور نہ ہی صف بندی کے بارے میں کبھی اتنی اہمیت بیان کی ہے۔ اللہ تعالیٰ سنت نبوی کے مطابق نماز پڑھنے کی توفیق بخشے آمین۔

کیا نماز شکرانہ پڑھنی چاہیئے؟

سوال: محمد بشیر احمد برمنگھم سے دریافت کرتے ہیں کہ سجدہ شکر بجالانے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ ہمارے ہاں کبھی کوئی ٹیم کسی میچ میں کامیاب ہوتی ہے تو بعض کھلاڑی کھیل کے گراؤنڈ کے اندر اسی وقت سجدے میں پڑ جاتے ہیں۔ کیا یہ طریقہ درست ہے

؟یا باقاعدہ شکرانے کی نماز پڑھے؟

جواب: عام طور پر شکرانے کی نماز کا جو رواج ہے یا جسے لوگ نماز شکر کہتے ہیں' اس کا قرآن و سنت میں کوئی ذکر نہیں ہے اور ظاہر ہے جس نماز کی رکعات یا طریقے کے بارے میں سرورِ دو عالم ﷺ سے کوئی چیز منقول نہ ہو اسے اپنی رائے و قیاس سے بنالینا درست نہیں ہے اس لئے باقاعدہ نماز شکر کا تو شریعت میں کوئی ثبوت نہیں ہے ہاں البتہ کسی کامیابی یا خوشی کے موقع پر اللہ کے حضور سجدے میں گر کر شکر بجالانا ایک مشروع امر ہے اور اس کا ثبوت نبی کریم ﷺ سے ملتا ہے۔

نسائی شریف میں حضرت ابو بکرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس جب کسی کامیابی کی یا مشکل آسان ہونے کی خبر آتی تو آپ اللہ کے حضور سجدہ شکر بجالاتے۔

اس حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ حضرت عائشہ کی گود میں سر رکھے اور آرام فرما رہے تھے کہ قاصد نے آکر آپ کو ایک لشکر کی دشمن پر فتح کی خبر سنائی آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر سجدے میں چلے گئے اور طویل سجدہ کیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابو جہل کا سر کاٹ کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں لائے تو اس وقت بھی آپ نے سجدہ شکر ادا کیا۔

اسی طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ کو جب یمامہ کی فتح کی خبر پہنچی تو انہوں نے بھی سجدہ شکر کیا۔

حضرت کعب بن مالک اور ان کے جو ساتھی غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے' ان کی توبہ جب قبول ہوئی تو اس خبر پر حضرت کعبؓ نے سجدہ شکر کیا تھا۔

ان دلائل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی اچھی نعمت جیسے مال' اولاد اور مکان وغیرہ حاصل ہونے پر سجدہ شکر ادا کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دشمنوں پر فتح' کسی مشکل کام میں کامیابی اور پریشانی سے نجات پر بھی شکرانے کا سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے

یہ سجدہ مستحب ہے۔

سجدہ شکر کا نماز کی طرح کوئی متعین طریقہ نہیں ہے۔ سجدہ تلاوت کی طرح اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں پڑ جائیں اور اللہ کی تعریف و تسبیح کریں۔ اس میں رفع الیدین' تشہد یا سلام وغیرہ کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نماز شکر کا تو کوئی ثبوت نہیں لیکن سجدہ شکر ثابت ہے۔ اس لئے اگر کوئی مسلمان کھلاڑی اپنی کامیابی پر گراؤنڈ میں سجدہ بجالاتا ہے تو نہ صرف یہ جائز ہے بلکہ ایک اچھی صفت ہے۔

نماز استخارہ حدیث سے ثابت ہے؟

سوال: قربان حسین لیڈز سے تحریر کرتے ہیں نماز استخارہ کا صحیح طریقہ کیا ہے اور اس کے ذریعے صحیح کام کے کرنے کے اشارے کس طرح ملتے ہیں؟ شریعت کی روشنی میں جواب شائع کریں۔

جواب: نماز استخارہ حدیث سے باقاعدہ ثابت ہے اور یہ نماز ممنوعہ اوقات کے علاوہ کسی وقت بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ اس کی دو رکعت ہیں۔ دوسری نمازوں کی طرح ہی یہ رکعت ادا کی جائے گی۔

بخاری شریف میں حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں

کان رسول اللہ ﷺ یعلمنا الاستخارہ فی الامور کلھا کما یعلمنا السورۃ من القرآن یقوم اذا ھم احدکم بالامر فلیرکع رکعتین من غیر الفریضۃ ثم لیقل: اللھم انی استخیرك بعلمك واستقدرك بقدرتك واسئالك من فضلك العظیم فانك تقدر ولا اقدر وتعلم ولا اعلم وانت علام الغیوب اللھم ان کنت تعلم ان ھذا الامر خیر لی فی دینی و معاشی وعاقبۃ امری فاقدرہ لی ویسرہ لی

ثم تبارك لي فيه وان كنت تعلم ان هذا الامر شر لي في ديني و معاشي و عاقبة امري فاصرفه عني واصرفني عنه واقدر لي الخير حيث كان ثم ارضني به[1]

یعنی رسول اکرم ﷺ ہمیں استخارہ کا طریقہ اس طرح سکھاتے جس طرح قرآن کی کسی سورت کی تعلیم دیتے اور آپ فرماتے جب تم میں سے کوئی کسی اہم کام کا ارادہ کرے تو دو رکعت نماز ادا کرے جو فرض نماز کے علاوہ ہوگی۔ پھر وہ یہ دعا پڑھے '(دعا کے الفاظ پہلے گزر چکے ہیں) جس کا ترجمہ یہ ہے:

"اے اللہ میں تیرے علم کی وجہ سے تجھ سے نیکی طلب کر رہا ہوں اور تیری قدرت کی وجہ سے تجھ سے طاقت کا سوال کرتا ہوں اور تیرے فضل عظیم کا خواستگار ہوں کیونکہ تو قدرت والا ہے' میں کمزور ہوں اور اس لئے کہ تو جاننے والا ہے میں بے خبر ہوں اور تو چھپے ہوئے معاملات کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔ اے اللہ اگر تیرے علم کے مطابق اس کام میں میرے لئے خود بھلائی ہو میرے دین کے لحاظ سے میری معیشت میں اور انجام کار کے طور پر تو پھر اس کام کو میرے لئے آسان کر دے اور مجھے اسے کرنے کی قدرت عطا کر اور وہ کام میرے لئے مبارک ہو۔ اور اگر تیرے علم میں اس کام کے کرنے سے میرے دین میری معیشت میں برائی ہے اور انجام کار اس میں شر ہے تو پھر مجھے اس کام سے دور رکھ اور اس کام کو مجھ سے دور کر دے اور جہاں بھی کوئی خیر و بھلائی ہے اسے میرے لئے پسند فرما دے اور اس کے کرنے کی مجھے توفیق عطا فرما دے۔"

اس دعا کے بعد اس کے سینے میں انشراح پیدا ہوگا اور دل و دماغ میں اس کام کے کرنے یا نہ کرنے کی رغبت پیدا ہوگی جس طرف غالب رجحان ہو اس پر اللہ کا نام لے کر اور اسی پر بھروسہ کرتے ہوئے عمل کر دے۔ دراصل یہ طبیعت میں اس دعا کے بعد ایک رجحان یا رغبت پیدا ہونے کا نام ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد کوئی خواب آتا ہے یا خاص اشارہ ہوتا ہے اس کا کوئی ثبوت و اصل نہیں ہے۔

---

[1] فتح الباري ج ١٢ كتاب الدعاء عند الاستخارة ص ٤٧٦ رقم الحديث ٦٣٨٢.

تحیۃ المسجد

"سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز اس سوال کا جواب دیتے ہیں"

سوال: تحیۃ المسجد کا مطلب کیا ہے اور اس کو کس طرح پڑھا جاتا ہے؟

جواب: مسجد میں داخل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی خاطر جو دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے اس کو تحیۃ المسجد کہتے ہیں۔ یہ نماز سنت ہے اور اس نماز کو عام ممنوعہ اوقات میں بھی پڑھ لیں کوئی حرج نہیں۔

اس کے پڑھنے کا طریقہ باقی نمازوں ہی کی طرح ہے جس میں ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ

"اس شخص کی نماز ہی نہیں جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی"

کیا پس ماندگان کی طرف سے متوفی کی فرض نمازوں کا کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے؟

سوال: مارڈن (سرے) سے محمد سعود الحق حقی تحریر کرتے ہیں:

دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح روزہ نہ رکھنے کی صورت میں کسی محتاج کو کھانا کھلا کر کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے۔ کیا اسی طرح اگر فرض نماز ادا نہ کر سکے تو کفارہ سے فرض نماز کی ادائیگی ہو سکتی ہے؟

مزید بر آں بوجہ علالت نماز وقت پر ادا نہ کر سکا اور نہ ہی قضا کی ادائیگی ہو سکی قبل از موت۔ ایسی صورت میں اگر نماز کا کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے تو کیا پس ماندگان کے ادا کرنے سے فرض کی ادائیگی مرحوم سے ہو سکتی ہے۔

جواب: دریافت طلب مسئلہ سے قبل روزوں کے کفارہ سے متعلق وضاحت کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ روزہ نہ رکھنے کی صورت میں کفارہ کا جو حکم ہے وہ خاص حالات پر ہے نہ کہ یہ عمومی حکم ہے کہ جو روزہ نہ رکھنا چاہے وہ کفارہ ادا کر دے۔ بلکہ اگر کوئی اس قدر بیمار یا کمزور ہے کہ اس کی صحت یابی اور تندرستی کی کوئی امید نہیں تو پھر کفارہ ادا کیا جا سکتا ہے ورنہ اگر کوئی مثلاً رمضان میں بیمار ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے کچھ روزے چھوٹ جاتے ہیں تو بعد میں اسے ان روزوں کی قضا کرنا پڑے گی۔

اس کے بعد نماز کے کفارہ سے متعلق جو مسئلہ دریافت کیا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ فرض نماز کا کوئی کفارہ نہیں بلکہ اگر نیند یا بھول کی وجہ سے کوئی نماز چھوٹ جائے تو جب بھی یاد آ جائے تو فوراً اس کی قضا کر لینی چاہئے اور اگر کوئی جان بوجھ کر نماز چھوڑ دے یا اتنی زیادہ نمازیں چھوٹ گئی ہوں کہ ان کا حساب اور گنتی مشکل ہے تو ان کا کفارہ صرف یہ ہے کہ وہ توبہ استغفار اور کثرت سے نوافل سے کام لے۔

باقی اس بیمار کی نمازوں کا کیا ہوگا جو ادا کئے بغیر وفات پا گیا ہو تو اس سلسلے میں یہ وضاحت ہے کہ نماز اور روزہ (جو مرحوم کی جانب سے بعض خاص حالات میں رکھا جاسکتا ہے) دونوں کے درمیان بنیادی طور پر بہت فرق ہے کہ روزے میں صبح سے شام تک کھانے پینے سے مکمل پرہیز کیا جاتا ہے گویا روزہ ایک طویل اور مسلسل کام ہے اور اس سلسلے میں نصوص بھی وارد ہوئی ہیں جب کہ نماز کے لئے کوئی نص نہیں۔ اسی طرح نماز کے ادا کرنے میں خصوصاً بیمار کے لئے کافی سہولتیں رکھی گئی ہیں کہ اگر کوئی کھڑا ہو کر نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے اور اس کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹے ہوئے اشاروں کے ذریعے نماز ادا کرلے۔ اگر وضو نہ کرسکتا ہو تو تیمّم کافی ہے۔

ان مذکورہ صورتوں میں آدمی ہوش و حواس کے قائم رہنے تک کسی نہ کسی پر عمل کرسکتا ہے۔ ہاں اگر وہ کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو کہ اپنے ہوش و حواس پر بھی قابو نہیں جیسے مسلسل بے ہوشی یا ذہنی فتور وغیرہ تو اس درمیان میں جو نمازیں گزریں گی وہ اس کے لئے معاف ہیں۔ جیسے حدیث میں آیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ پر ایک دفعہ بے ہوشی طاری ہوگئی جس کے نتیجے میں نماز بھی چھوٹ گئی اور جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے وہ نماز نہیں دہرائی۔ (مسند عبدالرزاق)

آپ نے جو بات دریافت کی ہے اس کا جواب یہی ہے کہ اگر مرحوم کی حالت اس قدر بگڑی ہوئی تھی کہ انہیں کسی چیز کا ہوش و حواس ہی نہیں تھا تو اس درمیان جو نمازیں گزریں وہ ان پر معاف ہیں ورنہ اگر یوں ہی چھوٹ گئی ہوں تو ان کا کفارہ صرف یہی ہے کہ ان کے لئے استغفار اور دعا کی جائے۔

نماز کے بعد بلند آواز سے ذکر کا حکم؟

سوال: لندن سے ایم صدیق لکھتے ہیں فرض نماز کے بعد کون سا وظیفہ اور ذکر ہے جو رسول اکرم ﷺ سے ثابت ہے؟ اس وقت یہاں بعض مسجدوں میں جو نماز کے بعد بلند آواز سے کلمہ طیبہ پڑھنے یا درود و سلام پڑھنے کا سلسلہ ہے اس کی شرعی حیثیت پر بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔ اس میں بہتوں کا بھلا ہوگا۔

جواب: نماز اسلام کا ایک اہم بنیادی رکن ہے جس کی اہمیت اور فضیلت کے بارے میں قرآن وحدیث میں واضح دلائل واحکام موجود ہیں۔ اس اہم عبادت کے فوائد اور حکمتوں پر بھی امت کے علماء بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ چونکہ نماز بندے اور خالق کے تعلق کو مضبوط کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے اس لئے نماز کے اندر اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس تعلق کو تازہ رکھنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے مختلف اذکار اور دعائیں بتائی ہیں اور ان مسنون دعاؤں کے علاوہ اپنی طرف سے اجتماعی ذکر یا دعا کا کوئی طریقہ رائج کرنا جائز نہ ہوگا۔

ہم ذیل میں اس بارے میں صحیح احادیث سے ثابت چند اذکار نقل کرتے ہیں

(۱) حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کے اختتام کو اللہ اکبر کے ذریعہ پہچانتا (بخاری شریف) یعنی آپ نماز کے بعد اللہ اکبر بلند آواز سے کہتے۔

(۲) حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز سے فارغ ہو کر ہماری طرف توجہ فرماتے تو تین مرتبہ استغفر اللہ پڑھتے اور پھر کہتے اللھم انت السلام و منك السلام تبارکت یاذالجلال والاکرام[1]

---

[1] مسلم مترجم ج ۱ کتاب المساجد باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ و بیان صفته ص۱۴۹ ترمذی ج ۱ باب ما یقول اذا سلم ص ۹۴ رقم الحدیث ۲۹۸/۲۴۳۔

(۳) حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے بعد صرف اتنی دیر بیٹھتے جتنی دیر میں یہ الفاظ پڑھتے: اللهم انت السلام و منك السلام تباركت يا ذالجلال والاكرام[1]

(۴) حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ صبح کی نماز میں سلام پھیرنے کے بعد آپؐ فرماتے: اللهم انی اسئلك علما نافعا ورزقا طيبا وعملا متقبلًا۔

(مسند احمد' ابن ماجہ)

(۵) حضرت مغیرہ بن شعبہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہر فرض نماز کے بعد یہ کلمات پڑھتے۔

لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شئى قدير اللهم لا مانع لما اعطيت ولا معطى لما منعت ولا ينفع ذالجد منك الجد[2]

(۶) حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ جب سلام پھیرتے تو بلند آواز سے یہ الفاظ پڑھتے

لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شئى قدير ولة حول ولا قوة الا بالله لا اله الا الله ولا نعبد الا اياه له النعمة وله الفضل وله الثناء الحسن لا اله الا الله مخلصين له الدين ولو كره الكافرون۔[3]

(۷) حضرت کعب بن عجرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فرض

---

[1] مسلم مترجم ج ۱ کتاب المساجد باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ ص ۱۴۹

[2] مسلم مترجم ج ۱ کتاب المساجد باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ و بیان صفته ص ۱۴۹ ترمذی ج ۱ باب ما يقول اذا سلم ص ۹۴ رقم الحدیث ۲۹۸/۲۴۳.

[3] مسلم مترجم ج ۱ کتاب المساجد باب استحباب الذکر بعد الصلاۃ ص ۱۴۹

نماز کے فوراً بعد کچھ الفاظ ایسے ہیں کہ انہیں کہنے والا کبھی نامراد نہیں ہوگا اور وہ ہیں ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ۔ ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر (مسلم شریف)

(۸) حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ہر فرض نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ کہا اور ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر اور آخر میں کہا **لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شئى قدير** تو اس شخص کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں اگرچہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔ (صحیح مسلم)

(۹) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اکرم ﷺ نماز کے بعد ان کلمات کے ساتھ پناہ طلب کرتے۔ **اللهم انى اعوذبك من البخل و اعوذبك من الجبن و اعوذبك من ان ارد الى ارزل العمر و اعوذبك من فتنة الدنيا و اعوذبك من عذاب القبر** -(صحیح بخاری)

احادیث کی معتبر کتابوں سے یہ کچھ روایات ہم نے نقل کی ہیں جن میں یہ مسنون اذکار ہیں۔ ان احادیث پر غور و فکر کے بعد درج ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

اول: صحابہ کرامؓ نے اپنے اپنے مشاہدات کے مطابق نبی کریم ﷺ کی نمازوں کے بعد کے معمولات کا ذکر کیا ہے اور ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ مختلف کلمات نمازوں کے بعد پڑھا کرتے تھے اور جس صحابی نے جو کلمات سنے وہ نقل کردیئے۔

دوم: کسی صحیح حدیث میں یہ نہیں آیا کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو اجتماعی طور پر بلند آواز سے کلمہ طیبہ کا ورد سکھایا ہو۔ کیوں کہ ہم نے اکثر وہ احادیث پیش کردی ہیں جن میں نماز کے بعد اذکار کا بیان ہے۔ اس طرح نماز کے بعد صلوٰۃ و سلام کا بھی کسی حدیث میں ذکر نہیں نہ کبھی آپؐ نے صحابہؓ کو بلند آواز سے یا آہستہ آواز کے ساتھ کھڑے ہوکے یا بیٹھ کر نماز کے بعد درود و سلام پڑھنے کا حکم دیا اور نہ ہی صحابہ کرام نے نمازوں کے بعد یہ عمل کیا۔

سوم: مسئلہ یہ نہیں کہ کلمہ طیبہ یا درود شریف پڑھنے سے کوئی منع کرتا ہے یا روکتا ہے۔ کوئی مسلمان بھلا یہ تصور بھی کر سکتا ہے کہ کلمہ یا درود کا انکار کرے اور لوگوں کو ان کے پڑھنے سے روکے ایسے شخص کے کفر میں کیا شبہ ہے جو کلمہ طیبہ پڑھنے سے انکار کرے، یا نبی کریم ﷺ پر درود سلام سے منع کرے بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کس موقع پر کون سے الفاظ یا کلمات پڑھنے کے لئے سکھائے ہیں۔

خلاصہ کلام: اس لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے نماز کے بعد جو اذکار بتائے ہیں ان میں نہ کلمہ طیبہ کا ذکر ہے اور نہ ہی درود سلام کا اور کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کے طریقے کو چھوڑ کر اپنی طرف سے کوئی طریقہ رائج کرے۔ اس سے بڑا دشمن اسلام اور گستاخ رسول اور کون ہو سکتا ہے جو یہ کہے کہ حضورؐ نے تو یہاں اس طرح چیزیں پڑھنے کے لئے نہیں کہا مگر میری مرضی اور خواہش یہ ہے کہ میں فلاں چیز پڑھوں۔ اس میں کیا حرج ہے؟ اس میں سب سے بڑا حرج یہی ہے کہ اس نے آنحضرت ﷺ کے فرمان کا احترام نہیں کیا۔

اس کی مثال بالکل ایسے ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ نماز میں قیام کی حالت میں سورہ فاتحہ پڑھنے کی بجائے وہ درود پڑھنا پسند کرتا ہے اور جب تشہد میں بیٹھے گا تو اس وقت فاتحہ پڑھے گا تو ایسے شخص کی نہ ہی نماز ہو گی اور نہ اسے کوئی محبّ رسولؐ یا عاشق رسولؐ تسلیم کرے گا کیونکہ اس نے اپنی طرف سے ایک طریقہ ایجاد کیا اور جو چیز جس جگہ نبی کریم ﷺ نے پڑھنے کے لئے کہی تھی اس میں اس نے اپنی طرف سے تبدیلی کی۔

لہٰذا مروجہ طریقہ صلاۃ و سلام کسی حدیث سے ثابت نہیں اور نہ ہی اونچی آواز سے مل کر کلمہ طیبہ اس طرح پڑھنے کا کوئی ثبوت ہے جس طرح آج کل کی بعض مسجدوں میں رواج ہے۔

بعض احادیث میں نماز کے بعد لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ کے الفاظ آئے ہیں

جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث کے حوالے سے ہم نے نقل کئے ہیں ممکن ہے بعض حضرات اس سے یہ دلیل پکڑیں کہ آج کل بعض مساجد میں جو بلند آواز سے کلمہ پڑھا جاتا ہے اس کے الفاظ بھی تو یہی ہیں لہٰذا نماز کے بعد لا الہ الا اللہ پڑھنے کا ثبوت مل گیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حدیث میں صرف لا الہ الا اللہ کے الفاظ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کی وحدانیت و یکتائی کے مکمل اور جامع کلمات ہیں جب کہ آج کل کے اہل بدعت حضرات کو نہ تو یہ وظیفہ آتا ہے اور نہ ہی اسے پڑھتے ہیں' بلکہ ان کے ہاں اکثر رواج تو یہ ہے کہ وہ صرف لا الہ الا اللہ ہی پڑھتے رہتے ہیں اور پھر ایک آدھ بار محمد رسول اللہ بھی کہہ دیتے ہیں جب کہ یہ طریق کار تو بالکل انوکھا ہے۔اگر یہ حضرات وہ تمام وظائف و کلمات جو ہم نے اوپر ذکر کئے ہیں مسنون طریقے سے پڑھیں تو آخر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ لیکن ساری مسنون دعائیں اور ورد چھوڑ کر کلمے کے ایک حصہ اور پھر کھڑے ہو کے درود پڑھنا بلکہ اس میں اردو شعروں کی آمیزش کر کے اسے گالینا ہرگز ہرگز سنت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

نماز کے لئے بلانا
کاروباری اوقات میں آجر کی اجازت؟

سوال: لندن سے محمد سعید پوچھتے ہیں

ا۔ جب کوئی شخص نماز ادا کرنے جائے تو اسے دوسروں کو بلاوا دینا اس کے فرائض میں آتا ہے یا نہیں؟ اگر آتا ہے تو کتنی بار؟

۲۔ کیا کاروباری اوقات میں نماز ادا کرنے کے لئے اپنے آجر کی اجازت لینا ضروری ہے؟

جواب: (ا) نماز کا بلاوا دینا دو قسم کا ہے ایک بطور اطلاع ساتھیوں کو بتانا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ یہ تو ہر وقت اور ہمیشہ کرنا چاہئے اور ایسا بلاوا نیکی کا کام ہے تاکہ لوگ بروقت

نماز ادا کر سکیں۔ خاص کر ایسے ملک یا جگہ میں جہاں اذان یا تو ہوتی نہیں؟ اگر ہوتی ہے تو اس کی آواز نہیں سنائی دیتی۔ اس قسم کے بلاوے سے بہتر اذان ہے۔ بشر طیکہ وہاں اذان میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ ایسا دفتر یا گھر جہاں ماشاء اللہ رہنے والے یا کام کرنے والے مسلمان ہیں تو وہاں اذان کا اہتمام کرنا چاہیئے اور اذان ہی کافی ہو گی۔ کسی دوسرے بلاوے کی ضرورت نہیں۔

دوسری قسم یہ کہ بلاوے سے مراد نماز کی ترغیب یا تلقین ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کو نماز کی اہمیت سے آگاہ کرے اور انہیں پڑھنے کی ترغیب دے۔ لیکن یہ صرف نماز پڑھنے کے وقت ضروری نہیں بلکہ اس کے علاوہ کسی مناسب وقت میں تلقین کرنی چاہیئے ہاں اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت نماز کی طرف بلانے یا رغبت دلانے سے کوئی بھائی نمازی بن سکتا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ نماز کے وقت اسے یہ فریضہ یاد دلایا جائے۔ لیکن یہ حالات پر موقوف ہے کہ کس قسم کے لوگوں سے آپ کو واسطہ ہے اگر لڑائی جھگڑے یا فتنے فساد کا خطرہ ہے تو اس صورت میں اتمام حجت کے طور پر ایک دو بار کوشش کر کے پھر اسے سوچنے کا موقع اور مہلت دینی چاہیئے۔

(۲) آجر یا مالک کی اجازت بنیادی طور پر ضروری ہے لیکن اگر آجر آپ کو نماز کی اجازت نہیں دیتا تو پھر اس مسئلے میں اس کا حکم ماننا ضروری نہیں کیونکہ:

لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق[1]

اللہ کی نافرمانی کر کے مخلوق کی بات ماننا درست نہیں۔

اس لئے عبادت سے اگر کوئی روکے اگر چہ والدین ہی کیوں نہ ہوں تو اس بارے میں ان کی بات ٹھکرائی جاسکتی ہے۔ ویسے مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ملازمت کرنے سے پہلے ان باتوں کی وضاحت کر دے کہ وہ کام کے اوقات میں اپنے دینی فرائض پوری طرح ادا کرے گا۔ بہرحال چوری چھپے نماز پڑھنے کی بجائے اپنے

[1] مشکوۃ للالبانی کتاب الامارۃ و القضاء ص ۱۰۹۲ رقم الحدیث ۳۶۹۶

آجر کو اطلاع دینی چاہئے۔

مرد اور عورت کی نماز میں فرق؟

سوال: گلاسگو سے الطاف حسین لکھتے ہیں:

کیا عورت اور مرد کی نماز میں کوئی فرق ہے؟ اگر رکوع سجدے وغیرہ میں کوئی فرق ہے تو وہ کیا ہے؟

جواب: شریعت اسلامیہ میں مرد اور عورت کی نماز میں کوئی فرق نہیں ہے۔ طریقہ دونوں کے لئے یکساں ہے۔ ہاں البتہ لباس کے سلسلے میں عورتوں کے لئے یہ حکم ہے کہ نماز کی حالت میں ان کے لئے چہرے ہاتھوں اور پاؤں کے علاوہ پورے جسم کو ڈھانکنا ضروری ہے۔ اگر سر کے کچھ بال بھی ننگے یا کھلے ہیں تو نماز نہیں ہوگی اسی طرح اگر اتنا باریک کپڑا یا دوپٹہ پہنا ہوا ہے جس سے بدن یا بال نظر آئیں تو نماز نہیں ہوگی۔

تسبیح کے علاوہ سجدہ میں دعا ہے؟

سوال: میڈ سٹون کینٹ جیل سے محمد اسلم دریافت کرتے ہیں

سجدہ کے اندر نماز کی حالت میں جو تسبیح پڑھتے ہیں اس کے علاوہ بھی کوئی دعا پڑھ سکتے ہیں؟

جواب: سجدے کی حالت میں بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ دعائیں کرنا مفید ہے۔ مختصر تسبیح یعنی سبحان ربی الاعلی کے علاوہ جو دعائیں یا تسبیحیں احادیث میں آئی ہیں ان میں سے بعض درج ذیل ہیں جو نبی کریم ﷺ نے سجدے کی حالت میں پڑھی ہیں:

۱۔ اللهم لك سجدت وبك امنت ولك اسلمت سجد وجهي للذي خلقه و صوره وشق سمعه و بصره تبارك الله رب العالمين۔

۲۔اللهم اغفرلی ذنبی کله دقه وجله و اوله واخره و علانیة و سره۔

(مسلم ٤٨٣ ابو داود ٨٧٨)

۳۔اللهم اعوذبك برضاك من سخطك و بمعافاتك من عقوبتك واعوذبك منك لا احصی ثناء علیك انت کما اثینت علی نفسك۔

جلسہ استراحت حدیث سے ثابت ہے؟

سوال: لیوٹن سے مقبول کاظمی لکھتے ہیں
سجدہ ثانی ختم کرنے کے بعد دوسری یا چوتھی رکعت ادا کرنے سے قبل معمولی سی استراحت کر کے قیام میں کھڑے ہونے کا مسئلہ کیا ہے؟

جواب: جلسہ استراحت حدیث سے ثابت ہے اس لئے اس سنت کا ادا کرنا جہاں باعث اجر وثواب ہے وہاں اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ مقتدی امام کی پوری اقتداء کرتا ہے اور وہ جلدی سے سیدھا کھڑے ہو کر امام سے پہلے اٹھنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔

اس سلسلے میں سب سے اہم دلیل حضرت مالک بن الحویرثؓ کی یہ حدیث ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا کہ آپ اکیلی رکعت میں جب اٹھتے تو پہلے تھوڑی دیر کے لئے بیٹھتے پھر کھڑے ہوتے۔ اس کا نام جلسہ استراحت ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلی اور تیسری رکعت میں دونوں سجدے کرنے کے بعد سیدھا کھڑے ہونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جائیں جیسا کہ دو سجدوں کے درمیان بیٹھا جاتا ہے اس کے بعد دوسری یا چوتھی رکعت کے لئے کھڑے ہو جائیں اس مختصر سے بیٹھنے کو جلسہ استراحت کہتے ہیں اور اس میں کچھ پڑھنا حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

رفع الیدین سنت ہے؟

سوال: ایک صاحب نے رفع الیدین کے بارے میں پوچھا ہے کیا یہ سنت نبوی ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں اس وقت لوگ بغلوں میں بت رکھتے تھے۔

جواب: نماز میں رفع الیدین کرنا یعنی شروع میں اور پھر رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت اپنے ہاتھوں کو کندھوں یا کانوں کے برابر اٹھانا سنت صحیحہ سے ثابت ہے۔ اس مسئلے میں تعصب برتنا یا جھگڑنا بھی مناسب نہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے متعدد روایات ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ رفع الیدین کیا کرتے تھے۔

معلیٰ شرح موطا میں پچاس صحابہ کرامؓ سے رفع الیدین کرنا نقل کیا گیا ہے۔

امام سیوطی نے تیس صحابہؓ سے رفع یدین نقل کیا ہے۔

اگر مختلف احادیث اور صحابہ کرامؓ کے اقوال کو جمع کیا جائے تو رفع الیدین کے بارے میں ان کے ارشادات کی تعداد چار سو سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

مشہور اماموں میں سے امام شافعیؒ، امام احمدؒ، امام مالک اور امام بخاری جیسے جلیل القدر اماموں نے رفع الیدین کو احادیث اور صحابہ کرامؓ کے اقوال سے ثابت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی ملاقات تک رفع الیدین کرتے رہے۔

جہاں تک بغلوں یا بانہوں کے نیچے بت رکھنے والی بات کا تعلق ہے تو یہ من گھڑت ہے۔ اس واقعہ کا کوئی اصل یا ثبوت نہیں اور یہ صرف جاہل اور ان پڑھ لوگوں کے درمیان مشہور ہے۔ اس کی علمی حیثیت کچھ نہیں ہے۔ جو لوگ رفع الیدین نہیں کرتے، وہ بھی اس بتوں والی بات کو دلیل کے طور پر پیش نہیں کرتے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ رفع

الیدین نہ کرنے سے نماز نہیں ہوتی لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ اتنی احادیث سے ثابت ہونے پھر صحابہ کرامؓ کے عمل اور اماموں کی اکثریت کے عمل کے بعد اس سنت کو بلاوجہ چھوڑنا بھی نہیں چاہیے اور کوئی عمل جس قدر سنت کے مطابق کیا جائے گا' وہ اس قدر ہی بہتر وافضل ہوگا۔ لیکن اس مسئلے کی وجہ سے اختلاف پیدا کرنا بھی درست نہیں۔

کیا سورہ فاتحہ ضروری ہے؟

سوال: برسٹل سے احمد علی پوچھتے ہیں

جو آدمی سورہ فاتحہ زبانی یاد نہیں کر سکتا بلکہ اسے کوئی دوسری آیت یاد ہے تو کیا وہ نماز میں فاتحہ کی جگہ اس کی تلاوت کر سکتا ہے؟

جواب: جمہور فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

لا صلوۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب[1]

"کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوئی جس نے نماز میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی"

اس لئے ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ سورہ فاتحہ حفظ کرے اور نماز میں پڑھے اور اگر کوئی شخص بڑھاپے کی وجہ سے یا کسی دوسری وجہ سے فاتحہ یاد نہیں کر سکتا تو وہ معذور ہے۔ اسے جو بھی سورت یا آیت یاد ہے پڑھ سکتا ہے۔

اگر اسے کوئی آیت بھی یاد نہیں یا یاد نہیں کر سکتا تو جیسا کہ حدیث میں آتا ہے رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی سے کہا تھا کہ اگر قرآن یاد نہیں تو پھر الحمد للہ' اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ جیسے کلمات بھی پڑھ سکتا ہے۔

---

[1] بخاری ٩٧٥٦ ' مسلم ٣٩٤' ابو داود ٨٢٢' ترمذی ٢٤٧' نسائی ١٣٧/٢' ابن ماجہ ٨٣٧.

آمین بالجہر سے روکنے والا امام؟

سوال : بریڈ فورڈ سے محمد سلیم صاحب کیمبل پوری تحریر کرتے ہیں

چند مہینے ہوئے میں پاکستان گیا ہوا تھا۔ گاؤں پہنچ کر میں نے مغرب کی نماز مقامی امام کے پیچھے پڑھی اور بلند آواز سے آمین کہی۔ نماز کے بعد ایک مولانا صاحب نے کہا تم نے ایسے کیوں کیا ہے؟ میں نے کہا اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ انہوں نے کہا قرآن میں نہیں ہے اور تم تفریق ڈالتے ہو۔ مختصر یہ کہ کیا ایسے علماء کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے جو سنت رسول ﷺ پر عمل کرنے سے روکتے ہیں؟

جواب: جہری نمازوں میں بلند آواز سے آمین کہنا رسول کریم ﷺ سے ثابت ہے اور اس مسئلے پر متعدد صحیح احادیث موجود ہیں۔ اس لئے بلند آواز سے آمین کہنے پر ناراض ہونا یا اس سے روکنا یہ تعصب اور جہالت کی علامت ہے۔ جس طرح آہستہ آمین کہنے والے کو اونچی آمین کہنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا' اسی طرح آہستہ آواز سے کہنے والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلند آواز سے آمین کہنے والے کو روکے یا اس پر تفریق کا الزام لگائے۔

جہاں تک ایسے مولانا کے پیچھے نماز پڑھنے کا تعلق ہے تو بظاہر ایسی کوئی وجہ نہیں کہ ایسے امام کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے۔ اس کے پیچھے نماز پڑھی جا سکتی ہے کیونکہ یہ محض جہالت اور تعصب کی بنا پر ایسا کرتے ہیں ورنہ آہستہ آمین کہنے والے جو عالم اور سنجیدہ حضرات ہیں وہ بھی بلند آواز سے آمین کہنے پر ہرگز اعتراض نہیں کرتے ایسے امام کو خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ تعصب ترک کرنے کی نصیحت کرنی چاہئے اور ایسے مسائل میں اتنی سختی سے انہیں باز رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے لیکن ایسے آدمی کو مستقل امام بنانے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

سورہ فاتحہ کا پڑھنا لازمی ہے؟

سوال: برمنگھم سے محمد اصغر نے دریافت کیا ہے

(۱) جو کوئی رکوع میں امام کے ساتھ مل جائے اسے رکعت مل جاتی ہے۔ اگر مقتدی پر سورت فاتحہ پڑھنی لازم ہوتی تو اسے رکعت نہ ملنی چاہیے تھی۔

اگر یہ شخص تکبیر تحریمہ نہ کہے یا تکبیر تحریمہ کے ساتھ ایک تسبیح کے برابر قیام نہ کرے بلکہ سیدھا رکوع میں چلا جائے تو اسے رکعت نہ ملے گی کیونکہ تکبیر تحریمہ اور قیام مقتدی پر فرض ہے تو ایسے ہی اگر اس پر سورہ فاتحہ فرض ہوتی تو اس کے بغیر رکعت نہ ملتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام کی قرأت اس کے لئے کافی ہے؟

اگر مقتدی فاتحہ کے بیچ میں ہو اور امام رکوع میں چلا جائے تو مقتدی کو کیا کرنا چاہیے فاتحہ آدھی چھوڑ دے یا رکوع چھوڑ دے؟

(۲) اگر مقتدی پر قرأت فاتحہ بھی ہے اور آمین بھی ہے اور امام مقتدی سے پہلے فاتحہ ختم کر دے تو یہ مقتدی جو فاتحہ کے بیچ میں ہے آمین کہے یا نہ کہے؟ نہ تو دو دفعہ آمین جائز ہے نہ فاتحہ کے بیچ میں آمین درست ہے۔ اس حالت میں مقتدی کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: (۱) نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا امام اور مقتدی دونوں کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لا صلوة لمن لم يقرا بام القرآن[1]

یعنی جو شخص فاتحہ نہیں پڑھے گا اس کی نماز نہیں ہو گی۔

---

[1] مسلم مترجم ج ۱ کتاب الصلاة باب وجوب قراءة الفاتحة فی کل رکعة ص ۲۱

اس لئے جو شخص سورہ فاتحہ پڑھے بغیر رکوع میں ملتا ہے اس کی وہ رکعت ادا نہیں ہو گی۔

(۲) اس صورت میں مقتدی کو فاتحہ مکمل کرنا ہو گی۔ اگر فاتحہ نہ پڑھ سکا تو وہ رکعت ادا نہیں ہو گی۔ امام اگر رکوع میں چلا گیا' تو وہ فاتحہ پوری پڑھنے کی کوشش کرے۔ اگر پڑھنے کے بعد رکوع میں شامل ہو جاتا ہے تو بہتر ورنہ یہ رکعت دوبارہ پڑھنا ہو گی۔

(۳) مقتدی کے لئے فاتحہ پڑھنا اور آمین کہنا دونوں ضروری ہے۔ اگر مقتدی قرأت فاتحہ میں امام سے پیچھے رہ گیا تو جب امام آمین کہے تو اس کے ساتھ آمین کہہ دے اور پھر جب اپنی قرأت مکمل کر لے تو دوبارہ آمین کہنی ہو گی۔ چونکہ آمین کہنا واجب ہے اس لئے فاتحہ کے بیچ امام کی اقتداء میں آمین کہہ سکتا ہے اور جب اپنی قرأت مکمل کرے تو اس پر دوبارہ آمین کہنا واجب ہو گا۔

قرأت فاتحہ ہر حال میں ضروری ہے۔ علامہ عینیؒ نے شرح بخاری میں بعض حنفی علماء کے بارے میں لکھا ہے کہ احتیاط کے طور پر وہ تمام نمازوں میں فاتحہ پڑھنے کو بہتر سمجھتے ہیں اور بعض سری نمازوں میں فاتحہ کی قرأت مستحسن سمجھتے ہیں۔

کیا قضا عمری ادا کرنا ضروری ہے؟ کیا اس قسم کا گناہ توبہ سے دھویا جا سکتا ہے؟

سوال: لیوٹن سے جناب مقبول کاظمی نے دریافت کیا ہے

(۱) کیا قضا عمری کا ادا کرنا ضروری ہے؟

(۲) کیا اس قسم کا گناہ توبہ سے دھویا جا سکتا ہے؟

جواب: نماز دین کا اہم ستون ہے اور بنیادی رکن ہے جان بوجھ کر اسے ترک کر دینا بہت بڑا گناہ اور جرم ہے اور جمہور علماء کے نزدیک نماز چھوڑنے کا جرم قتل' زنا' چوری

اور شراب نوشی سے بھی سنگین ہے۔ اس کے سنگین جرم ہونے میں تو کوئی اختلاف نہیں لیکن بے نماز کے کافر ہونے میں اختلاف ہے۔ کافر ہونے یا نہ ہونے کی بحث سے قطع نظر ائمہ دین نے اس کے لئے سخت سزائیں مقرر کی ہیں جیسے قتل کردینا یا عمر بھر کے لئے قید کردینا اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرنا۔ ائمہ دین کی ان آراء سے اس جرم کی سنگینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ عمر کے کسی حصے کی جو نمازیں نہیں پڑھیں ان کی قضا دینا ضروری ہے یا توبہ ہی کافی ہے تو اس مسئلے کی دو صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ کسی آدمی نے کچھ نمازیں جان بوجھ کر نہیں پڑھیں مگر ان نمازوں کے بارے میں اسے علم ہے کہ کتنی اور کون کون سی نمازیں ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے عمر کے بڑے حصے میں نمازیں ادا نہیں کیں اور اسے کچھ معلوم نہیں کہ اس کی کتنی اور کون کون سی نمازیں فوت ہوئی ہیں۔ پہلی صورت میں علماء سلف و خلف کی دو آراء ہمارے سامنے آتی ہیں۔

۱۔ جس شخص نے جان بوجھ کر کوئی نماز چھوڑی ہے اس پر قضا واجب ہے۔ ان کی دلیل نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث ہے جس میں آپ نے سونے کی وجہ سے یا بھول کر نماز ترک کرنے والے کو قضا کا حکم دیا ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر بھول کر یا نیند کی وجہ سے چھوڑی ہوئی نماز کی قضا ضروری ہے تو اس کی اور زیادہ ضروری ہے۔ انہوں نے دوسری دلیل میں وہ حدیث بھی پیش کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جنگ خندق کے دن نماز عصر مغرب کے بعد پڑھی۔ حالانکہ نہ تو یہ تاخیر نیند کی وجہ سے تھی اور نہ بھول کی وجہ سے۔ اس لئے جس آدمی نے جان بوجھ کر کوئی نماز ترک کی ہے اس کے لئے بھی قضا ضروری ہوگی۔

۲۔ جان بوجھ کر چھوڑنے والے کے لئے توبہ ضروری ہے اور قضا ضروری نہیں کیوں کہ جس وقت پر نماز فرض تھی وہ وقت گزر گیا۔ اب دوسرے وقت میں وہ فرض ادا نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے لئے یہ لازمی ہے کہ آئندہ نمازوں کی حفاظت

کرے اور نوافل کثرت سے پڑھے۔ جہاں تک سونے والے اور بھولنے والے کے لئے قضا ضروری قرار دی گئی ہے اس بارے میں ان حضرات کا خیال یہ ہے کہ ان کے بارے میں نص آچکی ہے اور بعد کا وقت ان کے لئے جو مقرر کیا گیا ہے وہ شرعی طور پر ان نمازوں کا وقت ہے جو نیند یا بھول سے رہ گئی ہیں تو اس لحاظ سے یہ نمازیں وقت کے اندر ہی ہیں اور جان بوجھ کر چھوڑنے والے کے لئے ان احادیث کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ ان کے ہاں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ قرآن میں جان بوجھ کر نماز نہ پڑھنے والے کے لئے سخت وعید آئی ہے۔ اگر قضا سے اس کا ازالہ ہو سکتا ہے تو اس کا حل قضا ہوتی اس قدر سخت ڈانٹ اور سزا کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ ارشاد قرآنی ہے کہ:

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ﴾ (الماعون: ٤)

”یعنی ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔“

یہاں 'غفلت' سے مراد بعض مفسرین نے جان بوجھ کر نماز ترک کرنا یا موخر کرنا لیا ہے۔

دوسری آیت سورہ مریم کی ہے کہ:

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (مریم: ٥٩)

”ان کے بعد ان کے ایسے جانشین پیدا ہوئے جنہوں نے نمازیں ضائع کیں اور خواہشات کی پیروی کی۔ یہ لوگ عنقریب تباہی سے دوچار ہوں گے۔“

اور خود نبی کریم ﷺ کا بھی ارشاد ہے کہ:

من فاتته صلوة العصر فكانما وتر اهله وماله[1]

”کہ جس کی عصر کی نماز فوت ہو گئی اس کا اہل اور مال سب تباہ ہو گئے۔“

تو ان دلائل کی بنا پر ان حضرات کے ہاں توبہ ضروری ہے قضا کی حاجت نہیں۔

---

[1] ابی داؤد جلد اول کتاب الصلاة باب من ادرك ركعة من صلاة العصر ص ٦٥

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص کی عمر کے بڑے حصے کی نمازیں رہ گئیں۔ مثلاً ۳۰، ۴۰ سال یا اس سے کم و بیش عرصہ اس نے جان بوجھ کر نماز نہیں پڑھی اور اسے متروکہ نمازوں کی صحیح تعداد یا رکعات کا بھی علم نہیں۔ اس صورت میں بھی اہل علم کی دو آراء ہمارے سامنے آتی ہیں

۱۔ ایک یہ کہ قضا ضروری ہے اور توبہ تب ہی صحیح ہوگی جب قضا دے گا اور اگر نمازوں کا علم نہیں تو اندازے سے جتنی نمازیں روزانہ پڑھ سکے پڑھ لیا کرے یعنی اپنی طرف سے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کرے۔

۲۔ دوسری یہ کہ توبہ ضروری اور کافی ہے اور ایسی صورت میں قضا ممکن ہی نہیں کیوں کہ اسے نمازوں کا علم نہیں کہ کتنی تعداد میں چھوڑی ہیں اور پھر نماز اپنے اصل وقت سے رہ گئی ہے اب اس کی قضا کے لئے کوئی نص صریح نہیں ہے۔

حاصل کلام: تمام دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے اور اہل علم کے تجزیے کی روشنی میں صحیح اور صواب رائے ہم ذیل میں تفصیل سے بیان کرتے ہیں

(۱) اس امر میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ نائم (سونے والے) ناسی (بھولنے والے) مریض اور مسافر کے لئے صحیح احادیث کے ذریعے نماز قضا کرنے یا دوسرے وقت میں پڑھنے کی اجازت ہے۔ اس لئے اس سلسلے میں سب کا اتفاق ہے۔

(۲) اس امر میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ جس نے نماز جان بوجھ کر چھوڑی، اس کے لئے توبہ ضروری ہے کیوں کہ معصیت کا ازالہ توبہ ہی ہو سکتا ہے اس لئے توبہ ہر حال میں ضروری ہے۔

(۳) اختلاف اس شکل میں ہے جب جان بوجھ کر نمازیں چھوڑ دیں لیکن اسے نمازوں کی تعداد اور اوقات کا علم ہے اور ان کی قضا کرنا اس کے لئے ممکن بھی ہے تو ایسی صورت میں صحیح رائے یہی معلوم ہوتی ہے کہ اسے توبہ کے ساتھ ساتھ ان نمازوں کی قضا بھی دینی چاہئے۔ اگرچہ اس سلسلے میں کوئی واضح نص تو نہیں ہے لیکن قرآن کی

آیت کہ

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ﴾ (طہ : ١٤)

"کہ نماز میری یاد کے لئے قائم کرو۔"

اور حدیث

" من نسی الصلوۃ فلیصلہا اذا ذکرھا"[1]

"کہ جو نماز بھول گیا وہ جب یاد آئے تو اسے ضرور پڑھے"

اس آیت اور حدیث سے کسی حد تک استدلال کی گنجائش موجود ہے اور پھر احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جو نماز چھوڑی ہو (بھول کر یا جان بوجھ کر) جب اس کا احساس ہو یا یاد آئی تو اسے پڑھ لینا چاہیئے' خاص طور پر ایسی صورت میں جب اس کے لئے ممکن بھی ہے۔اس لئے نمازی کی جب کوئی معلوم نماز رہ جائے تو اسے قضا بہر حال دینی چاہیئے۔

(۴) زیادہ مشکل یہ ہے کہ جب عمر کے بڑے حصے کی نمازیں نہیں پڑھیں اور جب اسے ہوش یا اللہ نے ہدایت دی اور احساس پیدا ہوا تو اسے تعداد یا رکعات کا بھی صحیح پتہ نہیں تو اس کے لئے اب کیا صورت ہے؟ قرآن و حدیث اور ائمہ دین و اہل علم کی تحقیق کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی دو شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

اول: ایک شخص جو نماز نہیں پڑھتا وہ اس کا تارک ہی نہیں منکر بھی ہے یعنی نماز کی فرضیت کا سرے سے قائل ہی نہیں اور نہ ہی اسے تسلیم کرتا ہے ایسا شخص تو بالاتفاق کافر ہے۔اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔لہٰذا اس شخص کو اگر اللہ نے ہدایت دی تو یہ گویا کہ از سر نو اسلام میں داخل ہو رہا ہے اور اس کے لئے کوئی قضا نہیں جس طرح کہ جب کوئی کافر مسلمان ہوتا ہے تو اس کے لئے پہلے ترک کئے ہوئے فرائض کی قضا نہیں ہوتی لہٰذا ایسی صورت میں صرف توبہ ہی کافی ہو گی۔

---

[1] ابن ماجۃ للالبانی ابواب مواقیت الصلاۃ باب من نام عن الصلاۃ او نسیھا ج ۱ ص ۱۲۵۔

دوم: دوسری صورت یہ ہے کہ وہ شخص نماز کا کھلے عام انکار تو نہیں کرتا تھا لیکن اس نے لمبا عرصہ نماز پڑھی بھی نہیں اور ایک لحاظ سے ترک نماز جیسی معصیت پر اصرار اور استمرار کرتا رہا تو ایسا شخص اب راہ راست پر آکر نمازیں شروع کرنا چاہتا ہے اور اسے سابقہ نمازوں کے بارے میں تشویش ہے کہ ان کی قضا کیسے ہوگی اور میرے خیال میں سوال میں بھی اس کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے۔ اس صورت میں درج ذیل دلائل کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص پر قضا نہیں ہوگی۔ یہ خالص اور سچی توبہ کرے گاہاں نوافل کثرت سے پڑھ کر اپنی کوتاہیوں کی تلافی کر سکتا ہے لیکن اصل معافی کا ذریعہ توبہ ہی ہے۔

(۱) قرآن وحدیث میں ایسی کوئی واضح دلیل یا نص نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم کہہ سکیں کہ یہ شخص ---جو اتنا طویل عرصہ جان بوجھ کر تارک صلوۃ رہا--- وہ ان کی قضا دے گا۔ احادیث میں سونے کی وجہ سے جس کی نماز رہ گئی یا کسی وجہ سے بھول گیا' اسی طرح مریض اور مسافر کے بارے میں تو نماز قضا کرنے یا جمع کرنے کا ذکر ہے لیکن مذکورہ شکل کے بارے میں کوئی واضح اثر نہیں اس لئے کسی نص کے بغیر ہم اس کے لئے قضا کا حکم نہیں دے سکتے۔

(۲) اس کے علاوہ ترک نماز کو کفر سے تعبیر کیا گیا اور اس میں کوئی صراحت نہیں کہ یہ ترک انکار کی وجہ سے ہو یا سستی کاہلی اور بے پروائی کی وجہ سے اور ائمہ مجتہدین کی ایک قابل ذکر تعداد نے اس سے کفر مراد لے کر بے نماز کو کافر قرار دیا ہے اور وہ ان آیات واحادیث سے استدلال کرتے ہیں

﴿مَا سَلَكَكُمْ فِىْ سَقَرَ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ﴾ (المدثر : ۴۲-۴۳)

''ان سے پوچھا جائے گا کہ تم جہنم رسید کیوں ہوئے تو جواب میں کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔''

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ (مریم: ۵۹)

"ان کے بعد ان کے برے جانشین آئے تو انہوں نے نمازیں ضائع کیں اور خواہشات کی پیروی کی۔ پس عنقریب یہ لوگ ہلاکت سے دوچار ہوں گے۔"

تیسری آیت ہے:

﴿فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُو الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾ (التوبة: ۱۱)

"اگر وہ توبہ کر کے نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں"

یعنی اگر نماز قائم نہیں کرتے تو دین سے خارج اور تمہارے دینی بھائی نہیں۔

چوتھی آیت بھی سورہ توبہ کی ہے جس کے آخر میں ہے

﴿فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ (التوبہ: ۵)

یعنی اگر وہ نماز قائم کریں تو ان سے تعرض نہ کرو۔

اس معنی کی اور بھی بہت سی آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ احادیث جو پیش کی جاتی ہیں ان میں صحیح مسلم کی یہ حدیث خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں آپؐ نے فرمایا

"بين الرجل و بين الكفر ترك الصلوة"[1]

آدمی اور کفر کے درمیان نماز چھوڑنے کا فاصلہ ہے۔ (مسلم، ترمذی)

دوسری حدیث میں ہے:

"العهد الذى بيننا وبينهم الصلوة فمن تركها فقد كفر"[2]

---

[1] سنن نسائی مترجم کتاب الصلاۃ: باب الحکم فی تارك الصلاۃ ص ۱۸۹ رقم الحدیث ٤٦٧ مسلم للالبانی جلد ۱ کتاب الصلاۃ باب ترك الصلاۃ کفر ص ٦٢ رقم الحدیث ٢٠٤.

[2] ترمذی للالبانی ابواب اقامة الصلاۃ ج ۱ باب ما جاء فی من ترك الصلاۃ ص ۱۹٤ رقم الحدیث ۱۰٦٥ ابن حبان ۱٤٥٤.

"ہمارے اور ان کے درمیان نماز ہی عہد ہے۔ پس جس نے اسے چھوڑ دیا اس نے کفر کیا۔"

اسی طرح حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ

اوصانا رسول اللہ ﷺ فقال لا تشرکوا باللہ شیئا و لا تترکوا الصلوۃ عمدا فمن ترکھا عمدا متعمدا فقد خرج من الملۃ[1]

ہمیں رسول اللہ ﷺ نے وصیت کی اور فرمایا اللہ کے ساتھ ذرا بھی شرک نہ کرو اور نماز نہ چھوڑنا۔ اس لئے کہ جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑی وہ اللہ کے ذمہ سے نکل گیا۔

یہ اور اس طرح کی متعدد احادیث اس معنی اور مفہوم میں کتب احادیث میں موجود ہیں۔ جن لوگوں نے مذکورہ آیات اور احادیث کے ظاہر کو سامنے رکھا ہے انہوں نے اس شخص کو کافر قرار دیا ہے جو ہمیشہ اصرار کے ساتھ نماز کا تارک رہا۔ اب یہ شخص جب نماز شروع کرے گا تو گویا کہ نئے سرے سے مسلمان ہوا ہے۔ اس لئے سچی توبہ ہی اس کے لئے ضروری ہوگی۔ قضا اس پر نہیں ہوگی۔

(۳) مگر دوسری طرف اہل علم کی ایک بڑی تعداد نے ایسے شخص کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا بلکہ اسے نافرمان اور گناہ گار قرار دیا ہے اور جو کفر کے الفاظ آئے ہیں ان سے مراد انہوں نے کفر عملی لیا ہے نہ کہ کفر اعتقادی۔ یعنی تارک الصلوۃ عملاً کافر ہے عقیدتاً نہیں۔ ہمارے نزدیک کفر اعتقادی ہو یا عملی۔ ان دونوں کا ازالہ توبہ کے بغیر نہیں ہو سکتا اور جب نبی کریم ﷺ نے بے نماز کے بارے میں کفر کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس کفر سے تائب ہو کر ہی وہ صحیح مومن بن سکتا ہے اس لئے اس بے نماز کے لئے توبہ ضروری ہے۔ یہاں بھی قضا نہیں ہوگی کیوں کہ وہ بھی ایک لحاظ سے کفر سے ایمان کی طرف آ رہا ہے۔

---

[1] مجمع الزوائد ۲۱۹/۴ تعظیم قدر الصلاۃ لمحمد بن نصر المروزی ۸۸۹/۲ شرح اصول الاعتقاد للالکائی ۸۲۲/۴، ۸۲۳. تاریخ کبیر للبخاری ۷۵/۴.

(۴) جس شخص کو نمازوں کی تعداد ہی معلوم نہیں جن کی اس نے قضا دینا ہے نہ اسے یہ یاد ہے کہ کب کون سی نماز ترک کی تھی کیوں کہ بیچ میں کبھی کبھار پڑھ بھی لیتا ہوگا تو اب وہ کس نماز کی آخر کیا نیت کرے گا اور قضا کی شکل کیا ہوگی۔ یوں ہی اندازے سے تو نماز پڑھنے کا کوئی قصد نہیں۔ جب اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ کون سی نماز کب اور کیسے پڑھ رہا ہے اور کس نماز کی قضا دے رہا ہے۔ یہاں ایک بڑا دلچسپ نکتہ ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ساری عمر کی نمازیں قضا کرنا ضروری ہیں ان سے جب یہ کہا جاتا ہے کہ جس آدمی نے ۳۰ سال کی نمازوں کی قضا شروع کی اور ابھی ایک سال کی قضا بھی پوری نہیں کی کہ وہ فوت ہو جاتا ہے۔ اب ان نمازوں کا کیا بنے گا تو وہ کہتے ہیں اگر توبہ کی تو اللہ معاف کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی قضا ضروری نہیں تھی ورنہ جو اب بھی رہ گئی ہیں ان کی سزا ضروری تھی۔ پھر جو یہ کہا جاتا ہے کہ جو نماز جب یاد آئے تو اس کا قرآن اور حدیث میں پڑھنے کا حکم ہے تو ہم کہتے ہیں جس کی عمر بھر کی نمازیں رہ گئی ہیں اسے تو صحیح تعداد بھی یاد نہیں لہٰذا اس پر قضا نہیں ہوگی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جس آدمی نے جان بوجھ کر لمبی مدت تک نماز نہیں پڑھی اسے تعداد یاد نہیں متعین نیت وہ کر نہیں سکتا۔ پھر ساری نمازوں کی قضا نہ ممکن ہے اور نہ یقینی اور پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے کفر کا لفظ بھی فرمایا ہو تو ایسے شخص کے لئے توبہ ہی اصل حل ہے قرآن و حدیث میں اس کے لئے قضا کا کوئی ثبوت نہیں ہے ہاں البتہ اسے نوافل کثرت سے پڑھنے چاہئیں تاکہ اجر و ثواب کی کمی کو پورا کر سکے۔ واللہ اعلم بالصواب

قضائے عمری کی نماز کا کیا حکم ہے؟

سوال: مغربی جرمنی سے ایک صاحب لکھتے ہیں بعض لوگ رمضان المبارک کے آخری جمعہ (جمعۃ الوداع) کے دن قضا عمری کی نماز پڑھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس

سے عمر بھر کی وہ نمازیں جو نہیں پڑھی گئیں ان کی قضا ہو گئی۔ اس کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ کچھ لوگ اس دن ظہر و عصر کے درمیان ۱۲ رکعت پڑھتے ہیں اور بعض اس میں سورہ فاتحہ' آیت الکرسی اور سورہ اخلاص کا اضافہ کرتے ہیں۔ کیا اس کی کوئی اصل ہے 'یا حدیث سے قضا عمری کی نماز ثابت ہے؟

جواب: قضا عمری کی نماز یا اس کا وہ ثواب یا فضیلت جو بیان کی جاتی ہے کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ جس عمل کے بارے میں ایک شخص کو یقینی علم ہی نہیں کہ اس کی کتنی نمازیں رہ گئی ہیں ایک تو ان کی قضا یوں اندازے سے دینا خود محل نظر ہے۔ پھر عمر بھر کی نمازوں کا بدل ایک دن کی کچھ رکعات آخر کیسے بن سکتی ہیں۔ آدمی کی گزری ہوئی زندگی کے گناہوں یا بداعمالیوں کا اصل کفارہ توبہ ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ توبہ پہلے سب گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور سچی توبہ انسان کو گناہوں سے پاک کر دیتی ہے' اس لئے قضا عمری تکلف محض ہے۔ بعض لوگ کچھ روایات بھی پیش کرتے ہیں جو بالکل موضوع اور باطل ہیں۔ مشہور حنفی عالم ملا علی قاری نے اس روایت کو بالکل موضوع اور قطعی باطل قرار دیا ہے۔ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی حنفیؒ نے بعض دوسرے ائمہ کے اقوال بھی پیش کئے ہیں جنہوں نے یہ لکھا ہے کہ قضا عمری کے بارے میں کوئی چیز رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔

سوال: میری عمر اس وقت ۲۱ سال ہے اور اب میں نے نماز پنجگانہ شروع کر دی ہے لیکن اس سے قبل جس ماحول میں تھا وہاں بلا عذر نماز کا تارک تھا تو کیا مجھ پر سابقہ نمازوں کی قضا ضروری ہے؟

جواب: ماضی پر رونے کی بجائے آپ مستقبل کی فکر کریں۔ بے شمار نیکیاں جو آپ سے رہ گئی ہیں' اب وہ وقت آپ کے ہاتھ نہیں آسکتا اور نہ ہی وہ گناہ واپس ہو سکتے ہیں جو آپ نے کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے فرمودات میں اس امر کی وضاحت فرمادی ہے کہ سچی توبہ کے بعد انسان گناہوں سے پاک ہو جاتا

ہے اور گویا کہ اسے نئے سرے سے اپنی زندگی کے آغاز کا موقع ہاتھ آتا ہے اور یہی توبہ تو یہی ہے کہ آپ سابقہ کوتاہیوں پر شرمسار و نادم ہو جائیں اور دوبارہ ان کا اعادہ نہ ہونے پائے۔ جہاں تک نمازوں کی قضا کا تعلق ہے اگر آپ کو ان نمازوں کی صحیح تعداد یاد ہے جو آپ سے رہ گئی ہیں تو پھر کوشش کیجئے کہ ساتھ ساتھ حسب استطاعت فوت شدہ نمازیں ادا کریں لیکن اگر آپ کو ان نمازوں کے بارے میں کوئی علم یا اندازہ نہیں جو آپ نے ترک کی ہیں تو پھر ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾(البقرة : ٢٨٦) اللہ کسی جان کو بھی اس کی طاقت سے بڑھ کر کسی کام کیلئے مکلّف نہیں کرتا لہٰذا آپ صدق دل سے توبہ کر کے آئندہ نماز کی پابندی کریں۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور قبول کرنے والا ہے۔ بعض لوگوں نے قضا عمری کا جو مسئلہ بنایا ہوا ہے کہ رمضان المبارک کا آخری جمعہ پڑھ لیا جائے تو عمر بھر کی چھوڑی ہوئی نمازوں کی قضا ہو جاتی ہے۔ یہ ذہنی اختراع ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کوئی بھی ایسا دن یا وقت نہیں جس کے بارے میں کہا جائے کہ اس دن نماز یا عبادت عمر بھر کی نماز یا عبادت کا قائم مقام بن سکتی ہے۔ ایسی بے دلیل باتوں سے دور رہنا چاہیے۔

ارکان اسلام کا تارک

سوال: میڈسٹون کینٹ ونگ جیل سے محمد اسلم پوچھتے ہیں

ایک آدمی جو نماز بھی نہیں پڑھتا اور دیگر ارکان اسلام کا بھی پابند نہیں اور اسی حالت میں مر جاتا ہے تو قرآن و حدیث کی روشنی میں بتائیں کہ وہ کافر کی موت مرا یا مسلمان کی موت مرا یعنی قیامت کے دن اس کا شمار کن لوگوں میں ہو گا؟

جواب: تارک نماز اگر کفر و انکار یا اللہ کے حکم کا استخفاف (حقیر و معمولی سمجھنا) کرتے ہوئے نماز چھوڑتا تھا تو ایسا شخص کافر ہو گا اور مرنے کے بعد اس سے کافروں

والا معاملہ کیا جائے گا۔ ہاں اگر سستی کی وجہ سے نماز ترک کی لیکن اس کی فرضیت کا انکار نہیں کرتا تھا تو ایسے شخص کا معاملہ مختلف ہوگا۔ دنیا میں اگر یہ شخص صحیح اسلامی ملک میں ہے تو وہ قابل سزا ہے اور اسلامی ریاست کا جج اس کے لئے کوئی سزا تجویز کر سکتا ہے۔ آخرت میں ایسے شخص کو اس جرم کی سخت سزا ہو سکتی ہے لیکن کفار کے ساتھ اسے نہیں اٹھایا جائے گا بلکہ اس کا شمار مسلمانوں میں ہوگا اور قرآن کی اس آیت کی رو سے اگر اللہ چاہے تو اسے معاف بھی کر سکتا ہے

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَادُوْنَ ذَالِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (النساء : ۴۸)

"اللہ تعالیٰ شرک کو ہرگز معاف نہیں کرے گا اس کے علاوہ جسے چاہے معاف کر سکتا ہے۔"

نماز قصر کے ضروری مسائل کیا ہیں؟

سوال: لیوٹن سے مقبول کاظمی لکھتے ہیں

تین سوالات ارسال خدمت کر رہا ہوں امید ہے آپ ان کے جوابات آئندہ شمارے میں شائع فرما کر مخلص کو ممنون ہونے کا موقع مرحمت فرمائیں گے۔

۱۔ نماز قصر کے مسائل کیا ہیں؟

جواب: سفر کی حالت میں جو نماز چار رکعت کی بجائے دو رکعت پڑھی جاتی ہے اسے نماز قصر کہا جاتا ہے۔ قصر کے چند ضروری مسائل درج ذیل ہیں

(الف) بعض کے نزدیک قصر واجب ہے اور بعض نے اسے اختیاری قرار دیا ہے یعنی جو چاہے پوری نماز پڑھ لے اور جو چاہے قصر کر لے۔ صحیح بات یہ ہے کہ سفر میں نماز قصر پڑھنا بہتر اور افضل ہے۔

ہاں اگر کوئی کبھی پوری نماز پڑھ لیتا ہے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ لیکن اللہ نے رخصت کے طور پر ایک ہدیہ دیا ہے' اسے قبول کرنا بہر حال بہتر ہے۔ سورہ نساء کی یہ آیت قصر کا ثبوت ہے۔

﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ﴾

"اور جب تم سفر کے لئے زمین پر نکلو تو قصر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

اب ان الفاظ سے بھی قصر کا لزوم یا وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ (النساء: ۱۰۱)

(ب) قصر کتنے میل یا کیلو میٹر کے سفر پر کیا جا سکتا ہے حدیث میں اس کا کوئی باقاعدہ تعین نہیں۔ ۹ میل سے لے کر ۴۸ میل تک کے اقوال منقول ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام عرف میں سفر کی اصطلاحات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اس لئے شارع علیہ السلام نے اس کی خاص حد مقرر نہیں کی مثلاً آج کے دور میں بسا اوقات انسان ایک بڑے شہر کے اندر یوں چلتے پھرتے ۲۰۔۲۵ میل کا سفر طے کر لیتا ہے لیکن وہ شرعی اصطلاح میں مسافر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک دیہات یا چھوٹے شہر سے ۹۔۱۰ میل کا سفر کر کے دوسری جگہ جانے والا بھی اپنے آپ کو مسافر خیال کرتا ہے تو دراصل یہ عرف اور احساس کا مسئلہ ہے۔ ہر مسلمان خود فیصلہ کرے کہ وہ کب اور کس صورت میں اپنے آپ کو مسافر خیال کرتا ہے۔ جیسا کہ بیماری کی صورت میں نماز بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت ہے لیکن شارع علیہ السلام نے یہاں بھی بیماری کی قسموں یا نماز کی حد کا تعین نہیں کیا کہ کون سی بیماری ہو یا کتنا بخار ہو تو بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت ہے ورنہ نہیں۔ بلکہ یہ بھی ہر انسان اپنے بارے میں خود فیصلہ کرے گا کہ اس وقت اس کی کیفیت اور احساس کیا ہے۔ یہی صورت سفر کے بارے میں ہے۔ اگر ۹ میل سفر میں کوئی شخص ذہنی طور پر اپنے آپ کو مسافر خیال کرتا ہے تو اسے قصر کی اجازت ہے اور اگر کوئی شخص ۳۰ میل میں بھی اپنے آپ کو مسافر خیال نہیں کرتا تو اسے قصر نہیں کرنا چاہئے۔ بہر حال قرآن و سنت میں اس کی واضح حد مقرر نہیں ہے۔

(ج) ظہر 'عصر اور عشاء کی نماز قصر ہو گی 'فجر اور مغرب کی قصر نہیں ہے۔ سفر میں سنتیں معاف ہیں عشاء کے وتر اور فجر کی سنتیں پڑھ لے تو بہتر ہے بعض لوگ فرض تو قصر کر لیتے ہیں مگر سنتیں اور نوافل کی خوب پابندی کرتے ہیں۔ اس سے بظاہر قصر کی غرض و غایت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ تخفیف اور رعایت جو دی گئی ہے اس سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔

(د) قصر کی مدت کے بارے میں صحیح ترین روایت صحیح بخاری کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب فتح مکہ ہوئی تو آپؐ نے وہاں ۱۹ دن قیام کیا اور آپ دو رکعت نماز یعنی قصر پڑھتے رہے۔

لہٰذا اگر ٹھہرنے کی مدت معلوم ہے تو ۱۹ دن تک قصر کر سکتا ہے اس سے اوپر ہو تو پوری نماز پڑھے گا اور اگر قیام کی مدت معلوم نہ ہو اور شک میں ہو کہ کب تک ٹھہرے گا تو پھر جب تک ٹھہرے قصر کر سکتا ہے

(ر) سفر میں نمازوں کو جمع کر کے پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ ظہر و عصر اور مغرب 'عشاء ایک ساتھ پڑھی جا سکتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ :

"رسول اکرم ﷺ جب سفر پر روانہ ہوتے تو بعض اوقات ظہر و عصر گھر پر ملا کر پڑھ لیتے اور اگر ظہر کا وقت نہ ہوتا تو پھر آپ چل پڑتے اور راستے میں جب عصر کا وقت شروع ہو جاتا تو دونوں کو ملا کر پڑھ لیتے۔ اس طرح اگر سورج گھر پر غروب ہو جاتا تو مغرب کے ساتھ عشاء بھی پڑھ لیتے اور اگر سورج گھر سے روانہ ہونے سے پہلے غروب نہ ہوتا تو پھر آپ عشاء کے وقت دونوں کو ایک ساتھ پڑھ لیتے۔"

یہ وہ آسانیاں ہیں جو اس امت کے لئے عطا کی گئی ہیں۔

وتر کی نماز کا وقت کیا ہے؟

سوال: شیفیلڈ سے عبدالحق پوچھتے ہیں وتر کی نماز کے لئے کون سا خاص وقت مقرر ہے؟ وتر کتنی رکعت ہیں اور کس طرح پڑھی جائیں؟

جواب: وتر کی نماز عمومی طور پر نماز عشاء یا رات کی نماز کا حصہ ہے۔ جو شخص آدھی رات کے آخری حصے میں تہجد یا نوافل پڑھنے کا عادی نہیں ہے اس کے لئے وتر کا مناسب وقت عشاء کے فوراً بعد ہے اور جو رات کی نماز پڑھتا ہے اسے سب سے آخر میں وتر پڑھنے چاہئیں جیسے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ رات کی نمازوں میں سے وتر سب سے آخر میں پڑھنا چاہئیں۔ (بخاری)

وتر کی رکعات ایک، تین، پانچ اور سات تک پڑھنا ثابت ہیں۔ بنیادی طور پر وتر تو ایک ہی ہوتا ہے۔ باقی رکعات اس کے ساتھ ملائی جائیں گی۔ کیونکہ وتر کا معنی ہی ایک ہے۔ بعض روایات سے ۹، ۱۱ اور ۱۳ رکعات کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

وتر پڑھنے کے تین طریقے معروف ہیں:

- تین، پانچ، یا سات وتر ایک ہی دفعہ یعنی ایک تشہد (آخر میں) اور ایک سلام سے پڑھے جائیں۔
- دوسرا یہ کہ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے اور پھر ایک رکعت الگ سے پڑھی جائے۔
- تیسرا یہ کہ دوسری رکعت میں تشہد پڑھ کر کھڑے ہو جائیں اور تیسری رکعت کے بعد سلام پھیریں۔

پہلے دو طریقوں کی احادیث سے زیادہ تائید ہوتی ہے۔ اس مسئلے پر درج ذیل احادیث قابل توجہ ہیں:

۱۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کی نماز میں جب تیرہ رکعت پڑھتے تو آپ پانچ رکعت ایک ساتھ وتر پڑھتے اور صرف آخر میں تشہد بیٹھتے۔ (بخاری و مسلم)

۲۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ جب تین یا پانچ رکعت پڑھتے تو آپ درمیان میں نہیں بلکہ آخر میں بیٹھتے۔(ابوداؤد نسائی)

۳۔ حضرت سعد بن ہشامؒ نے حضرت عائشہؓ سے حضور ﷺ کے وتر کے بارے میں پوچھا تو ام المومنینؓ نے فرمایا جب حضور ﷺ نو رکعت وتر پڑھتے تو آپ آٹھ رکعت سے پہلے نہ بیٹھتے۔ (مفصل حدیث کا حصہ)(مسلم ابوداؤد نسائی)

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ ان دونوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا۔ آپؐ نے فرمایا:

الوتر رکع من اخر اللیل (مسلم مترجم جلد ۲ ص ۲۵۱)

وتر ایک رکعت ہے رات کے آخری حصے میں۔

۵۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے دو رکعت پڑھیں۔اس کے بعد کھڑے ہوئے ایک رکعت وتر پڑھی۔ (نیل الاوطار)

۶۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "وتر پڑھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے جو پانچ پڑھنا چاہے وہ پانچ پڑھ لے جو تین پڑھنا چاہے وہ تین پڑھ لے اور جو ایک پڑھنا چاہے اسے ایک پڑھ لینا چاہئے۔"

ان احادیث سے وتر کی نماز کے سارے پہلو واضح ہو گئے ہیں۔

نماز وتر کی رکعات اور ادا کرنے کا طریقہ

سوال: لیوٹن سے مقبول احمد کاظمی تحریر کرتے ہیں۔

میں عام طور پر وتر کی نماز کی تین رکعات ادا کرتا ہوں اور دو رکعت کے بعد تشہد بیٹھ

کر' پھر تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہوتا ہوں کچھ حضرات دو رکعت کے بعد التحیات نہیں بیٹھے بلکہ وہ صرف ایک بار آخری رکعت ختم کرنے کے بعد ہی تشہد بیٹھتے ہیں۔ براہ کرم صحیح طریقے سے مطلع کریں۔

جواب: نماز وتر کی رکعات اور طریقہ ادائیگی کے سلسلے میں مختلف روایات موجود ہیں۔ وتر کی نماز میں ایک رکعت بھی ثابت ہے اور تین پانچ سات اور نو رکعتیں بھی ثابت ہیں۔

اسی طرح ادا کرنے کے طریقے بھی مختلف ہیں کہ ایک ہی قعدہ اور ایک سلام کے ساتھ ساری رکعات پڑھ لی جائیں' یا آخری رکعت سے پہلے تشہد کے لئے بیٹھ جائے جیسے تین رکعت میں دوسری رکعت کے بعد تشہد کے لئے بیٹھیں پھر آخری رکعت کے بعد تشہد کے بعد سلام پھیر دیں یا دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیں پھر الگ سے ایک رکعت پڑھیں۔ بہرحال اس میں کافی وسعت اور گنجائش موجود ہے لیکن ہم وتر کی نماز ایک ہی قعدہ اور ایک سلام کے ساتھ پڑھنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس سلسلے میں کافی زیادہ روایات موجود ہیں۔ جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی ﷺ تین رکعات وتر پڑھتے تھے اور صرف آخری رکعت ہی میں قعدہ فرماتے۔ (حاکم)

ایک اور روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ رات کی نماز میں تیرہ رکعات پڑھا کرتے تھے جن میں سے پانچ وتر کے طور پر پڑھتے اور پانچ رکعات اس طرح پڑھتے کہ ان کے درمیان کوئی قعدہ نہیں فرماتے بلکہ صرف آخری رکعت ہی میں قعدہ کرتے۔ (بخاری' مسلم' فقہ السنہ)

سوال: ڈارٹ مور ڈیون جیل سے ایم آئی خاں لکھتے ہیں
وتر نماز کم از کم اور زیادہ سے زیادہ کتنی رکعت پڑھی جاتی ہے؟ اور دعائے قنوت رکوع سے پہلے یا بعد میں کس طرح پڑھی جاتی ہے؟

جواب: بعض احادیث میں ۷، ۹، ۱۱، ۱۳ رکعت تک کا ذکر بھی ہے۔ بہر حال ایک رکعت وتر پڑھنا ثابت ہے۔

وتر میں دعائے قنوت رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد دونوں طرح سے ثابت ہے اور رکوع کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بہتر ہے۔

سوال: ایک صاحب پوچھتے ہیں

اگر دعائے قنوت پڑھنا بھول جائے تو کیا سجدہ سہو ہوگا؟

جواب: اگر کوئی شخص تراویح کی نماز کے بعد وتر کی نماز میں یا ویسے وتر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھنا بھول گیا ہے تو اس پر سجدہ سہو نہیں ہوگا۔ کیونکہ کسی حدیث میں دعائے قنوت کا وجوب ثابت نہیں ہے بلکہ بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے رمضان میں صرف پندرہ دن دعائے قنوت پڑھی۔

☆☆☆

حضور ﷺ کس وقت وتر پڑھتے تھے؟

سوال: کیا حضور ﷺ تہجد پڑھ کر وتر پڑھتے تھے یا کہ وتر پڑھ کر پھر نیند سے بیدار ہو کر تہجد پڑھا کرتے تھے؟

جواب: رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز کے بعد جلدی سو جاتے اور پھر جب رات کا تیسرا حصہ باقی رہ جاتا تو پھر تہجد کے لئے اٹھتے اور آخر میں وتر پڑھتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ ایک رات میں اپنی خالہ میمونہ کے ہاں سویا اور رسول اللہ ﷺ بھی وہاں قیام فرما تھے۔ آپ نے عشاء کی نماز کے بعد تھوڑی دیر گھر والوں کے ساتھ ضروری باتیں کیں اور پھر سو گئے۔ جب رات کا تیسرا حصہ باقی تھا تو آپؐ بیدار ہوئے پہلے قرآنی آیات پڑھیں پھر تہجد کی تیاری کی اور میں بھی آپ کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ آپؐ نے مجھے کان سے پکڑ کر اپنی دائیں طرف کھڑا کیا اور پھر تیرہ رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد آپ لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ حضرت بلالؓ نے فجر کی اذان دی اور آپ نے نماز پڑھائی۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”رات کو اپنی آخری رکعت وتر کو بناؤ“

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا معمول یہی تھا کہ آپ وتر رات کے آخری حصے میں تہجد کے بعد پڑھتے تھے اور یہی افضل ہے۔ لیکن کوئی شخص رات کے آخری حصے میں اٹھنے کی امید نہ رکھتا ہو تو اسے سونے سے پہلے وتر پڑھ لینے چاہئیں کیونکہ حضرت جابرؓ کی حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جو شخص ڈرے کہ رات کو آخر میں اٹھ نہیں سکے گا تو اول شب میں وتر پڑھ لے اور جو امید رکھے کہ آخر رات اٹھ سکے گا وہ آخر رات وتر پڑھے کیونکہ آخری رات کی نماز میں

رحمت کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔

کیا ایک رکعت سے حضور نے منع کیا ہے؟

سوال: لیوٹن سے مقبول کاظمی لکھتے ہیں
اکثر حضرات کو یہ کہتے ہوئے یہ سنا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک رکعت تنہا کی ادائیگی سے منع فرمایا ہے نیز صلوٰۃ الوتر کو مغرب کی نماز جیسا مت بناؤ۔

جواب: احادیث میں نماز وتر کے مختلف طریقے منقول ہیں اور وتر کی تعداد کے بارے میں بھی متعدد روایات ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک سے لے کر ۱۳ تک وتر پڑھ سکتے ہیں۔

ابوداؤد اور ابن ماجہ کی روایت جو حضرت ابوایوبؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا وتر ہر مسلمان پر واجب ہے جو پانچ سے وتر کرنا پسند کرے وہ کر سکتا ہے جو تین سے کرنا چاہے وہ کر سکتا ہے جو ایک سے کرنا چاہے وہ بھی کرے۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ وتر کی نماز آپؐ سے تیرہ' گیارہ' نو' سات' پانچ' تین اور ایک وتر رکعت روایت کی گئی ہے۔

امام ترمذیؒ نے محمد بن سیرین کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ صحابہ کرامؓ پانچ، تین اور ایک رکعت وتر پڑھتے تھے اور سب کو درست سمجھتے تھے۔

ان روایات کے بعد اس امر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ ایک وتر بھی جائز ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وتر کا معنی ہی جب ایک ہے تو اصل وتر ایک ہے۔ باقی رکعات کو ساتھ ملا کر وتر پڑھنے کے مختلف طریقے وارد ہوئے ہیں ان میں بھی بہتر طریقہ یہی ہے کہ اگر تین رکعت پڑھے تو دو پڑھ کر سلام پھیر دے اور پھر ایک رکعت الگ سے ساتھ ملا کر پڑھے۔ تین رکعت اکٹھی ایک سلام سے بھی پڑھ سکتا ہے اور مغرب سے وتر کو

مشابہت دینے سے جو منع کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ تین رکعت سے منع کیا گیا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ درمیان میں تشہد میں نہ بیٹھا جائے اور ایک آخری تشہد کر کے سلام پھیر دیا جائے۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

کان رسول اللہ ﷺ یوتر بثلاث لا یقعد الا فی آخرھن[1]

کہ رسول اللہ ﷺ تین وتر پڑھتے اور صرف آخر میں بیٹھتے۔

سبحان ربی الاعلیٰ کے علاوہ دعائیں؟

سوال: سجود اور رکوع میں عموماً پڑھی جانے والی دعا سبحان ربی الاعلی کے علاوہ اگر کوئی شخص دوسری دعائیں بھی پڑھنا چاہے تو کیا وہ پڑھ سکتا ہے؟

(علامہ یوسف قرضاوی جواب دیتے ہیں)

جواب: مومن حالت نماز میں خواہ وہ نماز فرض ہو یا نفل دعا کے موقعوں پر جو چاہے دعا کر سکتا ہے اور نماز میں دعا کرنے کے یہ مقامات ہیں۔ دونوں سجدے' دونوں سجدوں کے درمیان کا وقفہ' آخری تشہد میں تشہد اور درود شریف کے بعد والا وقفہ۔ ان موقعوں پر مومن حسب خواہش دعا کر سکتا ہے جیسا کہ حضور اکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ۔ آپؐ دونوں سجدوں کے درمیان یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اللھم اغفرلی وارحمنی واھدنی واجبرنی وارزقنی وعافنی[2]

مزید آپؐ فرمایا کرتے کہ:

"رکوع کی حالت میں اپنے رب کی عظمت بیان کیا کرو اور سجدے کی حالت

---

[1] تلخیص الحبیر ۲/۱۵ فتح الباری ۲/۵۵۸

[2] ترمذی مترجم ج ۱ ص ۱۴۰ ترمذی صحیح للالبانی جلد اول ص ۹۰ رقم الحدیث ۲۸۴

میں کثرت سے دعا کیا کرو کیونکہ سجدے میں دعا کی قبولیت کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔" (صحیح مسلم)

اسی طرح مسلم شریف ہی میں ابوہریرہؓ سے روایت آئی ہے کہ

آپؐ نے فرمایا کہ بندہ سجدے کی حالت میں اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے لہٰذا سجدے میں کثرت سے دعا کیا کرو۔

صحیحین میں عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ جب نبی ﷺ نے انہیں تشہد سکھا دیا تب فرمایا کہ اس کے بعد جو دعا تمہیں پسند ہو مانگ سکتے ہو۔

اسی طرح کی بہت سی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ نماز میں ان موقعوں پر دعا مانگی جا سکتی ہے اور مومن دنیا اور آخرت سے متعلق ہر دعا کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں خدا تعالیٰ کی نافرمانی یا قطع رحمی کا عنصر شامل نہ ہو۔

جمعہ کے مسائل

نماز جمعہ اور ایک اذان

سوال: نماز جمعہ کے لئے عام طور پر دو اذانیں ہوتی ہیں مگر ہم نے کچھ مسجدوں میں دیکھا کہ ایک اذان دی جاتی ہے۔ کیا جمعہ کے لئے ایک اذان بھی جائز ہے؟ (محمد نیک عالم، کارڈف)

جواب: جمعہ کے لئے صرف ایک اذان دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کے دور میں ایک ہی اذان ہوتی تھی۔ آپ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے دور خلافت میں بھی نماز جمعہ کی ایک ہی اذان ہوتی تھی۔ حضرت عثمان غنی کے زمانے میں ایک ضرورت کے تحت دوسری اذان شروع ہوئی اور چونکہ صحابہ کرام نے اس پر موافقت کی اس لئے دو اذانیں بھی جائز ہیں۔ لیکن سنت پہلی اذان ہی ہو گی۔

بہر حال اس مسئلے پر اختلاف کرنے یا لڑائی جھگڑے کی ضرورت نہیں۔

کیا شراب خانے میں جمعہ پڑھایا جاسکتا ہے؟

سوال: ہم ایک ایسے شہر میں ہیں جہاں ہماری ضرورت کے مطابق نماز پڑھنے کیلئے کوئی جگہ نہیں اور مسلسل ایک ایسی جگہ نماز جمعہ پڑھنے کیلئے مل رہی ہے جہاں پورا ہفتہ رقص وسرود اور شراب نوشی جیسی منکرات ہوتی ہیں۔ کیا ہم جمعہ کے دن اس جگہ کو صاف کر کے نماز جمعہ ادا کر سکتے ہیں؟

جواب: جس جگہ پر فسق وفجور اور معاصی کا ارتکاب ہوتا ہو وہاں نماز جمعہ کی ادائیگی درست نہیں ہے۔ ایک تو وہ مقام نماز جمعہ یا اطاعت الٰہی کا نہیں ہے اور پھر اس سے یہ شبہ پیدا ہونے کا بھی اندیشہ ہے کہ اسلام ان برائیوں کا مخالف نہیں ہے۔ معروف محدث وفقیہ امام ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ جس جگہ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ یا دین کی کسی بات کا مذاق اڑایا جائے یا کفر کیا جائے تو اس جگہ نماز پڑھنا درست نہیں ہے۔ اس لیے جہاں سارا ہفتہ گندگی اور بے ہودگی رہے، ہاں ایک دن صفائی کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حق اور باطل دونوں ایک جگہ نہیں ہو سکتے۔ آپ کوئی پاکیزہ جگہ تلاش کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے گا۔ اس وقت تک آپ کسی گھر یا کھلی فضا میں بھی نماز جمعہ ادا کر سکتے ہیں۔

سوال: جب میں کالج جاتا ہوں تو راستے میں برے اور فحش مناظر سے اپنی توجہ ہٹانے کے لئے قرآن کی تلاوت کرتا رہتا ہوں۔ کیا راستے میں قرآن کی تلاوت کرنا درست ہے؟ نیز اس سے پہلے مجھ سے جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان کا مداوا کیا ہے؟

جواب: آپ نے جس عمل یا عادت کا ذکر کیا ہے اس میں سراسر خیر اور بھلائی ہے۔ دعا استغفار اور قرآن کی تلاوت قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں اور اس سے روح کو تازگی اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو مومن کی صفت ہے کہ اس کی زبان چلتے پھرتے بھی اللہ کا ذکر کرے اور پھر اس کے ذریعہ آپ ان فحش اور قبیح مناظر کے اثرات سے بھی محفوظ رہ سکتے ہیں جو راستے میں آپ کے سامنے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس عمل پر قائم رہنے کی توفیق بخشے' آمین- جہاں تک آپ کی سابقہ غلطیوں کا تعلق ہے تو توبہ سب گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہے حتیٰ کہ شرک جیسا بڑا جرم بھی توبہ کے ذریعے معاف ہو سکتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ (الفرقان : ۷۰)

''مگر جو لوگ توبہ کریں اور اس کے بعد ایمان کا اقرار کریں اور نیک عمل کریں یہی ہیں جن کی برائیاں نیکیوں میں تبدیل کر دی جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے''

تو اس طرح نیک اعمال کرنے سے بھی برائیوں کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔

جمعہ کے دو فرض کے بعد چار فرض کی شرعی حیثیت؟

سوال: لیڈز سے محمد یٰسین لکھتے ہیں کہ جمعہ کے دو فرض پڑھنے کے بعد کیا مقتدی پھر چار فرض دوبارہ پڑھ سکتے ہیں؟ کیونکہ یہ مسئلہ بھی سنا ہے۔

جواب: جمعہ کے دو فرض کے بعد پھر چار فرض پڑھنا ثابت نہیں۔ ہم اس سے پہلے بھی ''صراط مستقیم'' میں اس مسئلے پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ دوبارہ احتیاطی چار فرض پڑھنے کا کوئی بھی ثبوت نہیں ہے۔ یہاں ہم صرف اس عبارت کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ جو فقہ کی مشہور کتاب ''فقہ السنہ'' کے مصنف سید سابق نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں درج کی ہے وہ فرماتے ہیں:

اما صلوة الظهر لمن صلى الجمعة فانها لا تجوز اتفاقا لان الجمعة بدل الظهر فهي تقوم مقامه والله لم يفرض علينا ست صلوات و من اجاز الظهر بعد الجمعة فانه ليس له مستند من عقل او نقل لا عن كتاب ولا عن سنة ولا عن احد من الائمة (حاشية فقه السنة ١/٢٦٦)

نماز جمعہ کے بعد پھر نماز ظہر کا (یعنی چار احتیاطی) پڑھنا بالاتفاق ناجائز ہے کیونکہ جمعہ ظہر کا بدل اور یہ اس کا قائم مقام ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہم پر چھ نمازیں ہرگز فرض نہیں کیں اور جو لوگ اسے جائز قرار دیتے ہیں ان کے پاس کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں ہے نہ کتاب سے نہ سنت سے اور نہ کسی امام

ہے"

اب اس بارے میں دلیل پیش کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو چار فرض پڑھنے کے قائل ہیں۔

سوال: لیوٹن سے مقبول کاظمی پوچھتے ہیں نماز جمعہ کے بعد سنتیں کون سی ہیں؟

جواب: نماز جمعہ کی رکعات کے بارے میں "صراط مستقیم" کے گزشتہ شمارے میں کچھ تفصیل شائع ہو چکی ہے۔ مختصر یہ کہ جمعہ کی نماز ظہر ہی کی نماز ہے صرف فرض نماز دو رکعت کم کر کے ان کی جگہ خطبہ دیا جاتا ہے۔ نماز جمعہ کے بعد سنتوں کے بارے میں جو احادیث آئی ہیں ان میں درج ذیل قابل ذکر ہیں:

○ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم جب جمعہ پڑھو تو بعد میں چار رکعات پڑھ لیا کرو (ابوداؤد' ترمذی)

○ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ جمعہ کے بعد دو رکعت اپنے گھر میں پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

بعض صحابہؓ سے جمعہ کے بعد ۶ رکعات کی روایات بھی مروی ہیں۔

اس سلسلے میں کوئی چیز لازم نہیں ہے یعنی دو رکعت' چار رکعت یا چھ رکعت نماز پڑھ سکتا ہے جس طرح آسانی یا سہولت میسر ہو لیکن سب رکعات سنت ہیں۔ چار رکعات پڑھنے کا طریقہ ایک ساتھ بھی جائز ہے لیکن اگر دو دو رکعت کر کے پڑھی جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

جواب: مانچسٹر سے محمد اسحاق دریافت کرتے ہیں

یہاں اکثر لوگ جمعہ کے دو فرض کے بعد چار رکعت نماز فرض ظہر پڑھتے ہیں۔ بعض اسے چار رکعات احتیاطی ظہر کہتے ہیں۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ نے دو فرض نماز جمعہ پڑھی۔ براہ کرم اس مسئلے کی بھی حدیث شریف کی رو سے وضاحت کریں۔

جواب: نماز جمعہ وہ فرض ہے جسے نماز ظہر کے ساتھ منسلک اس صورت میں کیا گیا

ہے کہ ظہر کی نماز کے دو فرض کم کر دیئے گئے اور ان کی جگہ خطبہ جمعہ رکھا گیا اور اس وقت سے نماز جمعہ کے دو ہی فرض چلے آرہے ہیں۔ جمعہ کے دو فرض کے بعد پھر نماز ظہر کے چار فرض پڑھنا جائز نہیں ہے- اس طرح پانچ فرض نمازوں کی بجائے چھ نمازیں نہیں ہیں- جو لوگ اس کو ظہر احتیاطی کہتے ہیں یہ بھی بے ثبوت چیز ہے کہ ہمیشہ پوری زندگی آدمی احتیاطی نماز ہی پڑھتا رہے۔ اگر بعض لوگوں کی فقہ میں برطانیہ جیسے ملک میں نماز جمعہ فرض نہیں تو پھر وہ باقاعدہ ظہر پڑھا کریں۔ ہمیشہ دو نمازیں الگ الگ پڑھنے کی آخر کیا تک ہے؟ اس لئے ہمارے سامنے کتاب و سنت کی کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ آدمی ہمیشہ جمعہ بھی پڑھے اور چار رکعات ظہر کے فرض' یا احتیاط بھی پڑھے- واللہ اعلم بالصواب

سوال: میڈسٹون جیل سے محمد اسلم لکھتے ہیں

جمعہ کی نماز میں ایسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی خطبہ دے اور دوسرا نماز پڑھائے؟

جواب: جمعہ کی نماز میں مسنون طریقہ تو یہی ہے کہ امام خطبہ دے اور نماز پڑھائے لیکن اگر ضرورت کے پیش نظر خطبہ ایک آدمی دے اور نماز دوسرا آدمی پڑھائے تو یہ جائز ہے۔

عورت نماز جمعہ ادا کر سکتی ہے؟

سوال: لیڈز سے محمد یٰسین لکھتے ہیں کیا عورتوں کو نماز جمعہ کی اجازت ہے؟

جواب: آپ کا سوال عورتوں کا نماز جمعہ کے لئے مسجد میں آنے کے بارے میں ہے اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں عورتیں نہ صرف نماز جمعہ میں بلکہ دوسری نمازوں میں بھی مسجد میں حاضر ہوتی تھیں۔ اس لئے اگر ضرورت کا تقاضا ہو تو عورتوں کو نماز جمعہ اور دوسرے اجتماعات میں شرکت کے لئے مسجد میں جانے کی ترغیب دینی چاہیے۔

مسند احمد اور ابو داؤد میں یہ حدیث مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ[1]

"کہ اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں جانے سے مت روکو۔"

بعض لوگ عورتوں کو مساجد میں جانے سے منع کرنے کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ عورتیں میک اپ کر کے جب مسجدوں میں جائیں گی تو اس سے فتنے پیدا ہوں گے۔

یہ درست ہے کہ عورتیں بناؤ سنگار اور زیب و زینت کر کے باہر نہیں نکل سکتیں اور نہ ہی مساجد میں آسکتی ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ انہیں مساجد میں آنے سے روک دیا جائے بلکہ اس کے بجائے انہیں میک اپ اور غیر ضروری زیبائش سے روکنا چاہیے اور خود نبی کریم ﷺ نے بھی فرمایا کہ جس عورت نے خوشبو لگائی ہوئی ہو تو اسے مسجد میں نہیں آنا چاہیے۔

ہمارے ہاں یہ عجیب منطق ہے کہ وعظ و تبلیغ کے حلقوں کے لئے عورتوں کو دوسرے شہروں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی لے جاتے ہیں لیکن نماز جمعہ کے لئے اپنے شہر میں جانے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ یہ بلا جواز شدت ہے اور اس دیار غیر میں عورتوں کے دین سیکھنے کے راستے میں رکاوٹ ہے۔

صرف خطبہ جمعہ کے لئے خطیب ہو؟

سوال: جو امام یا خطیب صرف ایک نماز جمعہ ہی کا ہو اس کو باقی دنوں کی نمازیں کیا معاف ہیں؟

جواب: جس امام نے جس قدر ذمہ داری قبول کی ہے وہ اسی حد تک نبھانے کا پابند ہے۔ اگر ایک مسجد میں ایک شخص کی صرف خطبہ جمعہ دینے کی ڈیوٹی ہے تو باقی نمازوں

---

[1] أبوداود مترجم جلد أول كتاب الصلاة باب ما جاء في خروج النساء الى المسجد ص ۲۵۹ رقم الحديث ۵۶۲

کے لئے اس پر یہ پابندی نہیں ہے کہ وہ بھی اسی مسجد میں ادا کرے۔ لیکن اگر وہ خطیب وہاں موجود ہے یا مسجد کے قریب رہتا ہے اور مسجد میں با قاعدہ نماز پنجگانہ ہوتی ہے اور اس کے باوجود حضرت صاحب مسجد میں تشریف نہیں لاتے تو یہ جائز نہیں ہے حضور ﷺ نے تو عام آدمی کو بھی اس امر کی اجازت نہیں دی کہ وہ بغیر کسی عذر کے مسجد سے غیر حاضر رہے کجا ایک عالم دین ہونے کے دعویدار شخص کے لئے یہ جائز ہو کہ وہ جمعہ کے دن لوگوں کو وعظ و نصیحت کرے لیکن ہفتے کے باقی دن جان بوجھ کر بغیر کسی عذر کے مسجد میں نہ آئے۔ ایسے شخص کو امام یا خطیب بنانے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

نماز جنازہ

نماز جنازہ کے لئے اذان کیوں نہیں؟

سوال: میں سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ نماز جنازہ کی اذان کیوں نہیں ہوتی۔ کیا پیدائش کے وقت جو اذان دی جاتی ہے وہی نماز جنازہ کی اذان ہوتی ہے؟ (محمد افتخار عاصی' چرچل ایونیو' مانچسٹر)

جواب: جنازے کی نماز سے پہلے اذان یا تکبیر رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے اور ہمارے لئے سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ جو چیز حضورؐ سے ثابت نہ ہو اس کا ہم اپنی طرف سے اضافہ نہیں کر سکتے۔ جہاں تک پیدائش کے موقع پر کہی جانے والی اذان کا تعلق ہے آنحضرت ﷺ سے تو ایسی کوئی چیز ثابت نہیں جس کی بنیاد پر ہم اس اذان کا نماز جنازہ سے تعلق جوڑ سکیں لیکن بعض فقہاء اور اسرار احکام شریعت پر بحث کرنے والے علماء نے نماز جنازہ کے موقع پر اذان نہ دیئے جانے کی حکمت یہی بیان فرمائی ہے کہ جب انسان دنیا میں آتا ہے تو اس کے ایک کان میں اذان اور دوسرے میں اقامت کہہ کر سب سے پہلے اللہ کا نام اس کے کان میں ڈالا جاتا ہے جس نے تجھے پیدا کیا ہے اسی کے احکام کے مطابق تو نے دنیا میں زندگی بسر کرنا ہے اور ساتھ ہی اس اذان اور تکبیر سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں تو اپنے قیام اور ٹھہرنے کی مدت کا اندازہ اس بات سے کر سکتا ہے کہ اذان اور تکبیر ہو چکی۔ بس اب جماعت کھڑی ہونے کی دیر ہے یعنی تیرا قیام بالکل عارضی اور مختصر ہے جسے تو نے غنیمت سمجھنا ہے اور اپنی آخرت کا توشہ جمع کرنے کے لئے اعمال صالحہ کے لئے محنت کرنی ہے۔

کیا نماز جنازہ بلند آواز سے پڑھنا حدیث سے ثابت ہے؟

سوال: کیا نماز جنازہ میں قرات اور دعائیں بلند آواز سے پڑھنا ثابت ہے؟ ایک مولوی صاحب نے کہا کہ جہری (اونچی آواز سے) پڑھنا کسی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

جواب: رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ کو دین کی تمام باتیں وضاحت اور تفصیل سے سکھاتے تھے۔ ہر عمل اور اس کے طریقے کے بیان میں کوئی کمی باقی نہیں چھوڑتے تھے۔ اس طرح میت سے متعلق احکام و مسائل کو بھی آپ نے پوری وضاحت سے بیان فرمایا جن میں متعدد طویل اور مختصر دعائیں بھی شامل ہیں جو رسول اللہؐ نے نماز جنازہ کے دوران پڑھیں۔ آپ نے جو بلند آواز سے نماز جنازہ کے متعلق دریافت کیا ہے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل تین احادیث کا ذکر بے حد مفید ہوگا۔ اور ان پر غور کرنے کے بعد آپ کو مسئلہ سمجھنے میں کافی آسانی رہے گی۔

عن عوف بن مالك قال سمعت النبی ﷺ علی جنازه يقول اللهم اغفرله و ارحمه و عافه و اعف عنه واكرم نزله و وسع مدخله واغسله بماء و ثلج و برد و نقه من الخطايا كما ينقى الثوب الابيض من الدنس وابدله دارا خير من داره و اهلا خير من اهله و زوجا خير من زوجه وقه فتنة القبر و عذاب النار قال عوف فتمنيت ان لو كنت انا الميت لدعاء رسول الله ﷺ لذالك الميت۔ (مختصر صحيح مسلم للالبانی رقم الحديث ٤٧٧)

حضرت عوفؓ بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو میں نے ایک میت پر جنازہ کے دوران یہ دعا پڑھتے ہوئے سنا۔ "اے اللہ! بخش دے۔ اس پر رحم فرما۔ اسے معاف کردے اور اسے عافیت دے۔ اس کی مہمان نوازی فرما اور اسے وسیع ٹھکانہ عطا فرما اور اسے گناہوں سے پانی کی مختلف شکلوں (ماء، ثلج، برد وغیرہ) سے دھودے اور

اس کے گناہوں کو اس طرح صاف کر دے جس طرح سفید کپڑے کو میل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اسے آخرت میں ایسا گھر نصیب فرما جو دنیا کے گھر سے بہتر ہو۔ اسے دنیا سے بہتر اہل خانہ عطا فرما اور دنیا سے بہتر جوڑا عطا کر۔ اسے قبر اور جہنم کے عذاب سے بچا حضرت عوف کہتے ہیں کہ یہ پیاری دعائیں سن کر مجھے رشک آیا کہ کاش آج میں اس کی میت کی جگہ ہوتا اور مجھ پر حضورؐ یہ دعائیں پڑھتے۔ (مسلم ونسائی)

○ دوسری حدیث واثلہؓ بن اسقع کی ہے۔ فرماتے ہیں

صلی بنا رسول الله ﷺ علی رجل من المسلمین فسمعته یقول اللهم ان فلان ابن فلان فی ذمتك وحبل جوارك فقه فتنة القبر و عذاب النار وانت اهل الوفاء و الحمد اللهم اغفرله وارحمه انك انت الغفور الرحيم۔[1]

حضرت واثلہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے ساتھ مسلمانوں میں سے ایک آدمی کی نماز جنازہ پڑھائی تو میں نے آپ کو یہ دعا پڑھتے ہوئے سنا آپ فرما رہے تھے: اے اللہ! اب فلاں ولد فلاں تیرے سپرد اور تیرے پڑوس میں آچکا ہے۔ پس اسے قبر اور آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ اور تو وعدے پورے کرنے والا اور تعریف کے لائق ہے۔ اے اللہ تو اسے بخش دے اور اس پر رحم فرما۔ بے شک تو ہی بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

○ تیسری حدیث ابن عباسؓ کی ہے

انه صلی علی جنازة فقراء بفاتحة الكتاب و قال لتعلموا انه من السنة (رواه البخاری) ایک اور روایت میں یہ لفظ ہیں: فقراء بفاتحة الكتاب و سورة و جهر فلما فرغ قال سنة و حق۔[2]

---

[1] ابوداؤد مترجم کتاب الجنائز ص ۶۱۷ رقم الحدیث ۱۴۲۶

[2] فتح الباری ج ۳ کتاب الجنائز باب قراءۃ الفاتحة ص ۵۶۳ رقم الحدیث ۱۳۳۵۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک جنازہ پڑھا تو سورہ فاتحہ پڑھی اور فرمایا تمہیں علم ہونا چاہیئے کہ یہ سنت ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ ایک اوز سورت بلند آواز سے پڑھی۔ پس جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا یہ سنت اور درست ہے۔ (بخاری' ابوداؤد' ترمذی' نسائی)

اب ان تینوں احادیث پر غور کیجئے۔ پہلی حدیث میں صحابی عوف بن مالکؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ کو یہ دعائیں پڑھتے ہوئے سنا جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپؐ نے بلند آواز سے یہ دعائیں پڑھی تھیں کیونکہ اگر آپؐ آہستہ پڑھتے تو پھر یہ نہ کہا جاتا کہ میں نے آپ کو سنا بلکہ مسلم شریف کی روایت میں اس لفظ سے اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ: "**فحفظتها من دعائه**"[1] (پس میں نے حضورؐ سے سن کر یہ دعا یاد بھی کرلی) اب صاف ظاہر ہے کہ آپؐ نے باآواز بلند دعا کی تھی کہ صحابی نے نہ صرف سنی بلکہ سن کر یاد بھی کرلی۔ اور پھر آخر میں عوف بن مالکؓ نے جو یہ کہا کہ کاش آج میری میت حضورؐ کے سامنے ہوتی اور اس پر یہ دعائیں پڑھی جاتیں۔ اس کے بعد تو کسی شک وشبے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی کہ آپ نے بلند آواز سے دعا پڑھی تھی۔ دوسری حدیث میں بھی حضرت واثلہ نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں نے جب حضورؐ کے پیچھے ایک جنازہ پڑھا تو میں نے آپ کو یہ دعا پڑھتے ہوئے خود سنا۔ اس سے بھی جہری قرأت ثابت ہوتی ہے۔

تیسری حدیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ہے جس میں انہوں نے ایک جنازے پر بلند آواز سے سورت فاتحہ اور ایک سورت پڑھی اور بعد میں اس کی وضاحت فرمائی کہ یہ سنت اور صحیح ہے۔ ابن عباسؓ کی اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں:۔ ایک یہ کہ جنازے میں سور فاتحہ پڑھنا سنت ہے اور دوسرے اس کا اونچی آواز سے پڑھنا بھی ثابت ہوا۔ یہ ہیں وہ ثبوت جو بلند آواز سے جنازہ پڑھنے کے بارے میں دیئے

---

[1] مسلم کتاب الجنائز باب الدعاء للمیت فی الصلاۃ (۸۵-۹۶۳)

جاسکتے ہیں۔

اب رہا کسی مولوی صاحب کا یہ کہنا کہ اس بارے میں کوئی حدیث نہیں ہے تو یہ ان کی علم حدیث سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ ورنہ یہ حدیثیں صحاح ستہ کی کتابوں میں مختلف الفاظ سے روایت کی گئی ہیں۔ جن کتابوں کے حوالے اوپر دیئے گئے ہیں ان میں یہ حدیثیں مولوی صاحب کو مل سکتی ہیں۔

ضروری وضاحت: یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

اول: یہ کہ ان احادیث کے بارے میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قرأت و دعا بلند آواز سے صحابہ کرامؓ کی تعلیم اور ان کو سکھلانے کے لئے پڑھی تھی اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ صحابہ کرام کو یہ دعائیں نہیں آتی تھیں اور حضورؐ ان کو تعلیم دینے کے لئے بلند آواز سے پڑھتے تھے اور دوسری یہ کہ صرف جنازے میں ایک دو بار سن کر ہر آدمی یاد بھی نہیں کر سکتا۔ بعض صحابہؓ نے جیسے حضرت عوف کا ذکر آیا ہے یاد بھی کیں مگر ہر شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ جنازے کے دوران کوئی چیز حفظ بھی کرلے بلکہ صحابہ کرامؓ دوسرے فارغ اوقات میں دین کی باتیں حضور سے سیکھتے اور یاد کرتے تھے اور اگر بالفرض یہ علت تسلیم بھی کرلی جائے کہ حضورؐ صحابہ کرامؓ کو سکھلانے کے لئے اونچی آواز سے پڑھتے تھے تو پھر آج یہ ضرورت کئی گنا زیادہ ہے۔ آج مسلمانوں کی اکثریت کو نہ صرف یہ کہ جنازے کی دعائیں نہیں آتیں بلکہ وہ جنازہ کے طریقے سے بھی واقف نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں تو اونچی آواز سے پڑھنا اور بھی زیادہ ضروری ہے اور مفید ہے تاکہ جن لوگوں کو نہیں آتا وہ سیکھ بھی لیں اور خاموش رہنے کی بجائے آمین کہہ کر امام کے ساتھ دعا میں شریک بھی ہو جائیں۔

دوم: یہ کہ کوئی جھگڑے یا بڑے اختلاف کا مسئلہ نہیں کہ مولوی صاحب حدیث سے ثبوت پیش کرنے کا چیلنج دے دیں (جبکہ احادیث موجود ہیں اور ان کے علم میں

نہیں) بلکہ ہمارے نزدیک دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ آہستہ بھی اور بلند آواز سے بھی کیونکہ حضورؐ سے سری (آہستہ) پڑھنے کی روایات بھی نقل کی گئی ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں ہم اونچی آواز سے پڑھنا اس لئے بہتر سمجھتے ہیں کہ اکثر لوگوں کو جنازے کی دعائیں نہیں آتیں اور اونچا پڑھنے سے نہ صرف یہ کہ وہ دعاؤں میں شریک ہو جاتے ہیں بلکہ اس طریقے سے دعائیں یاد کرنے کا ذوق بھی ان میں پیدا ہو سکتا ہے۔ بہر حال دونوں طرح جائز ہے' اس لئے اس مسئلے پر لڑائی جھگڑے یا اصرار کی چنداں ضرورت نہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

دوبارہ نماز جنازہ کا حکم کیا ہے؟

سوال: برمنگھم سے محمد امین لکھتے ہیں:

میرا تعلق پاکستان کے جس علاقے سے ہے اس کی آبادی کا ایک خاصا حصہ یہاں برطانیہ میں فی الحال مقیم ہے۔ اکثریت بمع اہل وعیال رہائش پذیر ہیں۔ لیکن کسی کی موت واقع ہو جانے کی صورت میں اس کی میت دفنانے کے لئے پاکستان بھجواتے ہیں۔ بے پناہ ہوائی سفر کے اخراجات کی وجہ سے میت کے ہمراہ خاندان کا ایک آدھ فرد ہی جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہاں مسئلہ میت کی نماز جنازہ کا پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ مسلک کے لحاظ سے ہم حنفی ہیں۔ اس لئے بعض علماء کہتے ہیں حنفی مسلک میں میت کا جنازہ صرف ایک ہی دفعہ کیا جا سکتا ہے جس کی طرف اشارہ بہشتی زیور حصہ اول میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے "ایک جنازے کی نماز کئی دفعہ پڑھنا جائز نہیں مگر ولی میت کو جب کہ اس کی بغیر اجازت کسی غیر مستحق نے نماز پڑھا دی ہو دوبارہ پڑھنا درست ہے"

ایسی صورت میں ورثاء کو یہ پریشانی لاحق ہو جاتی ہے کہ اگر جنازہ یہاں کیا جائے تو پاکستان کے احباب ورشتہ دار محروم ہو جاتے ہیں اور اگر وہاں جنازہ پڑھا جائے

تو یہاں کے قریبی احباب ورشتہ دار محروم ہوتے ہیں۔

چونکہ یہ بیان کیا گیا مسئلہ فقہی قیاس معلوم ہوتا ہے۔ امکان غالب یہی ہے کہ اس وقت ایسی صورت نہ پیش آتی ہو۔ لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ وضاحت فرمائیں کہ قرآن وحدیث کی رو سے ایک سے زیادہ نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے کہ نہیں تاکہ پریشانی دور ہو سکے۔

جواب: ایک میت پر دو دفعہ نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں ائمہ کرام کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعیؒ حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے چند اماموں کے نزدیک دوسری مرتبہ نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے خاص طور پہ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے پہلے نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ولی کے سوا کسی دوسرے کے لئے دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔

جمہور کی دلیل بخاری و مسلم کی وہ حدیث ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک قبر کے پاس سے گزرے جس میں رات کے وقت کوئی میت دفن کی گئی تھی تو آپؐ نے فرمایا:

متی دفن هذا قالوا البارحة قال افلا اذنتمونی قالوا دفناه فی ظلمة اللیل فکرهنا ان نوقظك فقام و صففنا خلفه فصلی علیه[1]

”یہ کب دفن کیا گیا؟ لوگوں نے کہا: رات کو۔ تو فرمایا: مجھے تم نے کیوں اطلاع نہیں دی؟ عرض کیا گیا ہم نے رات کے اندھیرے میں اسے دفن کیا اور اس وقت ہم نے آپ کو بیدار کرنا مناسب نہ سمجھا تو رسول اللہ اٹھے اور ہم نے آپ کے پیچھے صفیں باندھیں اور آپ نے نماز پڑھائی۔“

اب اس حدیث سے واضح طور پر جمہور کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ دفن ہونے کے بعد دوبارہ نماز جنازہ پڑھی گئی اور ظاہر ہے دفن سے پہلے تو بالاولی جائز ہونی

---

[1] فتح الباری ج ۳ کتاب الجنائز باب الاذان بالجنازة ص ٤٥٤ رقم الحدیث ١٢٤٧.

چاہیے۔

کنزالعمال میں حضرت علیؓ کے بارے میں بھی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے ایک میت پر نماز جنازہ پڑھی حالانکہ اس پر پہلے نماز پڑھی جاچکی تھی۔

احناف مذکورہ حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دوبارہ اس لئے نماز پڑھی تھی کہ آپ ولی تھے اور ولی کے لئے دوبارہ پڑھنا جائز ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حدیث میں کوئی ذکر نہیں کہ آپ نے دوبارہ نماز ولی کے لئے خاص کی ہے۔ اگر یہ شرط ضروری ہوتی تو نبی کریم ﷺ خود اس کی وضاحت فرمادیتے اور دوسری بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ حضور ﷺ کے علاوہ صحابہ کرامؓ نے بھی دوبارہ نماز پڑھی۔ اگر ولی کے لئے خاص ہوتی تو صرف آپ کو ہی پڑھنی چاہئے تھی۔

بہرحال حدیث مذکورہ سے واضح طور پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے اس لئے اس مسئلے میں زیادہ شدت اختیار نہیں کرنی چاہئے۔ اس لئے بھی کہ یہ میت کے لئے مسنون دعا کا ایک طریقہ ہے۔ جو لوگ اس سے محروم رہیں انہیں موقع دینا چاہئے۔ اور اگر ولی پڑھے تو احناف بھی اجازت دیتے ہیں۔ اس لئے اگر میت کا ولی دوبارہ پڑھانا چاہتا ہے یا کسی اور کو اپنی طرف سے وکیل بنا کر نماز جنازہ پڑھانے کے لئے کہے تو ایسی صورت میں احناف کے نزدیک بھی جائز ہونی چاہئے۔ اور پھر حدیث کی دلیل آجانے کے بعد فروعی مسائل میں کسی ایک فقہ پر اصرار کرنا بھی ضروری نہیں۔

میت پر دوبارہ نماز جنازہ کا حکم؟

سوال: راہد رم سے کرم الٰہی دریافت کرتے ہیں

کیا ایک شخص کسی میت پر دو مرتبہ جنازہ پڑھ سکتا ہے؟ کیونکہ ایک مولانا صاحب نے ایک بھائی کو یہاں جنازہ پڑھنے سے یہ کہہ کر روک دیا کہ تم یہاں جنازے کی نماز میں شرکت نہ کرو اور پاکستان جاکر جنازہ پڑھ لینا۔ اس لئے کہ وہ آدمی میت کے

ساتھ پاکستان جارہا تھا اور ظاہر ہے وہاں دوبارہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔

جواب: دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ ایک میت پر لوگوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ اس کے بعد کچھ لوگ آئے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی تھی۔ انہوں نے اس میت پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک میت پر ایک بار نماز جنازہ ہوگئی دوسری بار کچھ لوگوں نے نماز پڑھی اور اس میں وہ لوگ بھی شامل ہوگئے جنہوں نے پہلے بھی نماز پڑھی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ احناف کے نزدیک دوسری شکل میں ان لوگوں کے لئے نماز جنازہ پڑھنا درست نہیں جو پہلی نماز میں شامل ہوچکے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ احناف کے نزدیک تو پہلی صورت میں بھی نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں۔ یعنی ایک میت پر دوسری بار جنازہ پڑھنا ان کے ہاں ویسے ہی درست نہیں۔

مثلاً ایک شخص کی یہاں برطانیہ میں نماز جنازہ ہوگئی تو اب پاکستان میں یا کسی اور جگہ نماز دوبارہ نہیں پڑھی جائے گی سوائے ولی یا وارث کے اور کوئی دوبارہ نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اب علمائے کرام ایک شخص کو دوبارہ جنازے سے تو روکتے ہیں لیکن ایک میت پر دوبارہ جنازہ پڑھنے سے آخر منع کیوں نہیں کرتے؟

ہماری تحقیق کے مطابق یہ دونوں باتیں بنیادی طور پر درست نہیں۔ جنازہ میت کے لئے دعا ہے اور بنیادی طور پر دعا کی تکرار ممنوع نہیں ہے اس لئے ایک میت پر ایک سے زائد مرتبہ پڑھا جاسکتا ہے اور جو شخص ایک مرتبہ پڑھ چکا ہے وہ دوسری نماز میں بھی شریک ہوسکتا ہے۔ اس سلسلے میں بخاری شریف کی درج ذیل حدیث فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے

عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ مر بقبر دفن ليلا فقال متى دفن هذا قالوا البارحة قال افلا اذنتمونى قالوا دفناه فى ظلمة الليل فكرهنا ان نوقظك فقام و صففنا خلفه فصلى عليه-[1]

---

[1] فتح الباري ج ٣ كتاب الجنائز باب الأذان بالجنازة ص ٤٥٤ رقم الحديث ١٢٤٧

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک قبر کے پاس سے گزرے جس میں ایک آدمی کو رات کے وقت دفن کیا گیا تھا۔ آپ نے دریافت فرمایا: یہ قبر والا کب دفن کیا گیا؟ جواب دیا گیا کہ گزشتہ رات کو۔ آپ نے فرمایا تم نے اس کے بارے میں مجھے خبر کیوں نہیں دی؟ عرض کیا گیا ہم نے اسے رات کے اندھیرے میں دفن کیا اور ہم نے اس وقت آپ کو جگا کر تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا۔ پس آپ (نماز کے لئے) کھڑے ہوئے اور ہم نے آپ کے پیچھے صفیں بنائیں اور آپ نے نماز جنازہ پڑھی۔ (بخاری و مسلم)

اب اس حدیث سے دو باتیں بڑی واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ آپ نے پہلے نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی اور بعد میں قبر پر جا کر آپؐ نے نماز پڑھی اس طرح ایک میت پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔

دوسری یہ کہ وہ صحابہ کرامؓ جو رات کو دفن کرنے اور جنازے میں شریک تھے انہوں نے بھی آپ کے ساتھ صفیں باندھ کر نماز پڑھی۔ کیونکہ انہوں نے خود کہا کہ اللہ کے رسول ہم نے رات کو آپ کو اطلاع دیئے بغیر اس کو دفن کر دیا' تاکہ آپ کو زحمت نہ ہو اور پھر وہی لوگ دوبارہ حضورؐ کے ساتھ صفیں باندھ کر شریک ہو جاتے ہیں جس کا مطلب ہے جن لوگوں نے پہلے نماز پڑھی ہوئی ہو وہ بھی دوبارہ پڑھ سکتے ہیں۔

(ب) جو میت دفن کر دی گئی تھی اس پر اگر دوبارہ دونوں طریقوں سے نماز جنازہ پڑھی جا سکتی ہے تو جو میت ابھی دفن ہی نہیں ہوئی اس پر تو بالاولی دوبارہ پڑھی جا سکتی ہے۔

ایک اور حدیث کا یہاں ذکر مفید ہو گا جو نماز جنازہ کے بارے میں تو نہیں دوسری نماز کے متعلق ہے لیکن اس مسئلے میں اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے

"حضرت یزید بن اسودؓ روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ حجتہ الوداع میں موجود تھا اور میں نے آپ کے ساتھ فجر کی نماز مسجد خیف میں پڑھی۔ جب آپ فارغ ہوئے تو دیکھا دو آدمی پیچھے چھپے ہوئے ہیں وہ جماعت میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ آپؐ نے فرمایا تم نے ہمارے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی؟ انہوں نے کہا ہم اپنے خیموں میں نماز پڑھ آئے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا جب تم نماز پڑھ آؤ اور پھر تمہیں مسجد میں جماعت مل جائے تو اس نماز میں شامل ہو جایا کرو وہ تمہارے لئے نفل ہو جائے گی (ابوداؤد)

اب ظاہر ہے اگر فرض نماز دوبارہ پڑھی جاسکتی ہے تو نماز جنازہ تو فرض کفایہ ہے' وہ بھی ایک شخص دوبارہ پڑھ سکتا ہے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے پہلے جماعت سے نہیں پڑھی تھی اس لئے جماعت کے ثواب کے لئے وہ دوبارہ شریک ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں ممکن ہے وہ خیمے میں جماعت کے ساتھ پڑھ کر آئے ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ فرض کی نیت سے دوبارہ نہیں پڑھی جاسکتی نفل کی نیت سے فرض پڑھنے والے امام کے پیچھے دوبارہ نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

بہر حال یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں جس پر لڑائی جھگڑا کیا جائے یا شدت اختیار کی جائے جو شخص ایک ہی نماز جنازہ میں شریک ہونا چاہتا ہے' وہ بھی قابل ملامت نہیں اور جو دونوں میں شریک ہوا' سے بھی منع نہیں کرنا چاہئے۔

(ج) قبر پر فاتحہ پڑھنے کے الفاظ زیادہ تر ہمارے ہاں برصغیر میں ہی مروج ہیں۔ حدیث میں تو بخشش و مغفرت کی دعاؤں کا ذکر آتا ہے۔ کم از کم ہمارے علم میں کوئی ایسی دلیل نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ قبر پر فاتحہ کا اہتمام کیا جائے۔ بلکہ اس بارے میں مسنون دعائیں صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

میت کے دفن کرنے یعنی قبر پر مٹی ڈالنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے ثابت قدمی کے لئے دعا کرنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ جب میت کی تدفین سے فارغ ہوتے تو قبر کے پاس ٹھہرتے اور لوگوں سے فرماتے کہ اپنے بھائی کے لئے اللہ تعالیٰ سے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو اس لئے کہ اس وقت اس سے سوال ہوگا (ابوداؤد)

یہ تو دفن کے فوراً بعد دعا کا مسنون طریقہ ہے۔ اس کے بعد اگر قبروں کی زیارت کی جائے تو اس سے غرض یہ ہونی چاہئے کہ مردوں کے لئے بخشش کی دعا کی جائے اور قبرستان میں موت و آخرت یاد کرکے عبرت حاصل ہو۔ یہ زیارت تو مشروع اور جائز ہے بلکہ اس زیارت کو امام ابن حزمؒ نے عمر میں کم از کم ایک مرتبہ فرض قرار دیا ہے۔ لیکن قبر والوں سے مراد مانگنے' چڑھاوے چڑھانے یا وہاں جاکر سجدے کرنے اور جھکنے کے لئے جانا' یہ زیارت قرآن و حدیث کی روشنی میں حرام ہے۔ بلکہ ایسی زیارتوں میں کئے جانے والے بعض اعمال شرک کے زمرے میں بھی آتے ہیں۔

فوت شدہ لوگوں کے لئے دعائے مغفرت اور اپنے لئے عبرت کی غرض سے اگر کوئی کسی قبر پر جائے تو وہاں دعا کرنے کا مسنون طریقہ حدیث میں اس طرح آتا ہے۔

صحیح مسلم اور سنن نسائی میں حضرت بریدہ اسلمیؓ سے روایت ہے کہ سرورِ دو عالم ﷺ صحابہ کرامؓ سے فرماتے کہ جب تم میں سے کوئی قبرستان جائے تو سب سے پہلے یہ الفاظ کہے:

السلام علیکم اهل الدیار من المومنین والمسلمین انا ان شاء الله بکم لاحقون انتم فرطنا ونحن لکم تبع. ونسال الله لناولکم العافیة[1]

ترجمہ: اے ان گھروں کے مومن اور مسلمان بھائیو! تم پر سلام ہو ان شاء

---

[1] مسلم کتاب الجنائز باب ما یقول عند دخول القبور

اللہ ہم بھی تم سے آکر ملنے والے ہیں۔ تم ہم سے پہلے جاچکے اور ہم تمہارے بعد آرہے ہیں۔ ہم اللہ سے اپنے اور تمہارے لئے خیر و عافیت کی دعا کرتے ہیں۔

اس کے بعد مغفرت کی مزید دعائیں ہاتھ اٹھا کر بھی کر سکتے ہیں۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک رات رسول اکرم ﷺ جنت البقیع (مدینہ کا قبرستان) میں تشریف لے گئے۔ دیر تک کھڑے رہے اور تین مرتبہ ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔

میت پاکستان لے جاسکتے ہیں؟

سوال: حافظ محمد اویس برمنگھم سے لکھتے ہیں

(الف) کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ یہاں جب کسی کی موت ہو جاتی ہے، تو سب حضرات اپنی میت کو پاکستان یا انڈیا بھیجتے ہیں۔ کیا اسلام میں اس کی اجازت ہے؟

(ب) یہاں میت کو جب دفن کرتے ہیں تو بکس میں دفن کرنا پڑتا ہے تو کیا اسلام اس بکس کی اجازت دیتا ہے؟ اور اگر دیتا ہے تو بکس کے اندر میت کے نیچے مٹی رکھنی چاہیے یا نہیں؟

جواب: (الف) اگر کوئی مجبوری اور عذر نہ ہو تو بہتر اور افضل یہی ہے کہ جہاں اور جس جگہ موت واقع ہو میت کو وہاں ہی دفن کیا جائے۔ مگر ضرورت کی شکل میں اسے منتقل کر کے کسی دوسری جگہ لے جاکر دفن کرنا بھی جائز ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل روایت سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔

قال عبد الله بن ابی ملیکه توفی عبد الرحمن بن ابی بکر بالحبشة فحمل الی مکة فدفن فلما قدمت عائشة اتت قبره ثم قالت و الله لو حضرتك ما دفنت

الا حیث مت۔[1]

یعنی عبدالرحمان بن ابی بکرؓ حبشہ میں فوت ہوئے تو ان کی میت مکہ میں لا کر دفن کی گئی۔ جب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ (ان کی بہن) آئیں اور قبر پر گئیں تو انہوں نے فرمایا: خدا کی قسم اگر میں وہاں موجود ہوتی تو تجھے وہاں پر ہی دفن کیا جاتا جس جگہ موت واقع ہوئی۔ (المغنی لابن قدامہ جلد دوم ص ۵۱۰)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت ہو تو میت منتقل کی جا سکتی ہے۔ بعض نے حضرت عائشہ کے فرمان سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے نزدیک یہ جائز نہیں تھا اسی لئے انہوں نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے

ما اعلم بنقل الرجل یموت فی بلده الی بلد اخر باسا۔[2]

"کہ میرے علم کے مطابق آدمی جس شہر میں فوت ہو' وہاں سے اسے دوسرے شہر میں منتقل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

امام زہریؒ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اس کے جواز میں یہ دلیل دی کہ سعد بن ابی وقاصؓ اور سعید بن زیدؓ کی میتوں کو عقیق سے مدینہ منورہ لایا گیا اور ابن عیینہؒ نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے وفات کے وقت یہ وصیت کی کہ انہیں یہاں دفن نہ کیا جائے بلکہ سرف کے مقام پر دفن کیا جائے۔ (المغنی لابن قدامہ ۳/۴۴۳)

بعض نے حضرت عائشہؓ کے قول کی یہ توجیہ پیش کی ہے کہ انہوں نے اس اندیشے کے پیش نظر اپنی ناپسندی کا اظہار کیا تھا کہ دور سے میت لائی جائے تو اس کو خراب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے' اس لئے قریب کے شہر یا جگہ میں منتقل کرنا جائز ہے' لیکن دور لے جانا درست نہیں۔

مذکورہ دلائل کی روشنی میں اس مسئلے کی درج ذیل صورتیں سامنے آتی ہیں۔

---

[1] ترمذی ج ۱ کتاب الجنائز باب ما جاء فی زیارة القبور للنساء ص ۳۷۷.

[2] المغنی لابن قدامة ۳/۴۴۲ مطبوع قاهره

۱۔ بہتر اور افضل یہی ہے کہ میت کے دفن میں کسی نوع کی بھی تاخیر نہ کی جائے اور جہاں فوت ہو اسی مقام پر دفن کیا جائے۔ مسنون طریقہ بھی یہی ہے۔

۲۔ اگر کوئی عذر یا مجبوری ہو تو پھر میت کو دوسرے مقام پر منتقل کرنا جائز ہے۔ مثلاً جہاں موت واقع ہوئی وہاں کفن و دفن یا جنازے کا صحیح انتظام نہیں، مسلمانوں کا اپنا قبرستان نہیں یا اس طرح کی کوئی دوسری مجبوری ہے۔

۳۔ برطانیہ سے جو لوگ میت پاکستان یا انڈیا بھیجتے ہیں وہ بڑا عذر یہی پیش کرتے ہیں کہ یہاں مسلمانوں کے الگ قبرستان نہیں ہیں اور اگر یہ عذر صحیح ہے تو اس میں کافی وزن بھی ہے۔ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے قبرستان میں دفن کرنا بہر حال جائز نہیں ہے اور اس غرض کے لئے اسے اپنے ملک لے جانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

۴۔ جہاں اپنے عزیز و اقارب ہوں وہاں دفن کرنے کو اس لئے بھی ترجیح دی گئی ہے تاکہ ان کا زیارت و دعا کے لئے آنا ممکن ہو سکے۔ اور اگر عزیز و اقارب سے دور غیر مسلموں کے قبرستان میں دفن کیا جائے جہاں کسی کا دعا کے لئے گزر بھی ممکن نہ ہو تو یہ مرنے والے کے ساتھ سخت بے انصافی ہو گی۔

۵۔ بہر حال عذر اور ضرورت کے تحت میت کا منتقل کرنا جائز ہے لیکن بلا ضرورت یہ جائز نہیں ہے اور خاص طور پر اگر نعش خراب ہونے کا خطرہ ہو یا جنازے میں بہت زیادہ تاخیر ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر دوسری جگہ لے جانے کی بجائے وہاں ہی دفن کرنا بہتر ہے۔ بشر طیکہ وہاں مسلمانوں کا اپنا الگ قبرستان موجود ہو۔

(ب) میت کو تابوت میں دفن کرنا خلاف سنت اور مکروہ کام ہے۔ ہاں اگر میت کو کسی جگہ منتقل کرنا ہے یا قبر میں پانی اور نمی آ گئی ہے۔ ایسی صورت میں مجبوراً تابوت استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن بغیر عذر اور مجبوری کے تابوت میں دفن کرنا جائز نہیں۔

بہتر یہ ہے کہ میت کو بکس سے باہر نکال کر دفن کیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر تابوت کے اندر مٹی رکھی جا سکتی ہے بشر طیکہ اس کی گنجائش اور جگہ ہو لیکن عام

طور پر جو بکس بنائے جاتے ہیں ان میں مزید مٹی ڈالنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

کیا غائبانہ نماز جنازہ حضور ﷺ سے ثابت ہے؟
ایک میت پر ایک سے زائد مرتبہ جنازہ پڑھا جا سکتا ہے؟
کیا مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے؟

سوال: (۱) کیا غائبانہ نماز جنازہ جائز ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ اگر جائز ہے تو چند ایک اکابرین کا ذکر بھی کریں کہ ان کے بعد کئی کئی دن تک مختلف جگہوں پر یا ملکوں میں ان کے معتقدین غائبانہ نماز جنازہ پڑھتے ہیں؟

(۲) کہتے ہیں کہ میت کا جنازہ ایک ہی دفعہ ہو سکتا ہے مگر ہم جو بھی میت بھیجتے ہیں اس کا یہاں بھی جنازہ پڑھتے ہیں اور پاکستان میں بھی۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(۳) کیا مسجد کے اندر میت کو لے جا کر نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے؟ (این۔ ایم لودھی ہائی ویکمب)

جواب: (۱) غائبانہ نماز جنازہ کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن میں فقہاء کے درمیان علمی اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور جمہور سلفؒ کے نزدیک غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے جب کہ احناف اس کے قائل نہیں ہیں۔ امام ابن حزمؒ کا قول ہے کہ کسی بھی صحابی سے غائبانہ نماز کی ممانعت ثابت نہیں ہے۔ جن کے نزدیک غائبانہ نماز جنازہ یا غائب کا جنازہ پڑھنا جائز ہے ان کی بڑی دلیل یہ حدیث ہے کہ

عن جابر ان النبی ﷺ صلی علی اصحمة النجاشی فکبر علیه اربعا و فی لفظ قال توفی الیوم رجل صالح من الحبش فهلموا فصلوا علیه فصففنا خلفه فصلی رسول الله ﷺ و نحن صفوف۔[1]

---

[1] فتح الباری ج ۳ کتاب الجنائز باب التکبیر علی جنازة اربعا ص ۵۶۱ رقم الحدیث ۱۳۳۳۔

حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اصحمہ نجاشی (شاہ حبش) پر چار تکبیروں کے ساتھ نماز پڑھی۔ اس طرح کے لفظ بھی آئے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا آج حبش کا ایک نیک آدمی فوت ہو گیا ہے پس آؤ اس کی نماز جنازہ پڑھیں تو ہم نے آپ کے پیچھے صفیں باندھ لیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمنے نماز پڑھائی۔ (بخاری ومسلم)

اس حدیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کو نجاشی کی وفات کی جب اطلاع ملی تو آپؐ نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔

جو لوگ نمازِ جنازہ غائبانہ کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے نجاشی کی نماز جنازہ غائبانہ اس لئے پڑھی تھی کہ اس کی نماز جنازہ وہاں پڑھی نہیں گئی تھی۔ بہر حال اس حدیث سے غائبانہ نماز کا ثبوت ملتا ہے اس کی وجہ یا علت کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ نماز صرف نجاشی کے لئے خاص تھی۔ بعد میں کسی غائب کے لئے نہیں پڑھی جا سکتی۔ ہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ سیاسی قسم کے غائبانہ جنازے کا کہیں ثبوت نہیں ملتا کہ محض لوگوں کو احتجاج کے لئے اکٹھا کرنے کے لئے جنازے کو ذریعہ بنا لینا اور جنازے کے فوراً بعد غلیظ الفاظ بکنا گالیاں دینا اُسے سیاسی جنازہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ شرعی جنازے کی یہ کیفیت نہیں ہوتی۔

رہی یہ بات کہ کیا اکابرین میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے کئی کئی روز تک مختلف ملکوں میں جنازے پڑھے جاتے رہے تو اس سلسلے میں یہاں تاریخ وسیرت کی کتب اور مراجع نہ ہونے کی وجہ سے میں سلف کی زیادہ مثالیں ذکر نہیں کر سکتا۔ ایک مثال شیخ الاسلام حضرت امام ابن تیمیہؒ کی ذکر کئے دیتا ہوں۔ ان کی نماز جنازہ غائبانہ کا ذکر تاریخ میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے

صلی علیہ الصلوة الغائب فی الغالب بلاد الاسلام القریبة و البعیدة حتی فی الیمن و الصین واخبر المسافرون انه نودی باقصی الصین الصلوة علیه یوم جمعة الصلوة علی ترجمان القران۔

یعنی امام ابن تیمیہؒ نے جب وفات پائی تو اسلام کے اس عظیم سپوت کی اکثر اسلامی ملکوں میں غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ جن میں یمن اور چین کا ذکر بھی آتا ہے اور سیاحوں نے بتایا کہ چین کے دور دراز علاقوں میں مناوی کرنے والے نے ان الفاظ سے لوگوں کو نماز جنازہ کے لئے بلایا کہ "ترجمان القرآن کی نماز جنازہ جمعہ کے دن پڑھی جائے گی"

ماضی قریب میں مصر کے شیخ حسن البناء شہید' قائد اعظم محمد علی جناح' مولانا ابوالکلام آزاد اور شاہ فیصل کے غائبانہ جنازے مختلف ممالک اور مختلف شہروں میں ہر ملک و مذہب کے لوگوں نے پڑھے۔

لہٰذا حدیث نجاشی کو بنیاد بنا کر غائبانہ نماز جنازہ کے جواز کا ثبوت ملتا ہے لیکن کسی ایک واقعہ سے جو مسئلہ ثابت ہو ضروری نہیں کہ اس کے لئے بعد میں متعدد مثالیں پائی جائیں کیونکہ جواز کے لئے ایک آدھ واقعہ بھی دلیل بن سکتا ہے لیکن اسے مستقل عادت بنالینا یا غائبانہ جنازے کو ضروری سمجھنا ہرگز درست نہیں۔

جواب: (۲) ایک میت پر ایک سے زائد مرتبہ جنازہ پڑھنا بھی حدیث سے ثابت ہے۔ مشکوۃ شریف میں بحوالہ صحیح بخاری و مسلم یہ حدیث مذکور ہے۔

عن ابن عباس ان رسول اللهﷺ مر بقبر دفن ليلا فقال متى دفن هذا قالوا البارحة قال افلا اذنتمونی قالوا دفناه فی ظلمة الليل فكرهنا ان نوقظك فقام و صففنا خلفه فصلى عليه۔[1]

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک قبر کے پاس سے گزرے جس میں میت دفن کی گئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا یہ کب دفن ہوا؟ لوگوں نے عرض کیا گزشتہ رات کو۔ آپؐ نے فرمایا: تم نے مجھے کیوں خبر نہ دی؟ لوگوں نے کہا اندھیری رات میں ہم نے اسے دفن کیا اور اس وقت آپ کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اٹھے اور ہم نے آپ کے پیچھے صفیں باندھ لیں اور آپ نے

---

[1] فتح الباری ج ۳ کتاب الجنائز ص ٤٥٤ رقم الحديث ١٢٤٧

نماز جنازہ پڑھی۔(بخاری و مسلم)

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ میت کہ دفن کرنے کے بعد اس پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا درست ہے۔ ظاہر ہے جب دفن کے بعد جائز ہے تو دفن کرنے سے قبل اس پر ایک سے زائد مرتبہ جنازہ پڑھنے میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا اور اس بارے میں کوئی دلیل شرعی نہیں ہے کہ ایک میت کا صرف ایک ہی بار جنازہ پڑھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اگر میت یہاں سے پاکستان منتقل کی جاتی ہے اور وہاں اس کا دوبارہ جنازہ پڑھا جاتا ہے تو یہ بالکل جائز ہے اس میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں بھی یہ روایت آتی ہے کہ۔ صلی علی علی جناز بعد ما صلی علیھما کہ حضرت علیؓ نے ایک جنازہ پڑھا حالانکہ اس پر پہلے نماز جنازہ پڑھی جا چکی تھی۔

جواب: (۳) مسجد کے اندر نماز جنازہ ادا کرنے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک مسجد میں جنازہ پڑھنا مکروہ ہے جبکہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔ امام مالک سے بھی ایک روایت جواز کی ملتی ہے جن کے ہاں مسجد میں نماز جنازہ جائز ہے ان کی دلیل یہ روایت ہے۔

عن عائشة انها قالت لما توفي سعد بن ابي وقاص ادخلوا به المسجد حتى صلوا عليه فانكروا ذالك عليها فقالت لقد صلى رسول الله ﷺ ابني بيضا في المسجد سهيل و اخيه۔ (مسلم مترجم ج ۱ كتاب الجنائز ص ۴۰۰)

جب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فوت ہوئے تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ میت مسجد میں لے آؤ تاکہ اس پر جنازہ پڑھوں۔ کچھ لوگوں نے اس کو اچھا نہ سمجھا تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا بیضاء کے دونوں بیٹوں سہیل اور سہل کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھی گئی تھی۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ابن ابی شیبہ کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کی نماز جنازہ مسجد میں پڑھائی اور حضرت صہیبؓ نے حضرت عمرؓ کا جنازہ مسجد میں پڑھایا۔

احناف نے عدم جواز پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو امام محمد موطا میں لائے ہیں لا یصلی علی جنازۃ فی المسجد[1] کہ مسجد میں جنازہ نہیں پڑھا جائے گا جبکہ دوسرے محدثین نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ بعض کے نزدیک اگر میت مسجد سے باہر ہو تو جنازہ مسجد میں پڑھا جاسکتا ہے۔ بہر حال جمہور ائمہ کا مسلک یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔

عیسائی کی آخری رسوم میں مسلمان کی شرکت جائز ہے؟

سوال: مغربی جرمنی سے نثار احمد صاحب لکھتے ہیں کہ "اگر کوئی عیسائی فوت ہو جائے تو اس کی آخری رسوم میں مسلمان کس طرح شرکت کر سکتا ہے۔ نیز کیا مسلمان اس کی بخشش کے لئے دعا کر سکتا ہے؟"

جواب: غیر مسلم چاہے عیسائی ہو یا یہودی یا ہندو اور سکھ ان کے جنازے میں مسلمان کے لئے شرکت جائز نہیں وہ اپنے مخصوص طریقے اور مذہب کے مطابق آخری رسومات ادا کرتے ہیں جنہیں اسلام درست نہیں سمجھتا۔ اس لئے مسلمان کے لئے ان کی کسی بھی مذہبی رسم میں شرکت صحیح نہ ہو گی۔

ہاں البتہ غیر مسلموں کی موت پر ان کے ورثا یا اقربا کے ساتھ اظہار ہمدردی و تعزیت جائز ہے۔ اس کی اجازت دو باتوں کی بنا پر ہے

اول: یہ کہ اسلام ہمدردی و خیر خواہی کا دین ہے اور انسانی ہمدردی کے تحت مسلمان دوسروں کے دکھ و غم میں شریک ہو سکتا ہے اور ان کے پاس جا کر اظہار افسوس کر سکتا ہے۔

دوم: یہ کہ اس طرح غیر مسلموں پر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں اچھے

---

[1] موطأ امام محمد ص ۱۶۹ باب الصلاۃ علی الجنازۃ فی المسجد

تاثرات قائم ہوں گے اور اسلام کی طرف ان کے اندر اس احسن اخلاق کی وجہ سے رغبت و توجہ پیدا ہو سکتی ہے۔ اسلام بنیادی طور پر بداخلاقی اور بے رخی کو پسند نہیں کرتا اس لئے ایسے مواقع پر غیر مسلموں سے اسلامی اخلاق کے مطابق ہی معاملہ کرنا چاہیے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص معلومات کے لئے ان کی آخری رسومات میں جاتا ہے یعنی خود شریک تو نہیں ہوتا لیکن قریب سے ان کے طریق کار کو دیکھتا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ بہرحال بنیادی بات یہی ہے کہ انسانی جان سمجھ کر ان سے اظہار افسوس و ہمدردی کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں بخاری شریف کی ایک حدیث سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے۔

حضرت سہل بن حنیفؓ اور حضرت قیس بن سعدؓ قادسیہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو وہ کھڑے ہوگئے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ تو ذمی تھے یعنی غیر مسلم تو انہوں نے فرمایا:

> ان رسول اللهﷺ مرت به جنازة فقام فقيل له انها جنازة يهودى فقال اليست نفسا۔[1]

> "رسول اکرمﷺ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو آپ کھڑے ہوگئے۔ لوگوں نے کہا یہ تو یہودی کا جنازہ تھا۔ آپ نے فرمایا کیا یہ ایک جان نہیں تھی؟"

اب یہاں یہ مراد نہیں کہ آپ یا صحابہ کرامؓ ان میتوں کے احترام کے لئے کھڑے ہوئے تھے بلکہ یہ قیام دراصل موت کے اثر کو قبول کرنا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر ایمان کے اظہار کی نشانی کے طور پر تھا۔ ابن حبان کی ایک روایت میں اس کی وضاحت بھی ہے کہ انما تقومون اعظاما للذى يقبض الارواح[2] کہ یہ قیام

---

[1] فتح البارى ج ۳ كتاب الجنائز باب من قام لجنازة يهودى ص ۵۳۳ رقم الحديث ۱۳۱۲

[2] ابن حبان موارد الظمآن كتاب الجنائز باب القيام للجنازة رقم ۷۷۰

دراصل اس ذات کی تعظیم کے لئے ہے جو روحوں کو قبض کرتا ہے۔

اسی طرح غیر مسلموں سے تعزیت کرنا اور ان کے پاس جاکر اظہار ہمدردی کرنا۔ یہ ان کی بڑائی نہیں' بلکہ اس میں جہاں ایک طرف انسانی ہمدردی کا پہلو اور اسلام کے اخلاقی نظام کا ایک حصہ ہے' وہاں دوسری طرف موت کے احساس کو عام کرنا اور جس ذات کے قبضے میں موت و حیات ہے' اس کی تعظیم کا اظہار کرنا ہے اور قدرت الٰہی کا اعتراف و اقرار برابر ہے چاہے کسی مسلمان کی میت کی وجہ سے ہو یا عیسائی کی میت سے۔

بہر حال اس طریقے سے عیسائی کی موت پر مسلمان کی شرکت جائز ہے مگر ان کی مذہبی رسومات میں شریک ہونا درست نہیں۔

اسی طرح قرآن حکیم کی واضح نص ہے کہ مشرکین و کفار اور منافقین کے لئے بخشش کی دعا کی اجازت نہیں۔ خود رسول اکرم ﷺ کو بھی ان کے حق میں دعا کرنے سے منع کردیا گیا تھا۔ اس مسئلے کی درج ذیل آیات قرآنی سے مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔

۱۔ (اے نبی) آپ بخشش مانگیں یا نہ مانگیں برابر ہے۔ اگر ستر دفعہ بھی بخشش طلب کریں تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے۔ (التوبہ: ۸۰)

۲۔ نبی اور اہل ایمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مشرکین کے لئے بخشش مانگیں۔ اگرچہ وہ ان کے قریبی ہی کیوں نہ ہوں۔ جب یہ پتہ چل گیا کہ یہ لوگ اپنے بد اعمال کی وجہ سے جہنم والے ہیں (التوبہ: ۱۱۳)

۳۔ (اے نبی) جب ان میں سے کوئی مر جائے تو اس پر نہ تو نماز پڑھیں اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں' کیوں کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اسی فسق کی حالت میں مر گئے۔ (التوبہ: ۸۴)

جنازہ کے لئے سکھ مسجد میں داخل ہو سکتا ہے؟

سوال: لندن سے محمد سعید اللہ پوچھتے ہیں
آج میں نے ایک ”سکھ“ کو مسجد میں دیکھا جو اپنے ظاہری حلیہ سے سکھ دکھائی نہیں دیتا لیکن بندہ ذاتی طور پر اس کو جانتا ہے۔ شاید وہ بعد نماز جمعہ جس شخص کی نماز جنازہ تھی اس کی دوستی کی وجہ سے آیا۔ میں یہ سوچتے ہوئے خاموش رہا کہ کہیں دوسرے مسلمان مسجد سے نکال نہ دیں۔ کیا سکھ مسجد میں داخل ہو سکتا ہے اور نماز جنازہ میں شریک ہو سکتا ہے؟

جواب: غیر مسلم چاہے سکھ ہی کیوں نہ ہو' ان کے مسجد میں داخل ہونے کی اجازت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے عیسائیوں کو مسجد میں قیام کرنے کی اجازت دی۔ اس کے علاوہ بعض کفار کو بھی آپ نے مسجد میں ٹھہرایا۔ اس لئے بنیادی طور پر ان کو روکا نہیں جاسکتا۔ لیکن اس میں مقصود یہی ہونا چاہئے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو قریب سے دیکھیں اور ان سے متاثر ہو کر اس سچے دین کو قبول کر لیں۔

جہاں تک نماز جنازہ کا تعلق ہے تو یہ ایک عبادت ہے جس کے لئے وضو اور پاکیزگی کی کچھ شرائط ہیں اس لئے مناسب نہیں کہ کوئی غیر مسلم مسلمانوں کی پاکیزہ صفوں میں کھڑا ہو' لیکن اگر کوئی غیر مسلم آکر کھڑا ہو جاتا ہے تو اسے سختی کے ساتھ روکنا نہیں چاہئے بلکہ نماز کے لئے طہارت و صفائی کے جو اصول ہیں وہ اسے بتانے چاہئیں' روکنا اس لئے مناسب نہیں کہ شاید یہ شخص نماز جنازہ کے اس منظر سے متاثر ہو کر اسلام میں داخل ہو جائے۔

اس موقع پر آپ سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ ہاں اگر آپ اسے نماز میں شامل ہونے کے آداب جو اسلام نے بتائے ہیں وہ بتادیتے تو زیادہ مناسب تھا۔

یہ تو بعض مسلمانوں کی جہالت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کو بھی معمولی اختلاف کی وجہ سے اپنی مسجدوں میں برداشت نہیں کرتے۔ جب جہالت زیادہ تھی تو مسجدوں کو دھوتے تھے۔ اب کچھ تعلیم ہوئی تو فرق پڑا ہے لیکن بعض مساجد میں ایسے حالات ضرور پیدا کئے جاتے ہیں کہ وہاں سے دوسرے مسلک والوں کو نکلنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ یہ انتہائی تنگ نظری اور تعصب پر مبنی فعل ہے' اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اگر مسجد نبویؐ میں غیر مسلموں کو داخل ہونے یا رہنے کی اجازت تھی تو آج کسی کو کیا حق ہے کہ وہ مسلمانوں کو مسجدوں میں داخل ہونے سے روکے۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

نماز جنازہ کے بعد مروجہ دعا کی شرعی حیثیت

سوال: کچھ عرصہ پہلے جامع مسجد برمنگھم میں آپ نے ایک جنازہ پڑھایا۔ نماز جنازہ کے بعد جیسا کہ رواج ہے آپ نے دعا نہ مانگی اس کے بعد دوسرے امام نے دعا کو ضروری قرار دیا اور جو دعا نہیں مانگتے ان کی مذمت بھی کی۔ جس سے وہاں شور ہوا اور کچھ بدمزگی بھی پیدا ہوئی۔ آپ قرآن و سنت کی روشنی میں اپنے موقف کی وضاحت کریں۔ دوسرے فریق کی طرف سے جو دلائل مجھے بھیجے گئے ہیں ان کی کاپی بھی آپ کو دے رہا ہوں۔ (رب نواز' برمنگھم)

جواب: مسلمانوں کی اکثریت کی دینی علوم سے ناواقفیت اور عدم دلچسپی کی وجہ سے جو کام رسم و رواج کے طور پر جاری ہو چکے ہیں (جب کہ ان کا قرآن و حدیث یا ائمہ دینؒ کے اقوال میں کوئی ثبوت بھی نہیں ہوتا) ان میں ایک جنازے کے بعد مروجہ دعا بھی ہے۔ شرعی اصولوں سے ناواقف لوگ جب یہ سنتے ہیں کہ فلاں آدمی دعا کا قائل نہیں تو وہ جذبات میں آکر لڑائی جھگڑا شروع کر دیتے ہیں اور دلائل سے بات کرنے کی طرف نہیں آتے۔ حالانکہ مطلق دعا کا کوئی مسلمان منکر نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے بارے جب چاہے اللہ سے دعا کر سکتا ہے لیکن اس مسئلے میں بات صرف دعا کرنے کی نہیں بلکہ غور طلب بات یہ ہے کہ ایک معاملے میں رسول اللہ ﷺ الف سے لے کر یا تک یعنی اول سے لے کر آخر تک ایک طریقہ بتاتے ہیں کہ فلاں وقت فلاں جگہ یہ کام اس طرح کرنا ہے۔ آپ حمد' ثنا' درود اور دعا ہر ایک کے بارے میں بتاتے ہیں کہ کون سی چیز کہاں اور کیسے کرنی ہے۔ اب ایسے معاملے میں اگر کوئی شخص ایک چیز اپنی طرف سے شامل کر کے رسول اللہ ﷺ کے طریقے میں اضافہ کرے گا تو ہم نہ اس چیز کو قبول کریں گے اور نہ ہی اسے جائز قرار دے سکتے ہیں۔ یہ

الگ بات ہے کہ ہم ایسے فروعی مسائل میں سختی یا تشدد کے قائل نہیں ہیں۔ ان مسائل کو بنیاد بنا کر دوسروں کے خلاف نفرت پھیلانے کو ہم مسلمان دشمنی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ایک فروعی مسئلے کو جذباتی رنگ دے کر بیان کرنا اہل علم کی شان ہرگز نہیں بلکہ ایسے مسائل پر خالص علمی انداز سے گفتگو کرنا ہی مناسب ہوتا ہے۔ بہر حال زیر بحث مسئلے میں ہم تمام پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔ کسی صاحب کی لکھی ہوئی کتاب کے کچھ صفحات کی جو فوٹو کاپی آپ نے دی ہے اسے بھی سامنے رکھیں گے اور ۱۳ مئی ۱۹۸۱ء کے اخبار وطن میں محمد بوستان خاں صاحب کے نام سے جو مضمون شائع ہوا ہے وہ بھی پیش نظر رہے گا تاکہ قارئین مسئلے کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

کوئی بھی مسلمان جب اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور دار آخرت کا سفر اختیار کرتا ہے تو اس میت کے لئے زندہ مسلمانوں کی طرف سے سب سے بڑا اور سب سے عمدہ تحفہ دعا ہے کہ اس کے حق میں دعائے مغفرت و بخشش کرے اب اس دعاء کے دو طریقے ہیں۔ ایک انفرادی' دوسرا اجتماعی

انفرادی دعا: کا طریقہ یہ ہے کہ جب بھی ہم کسی مسلمان بھائی کے انتقال کی خبر سنتے ہیں تو سب سے پہلے "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد ہر شخص اپنے اپنے انداز سے اس کے لئے دعا کے کلمات زبان سے ادا کرتا ہے۔ کوئی کہتا ہے خدا اسے بخشے' بہت نیک آدمی تھا۔ کوئی کہتا ہے یہ آدمی غریبوں کی بہت مدد کرتا تھا اللہ اسے جنت نصیب کرے۔ کوئی کہتا ہے اچھا آدمی تھا' خدا اس کی غلطیاں معاف کرے۔ غرض یہ سارے کلمات دعائیہ کلمات ہیں جو ہر شخص اپنے اپنے انداز سے کہتا ہے' وہ دعا کرتا ہے۔ اگر کسی نے کسی کی وفات کی خبر سننے کے بعد نماز پڑھی تو نماز کے بعد دوسری دعاؤں کے ساتھ یقیناً اس کی بخشش اور درجات کی بلندی کے لئے بھی دعا کرے گا۔ یہ دعا کا انفرادی طریقہ ہے جس کے لئے کوئی شخص کسی خاص جگہ یا خاص وقت یا خاص شکل اختیار کرنے کا پابند نہیں بلکہ چلتے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے یہ دعائیں کر سکتا ہے اور جن کا مرنے والے سے حقیقی تعلق ہوتا ہے وہ اس طرح دعائیں کرتے

رہتے ہیں۔

اجتماعی دعاء: دعا کا دوسرا طریقہ اجتماعی ہے کہ مسلمان بڑی تعداد میں جمع ہو کر میت کے لئے دعائے مغفرت کریں۔ اجتماعی دعا کے لئے کئی سوال پیدا ہوتے ہیں کہ یہ دعا کہاں کی جائے؟ میت کے گھر میں' مسجد میں یا کسی دوسری جگہ؟ کیسے کی جائے؟ کھڑے ہو کر' بیٹھ کر یا فرض نماز کے بعد۔ کب کی جائے؟ میت کے دفن سے پہلے یا بعد یا کس مرحلے پر اور دعائیں کیا کی جائیں؟ الفاظ خود بنائے یا قرآن و حدیث سے تلاش کرے۔ اپنی زبان میں یا عربی میں؟ یہ ہیں وہ سوالات جن کے جوابات کے بعد مسئلے کی نوعیت کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے۔ اب یہ شریعت اور دین کا مسئلہ ہے لہذا یہاں پیدا ہونے والے سوالات کے جواب کے لئے ہم آنحضرت ﷺ کی طرف رجوع کریں گے کہ کیا آپ کے دور میں کچھ لوگ فوت ہوئے تھے؟ اگر ہوئے تھے تو پھر آپ نے اجتماعی دعا کا کیا طریقہ اختیار فرمایا تھا اور مسلمانوں کو اس سلسلے میں کیا ہدایات دیں۔ چنانچہ جب ہم رسول اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں نہ صرف اجتماعی دعا کا طریقہ موجود ہے بلکہ ایک شخص کے آنکھ بند کرنے سے لے کر قبر پر مٹی ڈالنے تک ایک ایک چیز کی آپ نے وضاحت فرمادی کہ کس موقع پر کیا اور کیسے کرنا ہے۔ اختصار سے میں ان میں سے اہم چیزوں کا ذکر کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

(۱) قریب المرگ آدمی کے پاس لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تلقین کا آپ نے حکم دیا۔ (۲) عالم نزع کی کیفیت بیان کی (۳) قریب المرگ کے پاس سورہ یسین پڑھنے کی تاکید کی (۴) دفن و کفن میں جلدی کرنے کا حکم دیا (۵) میت پر نوحہ کرنے اور پیٹنے سے منع کیا (۶) غسل دینے کا طریقہ اور احکام بیان کئے (۷) کفن کے کپڑے اور اس کی بناوٹ بنائی (۸) مرد و عورت کے کفن میں فرق بیان فرمایا (۹) کفن میں اسراف اور قیمتی کپڑا استعمال کرنے کی ممانعت (۱۰) غسل کے بعد خوشبو لگانے کا ذکر (۱۱) جنازہ جلدی لے کر چلنے کا حکم (۱۲) جن لوگوں کے پاس سے جنازہ گزرے وہ کیا کریں (۱۳) جنازہ مسجد میں پڑھا جائے یا کسی کھلی جگہ میں' اس کا ذکر (۱۴) کن اوقات

میں جنازہ نہیں پڑھنا چاہئے (۱۵) قبر کی بناوٹ کیسی ہونی چاہئے (۱۶) ایک قبر میں کئی آدمیوں کے دفن کرنے کا بیان (۱۷) جنازے سے پہلے میت کے قرض کی ادائیگی کا مسئلہ (۱۸) امام میت کے سامنے جنازہ پڑھاتے وقت کہاں کھڑا ہو (۱۹) نماز جنازہ کی کیفیت (۲۰) تکبیرات کتنی کہنی چاہئیں (۲۱) ہر تکبیر کے بعد کیا پڑھے (۲۲) قبر میں اتارنے کا بیان (۲۳) مٹی ڈالنے کا ذکر (۲۴) قبر کی ظاہری شکل کیسی ہونی چاہئے (۲۵) قبر پر کھڑے ہو کر دعا کا ذکر (۲۶) میت کے لئے ایصال ثواب اور صدقہ جاریہ کا ذکر (۲۷) سوگواروں کے ساتھ اظہار ہمدردی یا تعزیت کا ذکر (۲۸) مرنے والے کی خوبیاں بیان کرنے کی تاکید (۲۹) مرنے والے کی برائیاں بیان کرنے کی ممانعت۔

میت سے متعلقہ یہ امور جو ہم نے ذکر کیے ہیں ان کا تفصیلاً یا اجمالاً ذکر آپ کو حدیث اور فقہ کی ہر کتاب میں ملے گا اور ان کے احکام و مسائل پر فقہاء کرام نے اپنے اپنے انداز فکر سے بحث بھی کی ہے اور تفصیلات میں تھوڑا بہت اختلاف بھی پایا جاتا ہے لیکن سب کا اصل احادیث میں کسی نہ کسی انداز سے ضرور بیان ہوا ہے۔ اب آپ ایمانداری اور انصاف سے میت سے متعلقہ احکام کی کسی بھی کتاب میں دیکھیں تو آپ کو یہ عنوان حدیث کی کسی کتاب میں یا کسی فقہ کی معتبر کتاب میں ہرگز نظر نہیں آئے گا جس میں نماز جنازہ کے فوراً بعد دوبارہ اجتماعی دعا کی کوئی شکل پائی جاتی ہو یا بیان کی گئی ہو۔

جنازے کی دعا: بعض جہلا یہ کہتے ہیں کہ جنازہ تو جنازہ ہے اور دعا تو بعد میں کی جاتی ہے حالانکہ نماز جنازہ دراصل دعا ہی ہے اس کا مقصد ہی میت کی بخشش و مغفرت کی سفارش کرنا ہے اور اجتماعی طور پر دعا کا یہ طریقہ ہے جسے ہم جنازہ کہتے ہیں۔ عام دعا کے آداب میں آپ ؐ نے فرمایا کہ پہلے اللہ کی حمد و ثنا کیا کرو پھر مجھ پر درود و سلام اس کے بعد جو مانگنا ہے وہ اللہ سے مانگا کرو۔ اسی طرح میت کے لئے اجتماعی دعا کی باقاعدہ شکل بتائی گئی جس کا نام نماز جنازہ رکھا گیا جس میں تکبیرات کے علاوہ ثناء' فاتحہ اور درود شریف پڑھنے کے بعد میت کے لئے عاجزی سے دعا کرنے کی تاکید کی گئی ہے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے اجتماعی شکل میں جنازے کے اندر بے شمار دعائیں

منقول ہیں اور صحابہ کرامؓ نے آپؐ سے وہ دعائیں سیکھیں جو جنازے کی آخری تکبیر کے بعد آپ میت کی بخشش و مغفرت کے سلسلے میں کیا کرتے تھے۔ اب اس قدر شان اور اہتمام سے جب جنازے کے اندر چوتھی تکبیر کے بعد دعا ثابت ہو گئی تو پھر اس کے فوراً بعد دوبارہ دعا کا اعلان ہرگز قرین قیاس نہیں۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی قرآن کی کسی سورت کی زبانی تلاوت کرتا ہے جب وہ ختم کرتا ہے تو پھر کوئی کہتا ہے حافظ صاحب ذرا قرآن پڑھ دیں۔

جب وہ کہتا ہے میں نے ابھی تلاوت کی ہے' اب آپ دوسری کاروائی شروع کریں تو کوئی جاہل یہ کہہ دے کہ حافظ صاحب وہ تو آپ نے تلاوت کی تھی قرآن تو نہیں پڑھا تھا۔ ایسے ہی یہاں کہا جاتا ہے کہ وہ تو جنازہ پڑھا جاتا ہے دعا تو نہیں کی جاتی حالانکہ اس کا لب لباب دعا ہی ہے اور احادیث میں وضاحت کے ساتھ آیا کہ جس آدمی کے جنازے میں چالیس موحد آدمی شامل ہو کر نماز جنازہ پڑھیں تو اللہ ان کی دعا قبول کرتا ہے۔

لہٰذا جنازہ تو بذات خود اللہ کے ہاں میت کی سفارش اور اس کی بخشش کا طریقہ عبادت ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید دوسرے مسائل کی طرح یہ بھی حنفی شافعی کے درمیان اختلافی مسئلہ ہے۔ ہرگز نہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ فقہ حنفی کا مسئلہ ہے اور حنفی جنازے کے بعد پھر دعا مانگنے کے قائل ہیں وہ حنفی مسلک سے نابلد اور فقہ حنفی سے بالکل ناواقف ہیں۔

ایصال ثواب کی بدعات

میت کو ثواب پہنچانے کے مروجہ طریقے

سوال: والتھم سٹو لندن سے محمد رفیق پوچھتے ہیں

ثواب کے کیا معنی ہیں۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کے حق میں کیسے ثواب پہنچایا جائے اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ شخص شرک یا بدعت کرتا تھا؟

جواب: کسی کے مرنے کے بعد ثواب پہنچانے کا مسئلہ ہمارے ہاں دیگر بہت سے مسائل کی طرح غلط رنگ اختیار کر چکا ہے اور اگر قرآن وحدیث کی روشنی میں بغور جائزہ لیا جائے تو اس زمانے میں ایصال ثواب کی جتنی مروجہ شکلیں ہیں وہ خود ساختہ رسومات کے ضمن میں آتی ہیں اور خاندان و برادری کے رسم ورواج بن چکی ہیں یا کچھ مذہبی پیشہ وروں کے کھانے پینے کا ذریعہ۔ ایصال ثواب کے مسنون طریقے سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ صدقہ و خیرات جو میت کے ثواب کے نام پر کیا جاتا ہے وہ صرف نام کا ہوتا ہے اس کے کھانے والے سب دولت مند اور امیر لوگ ہوتے ہیں نہ ان کو کھلانا جائز ہے اور نہ ان کے لئے صدقے کا مال کھانا جائز ہے۔

ایصال ثواب کی بہترین شکل دعا ہے۔ اگر دعا قبول ہو گئی تو اس کا ثواب پہنچ جائے گا اور اگر دعا قبول نہ ہوئی تو وہ محروم رہے گا۔ کیوں کہ اصل انسان کا اپنا عمل ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ یہی فرمایا کرتی تھیں کہ قرآن میں واضح طور پر آگیا ہے کہ

لیس للانسان الا ما سعی (النجم)

کہ انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے خود کوشش کی یعنی اسے دوسروں کا کوئی عمل فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

جہاں تک صحیح مسلم شریف کی اس حدیث کا تعلق ہے جس میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

اذا مات الانسان انقطع عمله الا من ثلاث صدقة جارية او علم ينفع به او ولد صالح يدعوا له۔[1]

یعنی جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے سوائے تین حالتوں کے۔ ایک یہ کہ وہ زندگی میں صدقہ جاریہ کر گیا ہو' اب اس کا ثواب اس کے مرنے کے بعد بھی جاری رہے گا۔ دوسرے یہ کہ اس نے علم کا سلسلہ جاری کیا اور اس کے علم سے بعد میں بھی فائدہ حاصل کیا جا رہا ہے اور تیسرے یہ کہ نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی ہے۔ اب حضرت عائشہ صدیقہؓ کے مسلک کے مطابق یہ تین عمل جو کسی نہ کسی انداز میں خود انسان کے اپنے ہیں جو فوت ہوا ہے۔ اس لئے ایک لحاظ سے یہ اس کے اپنے ہی عمل ہیں اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ تین اعمال دوسروں کے ہیں تب بھی ایصال ثواب کی ان تین شکلوں ہی کو ہم اس حدیث سے ثابت کر سکتے ہیں۔ بعض روایات میں حج اور صدقے کا ذکر بھی آتا ہے مگر وہاں بھی اولاد کے بارے میں تخصیص ہے کہ یہ اعمال ان کی اولاد نے کئے تھے بعض علماء نے ان کا مفہوم عام لیا ہے کہ ان سے بنیادی طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مرنے کے بعد ثواب پہنچانے کے بعض ذرائع موجود ہیں۔ لیکن صحیح یہی ہے کہ صدقہ' خیرات' نوافل' حج اور قرآن کی قرأت وغیرہ جیسے اعمال جو میت کے لئے کئے جاتے ہیں حضور ﷺ کے زمانے میں ان کا عام رواج نہ تھا۔ ہاں اگر اس کی اولاد یا قرابت داروں میں سے کوئی یہ اعمال کرنے کے بعد میت کے لئے دعا کرتا ہے تو یہ جائز ہے کیونکہ دعا تو زندہ اور مردے سب کے لئے کی جا سکتی ہے۔ لیکن مروجہ شکل میں جو اجرت دے کر قرآن کے ذریعے ثواب پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے' یہ جائز نہیں ہے۔

اسی طرح بعض دنوں یا تاریخوں کو ان کاموں کے لئے خاص کرنا' شریعت

---

[1] مختصر صحیح مسلم للالبانی کتاب الجنائز باب ایصال الثواب رقم الحدیث ۱۰۰۱

میں ان کا بھی کوئی ثبوت نہیں۔ برصغیر پاک وہند میں میت کو ثواب پہنچانے کے لئے جو دن مقرر چلے آرہے ہیں اور اب تو ان دنوں کو ایک خاص تقدس حاصل ہو گیا ہے کہ لوگ دینی فرائض چھوڑنے میں دیر نہیں کرتے' حرام کاموں کے ارتکاب سے خوف نہیں کھاتے' لیکن گیارہویں' جمعرات کا ختم یا تیجا ساتواں وغیرہ چھوڑنے میں خوف کھاتے ہیں اور ان کی اتنی پابندی کرتے ہیں کہ فرائض وواجبات کی اتنی پابندی ہرگز نہیں کرتے۔

برصغیر پاک وہند کی تاریخ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اس طرح کی رسمیں زیادہ تر ہندوؤں سے لی ہیں۔ مشہور مورخ علامہ البیرونی متوفی ۴۰۳ھ لکھتے ہیں کہ "اہل ہنود کے نزدیک جو حقوق میت کے وارث پر عائد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ضیافت کرنا اور یوم وفات سے گیارہویں اور پندرہویں روز کھانا کھلانا اور اس میں ہر ماہ کی چھٹی تاریخ کو فضیلت ہے اسی طرح اختتام سال پر بھی کھانا کھلانا ضروری ہے۔ نو دن تک اپنے گھر کے سامنے طعام پختہ وکوزہ آب رکھیں ورنہ میت کی روح ناراض ہوگی اور بھوک وپیاس کی حالت میں گھر کے اردگرد پھرتی رہے گی۔" (کتاب الہند ص ۲۷۰)

اس کی تائید مولانا عبید اللہ مرحوم کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے کہ برہمن کے مرنے کے بعد گیارہواں اور کھتری کے مرنے کے بعد تیرہواں اور ویش یعنی بنئے کے مرنے کے بعد پندرہواں یا سولہواں دن اور شودر یعنی بالاہی کے مرنے کے بعد تیسواں یا انتیسواں دن مقرر ہے۔

آگے لکھتے ہیں۔ "زاں جملہ اسوج کے مہینے کے نصف اول میں ہر سال اپنے بزرگوں کو ثواب پہنچانے کا نام سرادھ ہے اور جب سرادھ کا کھانا بند ہو جائے تو اول اس پر پنڈت کو بلوا کر کچھ بید پڑھواتے ہیں جو پنڈت اس کھانے پر بید پڑھتا ہے وہ ان کی زبان میں اپھشر من کہلاتا ہے۔" (تحفۃ الہند ص ۹۱)

اب اندازہ کرلیں کہ مسلمان یہ رسم کس طرح کرتے ہیں۔ پنڈت کی جگہ مولوی نے لے لی ہے اور بید کی جگہ قرآن کی تلاوت کرکے اجرت بھی لی جاتی ہے اور

کھانے بھی مختلف قسم کے پکائے اور کھائے جاتے ہیں اور لذیذ کھانے کھانے والے حاضرین کو ایصال ثواب کا نہ مفہوم معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی اس سے انہیں کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ وہاں ان تمام غیر اسلامی کاموں کو محض پیٹ کی خاطر اسلامی بنانے پر دن رات زور صرف کیا جارہا ہے اور جو مرگ کے بعد میت کے گھر کھانے کی پارٹیاں اور خاندان اور برادری کے اجتماعات بلاکر جشن نہیں مناتا' اسے ایصال ثواب کا منکر کہہ کر بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

رہی یہ بات کہ جس کے بارے میں یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ مشرک یا بدعتی تھا' تو ظاہر ہے جسے آپ جانتے ہی نہیں عموماً تو اس کے لئے دعا کرتا ہی کون ہے؟ لیکن اگر آپ کو معلوم ہو کہ وہ مشرک نہ تھا یا عام مسلمان تھا تو اس کے لیے دعا کرنا چاہیے اور اپنی دعاؤں میں عام مومنین و موحدین کو شامل کرنا چاہیے۔

میت کو ثواب کیسے پہنچایا جائے؟

سوال: والتھم سٹو لندن سے محمد رفیق لکھتے ہیں

ہمارے ہاں جو فاتحہ کسی کے مرنے کے بعد ایصال ثواب کے لئے پڑھی جاتی ہے اس کی کیا حقیقت ہے؟ آیا حضور نے ایسا کیا یا یہ کب ایجاد کی گئی اور فاتحہ پڑھنے کا مقصد کیا ہے جب کہ ہمارے ہاں جب کوئی بچی بچہ فوت ہو جائے تو تب بھی پڑھی جاتی ہے اور اگر کوئی بدعتی مر جائے تو تب بھی پڑھی جاتی ہے؟

جواب: ہمارے ہاں کسی کی موت واقع ہونے کے بعد جو فاتحہ کا لامتناہی سلسلہ چل نکلتا ہے اس کا قرآن و سنت اور ائمہ دین کے اقوال میں کوئی ثبوت نہیں اور پھر یہ کب ایجاد ہوئی؟ معلوم یہی ہوتا ہے کہ یہ برصغیر پاک و ہند ہی کی ایجاد ہے۔ دوسرے ملکوں میں فاتحہ کی یہ شکل شاید نہیں ہے۔ ایصال ثواب بذریعہ فاتحہ' اس کا کوئی شرعی ثبوت

نہیں۔ آخر آنحضرت ﷺ کے وقت اموات ہوئیں' حضور ﷺ نے جنازے پڑھائے۔ تعزیت کے لئے تشریف لے جاتے لیکن اس مروجہ فاتحہ کا کسی صحیح حدیث میں کوئی ذکر تک نہیں ملتا۔ اسے حضورؐ نے میت کے ایصال ثواب کے لئے پڑھا ہو' کم ازکم میرے علم کی حد تک اس بارے میں کوئی حدیث یا کسی امام کا کوئی قول ثابت نہیں۔

مروجہ فاتحہ بدعت ہے؟

سوال: ایک صاحب پوچھتے ہیں

آپ نے شمارہ فروری، مارچ میں اجتماعی فاتحہ خوانی کو بدعت کہا ہے جب کہ اسی شمارے میں ڈاکٹر عبدالرؤف مرحوم کی وفات کے پیغام کے سلسلہ میں کہا ہے کہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں مقام عطا کرے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے' یہ بھی تو فاتحہ خوانی ہی ہوئی نا۔ وضاحت فرمائیں۔

جواب: (مولانا عبدالہادی جواب دیتے ہیں)

فروری اور مارچ کے شمارے میں جس فاتحہ کے متعلق کہا گیا کہ وہ بدعت ہے وہ دراصل مروجہ فاتحہ خوانی ہے جو خاص موقعوں پر اور خاص طریقے کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اور جس میں مقررہ چیزیں ہی پڑھی جاتی ہیں۔ چونکہ کتاب و سنت میں کہیں بھی اس قسم کی فاتحہ خوانی کا تذکرہ نہیں ملتا' لہٰذا جو چیز کتاب و سنت میں نہ ہو اور اسے کوئی دین یا کار ثواب سمجھ کر وہ کرتا ہے تو اسی کا نام بدعت ہے۔

لیکن جہاں تک مرنے والوں کے لئے یا کسی بھی انسان کے لئے دعا کرنے کا تعلق ہے یہ ایک عام سی چیز ہے اور مشکلات و پریشانیوں کے وقت یا حاجت اور ضرورت پر دعا کرنے کا قرآن و حدیث میں متعدد مقامات پر ذکر موجود ہے اس لئے دعاء مغفرت کو مروجہ فاتحہ خوانی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا دونوں ایک دوسرے سے

مختلف ہیں۔

فاتحہ خوانی میں کیا پڑھا جاتا ہے؟

سوال: ڈرایٹ مورڈیون جیل سے ایم آئی خان دریافت کرتے ہیں
فاتحہ خوانی میں کیا کیا چیزیں پڑھی جاتی ہیں اور کس طرح دعا مانگی جاتی ہے؟

جواب: فاتحہ خوانی کے بارے میں آپ کا سوال واضح نہیں ہے کہ آپ کون سی فاتحہ مراد لیتے ہیں اگر نماز میں فاتحہ مراد لیتے ہیں تو یہ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھنا ضروری ہے اور اگر کسی کے مرنے کے بعد اس کی قبر یا کسی دوسری جگہ کے لئے فاتحہ خوانی مراد لیتے ہیں تو موجودہ دور میں جاری رسم کی فاتحہ خوانی تو کسی حدیث سے ثابت نہیں اور نہ صحابہ کرام گھروں میں بیٹھ کر یا کھانے کو آگے رکھ کر یا جنازے کے بعد فاتحہ خوانی کرتے تھے اور ویسے بھی سورہ فاتحہ کا ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک دعا کا تعلق ہے تو یہ ہمیشہ زندوں اور مردوں کے لئے ہر جگہ اور ہر وقت انفرادی طور پر کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کی کوئی خاص شکل بنانا یا جگہ اور وقت کا اپنی طرف سے تعین کرنا' یہ جائز نہیں۔ کسی بھی کام کے لئے کوئی ایسی اجتماعی شکل بنانا جو رسول اکرم ﷺ یا صحابہ کرامؓ سے ثابت نہ ہو۔ دین کے کاموں میں اپنی طرف سے ایسی زیادتی جائز نہیں۔

رہی یہ بات کہ فاتحہ خوانی میں کون کون سی چیزیں پڑھی جاتی ہیں تو فاتحہ تو سورہ فاتحہ کا نام ہے اس میں دوسری چیزوں کے پڑھنے کا کیا مقصد؟ لوگوں نے اس کے ساتھ اپنی طرف سے جو چیزیں ملائی ہوئی ہیں وہ دین میں ثابت نہیں۔

کیا مروجہ رسم فاتحہ' قل' سوم اور چہلم جائز ہے؟

سوال: مروجہ فاتحہ خوانی کی رسومات کے بارے میں ایک صاحب پوچھتے ہیں کیا یہ جائز ہیں؟

جواب: مسلم معاشرہ میں فاتحہ خوانی قرآن' خوانی سوم اور چہلم وغیرہ کی رسومات اس قدر رواج پاچکی ہیں کہ اب یہ باقاعدہ تقریبات کی شکل اختیار کرچکی ہیں۔ اور جو ان کی موجودہ شکلیں ہمارے سامنے ہیں' ان کے بدعت ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ان تقریبات کا اس طرز کا وجود تک نہ تھا' نہ صحابہ کرامؓ سے اور نہ ائمہ دین سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور مندرجہ ذیل دلائل کی بنیاد پر ہم مذکورہ مروجہ رسومات یا تقریبات کو جائز نہیں سمجھتے۔

(الف) رسول اکرم ﷺ کے دور میں اموات ہوئیں۔ مرنے والوں کے عزیز و اقارب اور ورثاء کے لئے آپؐ نے کوئی ایسا کام کرنے کا حکم نہیں دیا جو آج ہمارے ہاں قل سوم یا چہلم کی شکل میں ہیں۔ خود آپ کی صاحبزادیاں فوت ہوئیں لیکن آپؐ نے کسی کے لئے اجتماعی فاتحہ خوانی' قرآن خوانی یا چہلم وغیرہ نہیں کیا۔ جس طرح ہمارے ہاں آج کل رواج ہے۔

(ب) حضور اکرم ﷺ کے ایک جلیل القدر صحابی حضرت جریر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ:

كنا نرى الاجتماع الى اهل الميت وصنعهم الطعام من النياحة[1]

ہم یعنی صحابہ رسول ﷺ) اہل میت کے ہاں لوگوں کے جمع ہونے اور اہل

[1] سنن ابن ماجه ج ۱ كتاب الجنائز باب ماجاء في النهى عن الاجتماع الى اهل الميت و ضعة الطعام ص ۷۹۸ رقم الحديث ۱۶۱۲۔

میت کا ان کے لئے کھانا تیار کرنے کو نوحہ سمجھتے تھے۔

اور دوسری حدیث میں خود حضور ﷺ نے نوحہ کو جاہلیت کی رسموں میں قرار دیا ہے۔

(ج) میت کے گھر والوں کو کھانا پکانا اور اپنے خاندان اور برادری والوں یا مہمانوں کو کھلانا یوں بھی معیوب ہے۔ اس کے برعکس رسول اکرم ﷺ نے اہل میت کو کھانا کھلانے کی تاکید فرمائی۔ حدیث میں ہے کہ:

جب حضرت جعفر بن ابی طالب کی وفات کی خبر آپ کو پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کرو کیونکہ وہ مصیبت و غم میں مبتلا ہیں۔

ہمارے ہاں مسئلہ ہی الٹ ہے۔ یہاں یتیم ہو یا غریب بیوہ عورت ہو یا مقروض آدمی جب موت واقع ہو گئی تو مولوی صاحبان سمیت کھانے والوں کی چالیسویں تک ایک لمبی قطار لگ جاتی ہے اور قرآن خوانی محض ایک بہانہ ہے اور ایصال ثواب محض برائے نام ہے اصل غرض کھانا کھلانا ہے۔

(د) آج کل ایسی تقریبات نام و نمود اور نمائش کا ذریعہ بن چکی ہیں اور شادی کی طرح اس کی تشہیر کی جاتی ہے اور پھر پورے اہتمام کے ساتھ انواع و اقسام کے کھانے تیار کئے جاتے ہیں اور کھانے والے اپنے عزیز و اقارب یا مذہبی لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں غریب و مسکین کا گذر تک بھی نہیں ہوتا اور جس عمل میں ریاء اور دکھلاوا آجائے وہ تو ویسے ہی اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔ گو ظاہر میں وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔

(ر) قرآن و سنت میں میت کے تعلق سے فاتحہ خوانی، قل، قرآن خوانی، سوم اور چہلم کے الفاظ یا اصطلاحات کا ذکر تک نہیں۔ اگر ان کی کچھ اہمیت ہوتی تو یہ الفاظ یا تقریبات قرآن و حدیث میں منقول ہوتے یا سلف صالحین سے ان کا ثبوت ہوتا اور اوپر ذکر کی گئی قباحتوں سے پاک بھی ہوں تب بھی ان اعمال کے لئے خصوصی مجالس قائم کرنا، خصوصی دن مقرر کرنا اور پھر ان کی خاص شکل بنانا اور پھر کچھ آیات کا

انتخاب کر کے اس موقع پر پڑھنا ان سب کا ثبوت درکار ہے۔ شارع علیہ السلام کے علاوہ کسی کو اختیار نہیں کہ وہ اپنی طرف سے کسی عبادت کی شکل بنائے یا دن اور کیفیت کا تعین کرے۔

اگر کوئی شخص ایصال ثواب کے لئے قرآن پڑھتا ہے نوافل یا دوسری عبادات ایصال ثواب کے لئے کرتا ہے تو اس کی مروجہ اشکال کی ضرورت نہیں۔ اس طرح صدقہ و خیرات اگر ایصال ثواب کے لئے کرتا ہے تو غرباء و مساکین کو ڈھونڈنا چاہئے۔ دنوں کا تعین کر کے اپنی طرف سے عبادات کی شکل بنانا ہرگز جائز نہیں ہے۔

بہرحال قرآن و سنت کی رو سے ان مروجہ چیزوں کا کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے۔

ہمارے ہاں ان رسومات کی پابندی کرنے والے اکثر دوست اپنے آپ کو حنفی بھی کہتے ہیں انہیں چاہئے کہ حضرت امام ابو حنفیہ اور دوسرے حنفی اماموں میں سے ان رسومات کا کوئی ثبوت فراہم کر دیں بلکہ اس کے برعکس بڑے حنفی ائمہ اور علماء نے اس طرح کی رسومات کو بدعت و ناجائز قرار دیا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم بزرگوں کے اقوال پیش نہیں کرتے تو بہتر ہوگا کہ چند بزرگوں کے ارشادات بھی اس موضوع پر پیش کر دیے جائیں۔ اگر ہمیں ایصال ثواب کا منکر ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے تو اپنے ان بزرگوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔

(۱) امام قاضی خان حنفیؒ لکھتے ہیں:۔

ویکرہ اتخاذ الضیافۃ فی ایام المصیبۃ لانھا تاسف فلا یلیق بھاما کان للسرور۔ (فتاویٰ قاضی خاں)

یعنی مصیبت کے دنوں میں دعوت کرنا مکروہ ہے۔ کیونکہ جو کام خوشی کے وقت ہو وہ غمی کے وقت مناسب نہیں۔

(۲) امام حافظ ابن ہمامؒ لکھتے ہیں:۔

ویکرہ اتخاذ الضیافة لانه شرع فی السرور لا فی السرود وھی بدعة مستقبحة– (فتح القدیر ج ۱ ص ۲۹۳)

یعنی میت کے گھر کھانا تیار کرنا مکروہ ہے کیونکہ کھانا تو خوشی کے موقع پر تیار ہوتا ہے نہ کہ غمی میں اور یہ بڑی قبیح بدعت ہے۔

(۲) امام حافظ الدین محمد بن شہاب حنفیؒ لکھتے ہیں۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

"تین دن تک ضیافت مکروہ ہے اور اس طرح اس کا کھانا بھی کیوں کہ ضیافت تو خوشی کے موقع پر ہوتی ہے اور پہلے دوسرے اور تیسرے دن طعام تیار کرنا بھی مکروہ ہے اس طرح سات دنوں کے بعد (یعنی ساتواں) اور عیدوں کے موقع پر اور اس طرح موسم بموسم قبروں کی طرف کھانا اور جانا بھی مکروہ ہے اور قرأت قرآن کے لئے اور علماء و قراء کو جمع کر کے ختم قرآن کے لئے دعوت کرنا بھی مکروہ ہے اور علی ہذا القیاس سورہ انعام یا سورہ اخلاص کے قرأت کے لئے کھانا تیار کرنا بھی مکروہ ہے۔ حاصل یہ ہے کہ قرأت قرآن کے وقت کھانا تیار کرنا مکروہ ہے"۔ (بحوالہ فتاویٰ بزازیہ جلد ۴)

(۳) حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جو سب کے مشترک بزرگ ہیں فرماتے ہیں

"دیگر از عادات شنیعہ ما مردم اسراف است در ماتمہا د سیوم و چہلم و شش ماہی و فاتحہ سالینہ وایں ہمہ را در عرب اول وجود نبود مصلحت آن است کہ غیر تعزیت وارثان میت تاسہ روز و طعام ایشاں یک شبانہ روز رسمے نباشد"

یعنی ماتم کے موقع پر یہ بری رسومات اور اسراف کے کام ہیں اور سوم چہلم شش ماہی اور فاتحہ وغیرہ کا اول عربوں میں وجود ہی نہیں تھا۔ تعزیت میت کے ورثاء کے لئے تین دن تک کے علاوہ کسی کھانے کا کوئی وجود نہیں۔

(۴) ہمارے بریلوی بھائیوں کے نزدیک بھی مقبول شخصیت حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ فرماتے ہیں:

"عادت نبوی نبود کہ برائے میت در غیر وقت نماز جمع شوند قرآن خوانند

دختمات خوانند نہ بر سر گور و نہ غیر آں وایں مجموع بدعت است و مکروہ نعم تعزیت اہل میت و تسلیہ وصبر فرمودن سنت و مستحب است اما ایں اجتماع مخصوص روز سوم وار تکاب تکلفات دیگر و صرف اموال بے وصیت از حق یتامی بدعت و حرام است" (سفر السعادت)

"یعنی یہ نبی کریم ﷺ کی عادت مبارکہ نہیں تھی کہ نماز کے وقت کے علاوہ خاص طور پر میت کے لئے جمع ہوں پھر قرآن پڑھیں اور کئی ختم بھی پڑھیں نہ قبر اور نہ کسی اور دوسری جگہ اور یہ سارے کام بدعت اور مکروہ ہیں۔ ہاں میت کے ورثاء کی تعزیت کرنا انہیں صبر و تسلی کی تلقین کرنا' یہ سنت و مستحب ہے۔ اس طرح تیسرے روز مخصوص اجتماع اور کئی تکلفات کرنا اور یتیموں کے مال کو بغیر وصیت کے خرچ کرنا بھی بدعت اور حرام ہے۔"

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے تو بات بالکل صاف کر دی ہے اور قرآن و سنت کا موقف بڑے واضح انداز میں بیان فرمادیا ہے۔ اب ہمارے بھائی ان پر جو چاہیں فتویٰ لگادیں۔

شیخ صاحب نے تین باتوں کی شرعی حیثیت متعین فرمادی ہے:

اول: میت کے گھر فاتحہ خوانی و قرآن خوانی کے لئے اہتمام کے ساتھ جمع ہونا ثابت نہیں' ہاں جب مسجد میں نماز کے لئے جمع ہو تو اس وقت دعا کر دینا الگ بات ہے اور یہ جائز ہے۔

دوم: سوم کی رسم بھی بے ثبوت اور بدعت ہے۔

سوم: پھر کھانے پینے میں اہتمام و تکلف کرنا یہ بھی ناجائز ہے۔

چہارم: اور اگر سب کچھ یتیموں کے اموال سے کیا جارہا ہے تو یہ حرام ہے۔

اب جب ان رسومات کا ثبوت ایسی شخصیات کے نزدیک بھی نہیں جن کا ہم سب احترام کرتے ہیں' اسکے بعد بھی ان رسومات کو اس جوش و خروش کے ساتھ کرنا جس جوش و جذبے سے فرائض بھی ادا نہیں کرتے تو یہ کھلی ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔

رہی ایصال ثواب کی بات تو اس کے سب مسلمان قائل ہیں بشرطیکہ مذکورہ بدعات ورسومات سے مبرا ہو۔ ہم ایصال ثواب کے اس حدیث کی روشنی میں قائل ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا:

اذا مات ابن آدم انقطع عمله الا من ثلاث صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعوا له۔[1]

یعنی جب ابن آدم فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ بھی منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین کے۔ صدقہ جاریہ یا ایسا علم سکھایا گیا جو اس کے بعد بھی نفع دے رہا ہے یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہے۔

دوسری حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا میرا باپ فوت ہو گیا ہے لیکن اس نے کوئی وصیت نہیں کی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اسے فائدہ دے گا؟ آپؐ نے فرمایا ہاں کیوں نہیں۔ (مسند احمد، مسلم شریف)

تیسری حدیث حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ہے کہ:

"ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا کہ میری ماں کی اچانک موت واقع ہو گئی۔ میرا خیال ہے اگر وہ بول سکتی تو صدقہ کرتی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اسے اجر ملے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں ملے گا۔ (بخاری و مسلم)

اب مروجہ ختم، سوم، چہلم اور درود کی شکلوں کو سامنے رکھتے ہوئے خود ایمان داری سے فیصلہ کر لیں کہ یہ صدقہ جاریہ یا صدقے کی کوئی دوسری قسم ہے یا دونوں کا تعین کر کے دوست واحباب کی محض ایک دعوت یا پارٹی کا سماں ہوتا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ صدقہ جاریہ کسے کہتے ہیں اور عام صدقات کرنے کا کیا طریقہ ہے۔

---

[1] صحیح مسلم للالبانی کتاب الجنئز باب ایصال الثواب رقم الحدیث ۱۰۰۱

ختم شریف کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال: لندن سے محمد رفیق لکھتے ہیں ختم شریف کا اسلام کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ چہلم' عرس' سالگرہ' جمعرات کا ختم اور چالیسواں کا ختم پڑھنا اور بزرگوں کی قبروں پر چراغ جلانا یا بکرے دینا یا نذر و نیاز کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

جواب: اصل مسئلے پر بحث سے قبل اس امر کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ شریعت میں وہی عمل قابل قبول ہو گا اور اس کے کرنے پر ثواب ملے گا جو قرآن و حدیث سے ثابت ہو یا صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کیا ہو اور جو کام شریعت سمجھ کر یا ثواب حاصل کرنے کی نیت سے کیا جائے اور وہ قرآن و سنت یا صحابہ کے عمل سے ثابت نہ ہو تو وہ درست نہیں ہو گا۔ دنیاوی کام جو انسان مختلف ضروریات کے لئے کرتا ہے' مقصود اجر و ثواب حاصل کرنا یا تقرب ڈھونڈنا نہیں اور نہ ہی وہ ایسے کاموں کو شریعت سمجھتا ہے تو یہ بدعت کے زمرے میں نہیں آتے۔ حالات و ظروف کے مطابق انسان لباس' سواری اور دوسرے معاملات میں نئی نئی چیزیں استعمال کرتا ہے کوئی بھی شریعت سمجھ کر استعمال نہیں کرتا اور کوئی بھی عینک یا ٹوپی اس لئے استعمال نہیں کرتا کہ اس طرح زیادہ ثواب ملے گا۔ لہذا ان کاموں کو دین میں اضافہ نہیں کہا جائے گا۔ یہ دنیاوی اسباب کے ضمن میں آتے ہیں۔ جنہیں ہر شخص جائز و حلال طریقے سے حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اہل بدعت کے اس فریب میں نہیں آنا چاہئے کہ اگر نئی چیز بدعت ہیں تو پھر مذکورہ چیزیں یعنی عینک شیروانی کار وغیرہ بھی تو حضور کے زمانے میں نہیں تھیں۔

جہاں تک ختم شریف کا تعلق ہے تو اس وقت جو شکلیں اس کی رائج ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ کسی میت کے بعد اس کے ورثا تیسرے' ساتویں اور چالیسویں دن

مختلف انواع و اقسام کے کھانے پکاتے ہیں اور اپنے عزیز و اقارب کو مدعو کرتے ہیں پھر مولوی صاحب کو بلاتے ہیں وہ کچھ پڑھتے ہیں اور پھر سارے مل کر کھا لیتے ہیں۔ پاکستان میں غریبوں مسکینوں کو خبر ہو جائے تو وہ بھی کچھ حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن یہاں اس کا بھی کوئی امکان نہیں۔ بہر حال اس مروجہ رسم میں کسی غریب یا مسکین تک اس کا حق پہنچانے کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔

دوسری شکل یہ ہے کہ میت کے بعد اس کے ورثاء کسی دن کا تعین تو نہیں کرتے کسی بھی دن کھانا پکایا جاتا ہے لیکن دعوت اس میں بھی دوستوں یا برادری ہی کو ہوتی ہے غرباء کو یہاں بھی مکمل طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے۔

تیسری شکل یہ ہے کہ میت کے لئے نہیں بلکہ شب برات' شب قدر' محرم' جمعرات کو' ۱۲ ربیع الاول یا کسی اور مناسبت سے عمدہ کھانے پکائے جاتے ہیں۔ پھر گھر والے خود یا مولوی صاحب اس پر ختم پڑھتے ہیں پھر خود اس کھانے کو کھاتے ہیں۔

غور سے دیکھا جائے تو ان تینوں شکلوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ مروجہ ختم ہو یا رسم قل کی مختلف شکلیں دو باتیں آپ کو دونوں میں نمایاں نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ غرباء و مساکین کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ دوسری یہ کہ دونوں جگہ عزیز و اقارب اور مولوی صاحبان نمایاں نظر آئیں گے۔ ہم مندرجہ ذیل دلائل کی بنیاد پر ان مروجہ رسموں کو ناجائز سمجھتے ہیں۔

(۱) قرآن و حدیث میں ان رسومات کا کوئی ثبوت نہیں۔ خلفاء راشدین اور صحابہ کرام سے اس بارے میں کوئی چیز ثابت نہیں۔ چاروں اماموں کے دور میں یہ قل کی رسم یا جمعرات کا ختم وغیرہ کا کہیں ذکر نہیں۔

(۲) کھانے سے پہلے جو ختم کے الفاظ رائج ہیں یا کوئی سورت پڑھی جاتی ہے اس کا بھی رسول اللہ ﷺ یا صحابہؓ سے ثبوت نہیں- آپ کھانے پر بسم اللہ پڑھتے اور ختم کرنے کے بعد آپ سے متعدد دعائیں ثابت ہیں۔

(۳) چونکہ ان تمام جگہوں پر پکایا جانے والا کھانا غریبوں کی بجائے امیروں کو

بلکہ اپنے عزیزوں یا رشتہ داروں کو کھلایا جاتا ہے اس لئے اسے ایصال ثواب کے لئے قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(۴) اپنی طرف سے کسی دن کا مقرر کر لینا جب کہ شریعت میں اس دن کے تعین کا ثبوت نہ ہو' یہ بھی درست نہیں۔ اگر ان موقعوں پر پکایا جانے والا کھانا غریبوں ہی کو دیا جائے تب بھی تیجا' ساتواں یا چالیسواں کا نام دے کر دن مقرر کرنا غلط ہے۔ حضور ﷺ سے رمضان المبارک میں زیادہ صدقہ کرنے کی فضیلت حدیث سے ثابت ہے۔ اگر تیسرے' ساتویں یا چالیسویں دن کی بھی کوئی اہمیت ہوتی تو آپ اس کا ذکر ضرور فرماتے۔ اس لئے ایصال ثواب کے لئے دن کا اپنی طرف سے متعین کر دینا' یہ دین میں اضافہ ہے۔

(۵) اس طرح کی رسومات کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ لوگ انہیں اصل دین سمجھ لیتے ہیں اور کسی حالت میں بھی ان بے ثبوت کاموں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ فرائض کی پرواہ تو نہیں کرتے سنتوں کی تو ان کے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہوئی۔ لیکن رسومات ہر شکل میں ادا کرتے ہیں۔ یتیم بچے ہوں یا بیوہ عورت رہ جائے تو انہیں بھی ایسی رسومات کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور بعض لوگ تو قرض لے کر بھی یہ رسمیں پوری کرتے ہیں۔ لہٰذا اس غیر ضروری غیر ثابت رسم کے خاتمے کے لئے کوشش کرنی چاہیۓ تاکہ لوگوں پر خواہ مخواہ بوجھ نہ پڑے اور غیر شرعی کاموں کے کرنے پر وہ مجبور نہ ہوں۔

ایصال ثواب

اب رہا ایصال ثواب کا مسئلہ کہ صدقات و خیرات کا ثواب پہنچتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں ائمہ دین اور امت کے علماء کی مختلف آراء ہیں جن میں دو قابل ذکر ہیں۔ اول یہ کہ انسان کو انہی اعمال کی جزاو سزا ملے گی جو خود اس نے کیۓ ہیں- کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس رائے کی تائید میں قرآن کی یہ دو آیات پیش کی

جاتی ہیں۔ پہلی آیت ہے

﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (النجم : ۳۸)

کوئی نفس دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

دوسری یہ کہ:

﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ (النجم : ۳۹)

یعنی انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے کوشش کی۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان آیات کی رو سے مرنے کے بعد انسان کا اعمال سے رابطہ کٹ جاتا ہے مگر کچھ اعمال مرنے کے بعد بھی اسے فائدہ پہنچاتے رہتے ہیں اور یہ وہ اعمال ہیں جن سے مرنے والے کا زندگی میں کسی نہ کسی نوع کا تعلق ہوتا ہے۔ اس کی تائید یہ فرمان نبوی کرتا ہے۔

اذا مات الانسان انقطع عمله الا من صدقة جارية او علم ينفع به او ولد صالح يدعوا له۔[1]

جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے عمل کا ثواب موقوف ہو جاتا ہے مگر تین عملوں کا ثواب ملتا رہتا ہے۔ اگر اس نے صدقہ جاریہ کیا یا اس کے علم سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں یا اس کی نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ ایصال ثواب کے لئے اگر صدقہ کیا جائے تو میت کو اس کا ثواب پہنچتا ہے لیکن یہ موقف اس شکل میں درست ہوگا جب ان قباحتوں سے خالی ہو جن کا ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے لیکن اصل عمل پھر بھی وہی ہے جو آدمی اپنی زندگی میں کرتا ہے اس لئے مرنے سے پہلے ہی اعمال خیر کا خزانہ کر لینا چاہیے۔ یہی اصل چیز ہے۔ انہی نیک اعمال کے کرنے کی قرآن تائید کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ان نیک اعمال کے کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔ آخرت کے معاملے میں پچھلوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ بعد میں ثواب بلٹی کریں گے تو

---

[1] مختصر صحیح مسلم کتاب الجنائز باب ایصال الثواب رقم الحدیث ۱۰۰۱

بخشا جاؤں گا- اس لئے کہ ایک تو بعد والے اس کے ورثاء یہ ثواب پہنچانے کے پابند نہیں اور نہ ہی ان پر یہ فرض ہے اور پھر اکثر ایسے ہوتا ہے جو اعمال بعد میں کئے جاتے ہیں وہ ریاکاری، دکھلاوے اور برادری کی واہ واہ کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں اور ظاہر ہے لوگوں کو دکھلاوے کے لئے یا ان کی واہ واہ حاصل کرنے کے لئے جو اعمال کئے جاتے ہیں ان کا میت کو ثواب پہنچنے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ بات بڑی سیدھی اور صاف ہے جو ہمارے اکثر بھائیوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ صدقہ و خیرات صرف غریبوں کا حق ہے اگر کوئی رشتہ دار بھی اس کا مستحق ہے تو وہ بھی کہہ سکتا ہے۔ اگر مولوی صدقے کا حقدار ہے تو اسے بھی دینا چاہئے لیکن اصل شرط استحقاق (مستحق ہونا) ہے۔ بد قسمتی سے یہاں برطانیہ میں بعض مذہبی پیشہ وروں نے اس مسئلے کو ذریعہ معاش بنالیا ہے اس لئے وہ طرح طرح کی تاویلیں کرکے مسئلے کو پیچیدہ بنادیتے ہیں۔ لیکن خود قرآن نے اس مسئلے کو پوری طرح واضح کردیا ہے۔ دیکھئے سورہ التوبہ آیت نمبر ۵ جس کا ترجمہ یہ ہے بے شک صدقات فقیروں کے لئے اور مساکین کے لئے اور صدقات جمع کرنے والوں کے لئے اور ان کی تالیف قلب کے لئے جو نئے مسلمان ہوئے اور گردن آزاد کرانے کے لئے اور ان کے لئے جن پر قرض یا تاوان ہے اور اللہ کی راہ میں اور مسافر کے لئے ہیں-

اب اس کے بعد صدقات و خیرات کا مال رشتہ داروں یا دوستوں کو بلا کر کھلانا یہ قرآن مخالفت نہیں تو اور کیا ہے؟

اب اس بارے میں چند علماء کے فیصلے بھی ملاحظہ فرمالیں جو ان لوگوں کے نزدیک سند ہیں جو اس طرح کی رسموں کو رواج دینے میں پیش پیش ہیں:

(۱) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اپنی کتاب "سفر السعادت" میں لکھتے ہیں "عادت نبوی نبود کہ برائے میت در غیر وقت نماز جمع شوند و قرآن خوانند و ختمات خوانند نہ بر سر گور و نہ غیر آن واین مجموع بدعت است و مکروہ نعم تعزیت اہل میت و تسلیہ و صبر فرمودن سنت و مستحب است اما ایں اجتماع مخصوص روز سوم و ارتکاب

تکلفات دیگر وصرف اموال بے وصیت از حق یتامی بدعت وحرام است"

"یہ عادت نبویؐ نہ تھی کہ نماز کے علاوہ وہ کسی وقت جمع ہو کر قرآن پڑھتے یا قرآن ختم کرتے ہوں نہ قبر کے پاس نہ کسی دوسری جگہ اور یہ سب بدعات ہیں اور مکروہ' ہاں تعزیت کرنا یا ورثاء کو صبر و تسلی کی تلقین کرنا یہ سنت و مستحب ہے لیکن خاص طور پر تیسرے دن جمع ہو کر (کھانے وغیرہ میں) کئی تکلفات کرنا اور یتیموں کا مال وصیت کے بغیر خرچ کرنا یہ بدعت اور حرام ہے"

شیخ صاحب نے تین باتیں واضح فرمادی ہیں۔

اول: یہ کہ خاص تیسرے دن کو کسی غرض کے لئے جمع ہونا یہ بدعت ہے۔

دوسرا: تکلفات کرنا جن میں ایک کھانے کا تکلف بھی شامل ہے کہ اس دن پر تکلف کھانے خاص طور پر تیار کئے جاتے ہیں اور جہلا تو کھانے کی قسموں کی ایک مخصوص تعداد پوری کرتے ہیں۔

تیسرا: یہ کہ اگر یہ رسم ان لوگوں کے گھر ادا کی جائے جو یتیم رہ گئے ہیں یا بیوہ ہے تو پھر بالکل حرام ہے۔

اب یہ بدعت یا حرام کا فتویٰ ہمارا نہیں بلکہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ہے جن کا تمام مکاتب فکر کے لوگ احترام کرتے ہیں۔

(۱) حضرت ملا علی قاری حنفیؒ مشکوٰۃ کے حاشیہ مرقاۃ میں اس حدیث کے تحت جس میں رسول اکرم ﷺ نے حضرت جعفر کی وفات پر صحابہ کرامؓ سے کہا تھا کہ جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانے کا انتظام کرو (کیونکہ وہ صدمے سے دوچار ہیں) لکھتے ہیں "اور گھر والوں کا میت کے سلسلے میں کھانا تیار کرنا تاکہ لوگوں کو اکٹھا کر کے کھلایا جائے یہ بدعت ہے' مکروہ ہے اور امام غزالی نے ایسا کھانا کھانا مکروہ قرار دیا ہے اور اگر یتیم یا غیر حاضر آدمی کا مال ہو تو پھر تمام کے نزدیک حرام ہے۔"

(۲) مولانا عبدالحئی لکھنوی حنفیؒ فرماتے ہیں "خاص طور پر تیسرا دن خاص کرنا اور پھر اسے ضروری قرار دینا یہ شریعت محمدیہ میں ثابت نہیں۔"

بعض لوگ تیسرے دن کی تخصیص پر یہ عجیب دلیل پیش کرتے ہیں کہ موت کے بعد قبر میں وحشت کو دور کرنے اور سوال و جواب میں وہ ثواب کا محتاج ہوتا ہے اور یہ زمانہ قریب ہوتا ہے کہ اسے کچھ پہنچایا جائے۔ یہ اس لئے غلط ہے کہ اگر کھانے سے اس کی نجات ہو سکتی ہے تو پھر تین دن کا بھی انتظار نہیں کرنا چاہئے بلکہ پہلے اور دوسرے دن ہی یہ عمل کرلینا چاہئے جب بیچارے کی تین دن خوب مرمت ہو چکی تواب کیا فائدہ۔

بہرحال یہ تیسرا ہو یا چالیسواں یا برسی ہو سب کی حیثیت برابر ہے محض رسمیں ہیں۔ دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

چراغ جلانا

قبروں پر چراغ جلانا' عرس کرنا یا نذرونیاز وہاں جاکر دینا سب ہی غیر مشروع کام ہیں- قرآن و حدیث کے خلاف ہیں۔ صحابہ کرامؓ یا ائمہ دینؒ سے ان کا کوئی ثبوت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا اپنے گھروں کو قبروں کی طرح نہ بنالو اور میری قبر کو عید کی طرح نہ بنالینا اور مجھ پر درود بھیجو اور جس جگہ سے بھی تم درود بھیجو گے میرے پاس پہنچ جائے گا-(نسائی)

یہاں عید سے مراد خوشی کا اجتماع یا میلہ ہے جس طرح لوگ عید کے دن اظہار زینت کرتے ہیں' قبروں پر ایسے جائز نہیں اور آج کل عرسوں پر ایسے ہی عید اور میلے کی کیفیت ہوتی ہے بلکہ عوام تو ان کو کہتے ہی میلہ ہیں یعنی عید و جشن۔ قبروں پر چراغ جلانے سے بھی آپ نے منع فرمایا۔

قاضی ثناءاللہ حنفی پانی پتی اپنی تفسیر مظہری میں لکھتے ہیں:

ترجمہ: جہلا جو کام اولیاء یا شہداء کی قبروں پر کرتے ہیں ان میں سے یہ کام جائز نہیں۔

سجدہ کرنا' طواف کرنا' دیئے جلانا' قبر پر مسجد بنانا' سال کے سال عید کی طرح اس پر جمع ہونا جسے لوگ عرس کہتے ہیں۔

اپنی کتاب ارشاد الطالبین ص ۲۲ میں فرماتے ہیں:

"حضور ﷺ نے ان لوگوں پر لعنت کی جو قبروں پر چراغ جلاتے یا سجدہ کرتے ہیں۔"

نذر و نیاز کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی کا فیصلہ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ مکتوبات شریف نمبر ۴۱ جلد ۳ صفحہ ۷۱ میں لکھتے ہیں۔

ترجمہ: حیوانات کو مشائخ کے نام کی جو منت مانتے ہیں اور ان کی قبروں پر جاکر ان حیوانات کو ذبح کرتے ہیں فقہی روایات میں یہ چیزیں بھی شرک میں داخل ہیں اور فقہاء نے اس بات میں سختی سے منع کیا ہے۔

ہم نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا بلکہ قرآن و حدیث اور بزرگان دین کے فیصلے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ انصاف سے فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔

احکام رمضان

شب برات کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال: بریڈ فورڈ سے قربان حسین دریافت کرتے ہیں کہ کیا پندرھویں شعبان کو شب برات کے طور پر منانا حدیث سے ثابت ہے اور اس رات کی فضیلت کے بارے میں صحیح مسئلہ کیا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: برصغیر پاک و ہند میں اس رات کو شب برات کے علاوہ شب قدر بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ احادیث میں اس رات کے بارے میں شب برات یا شب قدر کے الفاظ کا کہیں ذکر نہیں۔ بعض روایات میں اس رات کا جو ذکر آیا ہے وہ نصف شعبان کی رات کے حوالے سے آیا ہے اور ویسے بھی شب قدر اور شب برات سے مراد لیلۃ القدر ہے جس کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔

سورہ القدر میں فرمایا:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ﴾

کہ ہم نے اس قرآن کو قدر والی رات میں نازل کیا۔

سورہ دخان میں ہے کہ

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾

یعنی ہم نے اس کتاب کو برکت والی رات میں نازل کیا۔

یہ خیال درست نہیں ہے کہ سورہ دخان میں مراد شعبان کی ۱۴۔ ۱۵ کی درمیانی شب ہے کیونکہ معتبر تفاسیر میں اس سے مراد لیلۃ القدر ہی لی گئی ہے۔

جہاں تک اس رات کو منانے کا تعلق ہے تو ہمارے ہاں اس کے مختلف

طریقے رائج ہیں:

ایک یہ کہ اس شام کو اچھے اور عمدہ کھانے (حلوہ وغیرہ) پکائے جاتے ہیں اور پھر خود ہی بیٹھ کر اسے مزے سے کھاتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ آتش بازی کی جاتی ہے اور گولہ بارود خوب استعمال کیا جاتا ہے۔

تیسرا طریقہ کچھ لوگوں کے ہاں یہ بھی مروج ہے کہ اس رات کے استقبال کے لئے گھروں کو صاف کیا جاتا ہے اور انہیں خوب سجایا جاتا ہے اور یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اس دن مرے ہوئے لوگوں کی روحیں واپس آتی ہیں۔

چوتھا طریقہ بعض جگہوں پر یہ بھی دیکھا گیا کہ اس رات لوگ خصوصی اہتمام کے ساتھ اور بعض اوقات اجتماعی شکل میں قبرستان کی زیارت اور دعا کے لئے جاتے ہیں۔

پانچواں طریقہ جو زیادہ معروف ہے وہ اس دن روزہ رکھنا اور رات کو عبادت و ذکر کرنے کا طریقہ ہے۔

ان پانچوں طریقوں میں جہاں تک پہلے تین کا تعلق ہے ان کے ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں بلکہ یہ بدعت اور خرافات کے زمرے میں آتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ نصف شعبان کی اس رات کو سرے سے اسلامی تہوار کہا ہی نہیں جاسکتا اور اسے عیدین یا حج وغیرہ کی شکل دینا ہی غلط ہے۔

اور پھر یہ حلوہ پکانے اور کھانے، آتش بازی کرنے اور گھروں کو سجانے کی رسمیں تو یوں بھی کسی اسلامی تہوار کا حصہ نہیں۔ یہ وہ خود ساختہ رسومات ہیں جو یا تو بعض مذہبی پیشواؤں نے اپنے مخصوص مفادات کے لئے جاری کیں اور یا پھر مسلمانوں نے ہندوؤں سے مستعار لے لی ہیں اور آتش بازی کا کسی دن کے منانے کے ساتھ اسلام میں سرے سے تصور ہی موجود نہیں۔

مردوں کی روحوں کے آنے کا عقیدہ بھی باطل ہے۔ قرآن وحدیث میں اس

کا کوئی ثبوت نہیں۔ مرنے کے بعد کسی روح کا واپس آنا نہ شعبان کی اس رات میں ممکن ہے نہ کسی دوسرے دن وہ واپس اس دنیا میں آسکتی ہیں۔

اس رات قبرستان کی خصوصی زیارت کا مسئلہ بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ یوں تو کسی بھی دن یا رات قبروں کی مسنون طریقے سے زیارت جائز ہے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کی تلقین فرمائی ہے لیکن اس رات بطور خاص اور اجتماعی شکل میں اس رات کی فضیلت کی وجہ سے جانا ثابت نہیں اس بارے میں ایک روایت ترمذی شریف کی پیش کی جاتی ہے۔ مگر محدثین نے اس سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اس لئے ضعیف حدیث سے دلیل نہیں پکڑی جاسکتی۔

اب رہا مسئلہ پانچویں طریقے کا جس پر زیادہ لوگ عمل کرتے ہیں یعنی دن کو روزہ رکھنا اور رات کو ذکر و عبادت کرنا اور اس کے فضائل بیان کرنے کے لئے مخصوص مجلسیں منعقد کرانا۔

اس بارے میں درج ذیل روایات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ شعبان کی پندرھویں شب کو اللہ تعالیٰ سورج غروب ہوتے ہی آسمان دنیا کی طرف نازل ہوتے اور اعلان فرماتے ہیں کہ جو کوئی بخشش مانگے' توبہ کرے' رزق میں فراخی مانگے' بیماری سے شفاعت طلب کرے' تو میں اس کی یہ دعائیں قبول کروں گا۔ یہ اعلان طلوع فجر تک جاری رہتا ہے۔

۲۔ دوسری حدیث یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس رات اللہ تعالیٰ مشرکوں اور آپس میں بغض وعناد رکھنے والوں کے سوا سب کو معاف کر دیتا ہے۔

۳۔ ایک تیسری روایت بھی عوام میں مشہور ہے کہ اس دن کا روزہ رکھو اور رات کو قیام کرو۔

یہ تمام روایات جو اس رات کی فضیلت میں بیان کی جاتی ہیں وہ سند کے اعتبار سے قابل استدلال نہیں اور محدثین نے حدیث کی صحت کے لئے جو معیار مقرر کیا ہے اس پر پورا نہیں اترتیں۔ اس لئے ان روایات کو بنیاد بنا کر اس رات کو خصوصی

اسلامی تہوار کی حیثیت دینا ہرگز قرین قیاس نہیں ہے۔ علماء کرام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کی اس بارے میں صحیح راہ نمائی کریں۔ ورنہ وہ بے چارے ان چیزوں کو شریعت کے احکام اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سمجھ کر پابندی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس بارے میں جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ شعبان کے مہینے میں دوسرے مہینوں کے مقابلے میں زیادہ روزہ رکھتے تھے۔

جیسا کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ بیان فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے علاوہ دوسرے جس مہینے میں سب سے زیادہ روزے رکھتے تھے وہ شعبان کا مہینہ تھا اور اس مہینے میں رمضان کی خود بھی تیاری کرتے اور صحابہ کرامؓ کو بھی ترغیب دیتے۔

آج مسلمان دین سے ناواقفیت کی وجہ سے اس مہینے میں کثرت صوم کے عمل سے تو غافل ہیں لیکن فالتو رسموں کو خوب اہتمام سے کرتے ہیں۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ یوں تو اس رات کو باقاعدہ اہتمام سے کسی خاص طریقے سے منانے کا ثبوت قرآن و حدیث میں نہیں لیکن لوگوں کو آتش بازی اور حلوے مانڈے کے شغل سے نجات دلانے کے لئے انہیں عبادت کی ترغیب دی جائے تو اس کے مقابلے میں یہ بہتر ہے اور اگر کوئی شخص آتش بازی اور فضول رسمیں چھوڑ کر انفرادی طور پر اس رات ذکر و عبادت کر لیتا ہے تو اسے بھی برا بھلا نہیں کہنا چاہئے بلکہ اس رات کی صحیح حیثیت اچھے انداز سے اس کے سامنے واضح کر دینی چاہئے۔

رویت ہلال کمیٹی

سوال: کسی شخص کا یہ کہنا کہ میں رویت کمیٹی کا چیئرمین ہوں' قاضی ہوں' میرے حکم پر ہی عیدین کے فیصلے ہوتے ہیں درست ہے؟ براہ مہربانی رویت ہلال کمیٹی پر روشنی ڈالیں کہ اس میں کون کون سے علمائے دین شامل ہیں؟

جواب: برطانیہ کے مسلمانوں کو عیدین کے موقع پر جو پریشانی ہوتی ہے اسے دور کرنے کی غرض سے اسلامک کلچرل سینٹر لندن کی کوشش سے رویت ہلال کمیٹی وجود میں آئی جس میں تمام مکاتیب فکر کے علماء شامل ہیں۔ تاہم کسی ایک شخص کو کمیٹی کا صدر یا قاضی ہونے کا دعویٰ کر کے لوگوں پر رعب نہیں ڈالنا چاہئے۔ کمیٹی یا اس میں شامل علماء کو بھی اتنا ہی اختیار ہے کہ وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنی رائے کا اظہار کریں یا فیصلہ کریں۔ اپنی طرف سے کوئی بات ٹھونسنے کی ان کو بھی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ کمیٹی کے چیئرمین اسلامک کلچرل سینٹر لندن کے ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر ذکی بداوی ہیں اور ایک لحاظ سے اس کمیٹی کا بانی بھی اسلامک کلچرل سینٹر لندن ہی ہے۔

تراویح اور تہجد میں کیا فرق ہے؟

سوال: سلاؤ سے چوہدری عبدالرشید لکھتے ہیں "قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ وضاحت فرمائیں کہ کیا ایک رات میں تراویح اور وتر کے بعد تہجد بھی پڑھی جا سکتی ہے؟ اور کیا تہجد اور تراویح ایک ہی نماز کے دو نام نہیں؟ تراویح سونے سے پہلے پڑھی جاتی ہے اور تہجد سو کر اٹھنے کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ بعض لوگ تراویح وتر سمیت

پڑھنے کے بعد تہجد پڑھنے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔"

جواب: دراصل تراویح اور تہجد رات کی نماز کے دو نام ہیں۔ رات کو سو کر اٹھنے کے بعد جو نفلی عبادت کی جاتی ہے اسے قیام اللیل اور تہجد کہا گیا اور اگر یہی نماز رمضان میں سونے سے پہلے پڑھ لی جائے تو اسے قیام رمضان یا تراویح سے تعبیر کیا گیا۔ عام طور پر قیام اللیل کو تہجد اور قیام رمضان کو تراویح کہا گیا ہے قرآن حکیم کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر نماز تہجد ضروری قرار دی گئی۔ فرمایا:

﴿وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (بنی اسرائیل : ۷۹)

اور رات کے کچھ حصے میں آپ قرآن کے ساتھ جاگیں۔ یہ اجر میں آپ کے لئے زیادہ ہوگا۔

مختلف احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ نماز تہجد ہی کو رمضان المبارک میں نماز تراویح کہا گیا۔

چنانچہ ترمذی شریف کی حدیث ہے۔ حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں:

قال صمنا مع رسول الله ﷺ فلم يصل بنا حتى بقي سبع من الشهر فقام بنا حتى ذهب ثلث الليل ثم لم يقم بنا في الثالثة و قام بنا في الخامسة حتى ذهب شطر الليل فقلنا يا رسول الله لو نفلتنا بقية ليلتنا هذه؟ فقال انه من قام مع الامام حتى ينصرف كتب له قيام ليلة ثم لم يقم بنا حتى بقي ثلاث من الشهر فصلى بنا في الثالثة و دعا اهله و نسا فقام بنا حتى تخوفنا الفلاح فقلت له مالفلاح قال السحور۔[1]

حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رمضان المبارک کے روزے رکھے۔ آپ نے ہمارے ساتھ پورا مہینہ جماعت کے ساتھ کوئی نماز نہ پڑھائی۔ یہاں تک کہ سات دن باقی رہ گئے تو پھر ایک رات آپ نے ہمارے ساتھ

---

[1] سنن ترمذی ج ۱ رقم الحديث ٦٤٦

تہائی رات قیام فرمایا۔ اس کے بعد پھر آپ نے پچیسویں رات کو آدھی رات تک قیام کیا۔ ہم نے عرض کیا اللہ کے رسول اگر آپ باقی رات بھی ہمیں عطا کر دیتے تو کیا اچھا ہوتا۔ آپ نے فرمایا جو امام کے ساتھ عبادت کرنے کے بعد پھر اس کے ساتھ واپس چلا جاتا ہے اس کی ساری رات کی عبادت لکھی جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ نے ستائیسویں کو ہمارے ساتھ نماز پڑھی اور اپنے اہل و عیال کو بھی ساتھ بلایا اور اتنی دیر تک ہمارے ساتھ رات کا قیام کیا کہ ہمیں یہ خوف لاحق ہو گیا کہ ہماری سحری فوت نہ ہو جائے۔

اب اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے ساری رات قیام کیا۔ یہاں تک کہ سحری کا وقت قریب آگیا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر تہجد کی نماز آپ نے کس وقت پڑھی۔ کیونکہ رات ساری تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ تراویح کی نماز پڑھتے ہوئے گزاری۔ ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ ظاہر ہے کہ رمضان المبارک میں وہی نماز تہجد جو حضورؐ پڑھا کرتے تھے وہ تراویح کی شکل میں ادا فرمائی۔

پھر حضرت عائشہ صدیقہؓ سے جب حضور ﷺ کی رات کی نماز کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان ہو یا غیر رمضان گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ اس سے تو بالکل واضح ہو گیا کہ تہجد اور تراویح ایک ہی نماز ہے۔ بس رمضان المبارک میں اس نماز کو تراویح کہا گیا۔

اور پھر رمضان المبارک میں تراویح وتر سمیت ادا کرنے کے بعد پھر تہجد پڑھنے کی کوئی تک نہیں۔ کیونکہ وتر رات کی نماز میں آخری ہونا چاہیے۔ جیسا کہ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ایکم خاف ان لا یقوم من آخر اللیل فلیوتر ثم لیرقد و من وثق بقیام من آخر اللیل فلیوتر من آخرہ فان قراۃ آخر اللیل محضورۃ

و ذالك افضل.[1]

آپؐ نے فرمایا: تم میں سے جسے یہ ڈر ہو کہ وہ وتر کے لئے رات کے آخری حصے میں نہیں اٹھ سکے گا تو وہ وتر پڑھ کر سوئے۔ اور جسے یقین ہو کہ وہ آخر رات میں اٹھے گا وہ آخری حصے میں وتر پڑھے اس لئے کہ اس وقت رحمت کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور یہی افضل ہے۔

اس لئے جو لوگ رمضان کے علاوہ تہجد پڑھتے ہوں انہیں بھی وتر آخر میں ہی پڑھنا چاہیئے بہر حال یہ نماز تہجد ہی ہے جسے رمضان المبارک میں حضور اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ نے زیادہ اہتمام و شوق سے ادا کیا اور یہی نماز تراویح ہے۔ جہاں تک تراویح کے بعد پھر تہجد پڑھنے کا مسئلہ ہے اس کا بظاہر کوئی ثبوت یا دلیل نہیں ہاں جو لوگ مزید نوافل ادا کرنے چاہتے ہوں تو ان پر نہ کوئی پابندی ہے اور نہ ہی ان نوافل کی کوئی تعداد مقرر ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کو بھی چاہیئے کہ اگر وہ رات کے آخری حصے میں مزید نفل پڑھنا چاہتے ہوں تو پھر وتر موخر کر دیا کریں اور نماز تراویح کے ساتھ وتر نہ پڑھیں بلکہ مزید نوافل ختم کرنے کے بعد وتر پڑھیں یہی افضل ہے۔

کیا نماز تراویح اور نماز تہجد ایک ہیں؟

سوال: بریڈ فورڈ سے محمد سلیم خاں کاملپوری لکھتے ہیں تہجد اور نماز تراویح ایک ہی نماز ہے یا دو علیحدہ علیحدہ نمازیں ہیں۔ جو دو علیحدہ علیحدہ نمازیں تصور کرتے ہیں ان کے پاس کون سی دلیل ہے؟

جواب: موجودہ دور میں ہمارے ہاں رات کی نماز کو عام طور پر نماز تراویح سے تعبیر

---

[1] مسلم مترجم ج ۱ کتاب الصلوۃ المسافرین باب صوۃ اللیل و عدد رکعات النبی ﷺ فی اللیل و أن الوتر رکعة و أن الرکعة صلاۃ صحیحة ص ۲۵۲

کیا جاتا ہے مگر حدیث میں اس نماز کے بارے میں کسی جگہ بھی لفظ "تراویح" استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اسے صلوۃ رمضان یا قیام لیل یا قیام رمضان کہا گیا ہے۔ جس کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے سوال کیا گیا تو اس کے جواب میں انہوں نے جو فرمایا اس کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابی سلمة بن عبد الرحمن انه سال عائشة كيف كانت صلوة رسول الله ﷺ في رمضان فقالت ما كان رسول الله ﷺ يزيد في رمضان و لا في غيره على احد عشرة ركعة[1]

"یعنی حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہ سے یہ سوال کیا کہ نبی کریم ﷺ کی رمضان میں نماز کیسے تھی تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آپ رمضان ہو یا غیر رمضان گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔"

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں

اول: یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی رات کی نماز کی رکعات گیارہ تھیں۔

دوم: یہ کہ رمضان کے علاوہ نماز تہجد بھی آپ گیارہ رکعت ہی پڑھتے تھے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ تہجد اور تراویح ایک ہی نماز تھی یا الگ الگ تو ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ یہ دونوں نمازیں رمضان میں ایک ہی تھیں کیونکہ تہجد کو بھی قیام اللیل کہا گیا اور حضرت عائشہؓ سے رات کی نماز کے بارے میں رمضان میں پوچھا گیا تو انہوں نے مذکورہ جواب دیا- جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ رمضان میں حضورؐ تراویح الگ اور تہجد الگ پڑھتے تھے۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ رمضان میں حضورؐ کی تہجد اور تراویح علیحدہ علیحدہ تھیں۔ وہ تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے بھی تہجد اور تراویح کا الگ الگ ذکر کیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ نے رمضان میں ان دونوں کو الگ الگ پڑھا ہے؟ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ یہاں اس موضوع پر بعض ممتاز حنفی علماء کے اقوال نقل کرنا مفید ثابت ہوگا۔

---

[1] فتح الباری ج ۳ کتاب التہجد ص ۳۴۳ رقم الحدیث ۱۱۴۷

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

لامناعنه من تسليم ان تراويحه عليه السلام كانت ثمانية ركعات و لم يثبت في رواية من الروايات انه عليه السلام صلى التراويح و التهجد عليحدة في رمضان۔[1]

ترجمہ: "اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضورؐ کی تراویح آٹھ رکعت ہی تھیں اور کسی بھی روایت سے یہ ثابت نہیں کہ حضورؐ نے کبھی تراویح اور تہجد الگ الگ پڑھی ہوں۔"

امام ابن الھمام حنفی فرماتے ہیں:

"فتحصل من هذا كله ان قيام رمضان سنة احدا عشرة ركعة بالوتر فعله ﷺ۔[2]

یعنی مذکورہ ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ قیام رمضان میں سنت گیارہ رکعت ہی ہے جو کہ آپؐ نے خود کیا ہے۔

ان کے علاوہ کبار علماء احناف جن میں امام طحاویؒ، علامہ عینیؒ، ملا علی قاریؒ اور شیخ عبدالحق دہلویؒ شامل ہیں۔ انہوں نے تسلیم کیا ہے کہ سنت تو گیارہ رکعت تراویح ہی ہے جب کہ اس سے زیادہ رکعات پڑھنا بھی جائز ہے۔

---

[1] عرف الشذی ص ۳۰۹

[2] فتح القدير شرح هدايه لابن الهمام ۱/۴۰۷ (مطبوع کوئٹہ)

کیا روزے کی نیت کے الفاظ ثابت ہیں؟
وقت سے پہلے روزہ کھولنے والے کا کیا حکم ہے؟

سوال: برمنگھم سے ایک صاحب روزے سے متعلق درج ذیل سوالات دریافت کرتے ہیں

(الف): بعض لوگ روزہ رکھنے سے پہلے یہ الفاظ کہتے ہیں کہ وبصوم غد نویت۔ جبکہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نیت کے لئے کوئی الفاظ مقرر نہیں اس کا تعلق دل سے ہے۔ صحیح مسئلہ کیا ہے؟

(ب): ایک شخص غلط فہمی کی وجہ سے روزہ وقت سے پہلے افطار کر دیتا ہے۔ کیا اس کے لئے کفارہ ہے؟

(ج): ایک شخص بہت بوڑھا اور کمزور ہے روزہ نہیں رکھ سکتا لیکن اتنا غریب ہے کہ فدیہ بھی نہیں دے سکتا تو اس کے لئے کیا حکم ہے؟

(د): ایک شخص رات کو بیوی کے ساتھ مباشرت کرتا اور پھر سحری کھا کر روزہ رکھ لیتا ہے، غسل نہیں کرتا اور نہ ہی فجر کی نماز پڑھتا ہے بلکہ اسی طرح سو جاتا ہے کیا اس کا روزہ ہو جائے گا۔

(ہ): کچھ لوگ رات کا کھانا کھا کر سو جاتے ہیں اور سحری کے وقت کھانے کے لئے نہیں اٹھتے، روزہ رکھ لیتے ہیں۔ کیا روزہ ہو جائے گا؟

جواب: (الف) : فرض روزے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے فجر سے پہلے نیت نہ کی اس کا روزہ نہیں ہوگا لیکن نیت چونکہ دل کے ارادے کو کہتے ہیں اس لئے کوئی خاص الفاظ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں۔ وبصوم غد نویت کے الفاظ بھی قرآن وحدیث یا سلف سے ثابت نہیں۔ اگر نیت کے لئے کوئی مخصوص الفاظ

ہوتے تو جس طرح روزہ افطار کرنے کی دعائیں رسول اکرم ﷺ سے ثابت ہیں اسی طرح روزہ رکھنے یا نیت کے وقت کے الفاظ بھی آپ سے ثابت ہوتے لیکن ایسی کوئی چیز ثابت نہیں۔

(ب): جس شخص نے غلطی سے روزہ افطار کر دیا یعنی یہ سمجھ لیا کہ سورج غروب ہو گیا اور افطاری کا وقت ہو گیا تو اس نے کھاپی لیا۔ اس پر کفارہ تو نہیں ہو گا لیکن ایک روزہ دوبارہ رکھنا پڑے گا۔ اس لئے کہ اتموا الصیام الی اللیل (رات آنے تک روزہ پورا کرو) اس پر عمل نہیں ہوا۔ اس لئے ایک روزہ قضا کرے۔

(ج): جو شخص بوڑھا اور ضعیف ہے کہ روزہ نہیں رکھ سکتا اور ساتھ ہی اتنا غریب ہے کہ فدیہ بھی نہیں دے سکتا اس کے لئے روزے اور فدیے دونوں کی معافی ہے یعنی روزہ بھی فرض نہیں اور کفارہ بھی نہیں کیونکہ **لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا**۔ اللہ کسی کو بھی اس کی طاقت سے باہر کسی عمل کی تکلیف نہیں دیتا۔ (البقرہ: ۲۸۶)

(د): جو شخص رمضان کی رات کو بیوی سے مباشرت کرتا ہے اسے چاہئے کہ سحری کھانے سے پہلے غسل کرے۔ اگر غسل کا وقت نہیں تو وضو کر کے سحری کھالے اور بعد میں غسل کر کے نماز پڑھے جو شخص اس حالت میں سحری کھا کر سو جاتا ہے نہ غسل کرتا ہے نہ نماز پڑھتا ہے اس کا روزہ تو ٹو جائے گا لیکن سخت گنہگار ہو گا اور رمضان المبارک میں ایسے گناہ اور معصیت کے کاموں سے بچنا چاہئے۔

(ہ): جو آدمی رات کو سو جاتا ہے اور سحری کھائے بغیر روزہ رکھ لیتا ہے ایسے آدمی نے اگر روزہ کی نیت نہیں کی تو روزہ نہیں ہو گا اور اگر نیت روزے کی ہے تو پھر سحری کھانا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے **فصل ما بين صيامنا و صيام اهل الكتاب اكل السحر**۔[1]

یعنی ہمارے روزے اور یہود و نصاریٰ کے روزے کے درمیان فرق یہ ہے کہ ہم سحری کھاتے ہیں اور وہ نہیں کھاتے تھے۔ ایک دوسری حدیث ہے **تسحروا فان في**

---

[1] مسلم مترجم ج ۳ کتاب الصیام باب فضل السحور ص ۱۰۸

السحور بركة-[1] سحری کھایا کرو اس میں برکت ہے۔

سوال: کیا روزے کی حالت میں مسواک یا برش (ٹوتھ پیسٹ) استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب: حدیث میں روزے کی حالت میں مسواک کرنے کی اجازت آئی ہے اور اس میں خشک یا تر مسواک کی کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ اس لئے اگر تر مسواک کی جا سکتی ہے تو ٹوتھ پیسٹ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس میں یہ بھی احتیاط ہونی چاہئے کہ حلق یا پیٹ میں اس کا اثر نہ جائے۔

مریض اور روزہ

سوال: وارم ووڈ جیل لندن سے مطلوب حسین تحریر کرتے ہیں

میری صحت کچھ ٹھیک نہیں ہے اور دوا کھاتا ہوں- رمضان میں مشکل سے تین روزے رکھ سکا ہوں۔ گولیاں نہ کھاؤں تو تکلیف زیادہ ہو جاتی ہے اور گولیاں کھاؤں تو روزے نہیں رکھ سکتا۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟

جواب: بیماری کی حالت میں روزے ترک کرنے کی رخصت ہے۔ قرآن حکیم میں ہے- "کہ جو کوئی تم میں مریض' یا مسافر ہے تو وہ دوسرے دنوں میں روزے پورے کرے" (البقرہ:۱۸۵)

اس لئے آپ روزہ چھوڑ سکتے ہیں' جب طبیعت ٹھیک ہو جائے یا دن چھوٹے ہوں' تو آپ کو ان روزوں کی قضا دینا ہو گی۔ ہاں اگر بیماری ایسی ہے کہ اس میں افاقہ سال بھر نہیں ہوتا اور نہ ہی مستقبل میں امید ہے تو پھر فدیہ دے سکتے ہیں یعنی ایک روزے کے بدلے میں روزانہ مسکین کو کھانا کھلانا۔

سوال: لندن سے عبدالکریم لکھتے ہیں۔

---

[1] سنن ابن ماجة ج ۱ كتاب الصيام باب ما جاء في السحور ص ۸۳۸ رقم الحديث ۱۶۹۲

رمضان المبارک میں مجھے اور میرے بعض ساتھیوں کو کچھ ایسے مسائل پیش آئے جن کے بارے میں بعض مذہبی لوگوں سے ہمیں کوئی واضح اور تسلی بخش جواب نہیں مل سکا۔ آپ اگر درج ذیل مسئلوں پر قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت کر دیں تو بہت سے لوگوں کے لئے فائدہ مند ہوگا۔

۱۔ اگر کسی آدمی پر روزے کی حالت میں غسل فرض ہو جائے یعنی نیند کی حالت میں احتلام ہو جائے تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا یا جاری رہے گا؟

۲۔ ایک آدمی نے یہ سمجھا کہ سورج غروب ہو گیا اور روزہ افطار کرنے کا وقت ہو گیا اور اس نے افطار کر دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ابھی وقت نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے روزہ وقت سے پہلے چھوڑ دیا کیا اس کا روزہ ہو جائے گا؟

۳۔ کیا کوئی شخص روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے بوس و کنار کر سکتا ہے؟

۴۔ مسافر کو روزہ چھوڑنے اور اس کے بعد قضا دینے کی اجازت ہے۔ کیا ہوائی جہاز' ریل گاڑی یا کار پر سفر کرنے والا بھی روزہ چھوڑ سکتا ہے؟

جواب: (۱) اگر کسی شخص کو بے خبری میں روزے کی حالت میں احتلام ہو گیا تو اس کے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ایک آدمی سحری کھا کر اور فجر کی نماز پڑھ کر سو گیا۔ مگر جب بیدار ہوا' اس پر غسل فرض ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں اس کے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ہاں اگر اس نے جان بوجھ کر کوئی ایسا عمل کیا جس کی وجہ سے احتلام ہوا تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔

(۲) جس شخص نے یہ سمجھ کر روزہ افطار کر دیا کہ سورج غروب ہو چکا ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ ابھی وقت نہیں ہوا تھا تو اس کا روزہ فاسد ہو جائے گا اور ایک روزہ دوبارہ رکھنا ہوگا۔

(۳) روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے بوس و کنار جائز ہے اور بنیادی طور پر اس کی اجازت ہے۔ لیکن اگر یہ خطرہ ہو کہ کنٹرول نہیں کر سکے گا اور کسی غلطی کا ارتکاب کر کے کچھ اور کر بیٹھے گا تو ایسے آدمی کے لئے احتیاط ہی بہتر ہے۔

(۴) مسافر کے لئے قرآن و سنت میں اس امر کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ روزہ ترک کر دے اور بعد میں اس کی قضا دے۔ اس سلسلے میں ہوائی جہاز' ریل کار یا پیدل سفر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ کیوں کہ اس اجازت کا سبب یہ نہیں کہ اس کو تکلیف اور مشقت کتنی برداشت کرنا پڑی بلکہ اصل سبب خود سفر ہے۔ لہٰذا جب بھی کوئی آدمی سفر پر ہوگا تو دوران سفر جس طرح وہ نماز قصر کرتا ہے اسی طرح روزہ چھوڑنے کی بھی اسے رخصت ہے۔ سفر آرام دہ ہو یا تکلیف دہ' اس میں کوئی فرق نہیں۔

حاملہ عورت یا مرضعہ کو روزہ معاف ہے؟

سوال: لندن سے عبدالرحمٰن دریافت کرتے ہیں کہ حاملہ عورت یا چھوٹے بچے کو دودھ پلانے والی عورت کو روزہ معاف ہے؟ کیا مسافر کی طرح انہیں بعد میں روزہ کی قضا دینا ہوگی یا انہیں مکمل طور پر روزہ معاف ہے؟

جواب: حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے روزہ معاف ہے لیکن بعد میں قضا دینا ضروری ہے یعنی بالکل معاف نہیں ہے۔ حدیث میں ہے' حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان الله وضع من المسافر شطر الصلوة والصوم عن المسافر و عن المرضع والحبلى۔[1]

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مسافر سے نصف نماز اٹھالی ہے اور روزہ مسافر' حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کے لئے معاف کیا ہے۔

اس حدیث سے واضح ہے کہ جس طرح مسافر کیلئے روزہ معاف ہے لیکن اس کیلئے بعد

[1] سنن ترمذی للالبانی ج ۱ کتاب الصوم باب الرخصة فی الافطار للحبلی--- الخ... ص ۲۱۸ رقم الحدیث ۷۰۸

میں قضا ضروری ہے اسی طرح وہ عورت جس کے پیٹ میں بچہ ہے اور وہ روزہ نہیں رکھ سکتی یا جو عورت بچے کو دودھ پلاتی ہے اور روزے کی حالت میں وہ دودھ نہیں پلاسکتی تو اس کے لئے بھی بعد میں اس روزے کی قضا ضروری ہے۔ اسی طرح ایام حیض یا نفاس میں بھی چھوڑے گئے روزوں کی بعد میں قضا ضروری ہے۔ حافظ امام ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں حضرت حسن بصریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ حاملہ اگر روزہ نہیں رکھتی تو بعد میں قضا کرے گی۔ اسی طرح امام المحدثین حضرت امام بخاریؒ نے بھی حاملہ و مرضعہ کے بارے میں روزے قضا کرنے کے سلسلے میں متعدد اقوال نقل کئے ہیں۔ بعض اہل علم نے حاملہ و مرضعہ (دودھ پلانے والی) کو مریض کے قائم مقام رکھا ہے اور مریض کے بارے میں قرآن نے صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ وہ بعد میں قضا دے گا۔

اعتکاف والا آدمی اور گپ شپ

سوال: ریڈنگ سے کرم الٰہی تحریر کرتے ہیں

رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اعتکاف بیٹھنے والے بعض حضرات پوری مسجد میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور آنے والوں سے کھل کر گپ شپ بھی لگاتے ہیں اور ملحقہ کمرے میں سگریٹ نوشی بھی کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں بتائیں۔

(۱) اعتکاف رمضان المبارک میں ایک اہم عبادت ہے جس میں مسلمان دنیاوی مشاغل سے اپنے آپ کو الگ کر کے ذکر الٰہی کے لئے وقف کر دیتا ہے اور یہ قرب الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔ ضرورت کے مطابق کبھی کبھی اپنے اعتکاف کی جگہ سے باہر نکل کر چکر لگانے میں کوئی حرج نہیں لیکن گپ شپ لگانا یا سگریٹ نوشی کرنا یہ ہرگز جائز نہیں ہے اور ایسی حرکات سے اعتکاف کا مقصد پورا نہیں ہوتا اور محض دکھلاوے کا ایک

عمل بن کر رہ جائے گا۔ اس لئے اعتکاف میں بیٹھنے والے بزرگوں کو چاہئے کہ ان دنوں میں اپنے عام معمولات میں تبدیلی کریں اور زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کی عبادت اور اس کی یاد میں گزاریں اور سگریٹ نوشی اور اس طرح کی دوسری بری عادات سے مکمل اجتناب کریں۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

بچے کی امامت رمضان میں

سوال: رمضان المبارک میں بعض چھوٹی عمر کے لڑکے جماعت کراتے ہیں خاص کر نماز تراویح پڑھاتے ہیں تو کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی کیونکہ نابالغ ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے کہ ان کے پیچھے نماز نہیں ہوتی؟

جواب: چھوٹی عمر کے بچے کی امامت کے بارے میں ائمہ دین کے درمیان اختلاف ہے بعض جائز کہتے ہیں اور بعض نے ناجائز قرار دیا ہے اور بعض اہل علم فرض اور نفل میں فرق کرتے ہیں۔ یعنی فرض نماز میں نابالغ کی امامت جائز نہیں جب کہ نفل نماز جیسے تراویح وغیرہ میں امامت کرا سکتا ہے۔

لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں فرض یا نفل میں کوئی فرق نہیں۔ اگر اس کے اندر امامت کی اہلیت پائی جاتی ہے تو وہ جماعت کرا سکتا ہے اور اس کی امامت میں نماز ادا کرنا درست ہے۔

ایک حدیث میں ہے حضرت عمرو بن مسلمؓ کہتے ہیں:

فقدموني وانا غلام و علي شملة لي قال فما شهدت مجمعاً من جرام الا كنت امامهم[1]

---

[1] سنن ابی داود مترجم ج۱ کتاب الصلاۃ باب من احق بالامامۃ ص ۲۶۷ رقم الحدیث ۵۸۲۔

مجھے لوگوں نے اس وقت امامت کے لئے آگے کیا جب میں ابھی بچہ تھا اور جرم قبیلے کے اکثر اجتماعات میں مجھے ہی امامت سونپی جاتی تھی۔

امامت میں اصل چونکہ قرآن کا علم اور اس کی قرأت ہے۔ حضرت عمرو بن مسلم جن کی عمر اس وقت چھ سات سال کے قریب تھی' قرآن پڑھنے میں ان سب میں بہتر ہونے کی وجہ سے ان کی امامت کراتے تھے اور یہ بھی ثابت ہے کہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے والے اکثر صحابہ کرامؓ تھے۔

لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اگر بڑی عمر کا کوئی شخص بہتر قرآن پڑھنے والا نہ ہو اور بچہ موجود ہو تو بچے کی امامت فرض اور نفل دونوں میں جائز ہے۔ ہاں اگر بڑی عمر کا عالم یا حافظ موجود ہے تو پھر بچے کو امام بنانے سے احتراز کرنا ہی افضل ہے۔

مسائل عیدین

نماز عید فرض یا سنت؟

سوال: محمد حسن ویکفیلڈ سے لکھتے ہیں نماز عیدین فرض ہے یا سنت؟ اور کیا جیل میں مسلمان قیدی کے لئے یہ نماز ضروری ہے؟

جواب: دنیا میں مختلف قوموں اور اصحاب مذاہب کی عید اور میلے کے دن ہیں جن میں وہ خوشی اور مسرت کا مختلف طریقوں سے اظہار کرتے ہیں۔ اسلام نے بھی جہاں انسان کی روحانی و جسمانی ضروریات کا خیال رکھا ہے وہاں خوشی و مسرت کے مظاہرے کے لئے بھی اس کی طبعی و فطری ضروریات کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس لئے امت اسلامیہ کو دوسری قوموں کا تابع بنانے کی بجائے اسے عید کے دو دن عطا کئے ہیں جو عبادت کے دن ہونے کے ساتھ اظہار خوشی و مسرت کے ایام بھی ہیں۔ ان میں ایک عید الفطر ہے جو رمضان کے روزوں کا عمل مکمل کرنے کے بعد رکھی گئی ہے اور دوسری عید الاضحیٰ ہے جو حج کے اہم فریضے کی ادائیگی کے بعد رکھی گئی ہے۔ ان دونوں عیدوں کے علاوہ اسلام میں کسی اور شرعی عید کا کوئی تصور نہیں ہے اور نہ ہی اور کسی عید کے احکام و مسائل کا کتب حدیث و فقہ میں ذکر ہے جیسے آج کل لوگ عید میلاد النبیؐ یا عید غدیر وغیرہ مناتے ہیں۔

عیدین کی نماز کی حیثیت کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ فرض ہے یا سنت؟ بعض نے اسے واجب قرار دیا ہے بعض نے سنت مؤکدہ اور بعض کے نزدیک صرف سنت ہے بہر حال یہ نماز فرض نہیں ہے۔ فرض تو دن اور رات میں صرف پانچ نمازیں ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی بھی نماز فرض نہیں ہے۔

صحیح بات یہی ہے کہ یہ نماز سنت ہے لیکن اہمیت کے لحاظ سے یہ سنت ممتاز و منفرد ہے۔ اس کا اہتمام دوسری سنتوں کے مقابلے میں زیادہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ عبادت اور عید کے ساتھ عیدین کے اجتماعات مسلمانوں کی یک جہتی اور اتحاد کے مظاہر بھی ہیں۔
جب یہ فرض نہیں تو جیل کے قیدی پر بدرجہ اولیٰ فرض نہیں ہوگی۔ اگر آسانی سے جیل میں قیدیوں کے لئے عیدین کی نماز کا اہتمام ہو سکتا ہے تو بہتر ورنہ ان کے لئے یہ نماز ادا کرنا ضروری ہرگز نہیں۔ قیدیوں کے لئے تو نماز جمعہ (جو فرض ہے) بھی لازمی نہیں ہے جب کہ عیدین کی نماز ویسے بھی فرض نہیں۔

هذا ما عندی و الله اعلم بالصواب

عیدین کے دن روزہ رکھنا حرام ہے!

سوال: محمد علی لکھتے ہیں کہ سال میں وہ کون سے دن ہیں جن میں روزہ رکھنا حرام یا منع ہے؟

جواب: سال میں عید الفطر یا عید الضحٰی کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ اس بارے میں رسول اکرم ﷺ کی احادیث میں واضح ارشادات موجود ہیں۔ اسی طرح ایک حدیث میں آپ نے ایام تشریق میں روزے رکھنے سے بھی منع کیا ہے۔ گیارہ، بارہ، تیرہ ذوالحجہ کو ایام تشریق کہتے ہیں۔ مسلم شریف کی حدیث ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا
ایام التشریق ایام اکل و شرب و ذکراللہ عز و جل[1] کہ ایام تشریق کھانے پینے اور اللہ کو یاد کرنے کے دن ہیں۔

---

[1] مسلم للالبانی کتاب الصیام باب کراھیة الصیام أیام التشریق۔

عورتیں نماز عید کے لئے جاسکتی ہیں؟

سوال: لندن سے حبیب الرحمٰن لکھتے ہیں کہ کیا عورتیں نماز عید میں شامل ہو سکتی ہیں؟ لندن کی مرکزی مسجد میں عورتیں جس طرح بن ٹھن کر آتی ہیں، اس سے بہت دکھ پہنچتا ہے۔ کیا انہیں روکا نہیں جاسکتا؟

جواب: رسول اکرم ﷺ کے دور میں عورتیں نہ صرف عید کی نماز میں بلکہ نماز جمعہ اور پنجگانہ نماز کی ادائیگی کے لئے بھی مسجد میں آتی تھیں۔ عید کے بارے میں تو خاص طور پر بخاری و مسلم کی حدیث سے جواز ثابت ہوتا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

عن ام عطية قال امرنا ان نخرج الحيض يوم العيدين و ذوات الخدور فيشهدن جماعة المسلمين و دعوتهم و تنزل الحيض عن مصلاهن قالت امراة يا رسول الله احدنا ليس لها جلباب قال لتلبسها صاحبتها من جلبابها۔[1]

حضرت ام عطیہؓ سے روایت ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا کہ حیض والی عورتوں اور پردے والی عورتوں کو بھی دونوں عیدوں میں باہر ساتھ لے کر جائیں وہ مسلمانوں کی جماعت اور دعا میں شریک ہوں اور حیض والی عورتیں نماز میں شامل نہ ہوں۔ ایک عورت نے کہا اللہ کے رسول اگر کسی عورت کے پاس چادر نہ ہو تو وہ کیسے شامل ہو؟ آپ نے فرمایا اس کی کوئی ساتھی اپنی چادر اوڑھا لے۔

اب اس حدیث سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ خواتین نماز عید کے لیے عید گاہ میں

---

[1] فتح الباری ج ۳ کتاب العیدین باب خروج النساء والحیض الی المصلی ص ۱۴۳ رقم الحدیث ۹۷۴۔

جاسکتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ عورتوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شرم وحیاء کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے باپردہ لباس میں باہر نکلیں اور بن ٹھن کر یا میک اپ کر کے ہر گز عید گاہ میں نہ جائیں۔

جو عورتیں محض اپنے حسن کی نمائش کے لئے مرکزی مسجد لندن یا کسی دوسرے مرکز میں جاتی ہیں وہ گناہ گار ہیں۔ ایسی عورتوں کو مساجد سے دور رکھنے کے لئے مسجد کی انتظامیہ کو اقدامات کرنے چاہئیں۔

مسلم شریف کی ایک حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو عورت مسجد میں حاضر ہونا چاہتی ہے وہ خوشبو کو ہاتھ تک نہ لگائے۔

ایسے مرد بھی گناہ گار ہیں جن کی عورتیں بناؤ سنگار کر کے اس طرح مردوں کے سامنے آتی ہوں۔ عید ہو یا کوئی دوسرا موقع یہ بہر حال ناجائز ہے۔

نماز عید سے پہلے نفل پڑھنا جائز ہے؟

سوال: برمنگھم سے محمد حسین دریافت کرتے ہیں کہ عید کے موقع پر اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ نوافل پڑھتے ہیں حالانکہ ہم نے تو یہ سن رکھا ہے کہ عید کی نماز سے پہلے کوئی نماز نہیں ہوتی۔ اس بارے میں صحیح موقف رسالے میں پیش کر کے شکریے کا موقع دیں۔

جواب: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عید کی نماز سے پہلے کوئی نفل یا سنت پڑھنا ثابت نہیں اور اس بارے میں حضرت عمرو بن شعیبؒ کی روایت بڑی واضح ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده ان النبی ﷺ کبر فی عید ثنتی عشرة تکبیرة سبعا فی الاولی وخمسا فی الاخرة ولم یصل قبلها ولا

بعدھا۔[1]

حضرت عمرو بن شعیبؒ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز عید میں بارہ تکبریں کہیں' پہلی رکعت میں سات اور آخری رکعت میں پانچ اور نماز سے پہلے اور بعد آپؐ نے کوئی نماز نہیں پڑھی۔

اس لئے اس بارے میں تو کوئی شبہ نہیں کہ عید کی نماز سے پہلے یا بعد کوئی نماز نہیں۔ لیکن بعض اوقات کچھ لوگوں کو اس لئے بھی مغالطہ ہوتا ہے کہ جب نماز عید مسجد میں پڑھی جاتی ہے تو وہ مسجد میں داخل ہو کر دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھتے ہیں پھر نماز عید کے انتظار میں بیٹھتے ہیں کیونکہ دوسری طرف یہ حدیث بھی بڑی واضح ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو اس وقت تک مسجد میں نہ بیٹھے جب تک دو رکعت ادا نہ کرلے۔ اس لئے تحیۃ المسجد کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہے۔

چونکہ نماز عید سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے کوئی نماز نہیں پڑھی' اس لئے بہتر یہی ہے کہ عید کی نماز سے قبل کوئی نفل سنت نہ پڑھا جائے۔ چاہے نماز مسجد میں ہو یا میدان میں۔ کیونکہ لوگ اپنی ناواقفیت کی وجہ سے اسے عید کی نماز کا حصہ سمجھ کر ادا کرنا شروع کردیں گے۔

کیا جمعتہ المبارک کے دن عید جائز ہے؟

سوال: سلیم خاں کامل پوری بریڈفورڈ سے تحریر کرتے ہیں کہ

"کیا بروز جمعتہ المبارک عید کرنا درست نہیں جیسا کہ اکثر حضرات کا عقیدہ ہے

---

[1] ابن ماجہ مترجم ج ۱ کتاب اقامۃ الصلوۃ باب ماجاء فی کم یکبر الإمام فی الصلوۃ العیدین ص ۶۳۴ رقم الحدیث ۱۳۷۷۔

اور اکثر اخبارات میں آتا رہتا ہے کہ جمعہ کو دو خطبے بادشاہ وقت کے لئے باعث زوال ہیں سنت صحیحہ کے مطابق مسئلہ حل فرمائیں"

جواب: اسلام میں کسی چیز یا کام کے جائز و ناجائز ہونے کا اصل معیار کتاب و سنت ہے۔ اگر ایک مسئلے کو لوگوں کی اکثریت اپنا لیتی ہے مگر وہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاف ہے تو وہ ہرگز جائز نہیں ہوگا چاہے کتنی بڑی اکثریت اس پر عمل کیوں نہ کرتی ہو۔ اسی طرح ایک عمل قرآن و سنت سے ثابت ہو مگر لوگوں کی بڑی تعداد اس کی تارک ہے تو اس کے جائز و درست ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح عام روزانہ اخبارات میں جو چیزیں شائع ہوتی رہتی ہیں ان کے ساتھ اگر کوئی شرعی سند نہیں تو محض اخبارات میں شائع ہونے سے کوئی بات ہرگز جائز ثابت نہیں ہوگی۔

جمعہ کے دن عید یا دو خطبوں کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے یہ بھی عوامی ذہن کی پیداوار ہے۔ قران و سنت سے ایسی باتوں کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ویسے عقلی طور پر بھی یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف ہم جمعہ کے دن کو خیر و برکت کا دن کہتے ہیں اسی طرح عید کے دن کو بھی ہم مبارک دن سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں مگر جب دو برکتیں ایک دن جمع ہو جائیں تو اسے ہم نحوست اور باعث مصیبت سمجھتے ہیں حالاں کہ اچھے کام یا اچھے دن جتنے زیادہ ہوں گے زیادہ خیر و برکت ہونی چاہئے نہ کہ قوموں اور حکمرانوں کے لئے باعث زوال۔ اس لئے یہ سب لایعنی اور فضول عقائد ہیں جو دین سے دوری اور جہالت کا نتیجہ ہیں دین میں ان کی ہرگز کوئی اصل نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس خود نبی کریم ﷺ کے دور مبارکہ میں جمعہ اور عید ایک ساتھ آئے ہیں اور آپ نے اس کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں فرمائی کہ ان دونوں کا جمع ہونا خطرناک اور باعث نقصان ہے۔

صحاح ستہ کی اکثر کتابوں میں یہ روایت موجود ہے کہ حضرت زید بن ارقمؓ فرماتے ہیں کہ جمعہ کے دن عید آئی اور نبی کریم ﷺ نے نماز عید پڑھی۔ اس کے بعد فرمایا کہ جمعہ کی رخصت ہے جو چاہے نماز پڑھ سکتا ہے۔ ابو داؤد میں حضرت ابوہریرہؓ سے

روایت ہے کہ فرمایا کہ آج تمہارے لئے دو عیدیں یعنی دو خوشیاں جمع ہو گئی ہیں جو چاہے جمعہ بھی پڑھ سکتا ہے (اور رخصت بھی ہے) اور ساتھ ہی فرمایا ہم تو دونوں کو جمع کریں گے۔ اب رسول اکرم ﷺ تو اس دن کو جب جمعہ کو عید ہو دو خوشیاں قرار دے رہے ہیں اور ہم پریشان ہو رہے ہیں کہ اگر یہ دو عیدیں جمع ہو گئیں تو نا معلوم کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔

یہ ان توہم پرستوں اور خرافات کا نتیجہ ہے جس میں امت کا ایک بڑا طبقہ آج گرفتار ہے۔ خالص کتاب و سنت کی طرف رجوع کئے بغیر ان جہالتوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

کیا قربانی کا گوشت غیر مسلموں کو بھی دیا جا سکتا ہے؟

سوال: برمنگھم سے محمد ایوب دریافت کرتے ہیں کہ کیا قربانی کا گوشت غیر مسلموں کو بھی دیا جا سکتا ہے؟ نیز یہ بھی وضاحت کریں کہ اگر میت کی طرف سے قربانی دی جائے تو اس کا گوشت سارے کا سارا غریبوں کو دینا چاہئے' یا خود بھی کھا سکتے ہیں؟

جواب: قربانی اور عقیقہ کا گوشت ہر شخص کو دیا جا سکتا ہے۔ یہ صدقے یا خیرات کی طرح نہیں کہ صرف غرباء و مساکین کو دیا جائے۔ اسی طرح شریعت میں کوئی ایسی واضح نص بھی نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ قربانی کا گوشت غیر مسلموں کو نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے برعکس قرآن حکیم سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کا گوشت ہر شخص چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر اسے دیا جا سکتا ہے۔ فرمایا:

﴿اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ﴾ (الحج : ۳۶)

جو مانگے اسے بھی دو اور جو نہ مانگے اسے بھی کھلاؤ۔ اب اس آیت میں مسلم یا کافر کی کوئی شرط نہیں ہے۔

جہاں تک میت کی طرف سے قربانی دینے کا تعلق ہے تو اس میں بھی ایسی کوئی

شرط قرآن و سنت سے ثابت نہیں کہ میت کی طرف سے دی جانے والی قربانی کا گوشت صرف غرباء و مساکین کو دینا چاہئے۔اس لئے قربانی جس کی طرف سے بھی ہو اس کا گوشت ہر شخص کھا سکتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جہاں غریب لوگ رہتے ہوں وہاں یہ کوشش ضرور ہونی چاہئے کہ قربانی کے گوشت میں ان کا حصہ رکھا جائے اور جہاں غرباء و مساکین یا عزیز و اقارب نہ ہوں وہاں سارا گوشت خود بھی رکھ سکتے ہیں۔

قربانی کے جانور کی عمر کتنی ہونی چاہئے؟

سوال: برمنگھم سے ہی محمد نذیر پوچھتے ہیں کہ قربانی کے جانور کی عمر کے بارے میں تحریر کریں کہ کتنی ہونی چاہئے اور کیا عمر کی پابندی ضروری ہے؟

جواب: قربانی کے جانوروں کے بارے میں مختلف احادیث سے یہ چیز ثابت ہوتی ہے کہ جس جانور کے دو دانت نکل آئیں اور سامنے کے دو نئے دانت اسی وقت نکلتے ہیں جب جانور دو سال کا ہوتا ہے اس لئے بہتر اور مناسب یہی ہے کہ قربانی کے جانور کی عمر دو سال ہو۔ بعض روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر دو سال کا نہ ملے تو پھر بکری یا دنبہ اگر موٹا تازہ ہو تو سال کا بھی جائز ہے۔ برطانیہ میں جانوروں کی عمر کے بارے میں لوگ احتیاط نہیں کرتے خاص طور پر جو لوگ دیکھے بغیر فون پر قربانی ذبح کروا دیتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ اچھی طرح اس بات کی تسلی کر لیا کریں کہ جانور کی عمر پوری ہے ورنہ قربانی ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔

☆☆☆

قرآن حکیم سے متعلق چند سوالات

قرآن حکیم کو احتراما چومنا جائز ہے؟

سوال: براکل مغربی جرمنی سے محمد اشفاق نعیم لکھتے ہیں

(۱) کیا قرآن پاک کو پڑھنے کے لئے جب کھولا جاتا ہے تو احتراما چومنا جائز ہے یا نہیں؟ قرآن پاک کی عبارت پر ہاتھ پھیر کر چہرے پر پھیرنا خیر و برکت کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

جواب: قرآن پاک کا جتنا ادب و احترام بھی کیا جائے وہ کم ہے اور سرور دو عالم ﷺ کے اس ہمیشہ باقی رہنے والے معجزے کی عزت ہر مسلمان کے دینی فرائض میں شامل ہے۔ لیکن ادب واحترام کے سلسلے میں دو باتوں کا خیال رکھنا ہر حال میں ضروری ہے۔

اول: یہ کہ قرآن کا اصل ادب اس کے احکام بجالانا اور اس کی تعلیمات کا پڑھنا سمجھنا اور ان پر عمل کرنا ہے۔ قرآن کی اصل دعوت عمل ہے اور قرآن کے احکام اور اس کی تعلیمات کی بجا آوری کے بغیر اس کے ادب و احترام کا تصور بھی بے معنی ہے کیونکہ نزول قرآن کا مقصد صرف ظاہری آدب بجالانا نہیں بلکہ اصل غرض اس کے قوانین اور ضابطوں کو نظام زندگی کے طور پر اپنانا ہے۔

دوم: یہ کہ ظاہری ادب و احترام کے بھی وہی طریقے بہتر و افضل ہیں جو رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہوں۔ اور جو طریقے آپ سے ثابت نہ ہوں ان سے بچنا ہی بہتر ہے۔ قرآن کو کھولنے سے پہلے یا بعد میں چومنا یہ اظہار ادب کے لئے ہے لیکن اس طرح کا کوئی ثبوت نبی کریمؐ یا صحابہؓ سے نہیں ملتا کہ وہ قرآن کھولنے سے

پہلے یہ کام کرتے ہوں۔ بلکہ آپ نے یا خود قرآن نے جو ظاہری آداب بتائے ہیں ان میں یہ ہے کہ محبت و عقیدت کے ساتھ کلام الٰہی سمجھ کر قرآن اٹھایا جائے۔ اس کے لئے جسم کا پاک صاف ہونا بھی ضروری ہے اس کے پڑھنے سے پہلے تعوذ اور بسم اللہ پڑھ لی جائے اور اسے پاک و صاف جگہ میں رکھا جائے جہاں اس کی بے ادبی اور توہین نہ ہو۔

یوں تو قرآن کے ایک ایک حرف میں خیر و برکت ہے لیکن اس کی عبارت پر ہاتھ پھیر کر چہرہ پر ہاتھ پھیرنا' اس طرح کا عمل کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ اس کی عبارت یا الفاظ کی تلاوت کی جائے۔ اس کے پڑھنے میں یقیناً خیر و برکت ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ قرآن حکیم کی تلاوت جہاں روحانی بیماریوں سے شفا کا ذریعہ ہے وہاں ظاہری جسمانی بیماریاں بھی اس کی تلاوت و قرات سے دور ہو سکتی ہیں مگر ہاتھ پھیرنے یا ملنے کے عمل کو رسم کے طور پر کر لینا سلف صالحین سے بھی ثابت نہیں۔

کیا قرآن مجید نا مکمل ہے؟

سوال: ہیرٹ براک ویسٹ جرمنی سے بشیر احمد بھٹہ دریافت کرتے ہیں

ا۔ یہاں ایک شیعہ دوست سے کبھی کبھی تبادلہ خیال ہوتا رہتا ہے اس کا ایک اعتراض ہے (نعوذ باللہ) کہ قرآن مجید نا مکمل ہے کیونکہ اس میں ۳۶۰ آیات' جو اہل بیت کے متعلق نازل ہوئی تھیں شامل نہیں ہیں۔

جواب: ا۔ آپ کے شیعہ دوست کا قرآن عظیم کے بارے میں یہ خیال اور عقیدہ قطعی طور پر باطل ہے کہ یہ نامکمل کتاب ہے۔ جو شخص قرآن حکیم کو ایک مکمل' آخری' الہامی کتاب نہیں مانتا وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ جس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری خود خالق کائنات نے لی ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس میں کچھ آیات شامل

نہیں گمراہی اور جہالت ہے۔ارشاد ربانی ہے۔

﴿انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون﴾ (الحجرات :۹)

کہ ہم نے اس ذکر یعنی کتاب کو نازل کیا اور بلا شبہ ہم اس کی حفاظت بھی کرنے والے ہیں اور جب تمام مسلمانوں کا یہ بنیادی عقیدہ ہو (جس میں شیعہ و سنی سب شامل ہیں) کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسانوں کی قیامت تک کے لئے ہر شعبہ حیات میں راہ نمائی کرتا ہے اور ظاہر ہے یہ مکمل و عالم گیر ضابطہ حیات قرآن مجید کی شکل میں ہے۔ اگر قرآن کو غیر محفوظ اور نامکمل سمجھا جائے تو پھر پورے دین اسلام کی بنیادیں ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ اس فرقان عظیم میں دین اسلام کے مکمل ضابطے موجود ہیں۔ صحابہ کرامؓ اور پھر ان میں سے اہل بیت کے بارے میں جو باتیں اللہ کے نزدیک ضروری تھیں وہ اس میں بیان کر دی گئی ہیں اور جن کی ضرورت خود اللہ تعالیٰ نے نہیں سمجھی انہیں اس میں ذکر نہیں کیا۔ اب شیعہ بھائی کے لئے ۳۶۰ نئی آیات بنا کر اس میں داخل نہیں کی جا سکتی تھیں اور پھر تاریخی سلسلے کی ایک ایک کڑی اس بات پر شاہد ہے کہ ۱۴سو سال سے آج تک قرآن کی کوئی سورت یا آیت تو کجا اس کے ایک حرف میں بھی کوئی ردوبدل کرنے کی نہ کوئی جرات کر سکا ہے اور نہ آئندہ کر سکے گا۔

قرآنی آیات سے علاج؟

سوال: میڈ سٹون جیل سے محمد اسلم لکھتے ہیں

(۱) مرے ہوئے آدمی کو ثواب پہنچایا جا سکتا ہے؟

(۲) قرآنی آیات سے جو علاج کرتے ہیں' اس کی کیا حقیقت ہے؟

(۳) کیا قرآن سے کسی قسم کا فال نکالنا جائز ہے؟

(۴) کسی کو نظر لگ جانے کی صورت میں مرچوں کی دھونی جو دی جاتی ہے' اس کی کیا حقیقت ہے؟

جواب: (۱) اس موضوع پر اس سے پہلے "صراط مستقیم" میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ مختصر یہ کہ مرنے کے بعد نیک اولاد اور ورثاء کے نیک کام خاص طور پر دعا اور صدقے خیرات کا ثواب میت کو پہنچتا ہے بشرطیکہ وہ صحیح طریقے سے یہ کام کرے۔ رسمی طور پر کھانے پکانا نمائش کرنا اور پھر غریبوں کی بجائے اپنے رشتہ داروں اور کھاتے پیتے لوگوں کو کھانا کھلانا کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ اسی طرح کھانے کے نام پر قرآن خوانی کرانا اور پھر قرآن یا ثواب منتقل کرنے کا ثبوت بھی قرآن و حدیث میں نہیں۔

(۲) قرآنی آیات کے ذریعے دم کرنا' دعا کرنا اور انہیں برکت کے لئے پڑھنا جائز ہے لیکن اس کام کو بطور پیشہ اختیار کرنا اور ذریعہ آمدنی بنانا جائز نہیں۔

(۳) قرآن سے فال نکالنا جاہلیت کی بات ہے۔ قرآن کے نزول کا یہ مقصد ہرگز نہیں اس کا قرآن و سنت میں کوئی ثبوت نہیں۔

(۴) نظر لگ جانے کی صورت میں مرچوں کی دھونی دینے کی رسم بھی غیر اسلامی ہے۔ اس کا قرآن و حدیث میں کوئی ثبوت نہیں۔

سوال: بریڈفورڈ سے سلیم خان کیمبل پوری لکھتے ہیں

درج ذیل سطور مولانا محمد صادق سیالکوٹی کی کتاب "انوار التوحید" سے نقل کر رہا ہوں جو کتاب کے صفحہ ۶۴ پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں سے ایک نام "المصور" کی تفسیر لکھی گئی ہے "المصور" کے معانی کے بعد لکھتے ہیں

"المصور" کثرت سے پڑھنے سے دشواریاں آسانی کی صورت اختیار کرتی ہے۔ بانجھ عورت ایک سو ایک بار ہر روز پڑھ کر پانی پر دم کر کے چالیس روز پئے تو المصور اسے چاند سا بچہ عطا کرے گا" انشاءاللہ"

برائے مہربانی درج بالا سطور کے آخری حصہ "پانی پر دم" کے بارے میں قرآن د

حدیث نبویؐ سے مدلل ثبوت فرما کر یہ مسئلہ حل فرمادیں۔ اگر ایسا دم کرنا ٹھیک ہے تو پھر آج کل جو "دم درود" ہر جگہ عام ہے کیا یہ ان کا جواز مہیا نہیں کرتا؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے ناموں اور صفات کا ذکر کرنا مسنون اور اجر و ثواب کا باعث ہے اس طرح قرآن و سنت سے ثابت ورد اور وظیفے پڑھنا یقیناً باعث برکت ہے۔ اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ "المصور" بھی اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے اس لئے اس کا پڑھنا باعث قرب الٰہی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کوئی عورت جب اس کی تلاوت ایک سو ایک بار کرے تو اسے بیٹا عطا کرہو گا۔ یہ قرآن و حدیث کا نہ تو حکم ہے اور نہ ہی اس کے خلاف ہے۔ عین ممکن ہے اس ورد کے بعد اللہ تعالیٰ کسی کو بیٹا عطا کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عطا نہ کرے یہ اس کی مرضی ہے۔ اسی طرح "المصور" کے علاوہ بھی ایسے مجرب اذکار ہو سکتے ہیں جن کے ذریعے کچھ لوگوں کی مشکلات حل ہوتی ہیں اگر ان میں کوئی شرکیہ لفظ یا شرکیہ طریقہ کار نہ ہوں اس لئے اس طرح کے پڑھنے کو نہ تو ہم شرعی حکم کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی یہ سنت سے ثابت ہے۔ ہاں البتہ کسی کا تجربہ یہ ہے تو اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور یہ ضروری بھی نہیں کہ ایک آدمی کا تجربہ دوسرے کے لئے بھی درست ثابت ہو اور مولانا سیالکوٹی نے جو اپنی کتاب میں لکھا ہے شاید ان کی مراد تجربے سے ہی ہے انہوں نے بھی اسے سنت قرار نہیں دیا۔

اب رہا پانی پر دم کرنے کا مسئلہ' تو اس سلسلے میں جہاں تک اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے کلمات کا ثبوت ملتا ہے۔ اگر خیر و برکت اور شفاو تندرستی کے لئے آیات قرآنی یا مسنون دعاؤں اور کلمات کے ذریعہ دم کیا جائے تو اس میں بظاہر قرآن و سنت کی کوئی مخالفت نہیں ہے ہاں اگر آدمی غیر مسنون کلمات پڑھتا ہے یا شرکیہ الفاظ کے ذریعے دم درود کرتا ہے تو یہ جائز نہیں ہو گا۔

آپ نے آج کل کے جس "دم درود" کا حوالہ دیا ہے اس کے بارے میں بھی ہمارا یہی خیال ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نام پکارے جائیں تو ایسے دم میں کوئی خرابی نہیں۔

بشرطیکہ وہ آدمی اسے پیشہ نہ بنائے۔ عام طور پر آج کل اکثر لوگ اسے پیشہ بنا کر اختیار کرتے ہیں اور پھر وہ جائز و ناجائز کلمات کی تمیز بھی نہیں کرتے اور اسے دولت کمانے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں' یہ درست نہیں۔ اسی طرح لوگ بھی اگر خود یہ کلمات پڑھنے اور دم کرنے کی بجائے دوسروں پر تکیہ کر لیں اور انہیں مشکلیں حل کرنے والا سمجھ لیں جیسا کہ آج کل بعض لوگ ایسا عقیدہ بنا لیتے ہیں تو اس طرح غیر اللہ پر اعتماد یا دم اور تعویذ پر اعتماد یہ بھی شرک ہو جائے گا چاہے وہ اللہ کا نام ہی کیوں نہ لیتا ہو۔ تو ان چیزوں کا خیال رکھتے ہوئے محض اللہ کے نام سے دم کرنے میں بہر حال کوئی حرج نہیں ہے۔

ابن ماجہ کی ایک صحیح حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

ان النبی ﷺ کان ینفث فی الرقیة[1]

نبی کریم ﷺ علاج میں دم کیا کرتے تھے۔

دکانداری اور پیشے کے طور پر اس کام کے اختیار کرنے کا سنت میں کوئی ثبوت نہیں۔

بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ لکھ سکتے ہیں؟

سوال: خط یا کسی تحریر کے شروع میں ہمیں سکولوں میں یا ماں باپ نے ۷۸۶ لکھنا سکھایا تھا کہ اس کی طاقت کلمہ طیبہ کے برابر ہے لیکن ایک مولوی صاحب نے اسے غلط کہہ کر اپنی طرف سے ۷۸۶/۹۲ کی تعلیم جاری کی ہے اس پر مناسب روشنی ڈالیں۔

جواب: کسی بھی تحریر کے شروع پر بسم اللہ لکھنا سنت نبویؐ ہے اور مسلمانوں کو جس طرح کھانے پینے اور دوسرے کاموں کے آداب سکھائے گئے ہیں اسی طرح تحریر کے جو آداب ہیں ان میں بسم اللہ بھی شامل ہے لیکن برصغیر کے بعض علاقوں میں خط شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ لکھنے کا رواج ہے جس کی وجہ آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ اس کیلئے کوئی شرعی دلیل نہیں ہے لہٰذا ہمارے نزدیک

---

[1] ابن ماجہ مترجم ج ۳ کتاب الطب باب النفث فی الرقیة ص ۱۸۹ رقم الحدیث ۳۵۲۸

۷۸۶ یا ۷۸۶/۹۲ دونوں کا بسم اللہ کی جگہ لکھنا بے فائدہ اور خلاف سنت ہے۔ اصل طریقہ یہی ہے کہ تحریر کا آغاز بسم اللہ سے کیا جائے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ لوگ خطوط کی حفاظت نہیں کرتے لہٰذا اللہ کے نام کی بے حرمتی سے بچنے کے لئے بسم اللہ کے متبادل ۷۸۶ لکھا جاتا ہے یہ دلیل کئی لحاظ سے غلط ہے۔

ا۔ اول اس لئے کہ ۷۸۶ کسی طرح بسم اللہ کا متبادل نہیں' یہ مفروضہ ہی سرے سے غلط ہے کہ کوئی لفظ یا عدد بسم اللہ کا متبادل ہو سکتا ہے کیونکہ سلف صالحین سے کسی ایسی چیز کا ثبوت نہیں ملتا کہ اگر بسم اللہ کے عدد نکال کر انہیں لکھنے پڑھنے میں استعمال کر لیا جائے تو اس سے بسم اللہ کا مفہوم ادا ہو جائے گا یا مقصود پورا ہو جائے گا۔

۲۔ جہاں تک اس دلیل کا تعلق ہے کہ لفظ اللہ کی بے حرمتی کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے ۷۸۶ لکھا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پھر اللہ یا محمدؐ کا لفظ کہیں بھی خط میں تحریر کے اندر استعمال نہیں کرنا چاہئے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہی خطوط کے اندر جنہیں لوگ ۷۸۶ سے شروع کرتے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کے کئی بار نام لکھتے ہیں وہاں کوئی بھی احتیاط ملحوظ نہیں رکھتا کہ لفظ جلالہ کی توہین ہو جائے گی۔

۳۔ رسول اللہ ﷺ نے جو غیر مسلموں کو خطوط لکھے ان کو بسم اللہ اور رسول اللہ کے الفاظ سے شروع کیا حالانکہ غیر مسلموں سے تو ان خطوط کی عزت کی توقع ہی نہ تھی لیکن پھر بھی آپ نے بے حرمتی کے ڈر سے بسم اللہ اور لفظ اللہ ترک کر کے ان کی جگہ ان الفاظ کے عدد نہیں لکھے تھے۔ حضرت سلیمان نے جب ملکہ سبا کو خط لکھا تھا اس وقت وہ کافر تھی لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنے خط میں بسم اللہ کے الفاظ تحریر کئے نہ کہ اس کے عدد۔ ارشاد ربانی ہے

﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (نمل : ۳۰)

بے شک یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور اس اللہ کے نام سے شروع کیا گیا ہے جو بہت مہربان اور بہت رحم کرنے والا ہے۔

ان دلائل کی روشنی میں مسئلہ پوری طرح واضح ہو گیا کہ شرعی طور پر بسم اللہ کی جگہ نہ ۷۸۶ کی گنجائش ہے اور نہ ۷۸۶/۹۲ لکھنے کی بلکہ پوری بسم اللہ لکھنی چاہئے۔

حرف ''ض'' کا صحیح مخرج

سوال: لندن سے محمد ارشد صاحب لکھتے ہیں کہ میرے ایک دوست کہتے ہیں کہ وہابیوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ ''ض'' کو ظا پڑھتے ہیں اور سنی وہ جو ضاد کو دال سے پڑھتے ہیں۔ اس بارے میں وضاحت کریں کہ یہ اختلاف اور فرق کیوں ہے اور کیا واقعی اس بنیاد پر فرقہ بندی ہوئی ہے؟

جواب: ''ض'' کے تلفظ میں فرق کے سلسلے میں تفصیل سے پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ جہلا میں وہابی سنی کے نام پر جو امتیازات اور فرق قائم کئے جاتے ہیں ان کی علمی اور شرعی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ تو پیشہ ور ملاؤں نے اپنی روٹی پکی کرنے کے بہانے بنا رکھے ہیں۔ بعض فقہی مسائل میں جو تھوڑا بہت اختلاف ہے اس کی بنیاد پر ہرگز کسی فرقے کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔ بے چارے عوام کو کبھی کہا جاتا ہے جو اونچی آواز آمین کہے وہ وہابی ہے کبھی کہا جاتا ہے جو درود نہ پڑھے وہ وہابی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہابی کے نام پر دنیا میں نہ کوئی فرقہ ہے اور نہ ہی کسی دینی جماعت کا وجود ہے یہ محض انگریز کا پروپیگنڈہ ہے جسے آج کے اہل بدعت اپنے مخصوص مفادات کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ اسی طرح سنی کا لفظ بھی کسی ایک گروہ کی اجارہ داری نہیں، جس طرح پاکستان وہندوستان میں سمجھا جاتا ہے حالانکہ اہل سنت وسنی کا لفظ اہل تشیع وشیعہ کے مقابلے میں امتیاز کے لئے ہے اور اس کے مطابق شیعہ حضرات کے علاوہ مسلمانوں کے باقی تمام مکاتب فکر کو ''سنی'' کہا جاسکتا ہے۔

''ض'' کا مسئلہ بھی اس نوعیت کا ہے۔ یہ نہ وہابیت کی پہچان ہے نہ سنیت کی اور نہ

شیعیت کی۔ یہ خالص علمی مسئلہ ہے جو فن قرأت و تجوید سے تعلق رکھتا ہے۔ بعض جاہل یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ جو "ضاد" کو ظا کی طرح پڑھے اس کی نماز صحیح نہ ہو گی۔ اس طرح کی ساری باتیں غلط ہیں۔

اس بارے میں سید نذیر حسین محدث دہلوی نے فتاوی نذیریہ میں بڑی عمدہ اور مفید بحث کی ہے جسے ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:-

"ض" کے بارے میں تین دعوے یا آراء ہیں جنہیں تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) ایک دعویٰ یہ ہے کہ چونکہ ضاد کا مخرج سے ادا کرنا سخت دشوار ہے۔

(۲) اور دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ ضاد کو ظا سے بہت کم مشابہت اور فرق کم ہے۔

(۳) اور تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ چونکہ ضاد کا مخرج سے ادا کرنا سخت دشوار ہے اور ضاد کو ظا سے بہت مشابہت ہے اس لئے اگر کوئی شخص بجائے ضاد کے ظا پڑھے تو نماز اس کی موافق مذہب مفتی بہ کے صحیح رہے گی۔

اب ہر ایک دعوے کی دلیل لکھی جاتی ہے تاکہ عمرو کے اس قول کی صحت معلوم ہو۔

پہلے دعوے کی دلیل یہ ہے کہ کتاب النشر فی قرأت العشر میں مرقوم ہے جیسا ضاد کا ادا کرنا زبان پر دشوار ہے ویسا کسی حرف کا ادا کرنا دشوار نہیں۔ اسی وجہ سے لوگوں کی زبانیں اس کے ادا کرنے میں مختلف ہیں اور کم لوگ ہیں جو اس کو اچھی طرح سے ادا کر سکیں۔ علامہ جزری تمہید فی علم التجوید میں لکھتے ہیں۔ حروف میں حرف ضاد کی طرح کوئی اور حرف دشوار نہیں ہے۔ علامہ ابو محمد مکی کتاب الرعایہ میں لکھتے ہیں۔ ضاد کے پڑھنے میں قاری کو لحاظ و محافظت کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا امر ہے کہ میں نے اس میں بہت سے قراء اور ائمہ کو قصور کرتے ہوئے دیکھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ضاد کا ادا کرنا دشوار ہے ان لوگوں پر جن کو اس کی مشاقی نہیں ہے۔

اور دوسرے دعوے کی دلیل یہ ہے کہ علامہ ابو محمد مکی رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب الرعایہ میں لکھتے ہیں۔ ضاد ایک ایسا حرف ہے جو سننے میں ظاء کے مشابہ ہے۔ علامہ شعلہ موصلی حنبلی شرح شاطبیہ موسوم بہ کنزالمعانی شرح حرزالدمانی میں لکھتے ہیں ضاد اور ظاءاور ذال سننے میں باہم متشابہ ہیں اور ضاد اور ظاء میں صرف دو بات کا فرق ہے۔ ایک تو یہ کہ ان دونوں کے مخرج الگ الگ ہیں اور دوسرے یہ کہ ضاء میں استطالت ہے اور ظاء میں نہیں۔ اگر ان دونوں کا فرق نہ ہوتا تو یہ دونوں حرف ایک ہو جاتے علامہ محمد بن جزری تمہید فی علوم التجوید میں لکھتے ہیں لوگ ضاد کو ظاء بولتے ہیں اور یہ اکثر شام والے ہیں اور بعض اہل مشرق اور ان لوگوں کے ضاء کو ظاء پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ حرف ضاء حرف ظاء کی تمام صفتوں میں مشارک ہے اور اس میں استطالت کی صفت زائد ہے جو حرف ظاء میں نہیں ہے۔ سواگر ضاد میں استطالت کی صفت نہ ہوتی اور اس کا مخرج ظاء کے مخرج سے الگ نہ ہوتا تو ضاد عین ظاء ہو جاتا۔ اور ابن جنی نے اپنی کتاب التنبیہ میں لکھا ہے کہ بعضے عرب عام طور پر اپنے تمام کلام میں ضاد کو ظاء بولتے ہیں اور یہ قریب ہے اور اس میں عوام کے لئے وسعت ہے۔ قصیدہ جزریہ میں ہے ض اور ظ میں صرف استطالت اور مخرج کا فرق ہے۔ ض اور ظ میں بجز استطالت و مخرج کے تمام صفات میں مشارک و مشابہ ہونا ایک ایسی بات ہے کہ اس پر تمام علماء فن تجوید کا اتفاق ہے۔ لہٰذا دوسرے دعوے کے ثبوت میں جس قدر عبارتیں نقل کی گئی ہیں کافی ووافی ہیں اور عبارتوں کی نقل کی کچھ ضرورت نہیں۔

اور تیسرے دعوے کی دلیل یہ ہے تاریخ ابن خلقان جلد دوم صفحہ ۲۹۹ میں علامہ ابن الاعرابی اللغوی کے ترجمہ میں مرقوم ہے کہ کلام عرب میں ضاد کو بجائے ظا کے اور ظاء کو بجائے ضاد کے پڑھنا جائز ہے۔ پس جو شخص ضاد کی جگہ ظاپڑھے یا ظا کی جگہ ضاد پڑے تو وہ خاطی نہیں کہا جائے گا علامہ ابن الاعرابی کا یہ قول نص صریح ہے اس بات پر کہ جو شخص قرآن مجید میں ضاد کی جگہ ظاپڑھے وہ خاطی نہیں ہے اور جب وہ خاطی نہیں

ہے تو اس کی نماز بلا شبہ صحیح درست ہو گی۔ علامہ فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔ دسواں مسئلہ ہمارے نزدیک مختار یہ ہے کہ ضاد کا ظا کے ساتھ مشابہ ہونا نماز کو باطل نہیں کرتا اور اس پر دلیل یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان تمیز کرنا مشکل ہے۔ اس وجہ سے یہ بات واجب ہوئی کہ ان دونوں کے درمیان فرق کرنے کی تکلیف ساقط ہو اور ان دونوں میں مشابہت کا بیان کئی وجوہ سے ہے۔ اول تو یہ ہے کہ دونوں حرف حروف رخوہ سے ہیں اور تیسرے یہ کہ دونوں حرف حروف مطبقہ سے ہیں اور چوتھے یہ کہ اگرچہ ظا کا مخرج زبان سے اور ثنایا علیا کی نوک ہے اور ضاد کا مخرج زبان کے کنارہ سے ہے مع افراس کے جو کنارہ زبان سے متصل ہیں مگر چونکہ ضاد میں بوجہ اس کے رفوہ ہونے کے انبساط اور کشادگی حاصل ہے اس وجہ سے ضاد کا مخرج ظا کے مخرج سے قریب ہے اور پانچویں یہ کہ نطق بحرف ضاد عرب کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہمارے اس بیان سے ثابت ہوا کہ ضاد اور ظاء کے درمیان نہایت مشابہت ہے اور دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہے۔

جب یہ ثابت ہو چکی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اگر ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اور صحابہؓ کے زمانے میں بالخصوص جب کہ عجمی لوگ داخل ہوئے اس کے بارے میں ضرور سوال واقع ہوتا۔ پس جب اس بارے میں سوال واقع ہونا منقول نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ ان دونوں حرفوں میں تمیز کرنے کی ہم لوگوں کو تکلیف نہیں دی گئی ہے۔ فتاوی قاضی خاں میں ہے کہ چونکہ حرف ضاد اور ظا میں فرق کرنا مشکل ہے اور بلا مشقت کے فرق نہیں ہو سکتا اس لئے ضاد کی جگہ ظا پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہو گی اور یہی مضمون فقہ حنفی کی بہت سی کتابوں میں مرقوم ہے۔

الحاصل۔ عمرو کا یہ قول کہ (اگر کوئی شخص بجائے ضاد کے پڑھے یا بایں جہت کے ادا کرنا ضاد کے مخرج سے دشوار ہے اور ضاد کو ظاء سے مشابہت مفتی بہ کے صحیح رہے گی) صحیح اور مدلل ہے اور جب اس کا یہ قول صحیح اور مدلل ہے تو اس کا فعل یعنی ضاد کو

مانند صورت ظا کے پڑھنا بھی صحیح اور درست ہے اور یہیں سے ثابت ہو گیا کہ زید کا یہ قول کہ (اگر کوئی شخص بجائے ضاد کے ظا پڑھے گا تو اس کی نماز فاسد ہو جاوے گی) بالکل غلط ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ زید کا ضاد کو مانند صورت دال کے پڑھنا بالکل بے اصل و بے ثبوت ہے اور حسب تصریح قاضی خاں بجائے ضاد کے دال پڑھنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور عمرو کا ض کو مماثل دال کے پڑھنے سے منع کرنا اور کہنا کہ حرف دواد بے اصل و بے ثبوت ہے الخ، بہت بجا اور صحیح ہے فی الواقع حرف ضاد کا مماثل دال کے ہونا نہ تجوید کی کسی کتاب سے ثابت ہے اور نہ صرف یا فقہ یا تفسیر کی کتاب سے۔ پس ضاد کا مماثل دال پڑھنا بلاشبہ بے دلیل و بے ثبوت ہے۔

واللہ تعالی اعلم بالصواب

(فتاویٰ نذیریہ جلد دوم)

جن قرآنی آیات اور احادیث کی بے حرمتی ہو وہ ضائع کس طرح کریں؟

ڈاکٹر صلاح الدین (BODEL WYDPA) سے لکھتے ہیں

سوال: خطوط پر محمد، احمد، رحمٰن جیسے نام لکھتے ہیں یہ گھروں سے باہر پھینک دیئے جاتے ہیں۔ اگر اس طرح ان ناموں کی بے حرمتی ہوتی ہے تو اس گناہ سے آدمی اپنے آپ کو کس طرح بچائے؟ اسی طرح بعض اخبارات ورسائل میں قرآن وحدیث کے جو حوالے ہوتے ہیں اور بزرگ ہستیوں کے نام ہوتے ہیں۔ ایک آدمی اخبارات دینی رسائل یا ایسی کتابوں کو ضائع کرنا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ کیا ہے؟ اس پر قرآن وسنت کی روشنی میں مشورہ دیں۔

جواب: آپ کا سوال اخبارات ورسائل میں اللہ، رسول کے نام یا قرآنی آیات اور

احادیث کے بارے میں ہے کہ ایسے رسائل یا کتابچوں کو اگر ضائع کرنا ہو تو اس کا کیا طریقہ ہے؟ جہاں تک اخبارات کا تعلق ہے تو ان میں زیادہ تر تو غیر اسلامی چیزیں یا خبریں وغیرہ ہوتی ہے ہاں اگر کبھی ایسی چیز آپ کو مل جائے کہ اس میں قرآن کی آیت یا کوئی حدیث ہے تو اسے الگ کر لینا چاہئے اور کوڑے کرکٹ میں نہیں پھینکنا چاہئے جہاں تک ضائع کرنے کا طریقہ ہے تو وہ یہی ہے کہ یا تو پاکیزہ مقامات پر انہیں دفن کر دیا جائے یا انہیں احتیاط سے جلا کر ان کی راکھ کسی جگہ دفن کر دی جائے یا دریا میں بہادی جائے۔ لیکن جہاں تک دینی رسائل یا مذہبی کتابوں کا تعلق ہے تو انہیں احترام اور احتیاط سے رکھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے وہ جس طرح گھریلو سامان فرنیچر اور دوسری اشیاء کی حفاظت کا اہتمام کرتا ہے ان کے رکھنے کی جگہ بناتا ہے اسی طرح اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دینی رسائل اور کتابوں کے لئے بھی یہ اہتمام کرے۔ جب وہ نقل مکانی کرے یا گھر تبدیل کرے تو دوسرے سامان کی طرح ان کا بھی انتظام کرے۔ بعض لوگوں کی جہالت کی یہ انتہا ہے کہ جب انہیں کوئی دینی کتاب یا رسالہ دیا جاتا ہے تو یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیتے ہیں کہ جی ہمارے پاس انہیں رکھنے کی جگہ نہیں خواہ مخواہ ان کی بے حرمتی ہو جائے گی۔ یعنی ایک طرف تقوے کا یہ حال کہ ان کی بے حرمتی سے ڈرتے ہیں اور دوسری طرف بے دینی اور جہالت کا یہ عالم کہ ایک مسلمان ہونے کے باوجود اس کے گھر میں کسی دینی کتاب یا لٹریچر رکھنے کی جگہ بھی نہیں۔ کم از کم ایک دیندار مسلمان سے اس طرح کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

بہر حال آپ اپنی طاقت اور ہمت کے مطابق ہی پابند ہیں۔ جو چیز آپ کے اختیار ہی میں نہیں اس کی آپ پر کوئی پابندی نہیں۔ روزانہ عام اخبارات میں ناموں وغیرہ کا تو اتنا مسئلہ نہیں لیکن قرآنی آیات واحادیث پر اگر آپ کی نظر پڑ جائے تو اسے ضرور علیحدہ کر لیجئے۔

سوال: ہیلی فیکس سے جناب زین العابدین پوچھتے ہیں

(الف) اکثر اردو اخبارات میں نبی کریم ﷺ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے اور بعض دفعہ آیات قرآنی واحادیث بھی تحریر ہوتی ہیں۔ دکاندار ان میں سودا لپیٹتے ہیں۔ ہمیں ایسے اخبارات کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے اور اخبار کی بے حرمتی کے متعلق کیا خیال ہے؟

جواب: جن کاغذات پر اللہ اور اللہ کے رسول کے نام اور قرآنی آیات لکھی ہوں ان کا حتی الامکان احترام کرنا چاہئے۔ اخبارات والوں کو بھی چاہئے کہ عام حالات میں آیات واحادیث تحریر نہ کریں بلکہ ان کا ترجمہ دے دیا کریں دکانداروں اور عوام دونوں کو چاہئے کہ اس طرح پیپر کو استعمال کرنے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لیا کریں اور گندی جگہ پھینکنے یا غلیظ چیز کے لئے استعمال کرنے سے پرہیز کریں۔ جو آدمی ان چیزوں کو پالے اسے ایسے اخبارات کے ٹکڑے جلا کر خاک دفن کر دینی چاہئے یا ان کو دریا یا سمندر میں بہا دینا چاہئے۔ بہرحال جو چیز آپ کے اختیار میں ہے وہ کریں اور جو چیز آپ کے بس میں ہی نہیں اس کے لئے فکر مند بھی نہیں ہونا چاہئے۔ آپ اپنی حد تک احتیاط برتئے اور دوسروں کو پاکیزہ الفاظ اور پاک ناموں کا احترام کرنے کی تلقین کیجئے۔

حافظ قرآن کی عزت

سوال: حافظ قرآن کی شان کیا ہے؟ اگر کوئی پیشہ ور ملاا سے کہے کہ دفع ہو جاؤ۔ تم یہ کر رہے ہو وہ کر رہے ہو تو یہ کہاں تک درست ہے؟

جواب: حافظ قرآن اور عالم دین دونوں کی فضیلت بہت زیادہ ہے اور قرآن کے حافظ' قاری اور عالم کی عزت واحترام کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن حافظ قرآن کے والدین کے سر پر روشنی کا تاج ہوگا اور وہ اپنے والدین کے حق میں شفاعت کرے گا۔ اگر کسی نے حافظ قرآن کی توہین کی ہے تو اسے

اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیے۔ یہ گناہ ہے۔ ایک مسلمان کو تو عام مسلمان بھائی کی بھی عزت کرنی چاہیے جبکہ حافظ قرآن اور عالم دین کا تو مقام ہی بلند ہے۔

ریاکاری سے تلاوت کرنا شرک ہے؟

سوال: گلاسگو سے الطاف حسین لکھتے ہیں

نبی اکرم ﷺ کا جو یہ فرمان ہے کہ کوئی دوسرے آدمی کو دکھانے کے لئے نماز لمبی کرتا ہے کہ وہ کہے وہ اچھی نماز پڑھتا ہے تو یہ شرک ہے۔ کیا قرآن اس نیت سے پڑھا جائے تو وہ بھی مشرک ہے؟

جواب: غیر اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے جو بھی کام کیا جائے گا وہ شرک ہوگا۔ نماز یا قرآن کی تلاوت کا مقصود اگر کسی انسان کو خوش کرنا یا اس سے ڈر کر کرنا ہے تو شرک کی اقسام میں سے ہے کسی انسان کو دکھاوے کے لئے نماز لمبی کر دینا یا قرآن اونچی آواز سے پڑھنا شروع کر دینا اسے ہم حقیقی شرک تو نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ ریاکاری ہے جو اعمال کو ضائع کر دیتی ہے اور دکھلاوے کے طور پر کئے جانے والے اعمال کا اللہ کے ہاں کوئی اجر و ثواب نہیں۔ ایسے آدمی کو ریاکار تو کہا جا سکتا ہے مگر مشرک نہیں کہہ سکتے۔ شرک تو دراصل اللہ کی ذات اور صفات میں مخلوق میں سے کسی کو شریک کرنے کا نام ہے۔

صائبین سے مراد کون لوگ ہیں؟

سوال: لندن سے الحاج حکیم عبدالرحمٰن لکھتے ہیں "آپ کا ماہنامہ صراط مستقیم" مطابق اگست ستمبر ۱۹۸۱ء پڑھا، اس میں صفحہ ۱۳ باب "حلال حرام کی پہچان گوشت کے بارے میں" ہماری نظر سے گزرا۔ اس میں قرآن شریف کی آیت

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ (المائدة : ٦٩)

کا ترجمہ دیکھا تو اس میں صائبین کا ترجمہ "بے دین" لکھا ہے۔ اب اگر واقعی صائبین کا ترجمہ بے دین ہے تو پھر ان کو اہل کتاب اور مومنین کے ساتھ کیوں گنا گیا۔ اس صفحہ پر آپ نے لکھا ہے کہ مجوسیوں اور مشرکوں دونوں کا ذکر اس جگہ نہیں کیا۔ اگر ان دونوں حلقوں میں سے بھی کسی ملت کا صابیوں یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح آخرت میں خوش بختی اور سعادت کا کوئی شائبہ ہوتا تو اس کا بھی خدا نے ذکر کیا ہوتا۔ اگر ان کی بھی کوئی کتاب ہوتی تو نسخ و تبدیلی سے پہلے وہ ہدایت پر ہوتے۔ اب آپ نے لکھا ہے کہ مجوسی اور مشرکین کا ذکر اس آیت میں اس لئے نہیں کیا کہ ان کا اہل کتاب اور مومنوں سے کوئی سروکار نہیں۔ تو پھر اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب ان دونوں کا ذکر نہیں تو پھر صائبین کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ حالانکہ ایک طرف تو آپ نے اس کا ترجمہ بے دین لکھا ہے تو کیا "بے دین" کا آخرت میں سعادت مندی کا کوئی شائبہ رہتا ہے۔ میرے خیال سے اگر "بے دین" ترجمہ کیا جائے تو کافی اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کیا قدیم مفسرین نے اس کا ترجمہ بے دین کیا ہے؟

جہاں تک میرا خیال ہے صائبین یہود و نصاریٰ کی طرح اہل کتاب میں ہو سکتے ہیں۔ اتفاق سے ۱۹۵۳ء میں میرا عراق جانا ہوا۔ وہاں میں نے ایک قوم دیکھی جن کے چہرے پر داڑھیاں (ریش) تھیں۔ سنار کا کام کرتے تھے اور ان کی علیحدہ عبادت گاہیں بھی تھیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ داؤد علیہ السلام کی امت ہے جس طرح یہودی موسیٰ علیہ السلام اور عیسائی عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح یہ داؤد علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کو صائبین کہا جاتا ہے۔ اب غالباً اسی وجہ سے قرآن شریف کی مذکورہ آیت میں صائبین کا ذکر مومنین اور اہل کتاب کے ساتھ کیا

گیا ہے کہ وہ بھی حضرت داؤد علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ اب میں نے جتنے ترجے پڑھے سب میں صائبین کا مطلب بے دین لکھا ہے۔ سوائے مولانا مودودیؒ کے کہ انہوں نے صائبین کا ترجمہ صائبین ہی لکھا ہے۔ امید ہے آپ اس بات پر واضح جواب لکھ کر ہمارے ذہن کو صاف کریں گے۔

جواب: دراصل آپ نے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے وہ ہمارے ایک فاضل دوست مولانا منیر قمر نے متحدہ عرب امارات سے ایک جلیل القدر سعودی شیخ عبداللہ بن حمید حفظہ اللہ کے گراں قدر مقالے کا ترجمہ کر کے بھیجا تھا اور وہ قمر صاحب کے نام سے ہی شائع ہوا تھا اور صائبین کا ترجمہ "بے دین" شاید انہوں نے ہی کیا ہو گا۔ اس سلسلے میں آپ نے جو سوال اٹھایا ہے وہ کافی اہمیت رکھتا ہے لیکن صابی کا جو اردو میں بے دین معنی کیا جاتا ہے وہ ہمارے ہاں عرف عام میں "بے دین" کا جو مفہوم لیا جاتا ہے وہ مراد نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں مناسب تو یہی ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں ذرا وضاحت کر دی جائے جنہیں صائبین کہا گیا ہے اور اگر اس کا ترجمہ صائبین ہی کر دیا جائے تو وہ زیادہ بہتر ہے۔ جہاں تک اس لفظ سے مراد لوگوں کے عقائد کا تعلق ہے تو قدیم مفسرین کی آراء بھی اس سلسلے میں مختلف ہیں۔

حضرت عمر بن خطابؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا فرمان ہے کہ یہ لوگ اہل کتاب میں سے تھے لیکن بعض احکام میں ان سے اختلاف کرنے کی وجہ سے الگ ہی ایک مستقل گروہ بن گئے۔

حضرت مجاہدؒ کے نزدیک ان لوگوں کے عقائد یہودیت اور مجوسیت کے بین بین تھے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ زبور پڑھتے تھے۔ فرشتوں کی عبادت کرتے تھے۔ کعبہ کی طرف منہ کرتے تھے اور مختلف ادیان کی کچھ نہ کچھ باتیں لے لیتے تھے۔

حضرت ابن زیدؒ کا قول ہے کہ یہ لوگ جزیرہ موصل میں آباد تھے۔ عقیدہ توحید تھا لیکن کسی خاص نبی یا کتاب کو نہیں مانتے تھے اور نہ ہی ان کے ہاں کوئی مخصوص شرعی

نظام تھا۔

ان آراء کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ شروع شروع میں تو کسی باقاعدہ دین کو مانتے تھے لیکن بتدریج اس سے مائل ہو کر چند من گھڑت عقائد واعمال کو قبول کرنے لگے۔ لغت میں صبا کا معنی مائل ہونا ہے یعنی ایک دین سے دوسرے دین کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے انہیں صابی کہا گیا۔ جیسا کہ مشرکین مکہ بعض اوقات صحابہ کرامؓ کو بھی صابی کہتے تھے۔ اس لئے کہ وہ اپنے باپ دادا کے دین سے پھر گئے تھے یا بعض روایات کے مطابق اس لئے بھی کہ صائبین بھی نمازیں پڑھتے تھے اور مسلمان بھی نمازیں پڑھتے تھے۔ اس اشتراک کی وجہ سے انہوں نے صحابہ کرامؓ کو بھی صابی کہنا شروع کر دیا۔ اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ صائبین شروع شروع میں دین حق پر تھے مگر بعد میں منحرف ہو کر فرشتوں اور ستاروں کی عبادت کرنے لگ گئے۔

مجھے آپ کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ وہ مجوسیوں یا مشرکین کی طرح "بے دین" نہ تھے' اور قدیم مفسرین کے جو اقوال نقل کئے ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دین کی ایک کھچڑی سی انہوں نے بنالی تھی اور اصل دین سے منحرف ہو چکے تھے۔ آپ نے یہ جو مشاہدہ بیان کیا ہے کہ عراق میں ان لوگوں کو آپ نے دیکھا جو اپنے آپ کو صائبین کہتے ہیں ویسے تو ایک نئی اور معلوماتی چیز ہے لیکن حضرت قتادہؓ اور ابن زید کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ لوگ جزیرہ موصل (عراق) میں تھے اور یہ کہ وہ زبور کی تلاوت بھی کرتے تھے۔ قدیم مفسرین کی رائے تو یہ ہے کہ یہ لوگ نزول قرآن کے وقت تو تھے مگر اب ان کا وجود نہیں پایا جاتا۔ جب کہ آپ کے بیان کی تصدیق کی جائے تو پھر اس نام کے لوگ اب بھی عراق میں موجود ہیں۔

بہر حال ان سارے اقوال کی روشنی میں یہ کہنا ہی بہتر ہے کہ یہ لوگ معروف معنوں میں بے دین نہ تھے لیکن اصل دین سے منحرف ہو گئے تھے اس لئے انہیں صائبین کہا گیا اور چونکہ اصلاً وہ نبی اور کتاب کو ماننے والے تھے اس لئے ان کا ذکر اہل

کتاب کے ساتھ ہی کر دیا گیا۔اس سلسلہ میں دور حاضر کے مفسر سید قطب شہیدؒ اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں لکھتے ہیں۔

"راجح بات تو یہ ہے کہ بعثت نبویؐ سے پہلے ایک گروہ نے بتوں کی عبادت سے منہ موڑ کر مشرکین عرب سے علیحدگی اختیار کرلی تھی اور صحیح عقیدے کی تلاش کرنے لگے پھر توحید پر قائم ہوئے اور کہتے تھے کہ وہ ملت ابراہیمی پر ہیں۔اپنی قوم کے طریقہ عبادت سے مائل ہو کر الگ ہو گئے تھے۔اس لئے انہیں صابی کہا گیا جیسا کہ مشرکین مسلمانوں کو بھی کہتے تھے جو بعض تفسیروں میں انہیں ستارہ پرست کہا گیا یہ قول صحیح نہیں" (فی ظلال القرآن جلد ا ص ۷۵)

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

لونڈیوں والے احکام منسوخ ہو گئے ہیں؟

سوال: بریڈفورڈ سے قدیر احمد لکھتے ہیں: امید ہے درج ذیل مسائل میں میری الجھن رفع فرمانے کے لئے آپ اپنا مصروف وقت نکالنے کی کوشش فرمائیں گے اور اگر مناسب ہو تو جواب صراط مستقیم کے آئندہ شمارے میں شائع فرمادیں گے۔

چند دن پہلے تک تو میں یہ سمجھتا رہا کہ اسلام میں عمومی غلامی ایک بری چیز ہونے کے باوجود ملک یمین (لونڈیاں) جائز ہے۔کیونکہ میرے ناقص قرآنی مطالعے کے مطابق خود قرآن نے یہ اجازت دے رکھی ہے اور منکوحہ بیویوں کی طرح کنیزوں کی کوئی تعداد بھی مقرر نہیں۔کیونکہ اسلام میں کنیز کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ قتال فی سبیل اللہ میں حاصل ہو۔اس لئے ان کی تعداد مقرر ہی نہیں کی جاسکتی تھی اور لونڈیاں بغیر نکاح کے حلال اور جائز ہیں۔

لیکن اگلے دن نماز تراویح کے بعد ایک ساتھی جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اسلام کو

اچھی طرح سمجھتے ہیں' نے یہ کہہ کر کہ اب لونڈیوں والے احکام سورۃ محمد کی کسی آیت سے منسوخ ہو چکے ہیں مجھے شک میں ڈال دیا ہے۔ موصوف نے آیت کا نمبر تو نہیں بتایا لیکن جہاں تک خود میں نے مذکورہ سورت دیکھی ہے اس میں ملک یمین کے بارے میں کوئی واضح الفاظ تو نہیں ملے البتہ آیت نمبر ۴ جس میں قیدیوں کا ذکر ہے کچھ غور طلب ہے۔ مگر غالباً یہ پوری سورت محمد جنگ بدر سے بھی پہلے یا اس کے آس پاس نازل شدہ ہے اور لونڈیوں کے متعلق اجازت کا ذکر تو دیگر سورتوں کے علاوہ سورہ احزاب میں بھی موجود ہے جو شاید ۴ ہجری میں نازل ہوئی تھی۔

مزید یہ بھی کہ سورہ النساء جو غالباً ۳ ہجری سے ۵ ہجری کے درمیان نازل شدہ ہے میں بھی آیت نمبر ۲۵ کے تحت یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر وہ (لونڈیاں) بدچلنی کی مرتکب ہوں تو انہیں خاندانی عورت (محصنات) سے آدھی سزا دی جائے- تعجب ہے کہ بعد کے زمانے میں نازل شدہ احکامات پہلے نازل شدہ قرآن سے کیسے منسوخ قرار پائیں؟

مجھے تسلیم ہے کہ ملک یمین اور اسیران جنگ سے متعلق یہ احکام اس وقت دیئے گئے تھے جب آج کی طرح جنگی قیدیوں کے تبادلے کا معقول بندوبست نہ تھا اب تو شاید ایسی نوبت نہ آئے مگر اس کے باوجود جہاں تک حلت اور حرمت یا جائز و منسوخ کا تعلق ہے وہ آج بھی جائز ہے اور آئندہ بھی جب ویسے حالات پیش آئیں جائز ہوں گی۔ چونکہ اسلام ایک ابدی دین ہے اس لئے بھی اس کا تقاضا ہے کہ وہ جائز ہی ہوں۔

میں یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ میں دولت مند عیسائیوں کی وکالت نہیں کر رہا جو شاید یہ سمجھیں کہ زرخرید عورت بھی کنیز کی تعریف میں داخل ہے۔ لیکن قرآن اور رسول ﷺ نے جو اجازت دی ہے وہ اجازت ہی رہنی چاہیئے۔

اس ضمن میں ایک اور روایت بھی وضاحت طلب ہے وہ یہ کہ ایک حدیث میں یہ آیا ہے کہ اجتہاد کرنے والا اگر غلطی کرے تو ایک نیکی ملے گی اور اگر اس کا فیصلہ ٹھیک اور شریعت کے مطابق ہو تو دوہرا ثواب ہوگا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات قاضیوں اور

فقیہوں کے لئے ہے جو کسی بات کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں اور پھر کتاب وسنت یا آثار صحابہ میں وہ کچھ نہ پاتے ہوں۔ ورنہ اگر یہ معاملہ ہر ہما شما تک وسیع کر دیا جائے تو دین کا تیا پانچا ہو جائے گا کیوں کہ اس کی ایک مثال شاید روزنامہ جنگ میں گزشتہ دنوں آپ کی نظر سے بھی گزری ہوگی جب ایک عالم دین نے روزے سے متعلق اپنا اجتہاد پیش کیا تھا۔

جواب: اسلام میں غلامی کے موضوع پر کچھ عرصہ پہلے ایک مفصل مضمون صراط مستقیم میں شائع ہو چکا ہے اس موضوع پر مفصل معلومات کے لئے اس مضمون کی طرف رجوع کیجئے۔ مفید رہے گا۔ تاہم آپ کے سوال کے جواب میں مختصراً چند گزارشات پیش کر رہا ہوں۔

(۱) آپ کے دوست نے سورہ محمد کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ آیت نمبر ۴ ہی ہے اس میں لونڈیوں سے شادی یا ان کے بارے میں خصوصی مسائل یا احکام کا ذکر تو نہیں لیکن اس حد تک آپ نے درست حوالہ دیا کہ اس آیت میں غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق عمومی احکام کا ذکر بہر حال موجود ہے اور بعض لوگوں کو اس آیت سے غلامی کے نظام کی منسوخی کا شبہ بھی ہوا۔

(۲) اس آیت نمبر ۴ کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

> "اور جب تم کفار کے مقابلے میں جاؤ تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ جب ان کی قوت توڑ چکو تو انہیں مضبوطی سے پکڑ لو (یعنی قید کر لو) اس کے بعد یا تو احسان کر کے (بلا معاوضہ) انہیں چھوڑ دو یا معاوضہ لے کر انہیں آزاد کرو"

یہ آیت کے اس حصے کا ترجمہ ہے جس میں قیدیوں سے متعلق بعض احکام کا ذکر ہے۔ جس کا بنیادی طور پر مفہوم یہ ہے کہ جب کفار کی قوت توڑ کر ان کے لوگوں کو تم قیدی بنالو تو پھر ان قیدیوں کے بارے میں یہ حکم ہے کہ یا تو بطور احسان انہیں چھوڑ دو اور یا مال لے کر انہیں چھوڑو۔ بعض نے معاوضے میں تبادلے کو بھی شامل کیا ہے یعنی

مسلم قیدیوں کے بدلے میں انہیں چھوڑیں۔

(۳) بدر کے قیدیوں کے بارے میں بھی نبی کریم ﷺ نے اس طرح کا فیصلہ فرمایا تھا کہ فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے۔ مگر اس کے بعد سورہ انفال کی آیت ۶۷ نازل ہوئی اور اس طرح قیدی بنانے کی بجائے قتل کرنے کو ترجیح دی گئی اور بدر کے قیدیوں کے بارے میں یہ آیت سورہ محمد کے بعد نازل ہوئی۔

یہاں سورہ توبہ کی آیت ۲۹ بھی قابل ذکر ہے جس میں کفار کے ساتھ لڑائی کا حکم دیا گیا یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو جائیں یا جزیہ دینا قبول کر لیں۔

اسی طرح سورہ توبہ کی ۵ویں آیت بھی قابل غور ہے جس میں کہا گیا کہ مشرکین سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ راہ راست پر آجائیں۔

بعض ائمہ نے اس آیت کو باقی تمام آیتوں کے لئے ناسخ قرار دیا ہے۔

اب جب سورہ توبہ سورہ محمد کے بعد نازل ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ قیدیوں کو آزاد کرنے کے بارے میں سورہ محمد میں جو ذکر ہے وہ عموی اس لئے نہیں کہ اس کے بعد بھی قیدی بنائے گئے اور قرآن میں انہیں چھوڑنے کی بجائے بعض حالات میں قتل کرنے کا حکم بھی دیا گیا اور اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی بعض قیدیوں کو فتنہ دبانے اور دشمن کی قوت کچلنے کی خاطر قتل کیا گیا۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ سورہ محمد کی اس آیت سے غلاموں یا لونڈیوں کے بارے میں احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ بلکہ بظاہر اس کے بعد نازل ہونے والی آیات اسے منسوخ کر رہی ہیں۔

(۴) آپ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ خاص حالات میں اسلام نے قیدیوں کے بارے میں بعض احکام دیئے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غلاموں اور لونڈیوں کی بڑی تعداد انہی حالات کی وجہ سے مسلمانوں کے قبضہ میں آئی جن سے برتاؤ اور سلوک کے بارے میں قرآن وسنت میں مفصل احکام بیان کئے گئے ہیں۔

(۵) دراصل اسلام نے قیدیوں (مرد یا عورتوں) کے بارے میں جتنے احکام بھی دیئے اور جن میں سے بعض کا مذکورہ آیت میں ذکر کیا گیا وہ مخصوص حالات وظروف کا

تقاضا تھے۔ بعض حالات میں بطور احسان چھوڑنے کا ذکر ہے اور بعض حالات میں فدیہ لے کر یا تبادلے میں آزاد کرنے کا ذکر ہے یہ ساری صورتیں اپنے وقت میں درست تھیں۔ اگر ہم ان آیات میں سے کسی کو بھی منسوخ قرار نہ دیں تب بھی ہر آیت کا مفہوم اپنی جگہ اور اپنے مقام پر درست ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود غلامی کا نظام وقت کی ایک ضرورت کے تحت موجود تھا۔ اس لئے غلاموں اور لونڈیوں کے مفصل احکام بیان کئے۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس دور میں غلامی کا جو بدترین نظام قائم تھا' اسلام نے اسے بتدریج ختم کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان حالات میں ایک مدت تک کے لئے اس بین الاقوامی نظام سے چھٹکارا بھی ممکن نہ تھا۔ غلامی کے خاتمے کے سلسلے میں اسلام نے جو مثبت راستہ اختیار کیا اور اس کی جس قدر حوصلہ افزائی کی' اس کے ثبوت یا شاہد کے طور پر سورہ محمد کی مذکورہ آیت بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

اور جس دور میں بھی حالات کا تقاضا یا مجبوری اس شکل میں سامنے آئے جیسے اس دور میں تھی تو قیدیوں کے بارے میں حالات و ظروف کے مطابق کوئی بھی نظام جاری کیا جاسکتا ہے اور وقت کے خلفاء اسوہ رسول کو یقیناً سامنے رکھیں گے۔

جہاں تک آپ کے دوسرے سوال کا تعلق ہے تو آپ کی رائے بالکل درست ہے کہ اجتہاد وہی شخص کر سکتا ہے جو اس منصب کا اہل ہو گا۔ ہر جاہل یا ان پڑھ کو اجتہاد کا حق نہیں دیا جاسکتا اور اجتہاد کے لئے قرآن و سنت' لغت' اصول اور دوسرے بنیادی علوم میں دسترس ضروری ہے جو فہم اسلام کا ذریعہ ہیں۔ محض اردو کی چند کتابیں پڑھ کر کوئی شخص مجتہد نہیں بن سکتا۔ دین کا اصل ماخذ قرآن و سنت ہے اس لئے اجتہاد کے لئے قرآن کی زبان یعنی عربی پر ہر پہلو سے عبور حاصل کرنا اہم شرائط میں سے ہے۔

سجدہ تلاوت

سوال: عرض یوں ہے کہ کافی عرصہ سے جب بھی تلاوت قرآن پاک کرتے کرتے سجدہ تلاوت کے مقام پر پہنچتا ہوں تو چند سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں' جن کی وضاحت طلب کر کے ذہن کو مطمئن کرنا چاہتا ہوں۔ شاید میری طرح کچھ اور لوگوں کو بھی معلومات حاصل ہو جائیں- تلاوت تو بعض دفعہ باوضو حالت میں کی جاتی ہے اور بعض دفعہ بے وضو حالت میں بھی۔ البتہ جو سوال پیدا ہوتے ہیں وہ یہ ہیں

ا۔ سجدہ تلاوت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲۔ دوران تلاوت جب سجدہ آجائے تو اسی وقت ادا کرنا چاہئے یا بعد میں بھی ادا ہو سکتا ہے؟

۳۔ سجدہ تلاوت باوضو حالت میں ادا ہو سکتا ہے یا بے وضو حالت میں بھی ادا کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ اگر تلاوت بے وضو حالت میں ہی کی جارہی ہو تو؟

۴۔ کیا سجدہ تلاوت بھی قبلہ رخ ہو کر ہی ادا کرنا چاہئے۔ کوئی پاک مصلہ چادر بچھا کر یا عام جگہ پر بھی ہو سکتا ہے؟

براہ کرم مندرجہ بالا سوالات کے جوابات شائع کر کے ممنون فرمائیں۔

آپ کا خیر اندیش بھائی
عبدالحلیم ۹۸' فیر بینک روڈ'
بریڈ فورڈ۔

جواب: سجدہ تلاوت فرض تو نہیں لیکن اس کی اہمیت اور تاکید کے پیش نظر یہ اہم سنتوں میں سے ہے- بلا عذر اسے ترک کرنا درست نہیں ہے۔

اس سجدے کی شرائط کے بارے میں اہل علم کے ہاں دو رائیں پائی جاتی ہیں

پہلی رائے: یہ ہے کہ اس سجدے کی وہی شرائط ہیں جو نماز کی ہیں یعنی باوضو ہونا لباس اور جگہ کا پاک ہونا نیت کرنا اور قبلہ رخ ہونا۔

دوسری رائے: یہ ہے کہ سجدہ تلاوت میں نماز جیسی شرائط نہیں ہیں بلکہ جب سجدے کی آیت آئے تو فوری طور پر جہاں ہو جس حالت میں ہو سجدہ کر لینا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اسی پر عمل تھا۔

دلائل کا جائزہ لینے کے بعد دوسری رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے اور بخاری شریف کی ایک روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ

ان النبی ﷺ سجد بالسجود والمسلمون والمشرکون والجن والانس[1]

کہ رسول اکرم ﷺ نے سجدہ کیا اور مسلمانوں، مشرکوں، جنوں اور انسانوں سب نے آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔

ظاہر ہے اس صورت میں کسی شرط کی پابندی ممکن نہ تھی۔ اس لئے صحیح بات یہی ہے کہ سجدہ تلاوت کیلئے وضو، قبلہ رخ ہونے یا مصلی وغیرہ بچھانے کی کوئی پابندی نہیں ہے جن احادیث میں سجدہ تلاوت کے مسائل آئے ہیں وہاں بھی اس طرح کی شرائط کا کوئی ذکر نہیں۔ ہاں البتہ سجدہ تلاوت باوضو ہو کر کرنا بہر حال افضل اور بہتر ہے۔

جہاں تک سجدہ تلاوت کے وقت کا تعلق ہے تو جب سجدہ تلاوت کی آیت آئے گی اس وقت سجدہ کیا جائے گا۔ اس سے پہلے یا بعد میں سجدہ کرنے کی کوئی دلیل اور ثبوت نہیں ہے کیوں کہ یہ سجدہ اس آیت کی مناسبت سے ہوتا ہے جس کی تلاوت کی گئی۔ جب وہ آیت پڑھی ہی نہیں گئی تو بعد میں سجدہ کرنا یا سب سجدوں کو ملا کر کرنے کا کوئی جواز معلوم نہیں ہوتا۔

---

[1] فتح الباری ج ۹ کتاب التفسیر باب فاسجدوا للہ فاعبدون ص ۵۹۷ رقم الحدیث ۴۸۶۲-۴۸۶۲-

مسائل زکوٰۃ

حد نصاب سے زائد زیورات پر زکوٰۃ کا تعین کس حساب سے ہوگا؟

سوال: لندن سے جمال بنت رافع لکھتی ہیں: "صراط مستقیم" جلد ۷ شمارہ ۱۰ مطابق رجب ۱۴۰۴ھ اور شمارہ ۱۱ میں فضائل و مسائل کی دونوں قسطیں انتہائی مفید اور کار آمد ہیں۔ دوسری قسط میں ۱۳۔۳ سونا چاندی نقدی کا حساب میں برائے مہربانی مندرجہ ذیل کی تشریح فرمادیں مشکور ہوں گی۔ مثلاً چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولے ہے۔ اگر کسی کے پاس ساٹھ تولے چاندی ہو تو کیا صرف دس تولے پر زکوٰۃ دے اور ۵۰ تولے جو نصاب سے کم ہے اس پر نہ دے یا پورے ساٹھ تولے چاندی پر زکوٰۃ ادا کرے۔ اسی طرح اگر ساڑھے سات تولے سے کچھ تولے سونا زائد ہو تو کیا زائد کی زکوٰۃ نکالے یا پورے سونے کی؟ اور اگر نقدی ۳ ہزار سے کچھ زائد ہو تو کیا صرف زائد پر زکوٰۃ نکالے یا کل پر؟

جواب: سونا' چاندی' نقدی اور زیور سب پر چالیسواں حصہ یعنی اڑھائی فی صد زکوٰۃ فرض ہے اور یہ اس وقت جب یہ ساری اشیاء نصاب کو پہنچ جائیں۔ آپ نے جو شکل لکھی ہے اس کے مطابق اگر وزن ۶۰ تولے ہے تو پورے ساٹھ تولے پر زکوۃ واجب ہوگی۔ یہی صورتحال سونے اور نقدی میں ہے۔ یعنی جب نصاب پورا ہو جائے تو پھر نصاب سمیت ساری رقم کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔ مثلاً اگر کسی کے پاس پورا نصاب ساڑھے باون تولے ہے تو اس مقدار یا وزن کا ۴۰ واں حصہ نکالنا ہوگا اور اگر کسی کے پاس ۶۰۔۷۰ تولے ہو جاتا ہے تو اسے اس پورے وزن کا ۴۰ واں حصہ نکال کر زکوۃ ادا کرنا ہوگی۔ خلاصہ کلام یہ کہ زکوٰۃ صرف زائد پر نہیں ہوگی بلکہ کل پر ہوگی۔

خواتین کے زیر استعمال زیورات پر زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

سوال: کرائیڈن سے مسز حسن علی دریافت کرتی ہیں کہ کیا زیورات کی زکوۃ دینا ضروری ہے اور اگر ضروری ہے تو کیا اس میں وہ زیورات بھی شامل ہیں جو عورت استعمال کر رہی ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر مطمئن کریں۔

جواب: زیور کی زکوۃ کے بارے میں ائمہ دین اور فقہاء کرام کے درمیان کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن سارے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے جو چیز سامنے آتی ہے وہ زیور کی زکوۃ کے وجوب پر دلالت کرتی ہے اور اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کے ارشادات اتنے واضح ہیں کہ ان میں کسی تاویل کی ہرگز گنجائش باقی نہیں۔

اگر بیوی مال ومتاع کی زکوٰۃ ادا نہ کرے تو؟

سوال: گلاسگو سے ایک بھائی تحریر کرتے ہیں: میں ایک عرصے سے بیمار ہوں۔ اس دوران مجھے بیماری کا الاؤنس ملتا ہے جو تقریباً ۱۰۴ پونڈ ہے اور ۶ بچوں کا فیملی الاؤنس بھی جو ۴۲ پونڈ ہے اس طرح مجھے ہفتے کے کل ۱۴۶ پونڈ ملتے ہیں ۲۰ پونڈ بیوی سے لے لیتا ہوں اور باقی سارے اسے دے دیتا ہوں اور اس نے اب خاصی رقم بینک میں جمع کرائی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ میری بیوی کے پاس ۵۰ تولے سونا بھی ہے مگر اس رقم اور سونے کی وہ زکوۃ نہیں دے رہی اور نہ ہی زکوۃ کی ادائیگی کے لئے رقم میرے حوالے کرتی ہے اور وہ خود کام بھی نہیں کرتی۔ اس صورت حال میں میرے لئے کیا حکم ہے؟ اور قرآن وحدیث کی روشنی میں زکوۃ نہ دینے کا گناہ مجھ پر بھی ہے؟ اور کیا میں بیوی سے

اس رقم کا مطالبہ کر سکتا ہوں تاکہ زکوٰۃ ادا کی جا سکے؟

جواب: آپ نے زکوۃ کے بارے میں جو مسئلہ دریافت کیا ہے اس کی وضاحت درج ذیل ہے۔

(۱) زکوۃ کی ادائیگی کے سلسلے میں جو بنیادی شرائط ہیں ان میں دو شرطوں کا پایا جانا نہایت ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ جس مال پر زکوۃ فرض ہوتی ہے وہ آپ کی ملکیت میں ہو اور اسے خرچ کرنے کا آپ کو پورا اختیار بھی حاصل ہو اور دوسری شرط یہ ہے کہ اس مال پر نصاب زکوٰۃ کو پہنچتے وقت پورا سال گزر چکا ہو۔ آپ نے جو صورت تحریر کی ہے اس کے مطابق حکومت کی طرف سے فیملی الاؤنس آپ کو ملتا ہے اس لحاظ سے وہ آپ کا مال ہے اور آپ کی ملکیت میں ہے لہٰذا اس کی زکوٰۃ دینا بھی آپ کی ذمہ داری ہے او ر آپ کا یہ فرض ہے کہ بیوی کو جو مال آپ خود دیں وہ زکوٰۃ کی رقم نکال کر دیں تاکہ آپ کو یہ اطمینان ہو جائے کہ زکوٰۃ ادا ہو گئی کیونکہ جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے وہ تو زکوٰۃ ادا ہی نہیں کرتی۔

(۲) اب جو رقم اس سے پہلے آپ بیوی کو خود دے چکے ہیں تو وہ آپ کے اختیار سے باہر ہو گئی ہے اور قانونی طور پر اس سے نہ وہ رقم واپس لے سکتے ہیں اور نہ ہی اسے زبردستی زکوٰۃ دینے پر مجبور کر سکتے ہیں اس لئے آپ پر کوئی گناہ نہیں لیکن آئندہ کے لئے آپ کو احتیاط کرنا ہو گی اگر آپ اپنی مرضی سے اسے رقم دے دیتے ہیں جس کی وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتی تو پھر آپ بھی قصوروار ہوں گے۔

(۳) تیسری بات جس کی یہاں وضاحت ضروری ہے کہ اسلام میں بچوں کی کفالت اور بیوی کے نان و نفقہ کا ذمہ دار خاوند ہے اس لئے اگر وہ رقم جو بیوی کو دیتے ہیں اس سے وہ اپنے اور بچوں کے اخراجات پورے کرتی ہے تو پھر اس رقم کے بارے میں اس کے لئے آپ کی کسی اجازت کی بھی ضرورت نہیں اور وہ ضرورت کے مطابق اس میں تصرف کر سکتی ہے۔

حدیث میں ہے: **عن عائشة ان هندا قالت يا رسول الله ﷺ ان ابا سفيان رجل شحيح وليس يعطيني ما يكفيني وولدي الا ما اخذت منه وهو لا يعلم فقال خذي ما يكفيك و ولدك بالمعروف**۔[1]

حضرت عائشہؓ کی اس روایت کے مطابق ابوسفیانؓ کی بیوی حضرت ہندہؓ نے رسول اکرم ﷺ سے کہا کہ ابوسفیان مال نہیں خرچ کرتے یعنی کچھ بخل سے کام لیتے ہیں اور میری اور میری اولاد کی ضرورت بھی پوری نہیں کرتے تو کیا ایسی صورت میں اس کے مال سے میں اتنا اس کے علم کے بغیر لے سکتی ہوں جس سے میری اور میرے بچوں کی ضرورت پوری ہو جائے۔ تو آپ نے فرمایا ہاں تم اچھے طریقے سے اس طرح کے مال میں سے لے سکتی ہو۔

اب اس طرح کی صورت حال ہے پھر تو بیوی کا حق بنتا ہے اور ایسی حالت میں اس کے لئے خاوند کی اجازت بھی ضروری نہیں ہے اور اگر صورت اس سے مختلف ہے تو پھر ہم نے شروع میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔

بہر حال اصل مسئلہ آپ کے اختیار اور ملکیت کا ہے اور اگر اس مال پر آپ کا کوئی اختیار ہی نہیں بلکہ وہ آپ کی اطلاع اور اجازت کے بغیر اسے وصول کر سکتی ہے اور قانونی طور پر اس کا حق بھی بنتا ہے تو اس صورت میں اگر مال نصاب کو پہنچ جاتا ہے اور وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتی تو آپ پر کوئی وبال نہیں ہوگا' بلکہ سارا گناہ اس پر ہوگا اور قیامت کے دن اسی سے باز پرس ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب

کیا بھائی بہن کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں؟

سوال: نانگھم سے محمد علی صاحب لکھتے ہیں کیا رشتہ داروں کو بھی صدقہ اور زکوٰۃ

[1] فتح الباری ج ۱۰ کتاب النفقات باب اذا لم ینفق الرجل رقم الحدیث ٥٣٦٤

دی جاسکتی ہے۔ جیسے بہن بھائی بھتیجے وغیرہ قرآن و سنت کی روشنی میں مسئلہ کی پوری وضاحت کر کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچائیں۔

جواب: صدقات وزکوٰۃ کے جن مصارف کا قرآن میں ذکر کیا گیا ہے اگر رشتہ دار بھی اس ضمن میں آتے ہیں تو انہیں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ یعنی اگر وہ بھی غریب مسکین اور مستحق ہیں بلکہ قرآن نے واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ رشتہ داروں اور قرابت داروں میں جو مستحق ہیں ان کا زیادہ حق ہے اور پہلے ان کی مدد کرنی چاہئے اس کے بعد دوسرے لوگوں کا حق بنتا ہے۔ اس موضوع پر درج ذیل آیات میں تصریح کی گئی ہے:

اہل ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: "اور جو مال کی محبت کے باوجود اسے اپنے رشتہ داروں یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں اور گردن آزاد کرنے میں خرچ کرتے ہیں۔

یہاں بھی رشتہ داروں کو مقدم رکھا ہے۔ (البقرہ: ۳۶)

(۲) اور عبادت کرو اللہ کی اس کے ساتھ ہرگز شرک نہ کرو' والدین کے ساتھ احسان کرو اور رشتہ داروں یتیموں اور مساکین اور قریبی ہمسائے اور دور کے ہمسائے اور قریبی ساتھی اور مسافر سے نیکی کرو۔ (النساء: ۳۶)

(۳) اور رشتہ داروں کو ان کا حق دو اور مساکین کو اور مسافر کو اور فضول خرچی نہ کرو۔ (بنی اسرائیل: ۲۶)

(۴) اور مدد کرو قرابت داروں کی اور مسکینوں کی اور مسافروں کی۔ (روم: ۳۸)

(۵) کہہ دو کہ جو مال تم نیکی کی راہ میں خرچ کرو پس وہ والدین کے لیے' قرابت داروں کے لئے اور یتیموں کے لئے اور مسکینوں کے لئے اور مسافر کے لئے ہے۔

(البقرہ: ۲۱۵)

ان تمام آیات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ رشتہ داروں میں جو بھی مستحق ہو گا اس پر مال خرچ کرنا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔

سوائے ایسے رشتوں کے جن کی کفالت صاحب مال کے ذمہ ہے۔

حدیث سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو آدمی رشتہ دار پر مال خرچ کرتا ہے' اسے اللہ تعالیٰ دوہرا ثواب عطا کرتا ہے۔ حضرت سلیمان بن عامر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الصدقة على المسكين صدقة وهي على ذي الرحم ثنتان صدقة وصلة[1]

"کہ مسکین پر صدقہ کا ثواب صدقہ ہی کا ہوگا جب کہ رشتہ دار پر خرچ کا دو پہلو سے ثواب ہے صدقے کا بھی اور صلہ رحمی کا بھی۔"

اس لئے عزیز و اقارب میں جو مستحقین ہیں ان کو ترجیح دینا کتاب و سنت کی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

قرض دار پر زکوٰۃ ہے؟

سوال: شیفلڈ سے عبدالحق پوچھتے ہیں

جس آدمی کے پاس مال نصاب ہے مگر اس پر قرض بھی ہے قرض مال جمع سے زیادہ ہے جیسے مکان وغیرہ کا قرض ایسے آدمی کے لئے زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

جواب: جس آدمی پر قرض ہے اور اس کے پاس اتنا مال بھی ہے جو نصاب کو پہنچ چکا ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ کے لئے دو بنیادی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ مال نصاب کو پہنچ جائے اور دوسری یہ کہ اس پر پورا سال بھی گزر جائے۔ اب وہ مقروض ہے یا نہیں اسے بہرحال زکوٰۃ دینا ہوگی۔ اگر قرض ہے تو پھر ایسے آدمی کو چاہئے کہ وہ مال سال بھر جمع کرنے کی بجائے پہلے اس رقم سے قرض کی ادائیگی کرے۔ اگرچہ رقم قرض سے کم ہے لیکن پھر بھی اس کے ادا کرنے سے کچھ تو قرض کم ہوگا۔

---

[1] ترمذی مترجم ج ۱ ابواب الزکاۃ باب ماجاء في الصدقة على ذي القرابة ص ۲۵۴

سیاسی پناہ کی کمائی پر زکوٰۃ؟

سوال: ویسٹ مغربی (برلن) سے متعدد رفقاء لکھتے ہیں

مغربی جرمنی میں تقریباً تمام پاکستانی بھائی سیاسی پناہ کی بنا پر رہائش پذیر ہیں۔ یہاں رہ کر جو دولت کماتے ہیں کیا اس دولت سے صدقات' خیرات' زکوٰۃ اور حج وغیرہ جائز ہے اور جو کمائی ہم یہاں پر کرتے ہیں کیا وہ حلال ہے؟ اگر حلال نہیں تو قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح فرمائیں۔

جواب: جہاں تک زکوٰۃ وصدقات کا تعلق ہے تو زکوٰۃ ہر اس مال پر فرض ہو گی جس پر سال پورا ہو جائے۔ یعنی وہ رقم جو نصاب زکوٰۃ کو پہنچ چکی ہے اور ایک سال تک آپ کے پاس موجود بھی رہی ہے تو سال کے بعد اس میں زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ جہاں تک آپ کے مغربی جرمنی میں قیام کا مسئلہ ہے تو اس دوران آپ جو کمائی کرتے ہیں اس کے حلال ہونے کے لئے بنیادی شرط یہی ہے کہ آپ اس دولت کو حلال طریقے سے کماتے ہیں۔ اگر آپ ایسا کام نہیں کرتے جو حرام ہے جیسے جوا' شراب' سود اور زنا جیسے کاموں کی کمائی بالاتفاق حرام ہے۔ اسی طرح جھوٹ' دھوکے اور بددیانتی سے کمائی ہوئی دولت بھی حرام ہے اور اگر آپ نے کوئی حرام ذریعہ استعمال نہیں کیا تو پھر آپ کی دولت حلال ہے اور اس میں صدقات وخیرات سب جائز ہے اس سے حج بھی کیا جاسکتا ہے۔ اب یہ بتانا یا فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ اس دولت کو کمانے کے لئے ذرائع آپ نے جائز استعمال کیے ہیں یا ناجائز۔ اگر ایک حکومت آپ کو سیاسی پناہ دے دیتی ہے اور اس میں آپ کو کام کرنے کی بھی اجازت ہے تو پھر وہاں سے کمائی ہوئی دولت کو حرام قرار نہیں دیا جاسکتا۔

سوشل سیکورٹی بینیفٹ سے صدقہ دے سکتے ہیں؟

سوال: لیڈز سے محمد یٰسین لکھتے ہیں

جو مسلمان بھائی بے کاری اور سوشل سیکورٹی بینیفیٹ لیتے ہیں کہ ان اداروں سے یہ پیسے لینا جائز ہے۔ جبکہ بعض مسلمان بھائی یہ کہتے ہوئے سنے گئے کہ یہ پیسے مسلمانوں کے لیے جائز نہیں (یہ غریبوں کے پیسے ہیں) یہ مسئلہ ان بھائیوں کے لئے الجھن بنا ہوا ہے جو تھوڑا بہت دین پر چلتے ہیں۔ نیز کیا ایسے پیسوں سے صدقہ کرنا اور قربانی دینا جائز ہے؟

جواب: برطانوی قانون کے مطابق جو لوگ بے کار ہیں یا بیمار ہو جاتے ہیں انہیں سوشل سیکورٹی سروس یا دوسرے اداروں کے ذریعے امداد ملتی ہے جو بسا اوقات کام کرنے کی صورت میں ان کی تنخواہ سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ حکومت کے اس قانون کے مطابق اس سہولت سے ہر شہری جو اس ملک میں جائز طریقے سے آباد ہے اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور پھر حکومت نے یہ جو سہولت دی ہے یا اس طرح کا بینیفٹ دیتی ہے اس میں بڑا حصہ اس آدمی کے اپنے ٹیکس وغیرہ کا ہوتا ہے جو حکومت مختلف طریقوں سے وصول کرتی رہتی ہے۔ اس لئے شرعی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں۔ یہ بالکل جائز اور درست ہے ہاں اگر کوئی آدمی جھوٹ غلط بیانی اور ہیرا پھیری کے ذریعے یہ سہولت حاصل کرتا ہے تو یہ بہر حال حرام ہے اور اس سے بہتر ہے کہ وہ کام کرے۔ اگر وہ جائز طریقے سے اپنا یہ حق وصول کرتا ہے تو اس سے صدقہ کرنا قربانی دینا اور دوسرے فرائض اس رقم سے ادا کرنا جائز ہیں۔ کیوں کہ یہ اس کا اپنا مال ہے اس میں

جس طرح چاہے تصرف کر سکتا ہے۔

○ کیا زیور کی زکوٰۃ واجب ہے؟
○ حقیقی بھائی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟
○ فرض اور واجب میں کیا فرق ہے؟

سوال: برائے مہربانی زکوٰۃ سے متعلق مندرجہ ذیل فقہی اختلاف کو مدنظر رکھتے ہوئے اصل صورت حال صاف فرما کر الجھن دور فرمایئے۔

(الف) عورتوں کے استعمال کے زیور کے بارے میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہے جبکہ ایک دوسرا گروہ جس میں غالباً شافعی فقہ کے لوگ شامل ہیں اس طرف گیا ہے کہ عورتوں کے استعمالی زیور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ زکوٰۃ نہیں لگاتے اور یہی رائے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بھی ہے۔ موطا امام مالک ص ۱۰۶ میں ہے۔ کہ حضرت ابن عمرؓ اپنی لڑکیوں کو زیور پہناتے تھے اور زکوٰۃ نہیں دیتے تھے۔ یہ بات تو تمام فقہ کے لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کا صحابہ کرام میں بہت بلند مقام ہے چنانچہ اگر حدیث کی کتب سے ان کی بیان کردہ احادیث کو حذف کر دیا جائے تو آدھے صفحے خالی رہ جائیں۔ امام مالکؒ کی مالکی فقہ کا تو تمام تر دارومدار ہی حضرت ابن عمرؓ کے فتاویٰ پر ہے۔

(ب) نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ آپؐ نے ایک عورت کو سونے کے کنگن پہنے دیکھ کر پوچھا کیا تم اس پر زکوٰۃ دیتی ہو؟ جواب نفی میں پا کر ارشاد فرمایا کیا ان کی جگہ قیامت میں آگ کے کنگن پہننا پسند کرو گی؟

اس ضمن میں ایک دو اور سوال بھی واضح فرمایئے کہ کیا زکوٰۃ واجب ہے یا فرض؟ آیا فرائض اور وجوب ایک چیز کے دو نام ہیں یا کوئی فرق ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ کیا

سگے بھائی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے اور کیا اس پر بھی بیوی کے خاوند کو زکوٰۃ دینے کی طرح قرابت کا بھی ثواب ہوگا؟

میں یہ بات وضاحت سے عرض کردوں کہ میرا مدعا ہرگز یہ نہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کی آڑ لے کر زکوۃ کے سلسلے میں کوئی ناجائز فائدہ اٹھاؤں بلکہ مقصد صرف صحیح مسئلے کی واقفیت ہے۔

قدیر احمد بریڈفورڈ

جواب: آپ کے سوالنامے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا یہ کہ کیا زیور مستعملہ میں زکوٰۃ واجب ہے اور اگر واجب ہے تو پھر حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اختلاف کی حیثیت کیا ہے؟

دوسرا یہ کہ فرض اور واجب کی اصطلاح میں کوئی فرق ہے؟

تیسرا یہ کہ کیا حقیقی بھائی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟ جیسا کہ حدیث میں بیوی کے خاوند کو صدقہ دینے کا ذکر آیا ہے؟

۱۔ جہاں تک مستعملہ زیور کے وجوب کا تعلق ہے تو کتاب و سنت کے ظاہری دلائل کی روشنی میں یہی بات راجح ہے کہ مستعملہ زیور میں زکوۃ واجب ہے چاہے زیور سونے کے ہوں یا چاندی کے۔ اس سلسلے میں آپ نے جو کنگن والی حدیث بیان کی ہے اس کے علاوہ درج ذیل دو احادیث کا ذکر بھی مفید رہے گا۔

۲۔ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ وہ سونے کے زیور پہنتی تھیں پس انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا یہ کنز ہے؟ آپؐ نے فرمایا اگر تم نے اس کی زکوٰۃ دی ہے تو یہ کنز نہیں۔ (دار قطنی ٗ ابوداؤد)

۳۔ حضرت عبداللہ بن شداد کی روایت ہے کہ ہم حضرت عائشہؓ کے پاس گئے تو انہوں نے ذکر کیا کہ ایک بار حضور ﷺ نے میرے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھی تو دریافت کیا کہ عائشہؓ یہ کیا ہے؟ میں نے جواب دیا اللہ کے رسول یہ میں نے زینت کے لئے انگوٹھی

پہنی ہوئی ہے۔ تو آپ نے فرمایا اس کی زکوٰۃ تم نے ادا کی ہے؟ میں نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا تیرے لئے جہنم سے یہ کافی ہے۔

اس طرح کی اور بھی احادیث روایت کی گئی ہیں جن سے اس مسلک کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ مستعملہ زیور میں زکوٰۃ فرض ہے۔ جن لوگوں کے نزدیک مستعملہ زیور میں زکوٰۃ فرض یا ضروری نہیں ہے انہوں نے جہاں بعض اقوال سے استدلال کیا ہے وہاں حضرت جابر کی اس مرفوع حدیث کا بھی سہارا لیا ہے کہ لیس فی الحلی زکوۃ حالانکہ یہ حدیث نہ صرف ضعیف بلکہ موضوع اور بے اصل ہے۔ اسے دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ یا حضرت عائشہؓ کے اقوال کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ مرفوع صحیح روایت ملنے کے بعد کسی صحابی یا امام کے آثار و اقوال قابل حجت نہیں رہتے۔ رسول اللہ کا صحیح فرمان جب ہمارے سامنے آجائے تو پھر کسی بھی شخصیت کا قول چھوڑا جاسکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ کیا ان کے اقوال غلط ہیں تو اجتہاد درست بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی لیکن مجتہد کو ہر حال میں اس کا اجر ملے گا۔ اس لئے صحابہ کرام اور ائمہ دین کے اجتہادات کا صحیح حدیث آنے کے بعد ہمارے لئے اپنانا ضروری نہیں لیکن ان کو اس کاوش کا اجر ضرور ملے گا۔

اس لئے یہ سوچنا کہ اس مسئلے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عائشہؓ یا امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے اقوال کو کس طرح چھوڑا جاسکتا ہے حدیث کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہاں اس مسئلے میں بعض علماء نے ان احادیث پر بھی کلام کیا ہے جن سے زیوروں کی زکوٰۃ کا وجود ثابت ہوتا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیثیں بھی ضعف سے خالی نہیں ہیں۔ ان احادیث کی اسناد پر بحث سے قطع نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام احادیث پر غور کرنے کے بعد بہرحال قوی رائے یہی ہے کہ زیور مستعملہ پر زکوٰۃ واجب ہے اور اگر فریق مخالف کے دلائل کو اہمیت دی جائے تب بھی احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ زیوروں کو زکوٰۃ ادا کی جائے۔

۲۔ جہاں تک فرض اور واجب کے درمیان فرق کا مسئلہ ہے تو اس میں بھی اختلاف

ہے احناف کے نزدیک فرض اور واجب میں کچھ فرق ہے اور وہ واجب کو فرض سے کچھ کم درجہ دیتے ہیں جبکہ دوسرے ائمہ کے نزدیک فرض اور واجب ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ محض لفظی فرق ہے معنی میں کوئی فرق نہیں۔ احادیث میں فرض یا واجب کی جو اصطلاح استعمال ہوئی ہے اس سے دوسری رائے کو تقویت ملتی ہے۔ واجب کا لفظ فرض ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور ان دونوں میں فرق کی کوئی خاص دلیل نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

۳۔ اقرباء کو صدقہ یا زکوۃ دینے کے بارے میں تفصیلی بحث میں پڑنے کی بجائے ہم اختصار سے یہ ذکر کرتے ہیں کہ جس قریبی کا نان و نفقہ جس آدمی پر بھی واجب ہوگا' اس کو زکوۃ نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے اس بات پر اجماع ہے کہ خاوند بیوی کو زکوۃ نہیں دے سکتا۔ اسی طرح اس بات پر بھی اجماع ہے کہ والد لڑکے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا۔ جہاں تک عورت کا اپنے خاوند کو زکوۃ دینے کا تعلق ہے تو اس بارے میں اختلاف ہے بعض لوگوں نے فرق کیا ہے کہ نفلی صدقہ عورت خاوند کو دے سکتی ہے لیکن زکوۃ نہیں دے سکتی۔ جبکہ حضرت زینب کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب انہوں نے پوچھا تھا تو آپ نے فرمایا کہ ہاں تم خاوند کو صدقہ دو تو تمہیں دو اجر ملیں گے ایک قرابت کا ایک صدقے کا۔ لیکن اس حدیث سے زکوٰۃ دینے کا ثبوت نہیں ملتا۔ زیادہ سے زیادہ نفلی صدقے کا جواز ملتا ہے۔ جہاں تک حقیقی بھائی کو زکوٰۃ دینے کا تعلق ہے تو ظاہر ہے جب بھائی یا اس کی اولاد کے اخراجات پورے کرنا دوسرے بھائی کی ذمہ داری نہیں ہے جس طرح کہ اس کے اپنے بیوی بچوں کی اس پر ذمہ داری ہے تو ایسی صورت میں اگر بھائی مستحق ہے اور زکوٰۃ کے آٹھ مصارف میں سے کسی ایک دو میں وہ آتا ہے تو اسے زکوٰۃ دینے میں کوئی شرعی امر مانع نظر نہیں آتا۔ خاص طور پر اگر حضرت زینبؓ کی حدیث سے استدلال کیا جائے کہ انہوں نے زکوٰۃ کے بارے میں ہی حضور ﷺ سے دریافت کیا تھا تو پھر حقیقی بھائی کو زکوٰۃ دینے سے بھی دو اجر حاصل ہو سکتے ہیں ایک

قرابت کا ایک صدقے کا۔

بہر حال خلاصہ کلام یہ ہے کہ مستعملہ زیور جو عورتیں ہمیشہ پہنتی ہیں یا کبھی کبھی اس میں زکوٰۃ دینی ہوگی اس کے لئے شرط یہ نہیں کہ عورت اس زیور کو استعمال کتنا عرصہ کرتی ہے بلکہ شرط یہ ہے کہ وہ سونا چاندی نصاب کو پہنچتا ہے یا نہیں۔ اگر نصاب سے کم ہے تو زکوٰۃ نہ ہوگی جب نصاب پورا ہے تو زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

مسائل حج

حج کے لئے والدین کی اجازت ضروری ہے؟

سوال: برلن (مغربی جرمنی) سے ایم اے ملک لکھتے ہیں کہ آپ کی خدمت میں چند ایک سوالات ارسال کر رہا ہوں آپ قرآن و سنت کی روشنی میں جوابات سے نوازیں۔

(۱) زید امسال حج بیت اللہ کا ارادہ رکھتا ہے مگر اس بارے میں مجبوری یہ ہے کہ جب وہ پیشاب کرتا ہے تو پہلے اور بعد چند قطرے آتے ہیں۔ یہ چیز عام نہیں ہے بلکہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ کیونکہ دوران حج انسان کا پاک رہنا بہت ضروری ہے اور ناپاکی میں حج ادا نہیں کر سکتا۔

(۲) زید کے سر اور جسم کے بال بھی گرتے ہیں اور دوران حج بال نہیں گرنے چاہئیں۔

(۳) بکر کے والدین پہلے سے حج ادا کئے ہوئے ہیں' اب بکر کا حج ادا کرنے کا ارادہ ہے۔ تو کیا اس بارے میں والدین سے اجازت لینا بھی ضروری ہے؟

جواب: (۱) پیشاب کے قطروں کی مجبوری ایسی نہیں کہ آپ حج کا ارادہ ترک کر دیں۔ حدیث میں اس بیماری کا ذکر آتا ہے اور رسول اکرم ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ شلوار یا پاجامے کے نیچے کوئی زائد کپڑا (لنگوٹ یا انڈر ویئر کی شکل کا) پہن لیا جائے اس کے بعد اگر قطرے آتے بھی رہیں تو کوئی حرج نہیں ہاں اتنی احتیاط ضروری ہے کہ نماز کے لیے از سر نو وضو کرنا ہوگا۔ بہر حال اوپر والا کپڑا پاک اور صاف رہنا چاہئے۔ ایسی صورت میں قطرے آ بھی جائیں تو نماز اور حج کی ادائیگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۲)جہاں تک بالوں کے گرنے کا مسئلہ ہے تو ایسی صورت میں جب بال خود گر جائیں تو اس پر کوئی سزا یا دم نہیں ہے بلکہ قربانی اس صورت میں لازم آتی ہے جب احرام کی حالت میں خود بال کاٹے یا ہاتھ سے کھینچ کر نکال دے۔لہذا جو بال خود گر جائیں ان کی وجہ سے حج میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۳)والدین نے پہلے حج کیا ہو یا نہ کیا ہو اگر اولاد پر حج فرض ہے تو والدین روک نہیں سکتے اور نہ ہی کسی فرض کی ادائیگی کے لئے والدین کی اجازت ضروری ہے۔ہاں اگر والدین کسی شرعی عذر کی بنیاد پر بکر کو حج سے روکتے ہیں اور اجازت نہیں دیتے تو ایسی صورت میں والدین کی بات ماننا ہوگی۔ مثلاً والدین اتنے بوڑھے ہیں کہ وہ بکر کے بغیر سخت تکلیف یا مصیبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ایسی صورت میں بکر کو ان کے لئے کوئی معقول انتظام کر کے ان سے اجازت لینا ہوگی لیکن عام حالات میں والدین کی اجازت حج کے لئے کوئی شرط نہیں ہے۔

والدین کی طرف سے حج کی صورت کیا ہے؟

سوال: لندن سے محمد افضل سوال کرتے ہیں کچھ بھائی کہتے ہیں کہ جس شخص کے والدین نے حج نہیں کیا وہ اپنا حج نہیں کر سکتا یہاں تک کہ پہلے والدین کا حج ادا نہ کرلے۔اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب: حج کی فرضیت کے بارے میں اللہ رب العزت کا یہ فرمان اصل بنیاد ہے اور اسی کی روشنی میں فرض ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (آل عمران: ۹۷)

اللہ کی طرف سے اس شخص پر حج فرض ہے جو بیت اللہ تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔

ظاہر ہے یہاں طاقت سے مراد زادراہ ہے کہ اس کی مالی پوزیشن ایسی ہو کہ حج کے سفر کے جملہ اخراجات برداشت کر سکے اور واپس آنے تک اپنے اہل خانہ کے اخراجات بھی پورے کر سکے۔

اب باپ ہو یا بیٹا جس کی اپنی اقتصادی حالت ایسی ہے کہ حج فرض ہو جاتا ہے تو پھر انہیں ایک دوسرے کا انتظار کئے بغیر حج کرنا ہوگا۔ اگر ایک آدمی کے والدین پر حج فرض ہی نہیں ہے تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ پہلے اپنے والدین کا حج کرے۔

اور اگر کوئی آدمی اپنے والدین کی طرف سے حج کرنا چاہتا ہے کیونکہ والدین کسی عذر کی بنا پر حج نہیں کر سکتے، تب بھی اسے پہلے اپنا حج کرنا ہوگا اس کے بعد ہی والدین کا حج کر سکتا ہے۔ کیونکہ جو آدمی کسی دوسرے کی طرف سے حج کرنا چاہتا ہے اس کے لئے پہلے اپنا حج کرنا ضروری ہے ورنہ وہ حج بدل نہیں کر سکتا۔

حجر اسود جنت سے نازل ہوا ہے؟

سوال: محمد دین لیڈز سے تحریر کرتے ہیں۔ میرے ایک دوست کا کہنا یہ ہے کہ بیت اللہ میں جو حجر اسود نصب ہے وہ جنت سے نازل ہوا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے اور اس کی دلیل بیان کریں۔

جواب: حجر اسود اس پتھر کو کہتے ہیں جو بیت اللہ شریف کے اس کونے میں نصب ہے جو اس کے دروازے کے قریب ہے۔ اس کے سامنے سے طواف شروع ہوتا ہے اور اسی جگہ آکر ختم ہوتا ہے۔ اسے چوم کر یا ہاتھ لگا کر طواف شروع کرنا مسنون ہے۔

اس پتھر کے بارے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ مشہور فرمان ہے۔

انی اعلم بانك حجر لا تضر ولا تنفع و لو لا انی رایت رسول الله

ﷺ یقبلك ما قبلتك[1]

میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے' نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع دے سکتا ہے۔ اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہ دیکھا ہو تا کہ انہوں نے تجھے بوسہ دیا تو میں بھی تجھے بوسہ نہ دیتا۔

جہاں تک اس کے جنت سے نازل ہونے کا تعلق ہے تو یہ بھی حدیث سے ثابت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

نزل الحجر الاسود من الجنة و هو اشد بیاضا من اللبن فسودته خطایا بنی آدم[2]

"حجر اسود جب جنت سے دنیا میں نازل ہوا تو وہ دودھ سے بھی زیادہ سفید تھا پھر اولاد آدم کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا۔"

اس حدیث کو امام ترمذی نے حسن کہا ہے۔ اس حدیث سے بہر حال یہ ثابت ہوتا ہے کہ حجر اسود جنت سے لا کر بیت اللہ میں نصب کیا گیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

حج کی بنیادی شرائط کیا ہیں؟

سوال: محمد اسلم لیڈز سے لکھتے ہیں حج کے بارے میں چند سوالات لکھ رہا ہوں' امید کرتا ہوں کہ جلدی جواب سے نوازیں گے۔

۱۔ حج کی بنیادی شرطیں کیا ہیں؟ اور کس آدمی پر کب حج فرض ہو جاتا ہے؟

۲۔ کیا عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر حج کر سکتی ہے؟

---

[1] فتح الباری ج ٤ کتاب الحج باب ما ذکر فی الحجر الاسود رقم الحدیث ١٥٩٧

[2] ترمذی مترجم ج ١ ابواب الحج باب ما جاء فی فضل حجر الاسود ص ٣١٩

۳۔ بچے کے حج کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب: (۱) حج کی بنیادی شرطیں تو یہی ہیں کہ آدمی بالغ ہو، سلیم العقل ہو، آزاد ہو اور سفر کے لئے مالی اور جسمانی طور پر طاقت رکھتا ہو اور طاقت سے مراد یہ ہے کہ اپنے غائب ہونے کے عرصے میں گھر والوں کے اخراجات کے لئے کافی مال چھوڑ جائے اور ساتھ ان کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے تسلی بخش انتظام ہو۔ اگر اس کی بیوی بچے یا والدین اس حالت میں ہیں کہ اس کے بغیر ان کی جان و مال یا عزت محفوظ نہیں یا ان کی ضروریات کے لئے کوئی بالغ و محرم موجود نہیں تو ایسے آدمی پر حج فرض نہیں ہوتا۔

(۲) جہاں تک عورت کے حج کا تعلق ہے تو اس کے لئے بھی وہی شرائط ہیں جو مرد کے لئے ہیں۔ لیکن عورت کے لئے سفر میں کسی محرم کا ساتھ ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح اس عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاوند سے اجازت بھی طلب کرے۔

اور اگر خاوند اسے ناجائز طور پر حج پر جانے سے روکتا ہے تو پھر عورت اس کی اجازت کے بغیر بھی حج کر سکتی ہے۔ شریعت کے احکام کی بجا آوری کے راستے میں اگر خاوند رکاوٹ پیدا کرتا ہے تو اس کے لئے خاوند کی اطاعت ضروری نہیں۔ جیسے خاوند کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ بیوی کو نماز پڑھنے سے روک سکے۔ اسی طرح جب بیوی پر حج فرض ہو جائے تو اس کی ادائیگی سے بھی وہ نہیں روک سکتا اور نہ بیوی اس کی پابند ہے۔

(۳) بچے پر یوں تو حج فرض نہیں ہے لیکن اگر والدین کے ساتھ حج پر گیا اور وہ احرام وغیرہ باندھ سکتا ہے تو اس کے احرام کا اہتمام، نگرانی اور اس کی طرف سے نیت والد ہی کرے گا اور اس کا حج صحیح ہو گا اور اس کا اجر و ثواب اس کے والدین کو ملے گا۔ جیسا کہ حدیث میں اس کی وضاحت آئی ہے۔

طواف بیت اللہ کی مخصوص دعائیں؟

سوال: محمد ظفر خان برمنگھم سے حج کے بارے میں درج ذیل سوالات دریافت کرتے ہیں

ا۔حج کا سب سے اہم رکن طواف ہے تو طواف کے دوران کون سی دعا پڑھنا بہتر ہے یا کوئی اور ذکر جو ثابت ہو۔کیا طواف کے دوران قرآن پڑھا جاسکتا ہے؟

۲۔ صفاو مروہ کے دوران جو سبز نشان ہیں ان کے درمیان دوڑا جاتا ہے-کیا یہ دوڑنا عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے؟

۳۔ کہا جاتا ہے کہ شیطان کو کنکریاں مارنے کی جگہ پر بہت زیادہ بھیڑ ہوتی ہے تو کیا کنکریاں سب کے لئے ضروری ہے؟اور عورتوں کو بھی وہاں جانا لازمی ہے؟اس بارے میں پوری صراحت سے جواب دیں۔

جواب: (ا)بلا شبہ طواف حج کا اہم اور بنیادی رکن ہے لیکن طواف کے سات چکروں کے دوران جہاں تک دعاؤں اور اذکار کا تعلق ہے تو اس بارے میں وہی چیز درست ہو گی جو باقاعدہ رسول اکرم ﷺ سے ثابت ہو گی۔ ہر چکر کے لئے علیحدہ اور مستقل دعا کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جیسا کہ عام کتابوں میں ہر چکر کی الگ دعا لکھی ہوتی ہے۔ یہ غیر مسنون ہے۔ رسول اکرم ﷺ سے جو چیز ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب طواف شروع کریں تو حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کر یہ الفاظ کہے:

اللھم ایمانا بك و تصدیقا بکتابك و وفاء بعھدك و اتباعا لسنة نبیك. باسم الله الله اکبر–

اسی طرح جب رکن یمانی کے برابر پہنچے تو یہ دعا پڑھنا رسول اکرم ﷺ سے ثابت ہے۔

﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (البقرة : ٢٠١)

اس کے علاوہ طواف کے دوران حاجی آزاد ہے۔ انفرادی طور پر کوئی بھی دعا پڑھ سکتا ہے اور اگر قرآن کریم کی کوئی سورت یا آیت پڑھنا چاہے تو اس کی بھی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

(۲) صفا و مروہ کے درمیان دو سبز نشانوں کے درمیان جو فاصلہ ہے اس میں مردوں کو تو یہ حکم ہے کہ وہ دوڑ کر اسے طے کریں۔ عورتوں کے لئے یہ حکم نہیں بلکہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا

لیس علی النساء سعی بالبیت ولا بین الصفا و المروۃ[1]

عورتوں کے لئے طواف کے دوران اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑنے کا حکم نہیں ہے۔

اس لئے عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

(۳) جہاں تک کنکریاں مارنے کے مسئلے کا تعلق ہے تو یہ بھی حج کے اہم مسائل میں سے ہے لیکن حج کا رکن نہیں ہے۔ اگر کوئی آدمی کسی وجہ سے کنکریاں نہیں مار سکا تو اس کا حج بہر حال ہو جائے گا' ہاں اسے ایک جانور ذبح کرنا ہوگا۔

کنکریوں کے مقام پر اگر بہت زیادہ بھیڑ ہو اور بوڑھے' مریض اور عورت کے لئے وہاں پہنچنا مشکل ہو یا گرنے اور کچل جانے کا خطرہ ہو تو یہ جائز ہے کہ ان کی طرف سے کوئی دوسرا آدمی کنکریاں مار دے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں ہم نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ حج کیا اور ہمارے ساتھ عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی اور ہم نے بچوں کی طرف سے تلبیہ بھی کیا اور ان کی طرف سے کنکریاں بھی ماریں۔

---

[1] رواہ الشافعی کتاب الحج باب السعی بین الصفا و المروۃ

چوری چھپے کام اور حج

جواب: ریڈنگ سے کرم الٰہی چوہان لکھتے ہیں

۱۔ قرآن و حدیث کے علاوہ حج کی کتاب پڑھی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جدہ پہنچ کر آگے ہر مقام پر حاجی کے لئے دعا کرنا ضروری ہے اس طرح تو اتنی لمبی دعا یاد کرنا ممکن نہیں۔ کیا ایسی حالت میں جب یہ دعائیں نہ کی جاسکیں تو حج مکمل ہو جاتا ہے؟

۲۔ اس بے کاری کے دور میں گزارہ الاؤنس ملتا ہے بعض حضرات مزید ضرورت کے لئے پارٹ ٹائم کسی جگہ کام بھی کر لیتے ہیں' اس طرح چوری چھپے کام کر کے جو پیسے جمع کرتے ہیں کیا ان کے ذریعے حج ہو جاتا ہے؟

۳۔ اگر کسی مسجد میں دین کی تعلیم ہو رہی ہو تو اس میں شامل ہونا بہتر ہے یا تلاوت کرنا افضل ہے؟

۴۔ مسجد میں اگر سونے کی جگہ الگ نہ ہو تو کیا نماز کی جگہ سو سکتے ہیں؟

جواب: سفر حج میں جدہ پہنچ کر آگے مکہ مکرمہ تک کوئی خاص دعا نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں ہے اور یہ بالکل غلط ہے کہ ہر مقام پر حاجی کے لئے دعا ضروری ہے۔ بیت اللہ تک حج یا عمرہ کرنے والے کے لئے جو کلمات پڑھنے ثابت ہیں وہ صرف تلبیہ ہے یعنی لبیك اللھم[1] کے الفاظ آخر تک۔ یہ جس قدر کثرت کے ساتھ پڑھے بہتر ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے کلمات یا دعائیں ثابت نہیں ہیں لہٰذا اس طرح کی غیر ثابت دعاؤں کا حج سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح طواف کے ہر چکر کے لئے جو بعض کتابوں میں الگ الگ دعائیں ہیں وہ بھی ثابت نہیں ہیں۔ صرف رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان ربنا اتنا فی الدنیا

---

[1] فتح الباري ج ٤ كتاب الحج' باب التلبية رقم الحديث ١٥٤٩

حسنة و فی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار پڑھنا ثابت ہے۔ اس کے علاوہ دوران طواف کوئی بھی دعا کر سکتے ہے۔ اگر عربی میں نہ کر سکے تو اپنی زبان میں کر سکتا ہے یا کوئی دوسرے مسنون کلمات پڑھ سکتا ہے۔

(۲) حج کے لئے حلال کمائی کا ہونا ضروری ہے۔ ایسے ہی جس کمائی میں جھوٹ دھوکے یا فریب کا دخل ہو وہ مشکوک ہے' اس سے پرہیز کرنا چاہئے گزارہ الاؤنس کے ساتھ جو دوسرا کام کیا جاتا ہے اگر وہ محنت مزدوری کی شکل میں اجرت لیتا ہے تو فی نفسہ وہ کمائی حلال ہے۔ اس کمائی میں کوئی برائی نہیں کیونکہ آدمی کام کرتا ہے اور اس کے بدلے میں حق اجرت لیتا ہے لیکن اس کے ساتھ اس نے اتھارٹی کو جو یہ کہا کہ وہ کوئی کام نہیں کرتا۔ اس میں جھوٹ ہے اور جھوٹ سنگین جرم ہے جس کا اس کو اللہ کے ہاں جواب دینا ہے۔ یہ اس کا الگ عمل ہے لیکن کمائی یا محنت اپنی جگہ درست ہے اس لئے حج کی ادائیگی میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

(۳) اگر کسی مجلس میں دین کی تعلیم ہو رہی ہو اور اس میں بیٹھنے سے دینی معلومات میں اضافہ ہوتا ہو تو تلاوت سے بہتر ہے کہ اس مجلس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ نبی کریم ﷺ ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں تشریف لائے تو آپ نے دو طرح کے لوگوں کو دیکھا۔ کچھ لوگ ایک طرف بیٹھ کر اللہ کا ذکر کر رہے ہیں اور کچھ لوگ ایک مجلس میں علم سیکھنے سکھانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ خود اس مجلس میں تشریف لے گئے جس میں علم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تبلیغی و علمی مجلس کو چھوڑ کر اگر کوئی شخص الگ بیٹھ کر تلاوت کرتا ہے تو یہ بھی جائز ہے کیوں کہ آپ نے ذکر کرنے والوں کو منع نہیں کیا تھا۔

(۴) مسجد میں اگر الگ جگہ سونے کے لئے نہیں ہے تو نماز کی جگہ بھی سو سکتے ہیں۔ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں سوتے تھے۔ یہ حدیث سے ثابت ہے۔

کیا قبلہ کی طرف پاؤں کر کے لیٹنا جائز ہے؟

سوال: بہاول پور (پاکستان) سے محمد اشرف رسول لکھتے ہیں

سوال حاضر خدمت ہیں۔ امید ہے جواب صراط مستقیم کی وساطت سے مل جائے گا۔

۱۔ قبلہ (کعبہ) کی طرف پاؤں کر کے لیٹنا جائز ہے؟ جائز ہے تو کوئی دلائل اور اگر ناجائز ہے تو بھی دلائل سے واضح کریں۔

۲۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ شمال کی جانب بھی پاؤں کر کے نہیں لیٹنا چاہئے اور نہ ہی شمال کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنا چاہئے۔

جواب: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جب کوئی قضائے حاجت کے لئے بیٹھے تو وہ قبلہ کی طرف نہ منہ کرے نہ پیٹھ (مسلم شریف)

اس حدیث میں بیت اللہ کی طرف منہ اور پیٹھ کر کے پیشاب یا پاخانہ کرنے سے روک دیا گیا ہے اس کے علاوہ نبی کریم ﷺ سے کوئی ایسا فرمان منقول نہیں جس میں آپؐ نے بیت اللہ کی طرف پاؤں کر کے لیٹنے سے منع فرمایا ہو۔ اس لئے بنیادی طور پر ہم اسے ناجائز نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ پاؤں کر کے لیٹنے سے منع پر ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

رہا مسئلہ ادب و احترام کا تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیت اللہ کی طرف منہ یا پیٹھ کر کے پیشاب کرنے سے جو منع کیا گیا اس سے مقصود بیت اللہ کا احترام اور اس کی توقیر ہے۔ اس لئے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پاؤں کر کے لیٹنے میں بھی ایک لحاظ سے بے ادبی ہے اس لئے یہ بھی جائز نہیں۔

ہم اس بارے میں ممانعت کا حکم قطعیت کے ساتھ اس لئے نہیں لگا سکتے کہ اس

میں کوئی دلیل قرآن و سنت سے ہمارے سامنے نہیں لیکن اگر کسی علاقے کے عرف عام یا رواج کے مطابق کسی محترم چیز کی طرف پاؤں کر کے لیٹنا بے ادبی کی علامت ہے تو ایسی صورت میں بیت اللہ کی طرف پاؤں کر کے لیٹنے سے بھی پرہیز کرنا چاہئے اور اگر کوئی عام عادات کے مطابق اسے بے ادبی نہیں سمجھتا اور بے ادبی کے خیال سے وہ پاؤں کعبہ کی طرف نہیں کرتا تو اسے ناجائز نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ناجائز قرار دینے کے لئے واضح شرعی دلیل کا ہونا ضروری ہے۔

ادب واحترام کی وجہ سے بعض بزرگان دین کعبہ کی طرف منہ کر کے تھوکنے سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ اب یہ ادب واحترام ہے لیکن کوئی تھوکتا ہے تو اسے آپ ناجائز نہیں کہیں گے کیوں کہ ناجائز قرار دینے کے لئے ہمارے پاس کتاب و سنت سے کوئی ثبوت نہیں ہے۔

جہاں تک شمال کی طرف پاؤں کر کے لیٹنے کا مسئلہ ہے تو اس بارے میں کسی حدیث یا روایت میں کوئی ذکر نہیں کہ شمال کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنا یا پاؤں کر کے لیٹنا ناجائز ہے۔ اگر صرف اس دلیل کی وجہ سے ناجائز ہے کہ شمال کی طرف کچھ بزرگان کی قبریں یا خانقاہیں ہیں یا کوئی بڑی مسجد ہے تو پھر شاید کوئی کونہ بھی ایسا نہ ہو جس طرف کوئی مقدس مقام یا کسی بزرگ کی کوئی قبر نہ ہو۔ اس لئے صرف بیت اللہ تک اس مسئلے کو محدود رکھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ اگر پابندی عائد کریں گے تو اس میں خواہ مخواہ کی تنگی اور تکلیف ہو گی۔

جہاد

ارکان خمسہ میں جہاد کیوں نہیں؟

سوال: گلاسگو سے افتخار احمد نے طویل سوال ارسال کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ۔ ''بچپن سے ہم سن رہے ہیں کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں: کلمہ' نماز' زکوٰۃ' روزہ' حج' اور بعض علماء کی نظروں میں اسلام کے بنیادی پانچ ارکان ہیں: نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج' جہاد لیکن زیادہ زور پہلے پانچ ارکان پر دیا جاتا ہے' جس میں جہاد شامل نہیں ہے۔ میرے خیال میں علماء نے خطرات سے بچنے کے لئے جہاد کو ان پانچ بنیادی ارکان سے نکال دیا ہے تاکہ باغی کا فتویٰ دے کر ان کو جیلوں یا پھانسی کے تختہ پر نہ لٹکایا جائے اور اس طرح مسلمانوں کو باسانی غلام بنایا جاسکتا ہے آپ اس موضوع پر اپنے رسالے میں تحریر کر کے لوگوں کو بہرہ ور کریں۔

جواب: اسلام میں جو بنیادی ارکان ہیں قرآن میں ان سب کا ذکر موجود ہے۔ اسی طرح ان پانچ کے علاوہ جو دوسرے فرائض ہیں ان کا حکم بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ ان میں ایک اہم فریضہ ''جہاد'' بھی ہے۔ علماء امت نے نہ اسے ساقط کیا ہے اور نہ ہی کسی کو اجازت دی ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے مخصوص مقاصد کے لئے جہاد کی اہمیت اور فرضیت ختم کرنے کی کوشش کی اور پھر اس کا جو حشر ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔

قرآن تو واضح طور پر کہتا ہے کہ

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ﴾ (الحج: ۷۸)

اللہ کی راہ میں ایسے جہاد کرو جیسے جہاد کرنے کا حق ہے۔

جہاں تک پانچ بنیادی ارکان کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں خود نبی کریم ﷺ

نے ارشاد فرمایا کہ

"بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله و ان محمدا رسول الله و اقام الصلوة وایتاء الزکوة وصوم رمضان و حج البیت من استطاع الیه سبیلا"[1]

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی (۱) اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں (۲) اور نماز قائم کرنا (۳) اور زکوٰۃ دینا (۴) اور رمضان کے روزے رکھنا (۵) اور بیت اللہ کا حج کرنا اگر اس کی طاقت ہو۔

تو اس میں علماء نے کوئی کمی بیشی نہیں کی کہ جہاد کو درمیان سے نکال دیا بلکہ رسول اکرم ﷺ نے ان بنیادی ارکان کا تعین خود فرمایا اور ہمارے نزدیک اس سے جہاد کی اہمیت یا فرضیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ ان بنیادی ارکان پر پختگی اور استقامت کے بعد ہی انسان قتال فی سبیل اللہ کے لئے اپنے آپ کو تیار کر سکتا ہے۔ مومن کی ساری زندگی جہاد ہے اور یہ سارے اعمال جہاد کی تربیت ہیں۔ ان بنیادی ارکان پر عمل پیرا ہو کر جہاد اکبر اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے پانچ بنیادی فرائض میں اس کے ذکر نہ ہونے کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

قرآن نے نماز روزے سے بھی زیادہ تفصیل سے قتال فی سبیل اللہ کے احکام و مسائل اور جہاد کی فضیلت بیان کی ہے اور ہر دور کے علماء حق نے دشمنان اسلام کے خلاف اعلان جہاد کیا اور اسلامی احکام سے بغاوت کرنے والے مسلمان حکمرانوں کے خلاف بھی جہاد جاری رکھا۔ آپ دنیا بھر کی آزادی اور جہاد کی تحریکوں کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو علماء حق کا کردار بڑا نمایاں نظر آئے گا۔ اس لئے یہ صحیح نہیں کہ علماء جہاد پر زیادہ زور نہیں دیتے اور جو لوگ جہاد کی اہمیت کے قائل نہیں یا آج اس کی ضرورت محسوس

---

[1] فتح الباری ج ۱ کتاب الایمان باب دعاء کم ایمانکم رقم الحدیث ۸

نہیں کرتے وہ اسلامی تعلیمات کی روح ہی سے ناواقف ہیں۔ اس امت کی بقاء اور اس کے غلبے کا انحصار ہی جذبہ جہاد پر ہے جس کو زندہ رکھنا نہ صرف علماء بلکہ ہر مسلمان کا فرض ہے جو اسلامی جماعتیں جہاد کو نظر انداز کر کے اپنے پیروکاروں کو صرف ذکر و فکر کی تلقین کرتی ہیں وہ صحیح اسلامی دعوت پیش نہیں کر رہیں۔

ان شاء اللہ ہم کبھی جہاد کی اہمیت پر مفصل مقالہ شائع کریں گے۔

کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟

سوال: مغربی جرمنی سے کسی نے پوچھا ہے

اسلام نے کس قسم کی حکومت کا حکم دیا ہے؟ اسلام ڈنڈے سے پھیلا ہے' تلوار سے یا اخلاق سے؟ جس قوم کا مقدر فوجی حکومت ہو وہ ترقی کر سکتی ہے۔ میں بھوکا ہوں میرے بچے بھوکے ہیں بھوک سے تنگ آکر چوری کروں تو میرے ہاتھ کاٹنے جائز ہیں؟

جواب: اسلام میں نظام حکومت کی بنیادیں رسول اکرم ﷺ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم رکھ کر گئے ہیں۔

(۱) جس میں شخصی آزادی اور عدل و مساوات کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے اور ظلم و ناانصافی کی بیخ کنی کی گئی ہے۔ ان اصولوں کو مد نظر رکھ کر اسلام کو مکمل نظام حیات کے طور پر نافذ کرنا اسلامی حکومت کا کام ہے لیکن مغربی طرز جمہوریت کو مسائل کا حل سمجھنا یا طرز حکومت قرار دینا ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے بلکہ اسلام کے معاشی و معاشرتی نظام کو زندگی کے ہر شعبے میں لاگو کرنے کے بعد اس ملک کے مناسب حال کوئی انتظامی ڈھانچہ بھی تشکیل دیا جا سکتا ہے جس میں شخصی آزادی برقرار رہے اور عدل

و مساوات کے اسلامی اصولوں کو فوقیت دی جائے۔

(۲) اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا اس کی گواہی تو اب دشمن بھی دے چکے ہیں۔ جس دین کے لانے والے نے اپنی دعوت کا آغاز تین یا چار آدمیوں سے کیا ہو پھر جنہیں ان کے آبائی شہر سے نکال دیا گیا ہو جو باقی رہ گئے وہ ایک عرصے تک ظلم و ستم کا نشانہ بنتے رہے اور ایک عرصے تک خفیہ طور پر دعوت کا کام جاری رکھا اور پیغمبر اسلام ﷺ اپنے مظلوم و بے کس ساتھیوں کو لے کر بے سر و سامانی کے عالم میں ایک دوسرے شہر کا رخ کرتے ہیں' ان کے بارے میں کہنا کہ اسلام تلوار سے پھیلا کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ اسی طرح میثاق مدینہ اور صلح حدیبیہ بھی اس بات کے شواہد ہیں کہ اسلام نے تلوار کی بجائے اخلاق و صلح کو ترجیح دی ہے۔ کسی نے خوب کہا ؎

غلط کہ اس نے تیغ کے سہارے کار دیں کیا
غلط کہ اس نے مادی وسیلوں پر یقین کیا
حدیبیہ کی صلح سے عیاں ہے اس کی نرم خو
ہوا ہے کوئی اور نہ ہوسکے گا ایسا صلح جو

(۳) انتظامیہ ایمان دار ہو اور عدل و انصاف کو بالادستی حاصل ہو' اسلام اپنی ذات سے لے کر پورے ملک میں نافذ کرنے کی صلاحیت و جرات ہو تو پھر ملک ترقی کر سکتا ہے۔ حکمران چاہے فوجی ہو یا سیاست داں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۴) جو حکومت بھوکے کو کھانا نہ کھلا سکے اور لوٹ کھسوٹ اور استحصال کے دروازے بند نہ کرسکے وہ کسی بھوکے کا ہاتھ نہیں کاٹ سکتی۔ کیونکہ اسلام جزوی نہیں بلکہ مکمل نظام حیات ہے جس میں عبادات' اقتصادیات اور اخلاقیات سب شامل ہیں۔

مرتد کی تعریف کیا ہے؟

سوال: مرتد کی تعریف کیا ہے؟ اسلام میں اس کی سزا کیا ہے؟ اور کیا یہ سزا آزادی فکر کے منافی نہیں؟

جواب: دشمنان اسلام، جن اسلامی سزاؤں کے بارے میں مکروہ اور غلیظ پروپیگنڈہ کرتے ہیں ان میں ارتداد کی سزا بھی ہے حالانکہ مرتد کی اسلام نے جو سزا مقرر کی ہے وہ عدل و انصاف کے عین مطابق ہے۔ مرتد اسلامی اصطلاح میں وہ شخص ہے جو حلقہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف لوٹ جائے یعنی وہ مسلمان جو کافر ہو جائے اسلام میں اس کی سزا قتل ہے۔ پیغمبر اسلام نے فرمایامن بدل دینه فاقتلوه[1] جس نے اپنے دین کو تبدیل کر دیا اسے قتل کر دو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں مذہب و عقیدے کی آزادی ہے اور ارشاد ربانی ہے لا اکراه فی الدین لیکن اسلام میں سرکشی و بغاوت کی بھی اجازت نہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے کوئی شخص حریت فکر کا سہارا لے کر ایک ملک کا شہری ہونے کے ساتھ اسی ملک کے خلاف اعلانیہ بغاوت کر کے غداری کا مرتکب ہو۔ اور ان مصنوعی اور عارضی سرحدوں کے ممالک کا وفادار نہ رہے کوئی ملک بھی اسے معاف نہیں کرتا اور شاید ہی اس کیلئے سزائے موت سے کم کوئی سزا ہو۔ تو جو شخص اپنے دین ایمان اور اللہ سے بغاوت کرے، غداری کا مرتکب ہو تو کیا وہ اس سے کم سزا کا مستحق ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسلام نے مرتد کے قتل سے پہلے اسے رجوع اور توبہ کا حق دیا ہے تاکہ وہ تائب ہو کر دوبارہ حلقہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ اگر وہ تائب نہ ہو تو اپنے دین سے مذاق کرنے والے اس باغی کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے۔

---

[1] سنن الکبری ج ۸ کتاب. المرتد ص ۱۹۵

کیا سیدنا حسینؓ باغی ہیں؟

سوال: کیا سیدنا حضرت حسینؓ کو یزید بن معاویہؓ کا باغی قرار دینا درست ہے؟

جواب: حضرت حسینؓ کو باغی کہنا ہرگز جائز نہیں بلکہ ان کے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے توہین اور گستاخی ہے۔ ایسے شخص کو اللہ کا خوف کرنا چاہئے اور اس طرح کے الفاظ زبان پر لانے سے ڈرنا چاہئے۔ آپؓ نے یزید کی بیعت سے انکار ایک اصولی اور بنیادی اختلاف کی بنا پر کیا تھا جس میں وہ حق بجانب تھے اور پھر رسول اللہ ﷺ نے حسنین کا جو مرتبہ و مقام بیان فرمایا اور جس انداز سے اپنی بیٹی کے جگر گوشوں سے محبت والفت کا اظہار کیا اس کو سامنے رکھتے ہوئے سیدنا حسینؓ کے بارے میں اس طرح کے توہین آمیز الفاظ استعمال کرنا ایک مسلمان کو زیب نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان پاکیزہ ہستیوں کا صحیح احترام کرنے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مسائل نکاح

نکاح میں کلمے ضروری ہیں؟

سوال: حافظ داؤد چیپل اسٹریٹ آکسفورڈ سے پوچھتے ہیں۔

(الف) ایک مولوی صاحب نکاح پڑھاتے ہیں تو کلمے نہیں پڑھاتے۔ کیا کلمے پڑھائے بغیر نکاح ہو جائے گا اور مولوی صاحب صرف لڑکے کا نکاح پڑھاتے ہیں' لڑکی یعنی دلہن کو کچھ نہیں پڑھاتے فقط وکیل سے کہتے ہیں تم دلہن سے اجازت لے آؤ تو وکیل اور دو گواہ دلہن سے اجازت لے آتے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟

جواب: (الف) جہاں تک نکاح میں کلمے پڑھانے کا تعلق ہے تو احادیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ رسول اکرم ﷺ نے نکاح کے موقع پر دولہا یا دلہن کو کلمے پڑھائے ہوں یا ان سے کلمے سنے ہوں نہ ہی چاروں اماموں اور محدثین سے ایسی کوئی بات منقول ہے۔ یہ محض ایک رسم ہے جو بعض علاقوں میں رائج ہے اور یوں بھی اس وقت ایک دو بار کلمہ پڑھا دینا اس کا کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا۔ جس نے جوانی تک کلمہ یاد نہیں کیا وہ نکاح کے موقع پر مولوی صاحب کے ایک دو بار پڑھانے سے کیسے یاد کرلے گا۔ باقی رہی وکیل کی بات تو اگر لڑکی دو گواہوں کے سامنے اپنے ولی یا وکیل کو نکاح کی اجازت دے دیتی ہے تو وکیل اس کی طرف سے ایجاب قبول کر سکتا ہے۔ مسلم شریف کی ایک روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الثیب احق بنفسها من ولیها والبکر یستاذنها ابوها فی نفسها واذنها صمتها[1]

---

[1] مسلم مترجم ج ۳ کتاب النکاح باب استئذان الثیب فی النکاح ص ۲۸

"بیوہ ولی کے مقابلے میں اپنے نفس کی زیادہ مالک ہے اور کنواری سے اس کا والد اجازت حاصل کرے اور اس کی خاموشی اجازت سمجھی جائے گی"

اس اجازت کے بعد والد یا ولی اس کی طرف سے ایجاب و قبول کر سکتا ہے لیکن اگر لڑکی سے دو گواہوں کے سامنے براہ راست ایجاب و قبول کرالیا جائے تو یہ بھی جائز ہے بلکہ بعض حالات میں یہ زیادہ بہتر اور مناسب ہوتا ہے۔

شادی کے لئے سود پر قرض لے سکتا ہوں؟

سوال: میں ایک نوجوان ہوں اور جس معاشرے میں رہتا ہوں وہاں بے شمار اسباب ہیں جو گناہ کی دعوت دیتے ہیں جن سے گھبراتا ہوں لیکن شادی کے مالی وسائل بھی نہیں ہیں تو کیا شادی کے لئے میں سود پر قرض لے سکتا ہوں؟

جواب: سود حرام ہے۔ قرآن نے اسے اللہ اور رسول ﷺ کے خلاف کھلی جنگ قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے کھلانے والے اور لکھنے والے نیز گواہوں سب پر لعنت بھیجی ہے۔ آپ جیسے بھائیوں کو رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان پر عمل کرنا چاہئے۔ آپؐ نے فرمایا:

یا معشر الشباب من استطاع منکم الباءة فلیتزوج و من لم یستطع فعلیه بالصوم فانه له وجاء[1]

"اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو شادی کی ضروریات پوری کر سکے وہ شادی کرے اور جو نہ کر سکے وہ روزہ رکھ لیا کرے جو اس کے لئے ڈھال کا کام دے گا۔"

حضور ﷺ کے اس فرمان پر عمل کرنے سے جہاں ایک طرف صبر کا حوصلہ پیدا ہوگا

---

[1] مسلم مترجم ج ۳ کتاب النکاح باب استحباب النکاح ص ۹

وہاں اللہ تعالیٰ اس کے لئے آسانیاں اور ذرائع بھی پیدا کر دے گا۔ جب ہم حلال ذرائع کیلئے تھوڑے پر قناعت کریں گے تو اللہ تعالیٰ یقیناً ہمارے لئے آسانیاں پیدا کرے گا۔ اسکا وعدہ ہے کہ ﴿وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ (الطلاق: ۲-۳) جو اللہ سے ڈر جاتا ہے اس کیلئے وہ خود راستہ بنا دیتا ہے اور اس جگہ سے اس کیلئے رزق مہیا کر دیتا ہے جہاں سے اسے وہم گمان بھی نہیں ہوتا۔

شادی سے قبل منگیتر کو دیکھنا جائز ہے؟

سوال: لندن سے محمد علی لکھتے ہیں کہ کیا شادی سے پہلے منگیتر یا جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہو اسے دیکھنا اور اس سے ملاقات کرنا جائز ہے اور کیا اس کے فوٹو منگوا کر دیکھے جا سکتے ہیں؟ شریعت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب: شرعی نکاح اور شادی سے پہلے کوئی عورت چاہے کسی کی منگیتر ہو یا اس سے شادی کا فیصلہ ہو چکا ہو وہ اجنبی اور غیر محرم ہے اس سے خلوت کرنا یا ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھنا جائز نہیں ہے۔ ہاں اس عورت کے والدین یا عزیزوں کی موجودگی میں اسے دیکھنا جائز ہے جس سے شادی کرنے کا خیال ہو۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی عورت سے تمہاری منگنی ہو جائے تو اسے نکاح کی غرض سے دیکھنا جائز ہے۔ ایک صحابی حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ انہوں نے ایک عورت سے شادی کا ارادہ کیا تو آپؐ نے انہیں حکم دیا کہ پہلے اسے دیکھ لیں۔ یہ چیز نکاح اور شادی کی کامیابی کے لئے معاون و مفید ہے۔

ان احادیث سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نکاح یا شادی کی غرض سے کسی عورت کو دیکھنے کی اجازت ہے یعنی ایسی عورت جس سے شادی کے سلسلے میں

بات چل رہی ہے اور یہی مسئلہ دوسری طرف کا بھی ہے یعنی عورت کے لئے شادی کی غرض سے مرد کو ان حدود کے اندر دیکھنا جائز ہے۔

لیکن یہاں ایک بات کا ذکر بہر حال ضروری ہے کہ اس غرض کے لئے مختلف عورتوں کو دیکھنا پسند کرنا یا ملاقاتیں کرنا کوئی مشغلہ بھی نہیں کہ پسند و ناپسند کرنے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا جائے بلکہ عورت یا مرد کا دیکھنا یہ تو بعد کا مرحلہ ہے شادی کے لئے اس سے پہلے بھی کچھ مراحل ہیں۔ دیکھنے کا تعلق تو ظاہری شکل و صورت سے ہے جب کہ اسلام میں ظاہری شکل و صورت سے زیادہ سیرت و کردار و اخلاق و عادات کی اہمیت ہے۔ اسی طرح تعلیم خاندانی تعلقات و روابط اور دوسرے کئی عوامل بھی ہیں۔ اگر والدین کے باہمی رابطے سے پہلے سارے مراحل طے ہو جاتے ہیں تو اس کے بعد پھر عورت و مرد کو ایک دوسرے کو دیکھنے یا ملنے کی بھی اجازت ہے اور پھر علیحدگی یا خلوت میں ملنے یا ملاقات کی اجازت نہیں۔

جہاں تک فوٹو کا مسئلہ ہے تو جیسا کہ میں نے پہلے تحریر کیا ہے کہ شکل و صورت کا قبول ہونا یہ آخری مرحلہ ہے۔ جب باقی معاملات میں اتفاق ہو جائے اور صورت کے قبول ہونے کی کمی باقی ہے تو ایسے حالات میں کوشش تو یہی کرنی چاہئے کہ پھر انہیں ایک دوسرے کو دیکھنے یا ملاقات کرنے کا موقع فراہم کیا جائے اور اگر یہ ناممکن ہو یا اس میں شدید مجبوریاں حائل ہوں تو پھر فوٹو کے ذریعہ بھی یہ ضرورت پوری کی جاسکتی ہے لیکن اس میں احتیاط بہر حال ضروری ہے کیونکہ عام حالات میں فوٹو بجائے خود جائز نہیں اور پھر اس میں کئی قسم کے مفاسد اور خرابیاں بھی آسکتی ہے اور اگر رشتے کی بات کامیاب نہ ہو تو بعض دفعہ یہ فوٹو فساد کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

ٹیلی فون پر نکاح کرنا جائز ہے؟

سوال: مغربی جرمنی سے نثار احمد پوچھتے ہیں کیا ٹیلی فون پر نکاح جائز ہے؟

جواب: ٹیلی فون پر نکاح کے جواز یا عدم جواز سے پہلے صحت نکاح کے سلسلے میں چند بنیادی باتوں کا جاننا ضروری ہے اور وہ ہیں ایجاب و قبول۔ دو گواہ اور حق مہر اور ولی کا ہونا۔ اب اگر فون کے ذریعہ یہ ساری شرطیں پوری کی جاسکتی ہیں تو نکاح درست ہوگا اور اگر فون پر ان شرطوں کا پورا کرنا ممکن نہیں تو پھر نکاح صحیح نہ ہوگا اور اس میں اہم ذمہ داری نکاح کرنے والے کی ہے اگر وہ گواہوں کے سامنے فون پر ایجاب و قبول کروالینے پر مطمئن ہے اور لڑکی یا لڑکے کی آواز فون پر پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہے یا دو گواہ آواز پہچان کر ایجاب و قبول کی تصدیق کردیتے ہیں تو نکاح درست ہوگا۔ مگر ایجاب و قبول کی صحیح اور یقینی شکل کے بغیر فون پر نکاح نہیں کیا جاسکتا اور ایسے معاملات میں احتیاط ضروری اور بہتر ہے۔ کیونکہ اگر مطلقاً یہ دروازہ کھول دیا جائے تو اس سے بے شمار خرابیاں اور مسائل پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے یہ ذمہ داری نکاح کرنے یا نکاح کی رجسٹریشن کرنے والے کی ہے کہ وہ کس طرح شرائط نکاح کی تکمیل کرکے فون پر نکاح کرواسکتا ہے۔

خفیہ نکاح جائز ہے؟

سوال: نکاح جس میں مرد عورت ایجاب و قبول کریں اور مہر کا تعین کریں مگر کسی تیسرے آدمی کو خبر نہ ہو یعنی گواہوں کے بغیر شادی کرلی۔ کیا اس طرح کا خفیہ نکاح درست ہوگا؟

جواب: ایسا نکاح جس میں ولی اور گواہ موجود نہ ہو اور میاں بیوی کے سوا کسی تیسرے آدمی کو اس کا علم تک نہ ہو' اس کے باطل ہونے پر فقہا امت کا اتفاق ہے کیونکہ گواہ اور اعلان نکاح یہ دونوں بنیادی ارکان ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے

فصل ما بين الحلال و الحرام الدف والصوت[1]

---

[1] سنن أبي داود للالباني جزء الثاني رقم الحديث ١٨٦٥

یعنی حلال و حرام میں فرق اعلان و اظہار ہے۔

جس نکاح میں اعلان یا جس کی عام شہرت نہیں ہو گی وہ باطل ہو گا۔ اس لئے مساجد میں نکاح کی سنت ادا کرنا بہتر اور افضل ہے تاکہ عام لوگوں کو اس کا علم ہو جائے اور پھر نکاح کا مقصد ایسے آزادانہ تعلقات ہیں جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی جبکہ خفیہ شادی نہ صرف شک و شبہ کا محل ہوتی ہے بلکہ بعد میں بے شمار فتنوں کا سبب بھی بنتی ہے۔ بہر حال وہی نکاح صحیح ہو گا جس کا باقاعدہ اعلان کیا جائے' ولی کی اجازت ہو اور وہ موجود ہو۔

کیا قریبی رشتہ داروں سے نکاح کرنا نقصان دہ ہے؟

سوال: لیور پول سے عبدالقادر دریافت کرتے ہیں کہ بعض لوگوں سے سنا ہے کہ ڈاکٹر اپنے قریبی رشتے سے شادی (کزن میرج) سے منع کرتے ہیں مثلاً چچا کی لڑکی یا ماموں کی لڑکی وغیرہ سے اور اس کے بارے میں ڈاکٹری اصول سے کچھ نقصان بھی بتاتے ہیں۔ اس بارے میں قرآن و حدیث کا حکم چاہیئے۔ اس مسئلے کو ذرا وضاحت کے ساتھ شائع کریں کیونکہ بہت سے لوگوں کے دماغ میں الجھن موجود ہے۔

جواب: مسلمانوں کے لئے راہ نمائی اور ہدایت کی اصل بنیاد قرآن و حدیث ہیں اور اس کے سامنے اصل اتھارٹی اللہ کا قانون ہے۔ دنیاوی طبی تحقیق کے ذریعے کسی قرآنی اصول کو ہر گز جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ طب کی تحقیق میں نئے نئے انکشافات آئے دن ہوتے رہتے ہیں جن میں جدید طبی تحقیق پرانی تحقیق کو کالعدم قرار دے دیتی ہے اور جدید طب میں پہلے دور کی طبی تحقیق کو فرسودہ اور لایعنی قرار دیا جا چکا ہے اس لئے ایک مسلمان کے لئے اصل بنیاد قرآن و سنت کی تعلیمات ہیں۔

اب جب ہم زیر غور مسئلے کا جائزہ قرآن کی تعلیم کی روشنی میں لیتے ہیں تو قرآن

نے واضح طور پر ان رشتوں کو جائز حلال قرار دیا ہے اور قریبی شادیوں کے بارے میں کسی ضرر یا نقصان کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں کیا۔ اب قرآنی نص کے سامنے کسی وقتی طبی تحقیق کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں دیکھئے سورہ احزاب کی آیت ۵۰ جس میں نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے حلال رشتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس میں چچا کی بیٹیوں ماموں کی بیٹیوں پھوپھی کی بیٹیوں اور خالہ کی بیٹیوں کا خاص طور پر نام لیا گیا ہے۔ اس کے بعد کیا کسی ڈاکٹری تحقیق کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

اس کے علاوہ سورہ نساء کی آیت ۲۲، ۲۳، ۲۴ کا مطالعہ کیجئے ان آیات میں ان رشتوں کا مفصل ذکر ہے جن سے نکاح کرنا حرام قرار دیا گیا ہے اگر کسی دوسرے قریبی رشتے سے نکاح حرام یا نقصان دہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ جو علیم و خبیر ہے اور اپنے بندوں کی فطری کمزوریوں کا واقف حال ہے وہ خود یہاں ان رشتوں کو بھی حرام کر دیتا۔ مگر ان ساری آیات کو پڑھنے کے بعد ایسی کوئی بات سامنے نہیں آتی۔ اس لئے محض ایک طبی مفروضے کی بنا پر یقین کر لینا مسلمان کی شان کے شایان نہیں۔

اور پھر خود طبی لحاظ سے بھی یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ دور حاضر میں بعض مسلم ڈاکٹروں نے جو اس کی تحقیق کی ہے اس میں اس خیال کو سرے سے باطل ثابت کیا ہے قریبی رشتہ داروں سے نکاح کرنے سے صحت یا نسل پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

لندن سے شائع ہونے والے عربی ہفت روزے المسلمون نے اپنی ۲۰ جون ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں ڈاکٹر کبارتی کی ایک تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ خیال **مکمل طور پر باطل ہے** کہ قریبی رشتہ داروں سے نکاح کرنے میں کوئی ضرر یا نقصان ہے۔ ڈاکٹر کبارتی نے جدید علوم کی روشنی میں اس نظریئے کو غلط ثابت کیا ہے۔

اس سلسلے میں بعض لوگ ایک روایت کا بھی ذکر کرتے ہیں جس کا معنی یہ ہے کہ قریبی رشتہ دار ایک دوسرے سے شادی نہ کریں۔ اس سے کمزور اور بیمار اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اول تو اس حدیث کا احادیث کی کتب صحیحہ میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ پھر یہ

نص قرآنی کے خلاف ہے۔ پھر امت کا عملی اور فکری اجماع چودہ سو سال سے مسلسل اس کی نفی کر رہا ہے اور پھر محدثین کی ایک بڑی جماعت نے اس حدیث کو موضوع اور من گھڑت قرار دیا ہے۔

رضاعت کی وجہ سے رشتہ نہیں ہو سکتا؟

سوال: برمنگھم سے محمد اکرم مرزا نے درج ذیل استفتاء بھیجا ہے۔

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے کے بارے میں کہ مسمی غلام حیدر صاحب نے پہلی شادی کی۔ ان کے ہاں لڑکی کلثوم پیدا ہوئی۔ دوسری شادی کی تو ان کے ہاں لڑکا طاہر پیدا ہوا جو اب جوان ہے۔ اب طاہر کی منگنی مسمات طلعت بی بی سے قرار پائی۔ طلعت نے بوجہ مجبوری مسمات کلثوم کا دودھ پیا تھا۔ اب چند اشخاص کا کہنا ہے کہ طلعت بی بی کا نکاح طاہر سے نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ اب بھائی بہن بن چکے ہیں۔ ازروئے قرآن و سنت کیا یہ نکاح جائز ہے؟

کچھ حضرات نے اس مسئلے کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے جو درج ذیل ہیں:

(الف) مسمات کلثوم نے اپنی خوشی سے لگاتار کئی دن کئی ہفتے یا کئی مہینے دودھ پلایا۔

(ب) کلثوم نے بوجہ مجبوری دودھ پلایا طلعت نے بکری کا دودھ بھی پیا اور کلثوم کا بھی اور کلثوم نے لگاتار نہیں بلکہ ٹکڑوں میں دودھ پلایا۔ اس پر بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمایئے۔

جواب: آپ نے سوال کی جو شکل بیان کی ہے اس کے مطابق طلعت اور طاہر کا رشتہ بہن بھائی کا نہیں بلکہ ماموں بھانجی کا بنتا ہے۔ کیونکہ طلعت بی بی نے کلثوم کا دودھ پیا ہے اس طرح طلعت بی بی کلثوم کی رضاعی بیٹی ہو گی اور طاہر کلثوم کا بھائی ہے لہٰذا وہ

طلعت کا ماموں ہوا کیونکہ اس نے طاہر کی بہن کلثوم کا دودھ پیا ہے۔

قرآن وحدیث کی رو سے ماموں اور بھانجی کا رشتہ نہیں ہو سکتا چاہے بھانجی کا رشتہ اس سے دودھ کی وجہ سے قائم ہوا ہے یا حسب ونسب کی وجہ سے اس میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

یحرم من الرضاعة ما یحرم من الولادة [1]

"کہ جو رشتے پیدائش یعنی نسب کی وجہ سے حرام ہوتے ہیں وہ دودھ کی وجہ سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔"

حضرت علیؓ سے جو روایت ہے اس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

ان اللہ حرم من الرضاع ماحرم من النسب [2]

کہ اللہ نے نسب کی وجہ سے جو رشتے حرام ٹھہرائے ہیں وہ رضاعت (دودھ پلانے) کی وجہ سے بھی حرام کردیے ہیں۔

چونکہ ماموں اور بھانجی کا رشتہ نہیں ہو سکتا اور صورت مذکورہ میں طاہر اور طلعت ماموں بھانجی بنتے ہیں لہٰذا ان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ طلعت نے کلثوم کا دودھ لگاتار نہیں پیا بلکہ وقفوں سے پیا یا کسی مجبوری کی وجہ سے کلثوم کا دودھ پلانا پڑا تو اصل مسئلہ میں اس تقسیم سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دودھ پلانے کی اصل مدت دو سال ہے۔ اس عرصے میں اگر ایک مرتبہ بھی طلعت نے کلثوم کا دودھ پی لیا ہے تو وہ طاہر کی رضاعی بھانجی بن جائے گی۔ قرآن نے جہاں دودھ پلانے کا ذکر کیا ہے۔ وہاں تھوڑے یا زیادہ وقفوں اور لگاتار کی تقسیم نہیں کی۔ اور فرمایا:

---

[1] ابن ماجه للالبانی جلد اول ابواب النكاح۔ باب یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب ص ۳۵۶ رقم الحدیث ۱۹۴۴

[2] ترمذی مترجم ج ۱ ابواب الرضاع باب ما جاء یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب ص ۴۱۰

﴿وَ اُمَّهَاتُكُمُ الّٰتِيْ اَرْضَعْنَكُمْ﴾ (النساء : ۲۳)

کہ تمہاری وہ مائیں بھی حرام ہیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا۔

اس میں مقدار یا وقفوں کا ذکر نہیں۔ بعض نے پانچ یا دس دفعہ پینے کا ذکر کیا ہے لیکن جمہور علماء کے نزدیک جن میں امام مالکؒ' امام ابو حنیفہؒ' امام ثوریؒ اور امام احمد بن حنبلؒ شامل ہیں انہوں نے یہی کہا ہے کہ قلیل و کثیر دونوں سے رضاعت ثابت ہو جاتی ہے اور قرآن کے دلائل بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔

اور اگر صورت مذکورہ میں طلعت نے کلثوم کا دودھ پانچ یا دس مرتبہ پیا ہے' چاہے اس نے وقفوں سے ہی کیوں نہ پیا ہو' پھر رضاعت کے ثبوت میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔ اس لئے صورت مسئولہ میں طلعت اور طاہر کے اس رضاعی رشتے کی وجہ سے نکاح درست نہیں ہو گا۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

کیا میں دوسری شادی کر سکتا ہوں؟

سوال: ایک صاحب جنہوں نے اپنا نام تحریر نہیں کیا درج ذیل سوال کا جواب شائع کرنے کے لئے لکھا ہے:

میری عمر اس وقت پچاس سال کے قریب ہے اور میں ایک اچھے سرکاری محکمے میں ملازم ہوں۔ میری شادی پندرہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی اور میری بیوی مجھ سے پندرہ سال بڑی ہے۔ ایک لڑکے اور لڑکی کی پیدائش کے بعد وہ اکثر بیمار رہتی ہے اور اب وہ فرائض زوجیت ادا کرنے کے قابل نہیں ہے جب کہ میں اللہ کے فضل سے صحت مند ہوں اور شادی کے فرائض ادا کرنے کے قابل ہوں تو کیا میں دوسری شادی کر سکتا ہوں؟ شریعت میں اس کے لئے کیا شرط ہے؟

جواب: آپ کی مشکل کا اصل سبب تو دونوں کی عمر میں اتنا بڑا تفاوت ہے اور یہ وہ غلطی ہے جو آج سے ۳۵ سال پہلے آپ نے یا آپ کے والدین نے کی۔ بہر حال اسلام کے نزدیک اصل چیز پاک دامنی اور عفت ہے۔ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے اس بات سے ڈرتا ہے کہ اگر اس نے شادی نہ کی تو وہ کسی گناہ میں مبتلا ہو جائے گا یا وہ صبر نہیں کر سکے گا تو اس کے لئے شادی کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہیے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے درمیان عدل وانصاف سے کام لے اور کسی ایک طرف ایسا جھکاؤ اختیار نہ کرے جو ظلم وزیادتی بن جائے اور نہ ہی دونوں کے درمیان مستقل فساد جھگڑے کے حالات پیدا ہونے دے ایسے حالات میں شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

آپ اس بارے میں اپنی بیوی سے مشورہ بھی کر سکتے ہیں اور اسے اعتماد میں بھی لے سکتے ہیں وہ آپ کی مجبوری کا احساس کرتے ہوئے یقیناً آپ کا ساتھ دے گی۔ بہر حال شرعی طور پر اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔

گناہ کا ارتکاب کیا' اب شرمندہ ہوں۔

سوال: مسٹر ایم۔ آر سوال کرتے ہیں کہ برطانیہ میں قیام کے دوران میری ایک انگریز لڑکی سے واقفیت ہو گئی۔ میں نے حسن اخلاق اور حسن سلوک سے متاثر ہو کر اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اس دوران اسے اپنے ملک ساتھ لے گیا اور اس خیال سے کہ آئندہ میری بیوی ہو گی' اس سے جنسی تعلق بھی قائم کرتا رہا۔ اب مجھے یہ احساس ہوا کہ میں نے گناہ کا ارتکاب کیا اور اس پر شرمندہ بھی ہوں۔ کیا میرے اوپر زنا کی شرعی حد واجب ہے؟

جواب: اسلام میں کسی عورت سے شرعی نکاح سے پہلے جنسی تعلق قائم کرنا حرام اور کبیرہ گناہ ہے اگرچہ کسی عورت سے نکاح کی نیت ہی کیوں نہ ہو اور اس سے باقاعدہ منگنی بھی ہو چکی ہو۔ وہ اس کے لئے غیر محرم ہی ہو گی اور اس سے خلوت اختیار کرنا یا اس کے ساتھ جنسی گفتگو کرنا' کسی محرم کے بغیر اس سے ملنا یا اس کے ساتھ سفر کرنا یہ سب ناجائز ہیں۔ جنسی تعلق تو سنگین جرم ہے۔ جہاں تک اس فعل پر زنا کی شرعی حد کا تعلق ہے تو جب تک اس طرح کے فعل کی اطلاع حاکم یا عدالت کو نہیں پہنچتی اس وقت تک حد نہیں ہو گی اور جو آدمی سچے دل سے توبہ کرلے گا اللہ تعالیٰ اسے معاف کرنے والا ہے۔ کیونکہ اللہ نے اس گناہ پر پردہ ڈال دیا اور توبہ کا موقع بھی دے دیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوری توبہ کرنی چاہئے اور آئندہ ایسے گناہوں سے دور رہنے کا عہد کرنا چاہئے۔

نکاح کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں؟

سوال: ساؤتھ آل لندن سے قیوم عظیمی صاحب نے جو لکھا ہے اس کا مفہوم یہ ہے نکاح کے لئے کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے؟

جواب: اسلام میں نکاح کے لئے تین چیزیں ضروری ہے۔ اول مرد و عورت کا باہمی ایجاب و قبول' حق مہر اور گواہوں کی موجودگی۔

اگر یہ تین شرطیں پوری ہوں تو نکاح ہو جاتا ہے۔ بعض حالات میں ولی (لڑکی کا وارث) کا ہونا بھی ضروری ہے۔ قاضی کی موجودگی نکاح میں شرط نہیں ہے۔ جہاں تک خطبے کا تعلق ہے تو یہ سنت ہے اور نکاح مسنون طریقے سے ہو تو بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا (یعنی خطبے کے ابتدائی کلمات) عربی میں ہوں تو باعث برکت ہے اور پھر اس میں تین قرآنی آیات ہیں وہ بھی عربی میں ہیں۔ اس کے علاوہ خطبہ کسی زبان میں

بھی دیا جا سکتا ہے۔ خاص کر حقوق الزوجین کے بارے میں ضروری باتوں کا بیان اس زبان میں ہونا چاہئے جو سب سمجھتے ہوں۔

بہرحال سارا خطبہ عربی میں پڑھنا ضروری نہیں۔ بلکہ قرآن و حدیث کے الفاظ عربی میں ہوں تو بہتر ہے۔ شرط یہ بھی نہیں۔ اگر عربی میں نہ بھی پڑھیں تب بھی نکاح ہو جائے گا۔ لیکن مسنون طریقہ افضل ہے۔

مہر سے متعلقہ چند سوالات

بتیس روپے شرعی حق مہر؟

سوال: مہر کتنی قسم کا ہوتا ہے؟ کون سا مہر کب دیا جاتا ہے؟ جیسا کہ مجھے معلوم ہے کہ طلاق کے بعد ہی مہر کی بات ہوتی ہے۔ جب میاں بیوی اچھی طرح رہ رہے ہوں اس وقت بھی مہر دینا واجب ہوتا ہے؟

جواب: حق مہر نکاح کے ارکان میں سے ہے اس کے بغیر نکاح درست نہیں ہوگا۔ اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یا تو نکاح کے وقت بیوی کو ادا کر دیا جائے یا پھر مقرر کر دیا جائے اور بعد میں خاوند کسی وقت بھی بیوی کے مطالبے پر ادا کرے گا۔ اگر بیوی مہر معاف کر دیتی ہے تو اسے اختیار ہے۔ بصورت دیگر یہ بیوی کا حق ہے اور جب تک ادا نہیں ہوگا خاوند پر یہ قرض رہے گا۔

سوال: کیا اسلام میں نکاح کے موقع پر حق مہر کی رقم معین ہے بعض علماء کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تقریباً بتیس روپے حق مہر مقرر کیا ہے اور یہ شرعی مہر ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: رسول اللہ ﷺ سے کسی حدیث میں یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے مہر کی رقم معین کی اور آپؐ کے زمانے میں اس کے برعکس یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ نے

ایک شخص سے نکاح کے موقع پر فرمایا کہ تیرے اس مہر کے لئے گھر میں کوئی چیز ہے تو لاؤ وہ گیا اور خالی ہاتھ واپس آگیا اور کہنے لگا اللہ کے رسول میرے پاس تو ایک چادر کے سوا کچھ نہیں آپ نے فرمایا لوہے کی انگوٹھی ہی لے آؤ۔ اسے وہ بھی میسر نہ تھی تو پھر آپ نے فرمایا تجھے قرآن کا کچھ حصہ یاد ہے؟ اس نے کہا ہاں فلاں فلاں سورت یاد ہے تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے سورتیں یاد کرادو' تمہارا یہی حق مہر ہے۔

کیا وقت نکاح مہر کی ادائیگی لازم ہے؟

سوال: والتھم سٹو لندن سے محمد اقبال و محمد رفیق صاحبان لکھتے ہیں

لفظ ''مہر'' کے معنی اور وجہ تسمیہ کیا ہے؟

مہر کی ادائیگی کے بارے میں دو مکاتب فکر ہیں۔ اولاً یہ کہ وقت نکاح ادائیگی مہر لازمی قرار دی گئی ہے ورنہ تکمیل نکاح نہیں قرار پاتی۔ دوم یہ کہ وقت طلاق ادائیگی مہر شرط طلاق ہے۔ صحیح صورت کیا ہے تفصیل سے لکھیں۔

جواب: مہر کے لغوی معنی ہیں بدلہ اور عوض اور شرعی طور پر اس مال کو کہا جاتا ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا سکے اور خرچ بھی کر سکے۔ یہ معجّل بھی ہوتا ہے اور مؤجل بھی۔ یا دوسرے الفاظ میں۔

اسلام میں وہ چیز جو خاوند نکاح کے سلسلے میں بیوی کو پیش کرتا ہے جس سے وہ جلد یا بدیر فائدہ حاصل کرتی ہے اسے مہر کہا جاتا ہے۔ مہر کے علاوہ اس کے لئے لفظ صداق استعمال ہوا ہے۔ بعض فقہاء نے اس کے لئے ۹ نام ذکر کئے ہیں۔ دراصل یہ وہ عطیہ ہے جو خاوند کی طرف سے بیوی کو دیا جاتا ہے اور یہ وہ ہدیہ ہے جسے وہ پیش کرتا ہے بعض نے اس کا شرعی معنی یہ کیا ہے کہ وہ مال جو خاوند کے لئے ادا کرنا ضروری ہے اس فائدے کے مقابلے میں جو وہ بیوی سے حاصل کرتا ہے۔ بعض نے اس فائدے کا

معاوضہ قرار دیا ہے جو خاوند اٹھاتا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ معاوضہ نہیں بلکہ ایک ہدیہ اور عطیہ ہے جو خاوند کے لئے ضروری ہے کہ اسے ادا کرے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً﴾ (النساء: ٤) کہ اپنی عورتوں کو ان کے مہر عطیہ کے طور پر ادا کرو اس لئے یہ ہے تو عطیہ مگر اختیاری نہیں بلکہ واجب ہے اور بہتر اور افضل یہی ہے کہ خاوند بیوی سے پہلی ملاقات سے قبل اسے ادا کر دے جیسا کہ حضرت فاطمہؓ کے نکاح کے وقت رسول اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ کو نصیحت فرمائی تھی۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کیا مہر کی ادائیگی نکاح کی صحت کے لئے شرط ہے اور نکاح کے وقت اس کا ادا کرنا ضروری ہے' اس مسئلے میں یوں تو فقہاء کی مختلف آراء ہیں لیکن قرآن وسنت کی روشنی میں جو بات درست معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نکاح کے وقت اس کی ادائیگی شرط نہیں ہے۔

ارشاد ربانی ہے ﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ (البقرہ: ٢٣٦)

یعنی تم عورتوں کو طلاق دے سکتے ہو ایسی حالت میں بھی جب نہ تو تم نے انہیں ہاتھ لگایا اور نہ ہی مہر مقرر کیا۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مہر مقرر کئے بغیر نکاح کے وقت اس کا نام لئے بغیر نکاح ہو چکا تھا اسی لئے تو ایسی صورت میں بھی طلاق کا حق دیا۔ ظاہر ہے کہ نکاح ہو گا تب ہی طلاق ہو گی۔ ہاں بعد میں اسے مہر بہر حال دینا ہو گا۔ اگر مہر کی مقدار پر اتفاق نہ ہو سکے تو پھر خاندان کی یا اس طرح کی عورتوں کے جو مہر مقرر ہیں ان کی مثال سامنے رکھ کر مہر ادا کیا جائے گا۔

جہاں تک طلاق کے وقت مہر کی ادائیگی کا مسئلہ ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ نکاح کے فوراً بعد طلاق دے دی اور دونوں کے درمیان ازدواجی تعلق بھی قائم نہیں ہوا یعنی مباشرت نہیں کی تھی تو ایسی صورت میں عورت نصف مہر لینے کی

حق دار ہو گی یعنی اگر مہر مئوجل تھا اور نقد ادا نہیں کیا گیا تھا تو اب طلاق کے موقع پر یہ شرط ہے کہ وہ نصف مہر ادا کرے اور اگر معجّل تھا یعنی نکاح کے وقت ادا کر دیا گیا تھا تو عورت صرف نصف مہر رکھنے کی مجاز ہو گی۔ باقی نصف واپس لوٹانا ہو گا۔

قرآن حکیم میں اس کی تصریح اس آیت میں کر دی گئی ہے۔

﴿وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾ (البقرۃ : ۲۳۷)

یعنی اگر تم نے عورتوں کو طلاق دی اس سے پہلے کہ تم ان سے مباشرت کرو اور تم نے مہر مقرر کر دیا تھا ایسی حالت میں جو تم نے مقرر کیا اس کا نصف ادا کرنا ہو گا اور اگر ایسی صورت پیش آتی ہے کہ نکاح کے فوراً بعد طلاق کی نوبت آجاتی ہے نہ اس نے مباشرت کی اور نہ ہی مہر کی کوئی رقم مقرر ہوئی تھی ایسی صورت میں خاوند کو اپنی استطاعت کے مطابق کچھ مدد کرنا ہو گی۔ اس کے علاوہ کسی چیز کا دینا اس کے لئے بھی ضروری نہیں ہے۔

اس کی تصریح سورہ بقرہ کی دوسری آیت میں کر دی گئی ہے۔

"اگر تم عورتوں کو ایسی حالت میں طلاق دو کہ نہ تم نے انہیں ہاتھ لگایا تھا (یعنی مباشرت نہیں کی تھی) اور نہ ہی کوئی مہر مقرر ہوا تھا ایسی صورت میں وسعت والے کو اپنی حالت کے مطابق اور تنگی والے کو اپنی حالت کے مطابق عورت کو خرچ دینا ہو گا اور یہ فائدہ اچھے انداز میں پہنچانا چاہئے۔" (البقرہ:۲۳۶)

اور اگر مباشرت کے بعد طلاق دیتا ہے تو ایسی صورت میں طلاق کے وقت پورا مہر ادا کرنا ضروری ہے اور اگر مہر مقرر نہیں ہوا تھا تو ایسی صورت میں اسے مہر مثل یعنی خاندان میں اس طرح کی عورتوں کی مثال سامنے رکھتے ہوئے مہر ادا کرنا ہو گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ واقعہ بھی اس رائے کی تائید کرتا ہے کہ نکاح کے وقت مہر کی ادائیگی شرط نہیں ہے کہ ان کے پاس ایک سائل یہ سوال لے کر آیا کہ عورت کا خاوند فوت ہو گیا اور اس کا مہر ادا نہ ہوا تھا اب اس کی وراثت میں سے اس کے

مہر کا کیا حکم ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک ماہ تک اس پر غور فرماتے رہے اور آخر میں فرمایا: اس بارے میں اپنی رائے کے مطابق کچھ کہوں گا اگر صحیح ہو تو اللہ اور رسول کی جانب سے اور اگر خطا ہوئی تو وہ میری اپنی خطا ہوگی اور پھر فرمایا: اس عورت کے لئے مہر مثل ہوگا۔ یہ سن کر مجلس سے دو آدمی کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا ہم اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کے بارے میں جس کا نام بروعہ بنت واشق تھا یہی فیصلہ فرمایا تھا۔ اس پر حضرت ابن مسعود بہت خوش ہوئے۔

بہر حال مقصد یہ ہے کہ نکاح کے وقت مہر کی ادائیگی شرط نکاح نہیں بلکہ اس موقع پر مقرر بھی نہیں کیا تب بھی نکاح ہو جائے گا اور طلاق کی نوبت آئے تو پھر اس کے لئے مہر کا ادا کرنا شرط ہے۔

اسلام میں جہیز کی کیا اہمیت ہے؟

سوال: والتھم سٹو لندن سے محمد رفیق لکھتے ہیں جہیز کی اہمیت کیا ہے اور اسلام نے اس کی کہاں تک اجازت دی ہے؟

جواب: شادی کے وقت والدین کی طرف سے جب لڑکی کو خاوند کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے تو والدین یا دوسرے عزیز و اقارب کی جانب سے اسے کچھ اشیاء یا تحائف دیئے جاتے ہیں جو وہ ساتھ لے کر اپنے خاوند کے گھر جاتی ہے۔ والدین یا دوسرے رشتہ داروں کی جانب سے لڑکی کے لئے ان چیزوں کے دیئے جانے کا جہاں تک تعلق ہے تو بنیادی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں۔ ہمارے ہاں اس موقع پر جو کچھ دیا جاتا ہے اسے جہیز بھی کہا جاتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ الزہراؓ کو جب حضرت علیؓ کے ساتھ رخصت کیا تو انہیں کو گھر میں استعمال کی چند ضروری چیزیں دی تھیں جن میں

کچھ کپڑے' تکیہ' پیالہ' چکی' مشکیزہ اور کچھ دوسرے برتن شامل تھے اور یہ چیزیں آپ نے حضرت علیؓ کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی دی تھیں۔

! اگر خاوند آسودہ حال ہے اور اس کی طرف سے کسی چیز کا مطالبہ بھی نہیں ہے تو والدین اگر بغیر جہیز کے بھی اپنی بیٹی کو رخصت کر دیتے ہیں تو یہ بھی جائز ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ اپنی حیثیت کے مطابق اپنی بیٹی کو سامان دے سکتے ہیں جس کی خاوند کے گھر اسے ضرورت بھی پڑتی ہے۔

جہاں تک برصغیر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ہاں جہیز کی مروجہ شکل کا تعلق ہے تو اس میں بے شمار منکرات شامل ہو گئی ہیں اور بعض حالات میں اسے ناجائز بھی قرار دیا جاسکتا ہے خاص طور پر جس انداز سے جہیز کے سامان کی نمائش کی جاتی ہے اور پھر اسے بڑائی اور تفاخر کا ذریعہ بھی سمجھا جاتا ہے اس سے بے شمار اخلاقی و معاشرتی برائیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جھوٹی شہرت کے لئے خاندانوں اور برادریوں کے درمیان ایک دوڑ شروع ہو جاتی ہے اور پھر لڑکے والوں کی طرف سے جہیز کے لئے مطالبے اور شرائط بھی آتی ہیں۔ حتیٰ کہ سامان کی فہرست پیش کی جاتی ہے کہ یہ اشیاء اگر پوری کرو گے تو شادی کریں گے بعض اوقات ان کی توقع کے مطابق جہیز نہ لانے کی وجہ سے لڑکی واپس بھی بھیج دی جاتی ہے۔

یہ ایک خالص ہندوانہ رسم ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لعنت کے خلاف جہاد کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں یہ صورت حال ہو وہاں تو خوش حال لوگوں کو مناسب جہیز دے کر سادہ طریقے سے اپنی بیٹی کو رخصت کرنا چاہئے تاکہ یہ رسم جو غریب لوگوں کے لئے ایک مصیبت بن چکی ہے' وہ اس سے چھٹکارہ حاصل کر سکیں۔

مروجہ شکل کا ایک دوسرا پہلو بھی قابل ذکر ہے جس کی وجہ سے جہیز منکرات میں شامل ہو چکا ہے وہ فضول خرچی ہے کہ لوگ بلاضرورت محض ناموری کے لئے جہیز کی شکل میں اتنے سامان دے دیتے ہیں کہ بعض اوقات وہ ساری عمر بے کار پڑا رہتا ہے اور

اس کے استعمال کی نوبت بھی نہیں آتی۔

اسلام فضول خرچی کی سخت الفاظ میں مذمت کرتا ہے۔ لوگوں کے باہمی حقوق تو ادا نہیں کرتے، مستحقین اور مساکین کی مدد کے لئے مال خرچ نہیں کرتے لیکن خاندان اور برادری میں محض ناک اونچی کرنے کے لئے جہیز کی رسم کے لئے بے پناہ مال خرچ کرتے ہیں۔ یہ شکل بہر حال جائز نہیں ہے۔ سادہ طریقے سے بغیر نمائش کے خاوند کی ضرورت اور اپنی استطاعت کو سامنے رکھتے ہوئے اگر کچھ چیزیں شادی کے موقع پر بیٹی کو دی جاتی ہیں تو یہ جائز ہے۔

چہلم کے دن نکاح خوانی

سوال: محمد افتخار صاحب مانچسٹر سے دریافت کرتے ہیں کیا چہلم کے دن نکاح خوانی جائز ہے؟

جواب: چہلم کے دن نکاح خوانی کے بارے میں آپ نے جو دریافت فرمایا ہے اس کا ایک اجمالی جواب ہے اور ایک تفصیلی۔ اجمالی جواب تو یہ ہے کہ چہلم کے موقع پر نکاح خوانی جائز ہے اور قرآن و حدیث میں ایسا کوئی حکم یا اشارہ تک نہیں ملتا کہ میت کے انتقال کو چالیس دن پورے ہوں تو اس دن اس کی اولاد یا عزیز واقارب کی شادی نکاح جائز نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی درج ذیل ہے:

سب سے پہلے تو ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہے کہ چہلم کی رسم جو آج کل بعض لوگوں میں رائج ہے اس کا شریعت میں کوئی اصل یا ثبوت ہے؟ رسول اللہ ﷺ کا فرمان صحابہ کرامؓ کا عمل یا "چاروں اماموں" میں سے کسی کا قول ہے جس سے چہلم کا جواز ملتا ہو؟ ہرگز ایسی کوئی چیز نہیں ملے گی۔ درحقیقت یہ ساری رسمیں جنہیں تیجا ساتواں دسواں یا چالیسواں کہا جاتا ہے اور جنہیں میت کا سوگ منانے یا اسے ایصال ثواب کے

لئے کیا جاتا ہے۔ یہ ساری بعد کی رسمیں ہیں۔ سلف صالحین کے دور میں ایسی کوئی رسم نہیں تھی اور اب بھی ان کا زیادہ زور پاکستان وہندوستان میں ہی ہے دوسرے ملکوں میں تو لوگ شاید ان کے ناموں سے بھی واقف نہ ہوں۔ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے خوشی اور غمی کے اظہار کے جو طریقے اور مواقع بتائے ہیں ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے اور سوگ اس انداز سے منانا جس سے پیغمبر اسلام نے روکا ہو کیسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایصال ثواب کے لئے اپنی طرف سے دن کا تعین کرنا اور اس کی خاص شکل قائم کرنا بھی جائز نہیں۔ اس سلسلے میں درج ذیل دلائل آپ کے لئے قابل غور ہیں:

آنحضرت ﷺ کی حدیث ہے لا يحل لامراة تومن بالله واليوم الاخر ان تعد على ميت فوق ثلاث ليال الاعلى زوج اربعة اشهر و عشرا[1]

یعنی کسی مومن کے لئے یہ جائز ہی نہیں کہ وہ میت کا تین دن سے زیادہ سوگ منائے سوائے اس عورت کے جس کا خاوند فوت ہو گیا ہو وہ چار مہینے دس دن تک سوگ منائے گی۔ اس لئے سوگ کے لئے محفلیں منعقد کرنا یا جمع ہونا خلاف شریعت ہے۔ رہی بات ایصال ثواب کے لئے جمع ہونا تو اس کی مروجہ شکل بھی غلط ہے۔ مخصوص دن کیلئے احباب ورفقاء اور برادری کے لوگوں کو جمع کر کے قرآن خوانی کرانا پھر سب کا مل کر کھانے کھانا شریعت کی روح ہی کے خلاف ہے۔ غرباء ومساکین یا مستحقین کو مال دینا یا کھانا کھلانا یقیناً باعث اجر وثواب ہے لیکن اپنے لوگوں کا جمع ہو کر اہل میت کے ہاں سے کھانا کھانا اور یہ رسمیں منعقد کرانا چاہے میت کے وارث یتیم اور غریب ہی کیوں نہ ہوں بالکل غیر شرعی فعل ہے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

حنفی فقہ کی مشہور کتابوں میں بھی ان اعمال کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ فتاویٰ بزازیہ مستمل شرح منیۃ المصلی، در مختار اور شامی میں ان رسموں کو مکروہ اور بدعت قرار دیا گیا۔ علامہ شامی نے اس لئے انہیں ناجائز قرار دیا ہے کہ یہ کام اکثر دکھلاوے اور شہرت

[1] ترمذی مترجم ج ۱ أبواب الطلاق باب ماجاء فی عدة المتوفی عنها زوجها ص ٤٣١

کے لئے کئے جاتے ہیں۔اس لئے اس سے دور رہنا چاہئے اور پھر موجودہ دور میں تو یہ رسمیں بالکل شادی اور میلے کے انداز سے کی جاتی ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی سفر السعادت میں لکھتے ہیں: عادت نبویؐ نبود کہ برائے میت در غیر وقت نماز جمع شوند و قرآن خوانند و ختمات خوانند نہ بر سر گور و نہ غیر آں وایں مجموع بدعت است و مکروہ نعم تعزیت اہل میت و تسلیہ و صبر فرمودن سنت و مستحب است اما ایں اجتماع مخصوص روز سوم وارتکاب تکلفات دیگر و صرف اموال بے وصیت از حق یتامی بدعت است و حرام۔

(ترجمہ) برصغیر کے نامور محدث شیخ عبدالحق دہلوی فرماتے ہیں کہ عہد نبوی میں یہ عادت نہ تھی کہ نماز کے علاوہ میت کے لئے جمع ہوتے ہوں اس کے لئے (مخصوص شکل سے) قرآن خوانی کرتے ہوئے ختم پڑھتے ہوں' نہ قبر کے علاوہ کسی اور جگہ' یہ سب بدعت ہے۔ہاں میت کے ورثاء سے تعزیت کرنا انہیں تسلی دینا اور انہیں صبر کی تلقین کرنا سنت اور مستحب ہے۔ مگر یہ مخصوص تیسرے دن کا اجتماع اور پھر ان میں بے جا تکلفات کرنا' میت کی وصیت کے بغیر یتیموں کے مال کو اس طرح خرچ کرنا' نہ صرف بدعت بلکہ حرام ہے۔

تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ چہلم وغیرہ کا کوئی شرعی ثبوت نہیں ہے۔ یہ کچھ لوگوں نے محض کھانے پینے کے ذرائع بنائے ہوئے ہیں تو پھر اس موقع پر نکاح خوانی یا کسی دوسری تقریب کو کس طرح ناجائز کہا جا سکتا ہے۔ کسی چیز کو ناجائز یا ثواب واجر کا ذریعہ ثابت کرنے کے لئے کتاب وسنت اور عمل صحابہ سے دلیل ضروری ہے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ میت کے لئے چالیس دن کے بعد نکاح خوانی وغیرہ کا جواز عام ہے لیکن اگر کسی عورت کا خاوند فوت ہوا ہے تو اس کا نکاح چالیس دن کے بعد بلکہ چار مہینے دس دن تک جائز نہیں ہے۔ چار مہینے دس دن کی عدت گزرنے کے بعد پھر وہ نکاح ثانی کر سکتی ہے۔

محرم میں شادی کرنا جائز ہے؟

سوال: ایڈنبرا سے محمد سلیم دریافت کرتے ہیں کہ کیا محرم کے مہینے میں شادی کرنا' نئے کپڑے پہننا' خوشی کی کوئی محفل منعقد کرنا جائز ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب: محرم الحرام اسلامی سال کا پہلا مہینہ ہے۔ اس کی اس خصوصیت کے علاوہ رسول اکرم ﷺ نے اس مہینے کی جو فضیلت بیان فرمائی ہے وہ اس کی دسویں تاریخ کے روزے کی ہے اور اس کے ساتھ ۹ یا ۱۱ تاریخ کے روزے کا بھی ذکر ہے اور رسول اکرم ﷺ رمضان کے روزے فرض ہونے سے پہلے یوم عاشورہ کا روزہ پابندی سے رکھتے تھے۔ محرم کی دسویں تاریخ کو رسول اکرم ﷺ کے بعد اہم تاریخی واقعات ہوئے ہیں ان میں سیدنا حضرت حسین ابن علیؓ کی کربلا میں شہادت کا سانحہ عظیمہ بھی ہے لیکن چونکہ یہ واقعہ رسول اکرم ﷺ کے سالہا سال بعد میں وقوع پذیر ہوا اس لئے اس کی مناسبت سے یا اس کی یاد میں کسی کام یا رسم کو کوئی شرعی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن بدقسمتی سے محرم یا یوم عاشورا کی اصل فضیلت جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اس پر تو کوئی عمل نہیں کرتا لیکن بے شمار غلط رسومات اور توہم پرستیاں عوام میں ان دنوں کی مناسبت سے پھیلی ہوئی ہیں۔ شیعہ تو خیر شیعہ ہیں لیکن نام نہاد اہل سنت کی بڑی تعداد بھی ان بدعات ورسومات کی پابندی کرتی ہے۔ برصغیر پاک وہند میں محرم کے مہینے میں شادی نکاح سے مکمل پرہیز کیا جاتا ہے بلکہ بعض علاقوں میں تو یہ عجیب و غریب رسم ہے کہ دو عیدوں یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے درمیانی دنوں میں بھی شادی نکاح کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور بعض لوگ اسے دو عید کہہ کر منحوس قرار دیتے ہیں۔ دراصل دین سے دوری اور جہالت کی وجہ سے مسلمان طرح طرح کی

توہم پرستیوں میں مبتلا ہو چکے ہیں اور قرآن و سنت کی صحیح راہ نمائی نہ ہونے کی وجہ سے لوگ انہیں دین و شریعت سمجھ کر ان پر عمل کر رہے ہیں۔

غرض محرم کے مہینے میں شادیاں نہ کرنا یا جو کرے اسے برا سمجھنے کی قرآن و حدیث اور چاروں اماموں اور اہل علم سے کوئی سند یا ثبوت نہیں یہ ایک جاہلانہ اور بے اصل خیال ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ٹھیک ہے قرآن و حدیث سے تو ایسی بات کا کوئی ثبوت نہیں لیکن جس مہینے میں اتنا بڑا حادثہ ہوا اور خاندان نبوت کو رسوا کرنے کی کوشش کی گئی اور ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا اس مہینے میں خوشی کا جشن منانا یا شادی کرنا کون سی عقل مندی ہے۔ اگر جذباتی انداز سے مرثیہ خوانی کر کے اس دلیل کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تو شاید کچھ لوگ اس کو مان لیں۔ لیکن اگر دلائل و براہین کی روشنی میں اس بات کا جائزہ لیا جائے تو درج ذیل وجوہ کی بنا پر اس میں کوئی وزن نہیں ہے۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں سوگ منانے یا ماتم کرنے کے سلسلے میں بھی ہماری مکمل راہ نمائی کی گئی ہے۔ لہٰذا اس کی حدود بھی ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں متعین کر سکتے ہیں۔ قرآن میں صرف ان خواتین کو چار مہینے دس دن سوگ کی اجازت دی گئی ہے جن کے خاوند فوت ہو جائیں۔ خود رسول اکرم ﷺ نے اس کی وضاحت فرمائی کہ میت کا سوگ تین دن سے زیادہ منانے کی کسی کو اجازت نہیں سوائے اس عورت کے جس کا خاوند فوت ہو جائے۔ اب ان تعلیمات کے بعد اس امر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ صدیوں سے پہلے رونما ہونے والے واقعے کا سوگ آج مختلف طریقوں سے منایا جائے۔

(۲) اگر بڑی بڑی شخصیتوں کے انتقال اور شہادت کے واقعات پر سوگ کرنا ضروری ہوتا تو خود رسول اکرم ﷺ حکم فرماتے۔ آپ کی حیات مبارکہ میں حضرت حمزہؓ بڑی بے دردی سے شہید کیے گئے۔ ایک موقع پر ۷۰ قرآن کے عالم دھوکے سے شہید کر دیئے گئے مگر رسول اللہ ﷺ نے سال کے بعد ان کی موت کے سوگ میں نہ

جلوس نکالے نہ تعزیئے اور نہ ہی شادی نکاح پر اس مہینے میں کوئی پابندی لگائی اور نہ ہی بعد میں صحابہ کرامؓ نے اس چیز کو اختیار کیا۔

(۳) سرور دو عالم ﷺ کے انتقال کا واقعہ معمولی نہیں۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے موقع پر صحابہ کرامؓ اور خاندان اہل بیت کی جو حالت ہوئی اس کی تفصیلات سے سیرت و تاریخ کی کتب بھری پڑی ہیں۔ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ دکھ و غم کی تصویر بنے ہوئے تھے مگر اس کے باوجود ربیع الاول کے جس مہینے میں آپ کے بارے میں نہ سنی کچھ کہتے ہیں نہ شیعہ بلکہ اکثر لوگ اسی مہینے میں جس میں حضور ﷺ کی وفات ہوئی حضورؐ کی پیدائش کی خوشی میں جشن اور عید مناتے ہیں۔ تو کیا حضرت حسینؓ کا مقام حضور ﷺ سے بھی زیادہ ہے کہ محرم میں ہم ان کی شہادت کی وجہ سے نکاح اور خوشی کی تقریبات کی بھی ممانعت کر دیں۔ لہٰذا یہ محض جاہلانہ رسم ہے دین میں اس کا کوئی اصل نہیں۔

اس طرح دو عیدوں کے درمیان شادی نہ کرنے کا خیال بھی محض توہم پرستی ہے۔ اس کے خلاف مہم چلانی چاہیئے تاکہ لوگ ان بے جا پابندیوں سے آزاد ہو سکیں۔

کیا عیسائی اور یہودی عورت کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے؟

سوال: حاجی محمد لطیف ٹڈلز برو سے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات قرآن و حدیث کی روشنی میں دریافت کرتے ہیں۔

(۱) اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ (عیسائیوں) کی عورتوں سے نکاح تو جائز ہے جیسا کہ بعض علماء دین قرآنی آیات کا حوالہ دے کر ثابت کرتے ہیں۔ کیا نکاح کر لینے کے بعد انہیں مسلمان کر لینا شرط نہیں ہے؟ اور اگر وہ اپنے مذہب پر قائم رہ سکتی ہیں تو

پھر اگر کسی مسلمان کی عیسائی بیوی یا یہودی عورت اپنے مروجہ عقیدے یا رواج و عادات کے مطابق شراب اور خنزیر کھا پی لیتی ہے اور بوائے فرینڈ بھی رکھے اور اس کے ساتھ دیگر غیر شرعی کام بھی کرتی رہے تو کیا مسلمان خاوند پر کوئی گناہ نہ ہوگا؟ اگر گناہ ہے تو پھر نکاح کیسے جائز ہوگا۔ کیونکہ گناہوں سے بچنے کے لئے تو شریعت تشکیل دی گئی۔ بعض علماء دین احادیث کے حوالوں سے فرماتے ہیں کہ ایک عورت چار آدمیوں کو جہنم میں لے جائے گی۔ تو کیا ایسی عورت اس سے مستثنیٰ ہے یا بصورت دیگر ایسی احادیث کا کوئی مقام نہیں؟

(۲) کیا آج کل کے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ عیسائی) مشرکین ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو مشرکین عورتوں سے مسلمان کا نکاح کیسے جائز ہے؟

(۳) کیا آج کل کے اہل کتاب اس زمرے میں آتے ہیں جن سے قرآن نے نکاح جائز قرار دیا ہے یا اس وقت کے اہل کتاب آج کل کے اہل کتاب سے مختلف تھے؟

(۴) کیا نزول قرآن کے وقت اہل کتاب مشرکین نہیں تھے اور آج کل کے اہل کتاب کی طرح شراب اور خنزیر کھاتے پیتے نہ تھے اور تین خداؤں یعنی تثلیث کے قائل نہ تھے؟

(۵) کیا آج کل کے اہل کتاب کی عورت سے نکاح کرنے سے پہلے کوئی عمل یا شرط لازمی ہے جس کے بغیر نکاح جائز نہیں؟

(۶) مشرکین کی تعریف کیا ہے؟ ہم نے تو سنا تھا کہ وہ شخص جو خدا پر ایمان بھی رکھتا ہو مگر اس کے ساتھ ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرتا ہو اسے مشرک کہتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں مگر بتوں کی پرستش اس لئے کرتا ہوں کہ وہ خدا تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ یا یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے یا چھوٹے خدا (نعوذ باللہ) ہیں یعنی اللہ کی خدائی میں شریک ہیں تو یہ ہوا شرک جو آج کل کے یہود و نصاریٰ کر رہے ہیں؟

جواب: (ا)بنیادی طور پر اہل کتاب یعنی یہود اور عیسائی سے شادی کرنے کی اجازت کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے لیکن کون سے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے' اس بارے میں سلف کے دو قول ہمارے سامنے ہیں۔

ایک یہ کہ اہل کتاب سے مراد یہاں وہ ہیں جو تثلیث کا عقیدہ نہ رکھتے ہوں۔ حضرت عیسیٰؑ حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا نہ کہتے ہوں' ان کی عورتوں سے تو نکاح جائز ہے لیکن اگر وہ یہ عقیدہ رکھتے ہوں تو پھر وہ مشرک ہیں اور مشرک عورتوں سے نکاح حرام ہے۔اس لئے اس طرح کے اہل کتاب کی عورتوں سے بھی نکاح حرام ہے۔ اس قول کی تائید میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ قول بھی پیش کیا جاتا ہے جسے امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے کہ "لا اعلم شرکا اعظم من ان تقول ربھا عیسیٰ"[1] کہ حضرت عیسیٰ کو خدا بنا لینے سے بڑا شرک اور کیا ہو سکتا ہے۔دوسرا قول یہ ہے کہ اہل کتاب سے چاہے ان کے عقائد کیسے بھی ہوں ان سے شادی حرام تو نہیں مگر اس میں کراہت ضرور ہے اور اسے پسند نہیں کیا گیا۔اس سلسلے میں حضرت عمر فاروق کا یہ فرمان پیش کیا جاتا ہے کہ جب حضرت حذیفہؓ نے ایک یہودی عورت سے شادی کی تو حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ "خل سبیلھا" اسے فوراً الگ کر دیں تو انہوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا اتزعم انھا حرام فاخلی سبیلھا کیا آپ مجھے اس لئے چھوڑنے کا حکم دے رہے ہیں کہ یہ حرام ہے ؟ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا لا ازعم انھا حرام ولکن اخاف ان تعاطلوا المومنات منھن میں حرام تو نہیں سمجھتا لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ اس طرح تم مومن عورتوں میں دلچسپی لینا چھوڑ دو گے۔

ایک روایت میں ہے آپؓ نے کہا کہ جب مسلمان عیسائی یا یہودی عورتوں سے شادی کرنا شروع کر دیں گے تو پھر مسلم عورتوں کا کیا بنے گا اس لئے میں یہ پسند نہیں کرتا۔

---

[1] فتح الباری ج ۱۰ کتاب الطلاق باب قولہ تعالی و لا تنکحوا المشرکات ص ۵۲۲ رقم الحدیث ۵۲۸۵

امام ابن کثیرؒ نے ابن جریرؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ بنیادی طور پر اہل کتاب عورتوں سے نکاح کرنے کے جواز پر تقریباً اتفاق ہے۔

مختلف اقوال کے دلائل کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن میں جہاں کتابی عورتوں کے ساتھ نکاح جائز قرار دیا گیا ہے وہاں اس شرط کا ذکر نہیں کہ وہ تثلیث یا ابن اللہ کے عقیدے نہ رکھتی ہوں۔ بلکہ جواز کی اصل علت ان کا اہل کتاب ہونا ہے چاہے وہ حضرت عزیر یا حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا سمجھیں۔ لیکن جب تک وہ الہامی کتابوں اور رسولوں پر ایمان رکھتی ہیں ان سے نکاح جائز ہے کیونکہ اس دور میں بھی جب قرآن کی یہ آیات نازل ہوئی تھیں عیسائیوں کے یہ عقائد بہر حال معروف تھے۔

ہاں البتہ اس آیت میں کچھ اور شروط ہیں جن کا پورا ہونا بہت ضروری ہے۔ آیت کا پہلا لفظ ہی یہ ہے "والمحصنات" یعنی اہل کتاب کی محصنات تمہارے لئے حلال ہیں اور محصنات کا معنی ہے پاک دامن' یعنی وہ یہودی یا عیسائی عورتیں جو کردار کے لحاظ سے پاک دامن ہوں اور شرم و حیا کے زیور سے آراستہ ہوں۔ وہ آوارہ' بدکردار اور شمع محفل بننے والی عورتیں نہ ہوں۔ جن سے تعلقات کا آغاز گناہ سے ہو اور پھر انجام نکاح ہو۔ ایسی عورتیں "محصنات" سے خارج ہیں اور یہ پہلی اور بنیادی شرط ہے۔

دوسری شرط مرد کے بارے میں ہے کہ ﴿غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ﴾ (المائدۃ : ۵) مرد بھی نہ تو فحاشی کا ارتکاب کرنے والے ہوں اور نہ ہی ان سے خفیہ تعلقات رکھنے والے ہوں یعنی ان سے شادی سے قبل اعلانیہ یا خفیہ برائی کا تعلق قائم نہ ہو۔ اس کے علاوہ مرد دینی طور پر اس قدر پختہ بھی ہو کہ کتابیہ سے شادی کرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو اسلام پر قائم رکھ سکے۔ ایسے مردوں کو تو کسی حالت میں عیسائی عورتوں سے شادی کی اجازت نہیں دی جا سکتی جو پہلے ہی کمزور ایمان والے ہیں اور شادی کے بعد ایمان کی باقی پونجی بھی اس عورت کی نذر کر دیں اور

اپنی اولاد کو بھی عیسائی بنادیں۔

جیسا کہ حاجی صاحب نے لکھا ہے کہ وہ عورت جو حرام کھاتی پیتی ہے اور اپنے دوست بھی رکھتی ہے اور دیگر خلاف شریعت کام بھی کرتی ہے اور اس کا نہ صرف مرد پر گناہ ہوگا بلکہ ایسی عیسائی عورت سے کسی مسلمان کو سرے سے شادی ہی نہیں کرنی چاہئے۔

اسی طرح اس عورت سے بھی شادی ہرگز جائز نہیں جو عیسائی کہلاتی ضرور ہے لیکن وہ نہ خدا کو مانتی ہے نہ کسی نبی پر ایمان رکھتی ہے اور نہ کسی مذہب اور کتاب پر یقین رکھتی ہے اور ایسی عورت اہل کتاب میں شمار نہیں ہوگی۔

(۲) اس سوال کا جواب پہلے حصے میں آگیا ہے کہ شرک کے کام کرنے یا عقیدے رکھنے کے باوجود اگر آج کل کے عیسائی یا یہودی خدا' نبی' مذہب اور کتاب کو مانتے ہیں تو وہ اہل کتاب ہوں گے کیونکہ کسی رسول کے ماننے اور کسی آسمانی کتاب کی طرف نسبت کرنے کی وجہ سے ہی تو انہیں اہل کتاب کہا گیا۔

(۳) رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی اہل کتاب کی اکثریت کے وہی عقائد تھے جو آج ہیں۔

(۴) اس بارے میں شروع میں وضاحت کردی ہے کہ ان عقائد اور اعمال کے باوجود کتاب اور نبی کی طرف نسبت کرنے کی وجہ سے اسلام نے ان کی حیثیت دوسرے مشرکین اور کفار سے الگ رکھی ہے۔ کیونکہ دوسرے مشرک اور کافر سرے سے کسی الہامی دین کے قائل ہی نہیں اور کوئی کتاب چاہے (تحریف شدہ ہی ہو) ان کے پاس نہ تھی۔

(۵) مشرکین کی تعریف جو سوال میں لکھی گئی ہے وہ تقریباً درست ہے۔ یہود و نصاریٰ کے کفر و شرک کے باوجود ان سے مختلف معاملہ کرنے کی اصل وجہ ان کا اہل کتاب ہونا ہے۔اس سے ان کے کفر و شرک کے اعمال کی نفی نہیں ہوتی۔

اہل کتاب سے نکاح کرنا جائز ہے؟

سوال: مغربی جرمنی سے جناب فرید مانجرا لکھتے ہیں: ''کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلے میں کہ ایک مسلمان موجودہ زمانے میں اہل کتاب (عیسائی کیتھولک فرقہ کی) لڑکی سے شادی کر سکتا ہے؟ شریعت اسلامیہ اس کی اجازت دیتی ہے؟ براہ کرم اس کا جواب مفصل عنایت فرمائیں اور شرائط بھی واضح فرمائیں۔

جواب: ایک مسلمان مرد عیسائی یا یہودی عورت سے نکاح کر سکتا ہے یا نہیں' اس موضوع پر اس سے پہلے متعدد بار ''صراط مستقیم'' میں لکھا جاچکا ہے۔ چونکہ یورپ میں آنے والے مسلمانوں کے لئے یہ ایک اہم معاشرتی مسئلہ بن چکا ہے اور آئے دن انہیں ایسے حالات سے واسطہ پڑتا رہتا ہے جس میں اس طرح کے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسلئے ایک بار پھر ہم قدرے تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اس مسئلے پر مسلمانوں کی جو آراء مشہور ہیں وہ تین قسم کی ہیں:

اول: اہل کتاب (یہودی' عیسائی) کی عورتوں سے نکاح مطلقاً حرام ہے' کیونکہ آج کل کے عیسائی اور یہودی اہل کتاب نہیں بلکہ مشرک ہیں اور مشرکوں سے نکاح کی حرمت قرآنی نصوص سے ثابت ہے۔

دوم: عیسائی اور یہودی عورتوں سے نکاح مطلقاً جائز ہے اور اس کے لئے کوئی شرط نہیں۔ قرآن کریم نے اس کی بلا شرط اجازت دی ہے۔

سوم: قرآن نے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے اس لئے اس کے جواز کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے لئے چند شرائط کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔

جہاں تک پہلی رائے کا تعلق ہے تو وہ اس لئے درست نہیں کہ قرآن نے بہر حال

اہل کتاب سے نکاح کی اجازت دی ہے اور وہ اس لئے ہے کہ اللہ اور رسولوں اور الہامی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان صفات کی وجہ سے وہ دوسرے مشرکوں سے الگ ہیں اور جن عقائد کی بنا پر انہیں مشرک ٹھہرایا گیا یہ عقیدے وہ اس وقت بھی رکھتے تھے جب قرآن میں اہل کتاب سے نکاح کے جواز کے بارے میں آیات نازل ہوئیں۔

دوسری رائے بھی اس لئے درست نہیں کہ اہل کتاب کی عورتوں سے مطلقاً نکاح کی اجازت اس لئے نہیں دی جاسکتی کیونکہ اگر اس میں مسلمانوں اور اسلام کا نقصان ہے یا خود مرد کے عیسائی ہونے کا خطرہ ہے تو پھر اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ حضرت عمرؓ نے اسی لئے بعض صحابہؓ کو سختی سے منع کردیا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ:

> "میں اسے حرام نہیں سمجھتا لیکن اس کے باوجود اس کی اجازت اس لئے نہیں دے سکتا کہ اگر یہ دروازہ کھل گیا تو مسلمان عورتوں کے حقوق پامال ہونے کا خطرہ ہے"

اس لئے ان تینوں آراء میں تیسری رائے صحیح' معتدل اور متوازن ہے یعنی نکاح جائز ہے لیکن بعض شرائط کے ساتھ۔

جواز کے بارے میں جو آیت قرآنی بطور دلیل پیش کی جاتی ہے اس کے اندر بھی بعض شرائط کا ذکر ہے۔ یہ سورہ مائدہ کی آیت ہے

﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ﴾(المائدہ:۵)

ایک شرط تو اس آیت کے پہلے لفظ میں "المحصنا ت" ہے کہ اہل کتاب کی محصنات تمہارے لئے حلال ہیں یعنی پاک دامن عورتیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ یہودی اور عیسائی عورتیں جو بدکردار ہوں یا فاحشہ اور آوارہ ہوں ان سے نکاح جائز نہیں۔ دوسری شرط خود اس مرد کے بارے میں ہے جو کتابیہ عورت سے نکاح کر رہا ہے کہ ولا متخذی اخدان کہ مرد نہ تو زناکار ہوں اور نہ ایسی عورتوں سے خفیہ تعلقات رکھنے والے ہوں یعنی نکاح سے قبل اعلانیہ یا خفیہ ایسی عورت سے کوئی ناجائز

تعلق نہ ہو۔ کیونکہ اس سے بدکاری کے جواز کا دروازہ کھلے گا اور اس فحش و منکر سے نفرت ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس شرط کی پابندی ضروری ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ مرد اپنے دین اور عقیدے پر پختگی کے ساتھ قائم ہو۔ اگر صورت حال یہ ہے کہ اسے خود اپنے دین کے مبادی کا بھی علم نہیں اور یہ خطرہ ہے کہ عیسائی عورت اسے اپنے مذہب میں لے جائے گی یا اسے اسلام سے اور دور کر دے گی اور بعد میں اولاد پر بھی مرد سے زیادہ اس عورت کا اثر ہو گا تو ایسے مرد کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ کتابیہ سے شادی کرے۔

چوتھی شرط یہ بھی ہے کہ یہ عورت عیسائیوں اور یہودیوں کے معروف عقائد پر کاربند ہو۔ اگر کوئی عورت عیسائی تو کہلاتی ہے لیکن خدا کا انکار کرتی ہے کسی رسول اور کسی الہامی کتاب پر ایمان نہیں رکھتی تو ایسی عورت سے نکاح جائز نہ ہو گا۔

اسی طرح بعض علماء نے ایسے حالات میں بھی کتابیہ سے نکاح جائز نہیں کیا جب مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان سخت عداوت کی فضا ہو یا حالت جنگ میں ہوں کیونکہ ایسے حالات میں یہ خطرہ ہے کہ ان عورتوں کے ذریعے مسلمانوں کے راز دشمنوں تک پہنچ جائیں اور یہ عورتیں مسلمانوں کو شکست دینے کے لئے دشمنان اسلام کے آلہ کار کا کردار ادا کریں۔ اسی لئے اکثر ائمہ نے عمومی حالات میں کراہت کے ساتھ جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

مصر کے مرحوم مفتی شیخ محمد شلتوت نے یہاں ایک بڑی اہم بات کہی ہے:

"اذا ضعف الرجال وجب المنع"

اذا کان اللہ قد حرم علی المسلمة ان تتزوج بالکتابی صونا عن التاثر بسلطان زوجها وقوامته علیها فان الاسلام یری ان المسلم اذ شذ عن مرکز الطبیعی فی الاسرة بحکم ضعفه القومی والقی بمقالید امره بین یدی زوجة غیر المسلمة وجب منعه من التزویج بالکتابیة و

یوجب فی الوقت نفسه علی لحکومة التی تدین بالاسلام ومبادته بالزوجة و تفار علی قومیتها وشعائرها فی ابنائها ان تضع لهولاء الذین ینسلخون عن مرکزهم الطبیعی فی الاسرة حدا یردعهم عن غیهم"

وہ اس عنوان کے تحت "جب مرد کمزور ہوں تو مکمل ممانعت ہے" لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے جب مسلمان عورت کے لئے اہل کتاب مرد سے نکاح حرام قرار دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر مسلم خاوند اس پر غالب ہو گا اور اس کا اس پر حکم چلے گا تو اس لئے اسلام میں جو مرد اسلامی خاندانی مرکز سے دور ہو گیا کیوں کہ اس کا قومی و ملی جذبہ ماند پڑ گیا ہے اور اس نے اپنے معاملات ایک غیر مسلم عورت کے سپرد کر دیئے ہیں تو اس کے لئے کتابی عورت سے نکاح مکمل طور پر منع ہے۔ ایسے حالات میں ایسی حکومت جو اپنے بیٹوں کے سلسلے میں اپنی قومیت اور اپنے شعائر کے ازدواجی اصولوں کی پابندی کرنے والی ہے' اس پر فرض ہے کہ وہ ان لوگوں کے لئے غیر مسلموں سے شادی کی کوئی حد مقرر کرے جو اسلامی طبیعی خاندانی مرکز سے نکلنا چاہتے ہیں"

بہر حال بنیادی طور پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے لیکن ان شرائط کی پابندی ضروری ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اسلام تو مسلمان عورتوں سے رفیقہ حیات کے انتخاب میں سخت ہدایات دیتا ہے کہ نیک صالح اور باکردار عورتوں سے نکاح کرو تو ظاہر ہے کہ اہل کتاب جو غیر مسلم ہیں ان کی عورتوں سے نکاح کی کھلی چھٹی کیسے دے سکتا ہے۔ اس لئے صحیح بات یہی ہے کہ اذا اضعف الرجال و جب المنع کہ جب مرد کمزور ہو جائیں۔ (عقیدے ودین میں) تو پابندی ضروری ہے۔

کیا مسلم عورت غیر مسلم مرد سے نکاح کر سکتی ہے؟

سوال: سری سے محمد افضل گرجاکھی لکھتے ہیں (۱) اہل کتاب سے نکاح جائز ہے تو اس کا قرآن اور حدیث سے ثبوت دیں کہ کس وجہ سے جائز ہے؟ (۲) کیا واقعی نبی ﷺ کی حیات میں کسی نے غیر مسلم عورت سے نکاح کیا تھ؟ (۳) اگر مرد غیر مسلم عورت سے نکاح کر سکتا ہے تو کیا مسلم عورت بھی غیر مسلم مرد سے نکاح کر سکتی ہے؟ (۴) ایک مسلم مرد اور مسلم عورت کا نکاح ہوا ہے پھر عورت عیسائی ہو جاتی ہے تو کیا نکاح نہیں ٹوٹتا یا آدمی عیسائی ہو جاتا ہے تو کیا اس کے ساتھ مسلم عورت ویسے ہی رہ سکتی ہے؟

جواب: (۱) غیر مسلم عورت سے مرد کا نکاح قطعی حرام ہے' ہاں اہل کتاب غیر مسلم عورت سے بعض شروط کے تحت نکاح جائز ہے اس لئے یہاں صرف غیر مسلم کا نہیں بلکہ اہل کتاب کا لفظ استعمال کرنا چاہئے اور اس موضوع پر "صراط مستقیم" میں ایک سے زائد مرتبہ لکھا جاچکا ہے کہ جمہور علماء اور اماموں کا مسلک یہی ہے کہ اہل کتاب عورت سے نکاح جائز ہے۔ ان کی دلیل کی بنا پر سورہ مائدہ کی یہ آیت کریمہ ہے

﴿وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (المائدة : ٥)

یعنی اہل کتاب کی پاک دامن عورتیں بھی تمہارے لئے حلال ہیں۔

حضرت حذیفہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ جب انہوں نے حضرت عمر فاروق کے زمانے میں ایک یہودی عورت سے نکاح کیا تو حضرت عمرؓ نے انہیں اس عورت کو چھوڑ دینے کا حکم لکھا اور جب حضرت حذیفہؓ نے اس کی وضاحت چاہی تو فرمایا میں اسے حرام تو نہیں سمجھتا لیکن اس میں مومن عورتوں کے لئے ضرر و نقصان ہے۔ اس لئے علیحدگی کا حکم دے رہا ہوں۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر حضرت عمرؓ اسے جائز سمجھتے تھے اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ غیر مسلم ہونے کے باوجود مسلمان اور اہل کتاب کے درمیان ایک چیز مشترک ہے وہ اللہ پر ایمان' بعض رسولوں پر ایمان' آخرت پر ایمان اور آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور شاید اسی اشتراک اور قربت کی وجہ سے یہ گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس لئے اگر صحیح اہل کتاب ہونے' پاک دامن ہونے اور خود مسلم مرد کے صحیح مسلمان ہونے جیسی اہم شرائط پوری ہوں تو یہ نکاح جائز ہے اور اگر یہ شرائط پوری نہ ہوں یا کچھ اور خطرات ہوں تو پھر جیسے حضرت عمرؓ نے حضرت حذیفہؓ کو منع کر دیا تھا آج بھی اس سے روکا جا سکتا ہے۔

بعض نے اہل کتاب سے نکاح کو کراہت کے ساتھ جائز قرار دیا ہے اور بعض ائمہ نے اسے بالکل حرام بھی کہا ہے اور ان کی دلیل بخاری شریف میں مروی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول ہے:

لا اعلم شرکا اعظم من ان یقول ربها عیسی[1]

کہ میرے نزدیک اس سے بڑا شرک کیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو رب مان لیا جائے یعنی ان کے نزدیک اہل کتاب بھی مشرکین میں داخل ہیں اس لئے ان سے نکاح حرام ہے۔

لیکن جیسا میں نے تحریر کیا ہے کہ جمہور کے نزدیک اصل دلیل قرآن کی آیت ہے اس لئے کڑی شرائط کے باوجود جواز سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) میرے علم میں ایسا کوئی واقعہ نہیں کہ کسی نے نبی ﷺ کی حیات مبارکہ میں کسی اہل کتاب عورت سے نکاح کیا ہو۔

(۳) جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اگر مرد اہل کتاب عورت سے نکاح کر سکتا ہے تو پھر مسلم عورت اہل کتاب مرد سے کیوں نہیں کر سکتی۔ یوں تو اس کی

---

[1] فتح الباری ج ۱۰ کتاب الطلاق باب قوله تعالی ولا تنكحوا المشركات ص ۵۲۲ رقم الحديث ۵۲۸۵

مختلف حکمتیں ہو سکتیں ہیں لیکن جو بات آسانی سمجھ میں آجاتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کا اپنا ایک مخصوص نظام ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے جن میں عائلی زندگی بھی شامل ہے اور مجموعی لحاظ سے مرد کو عورت پر فوقیت دی گئی ہے اور عام طور پر عورت مرد کے احکام کے تابع ہوتی ہے اور زندگی کے بیرونی مسائل میں زیادہ تر مرد ہی حصہ لیتا ہے اور اسلام میں مرد کو عورت کے سلسلے میں جو خاص حقوق حاصل ہیں ظاہر ہے اگر مسلم عورت غیر مسلم مرد سے شادی کرے گی تو اسلام غیر مسلم کتابی مرد کو مسلمان عورت پر فوقیت کے اختیارات نہیں دے سکتا اس طرح ایک مسلمان غیر مسلم کا زیر نگیں ہو جاتا ہے اور قرآن نے اس بارے میں واضح طور پر کہہ دیا کہ:

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ (نساء: ١٤١)

کہ اللہ ہرگز کفار کو مومنین پر فوقیت کا راستہ نہیں دے سکتا کیونکہ اسلام دین غالب ہے یہ مغلوب ہو کر صحیح حالت میں نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح مسلمان بھی مغلوب رہ کر اسلام پر صحیح طور پر کاربند نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے واضح کر دیا کہ:

﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (صف: ٩)

اور پھر ایک غیر مسلم ایک مسلمان عورت کے دین کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ وہ اس کی کتاب کا انکار کرتا ہے اور اس کے نبی کی رسالت کو جھٹلاتا ہے ایسے ماحول میں میاں بیوی کے درمیان اسلامی طرز پر زندگی گزارنا ممکن نہیں ہوتا۔

اور جب مسلمان مرد عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کرتا ہے تو وہاں یہ خطرات و مضرات اس لئے نہیں ہوتے کہ اولاد کی نسبت اسلامی شریعت میں والد کی طرف ہوتی ہے۔ عورت باہر سے آکر ایک اسلامی خاندان میں شامل ہو جاتی ہے اور اس طرح مسلمان خاوند کے توسط سے اسلام اس کتابی عورت پر غالب و حاکم رہتا ہے اس کے برعکس جب مسلمان عورت اہل کتاب غیر مسلم مرد کے ساتھ نکاح کرے گی تو وہ اسلامی ماحول سے دور ہو جائے گی۔ ایک غیر اسلامی فیملی میں اسے ضم ہونا پڑتا ہے اور پھر اس کے بچوں پر اس کے والد کے اثرات ہوں گے اور وہ فوقیت جو اسلام چاہتا ہے

ایسی صورت میں قائم نہیں رہ سکتی۔اسی لئے ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کمزور مسلمان کسی اہل کتاب کی عورت سے نکاح کرتا ہے اور اس وجہ سے خود اس کے ایمان کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور غلبہ واثر کی بجائے وہ مغلوب ہو کر یا متاثر ہو کر زندگی بسر کرتا ہے تو ایسے مسلم مرد کے لئے بھی غیر مسلمہ عورت سے شادی جائز نہ ہو گی۔

(۴) مسلمان مرد اور عورت کے نکاح کے بعد ان میں سے ایک کے اسلام چھوڑ دینے کی شکل میں نکاح باقی نہیں رہے گا۔اگر عورت عیسائی ہو جاتی ہے تو مرد کے لئے جائز نہیں کہ اسے اپنے نکاح میں رکھے اور اگر مرد عیسائی ہو جائے تو مسلم عورت اس کے عقد میں رہ نہیں سکتی اور یہاں سبب بالکل مختلف ہے اور وہ ہے ارتداد یعنی یہ مرتد ہونے کی شکل ہے اگر صحیح اسلامی حکومت ہو تو ایسے لوگوں کی سزا قتل ہے جو اس طرح اسلام سے باغی و مرتد ہو جاتے ہیں لیکن نکاح تو کسی صورت میں باقی نہیں رہے گا کیونکہ ایسی عورت اہل کتاب میں شامل نہیں ہوئی بلکہ دین اسلام سے مرتد ہونے کی وجہ سے اس کے لئے یہ حکم ہے۔

احکام طلاق

غیر مسلم جج کا طلاق کے بارے میں فیصلہ؟

سوال: لندن سے محمد امین تحریر کرتے ہیں کہ میرے ایک دوست کی بیوی نے یہاں کے قانون کے مطابق کورٹ کے ذریعے طلاق حاصل کرلی ہے لیکن اس کے خاوند نے نہ تو اسے طلاق دی اور نہ بیوی نے طلاق مانگی بلکہ انگلش طلاق کے بعد اس نے دوسری جگہ شادی بھی کرلی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ شریعت کے مطابق وضاحت فرمائیں۔

جواب: کوئی بھی غیر مسلم شخص کسی کا ولی نہیں بن سکتا اور نہ ہی غیر مسلم جج اسلامی شریعت و قانون کے مطابق شادی کو ختم کر سکتا ہے۔ اگر کوئی خاوند بیوی کو ناجائز تنگ کرتا ہے اور محض پریشان کرنے کے لئے اسے طلاق نہیں دیتا تو بیوی کسی بھی اسلامی سینٹر یا ادارے سے رجوع کر سکتی ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں اس سلسلے میں کافی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں اس لئے برطانیہ میں علمائے کرام نے اس مسئلے کو خاطر خواہ طریقے سے حل کیا ہے اور مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام کی نمائندہ تنظیم "اسلامی شریعت کونسل" قائم کی جاچکی ہے جو عائلی مسائل کے حل کے لئے گزشتہ چار سال سے نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے۔ اسلامی طلاق و خلع وغیرہ جیسے مسائل کے سلسلے میں خواتین اس کونسل سے رجوع کر سکتی ہیں۔

یہاں ایک اور بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اصولی طور پر تو کوئی غیر مسلم جج یا عدالت اسلامی نکاح نہ توڑ سکتی ہے نہ طلاق کا حکم دے سکتی ہے لیکن اگر خاوند خود

اس طرح کی عدالت کے سامنے جاکر یا تحریری طور پر طلاق دیتا ہے تو پھر انگلش طلاق کے ساتھ اسلامی طلاق بھی خود بخود ہو جائے گی۔

شادی شدہ عورت سے نکاح ہو سکتا ہے؟

سوال: ایک شخص نے ایک ایسی عورت سے شادی کی ہے جس کو اس کے پہلے خاوند نے طلاق نہیں دی اور پہلے خاوند سے اس کے چار بچے بھی ہیں مگر دوسرا آدمی اس کو ورغلا کر لے گیا اور اب بیوی بنا کر رکھے ہوئے ہے اور کہتا ہے میں نے اس سے شادی کر لی ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا حکم کیا ہے؟

جواب: جس عورت کو باقاعدہ شرعی طلاق نہ دی گئی ہو اس سے نکاح یا شادی نہیں کی جا سکتی جس شخص نے اس شادی شدہ عورت کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے اور اس کو اپنی بیوی سمجھ رہا ہے یہ دونوں زنا جیسے بدترین گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ شرعی لحاظ سے اس شادی شدہ عورت کی سزا رجم یعنی سنگسار ہو گی۔ اگر یہ مرد جو اس عورت کو ورغلا کر لایا ہے شادی شدہ ہے تو اس کی سزا بھی رجم ہو گی۔ اگر وہ شادی شدہ نہیں تو پھر اس کو ۱۰۰ کوڑے لگائے جائیں گے۔

بد قسمتی سے اسلامی ملکوں میں طویل مدت سے اسلامی قوانین پر عمل معطل ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں شرعی حدود کو توڑنے کی اس قدر جرات پیدا ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے گناہوں میں مبتلا کرنے والے اور بھی کئی عوامل ہیں جن میں عورت کی لا محدود آزادی عورت و مرد کا باہمی اختلاط اور پردے سے فرار شامل ہیں۔

جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت؟

سوال: محمد سعید رگبی سے دریافت کرتے ہیں ایک عورت کی شادی ہوئی اور میاں

بیوی کے آپس کے تعلقات قائم ہونے سے پہلے ہی خاوند کی وفات ہو جاتی ہے تو ایسی عورت کے لئے عدت ہو گی؟ اور اگر ہو گی تو کتنا عرصہ ہو گی؟

جواب: کسی عورت کو طلاق ہو جائے یا اس کا خاوند فوت ہو جائے دونوں صورتوں میں عدت کی الگ الگ مدت مقرر ہے اور قرآن حکیم نے اس بارے میں پوری وضاحت کر دی ہے۔ مطلقہ عورت کی عدت تو تین حیض ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ﴾ (البقرة:٢٢٨)

اور طلاق شدہ عورتیں تین حیض تک انتظار کریں یعنی یہ مدت تین ماہ ہو گی۔

اسی طرح جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں ان کے بارے میں قرآن میں یوں بیان کیا گیا۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا﴾ (البقرة:٢٣٤)

اور وہ لوگ جو تم میں سے فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں چار ماہ دس دن انتظار کریں گی۔

تو گویا وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو گیا اس کی عدت چار ماہ دس دن ہو گی۔

اور اسی طرح وہ عورتیں جو حیض سے کبر سنی کی وجہ سے مایوس ہو چکی ہیں یا جنہیں ابھی حیض نہیں آیا ان کی عدت تین مہینے ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے

﴿وَالّٰئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰئِيْ لَمْ يَحِضْنَ﴾ (الطلاق : ٤)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں ان کے معاملہ میں اگر تم لوگوں کو کوئی شک لاحق ہے تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور یہی حکم ان کا ہے جنہیں ابھی حیض نہ آیا ہو۔

یہ تین طریقے قرآن و حدیث میں مذکور ہیں۔ لہٰذا جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے چاہے ان کے تعلقات قائم ہوئے تھے یا نہیں اس کی عدت بہر حال چار ماہ دس دن ہو گی اور قرآن نے اس عدت کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں صرف بیویاں کہا ہے اور ظاہر ہے جب نکاح ہو جاتا ہے تو عورت اس کی زوجیت میں آجاتی ہے چاہے تعلقات قائم ہوں یا نہ ہوں۔

عدت گزارنے والی عورت کام پر جاسکتی ہے؟

سوال: لندن سے مسز شمیم لودھی لکھتی ہیں "خاوند کے فوت ہو جانے پر بیوی کو عدت کے دن پورے کرنے ہوتے ہیں اور کافی شرائط بھی ہیں کہ وہ یہ نہیں کر سکتی' وہ نہیں کر سکتی' باہر نہیں جاسکتی۔ اگر عورت کے اوپر سب گھر بار کا بوجھ پڑ جائے اور مجبوراً اسے باہر نکلنا بھی پڑتا ہے جیسے اس ملک میں ایک دو ہفتے کے بعد عورت کام پر جانے لگتی ہے۔ اگر نہ جائے تو سارے گھر کا نظام رک جاتا ہے۔ تو ایسی حالت میں عورت کے لئے کیا حکم ہے؟ ذرا روشنی ڈالئے' بہت سی بہنوں کا سوال ہے۔

جواب: اگر کسی عورت کا شوہر فوت ہو جائے تو ایسی عورت کے لئے عدت چار مہینے دس دن ہے۔ اس مدت کے متعین کرنے کے مختلف اسباب یا حکمتیں ہو سکتی ہیں۔ بہر حال غرض یہی ہے کہ عورت کو اتنا وقت دیا جائے کہ وہ خاوند کی موت کا صدمہ بھی برداشت کرلے اور استبرائے رحم بھی ہو جائے۔ شریعت اسلامی میں عورت کے لئے بہتر اور مناسب تو یہی ہے کہ وہ اس دوران گھر کے اندر ہی رہے اور ہر قسم کی زیب و زینت سے مکمل پرہیز کرے۔ قرآن حکیم کی سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۳۶ میں عدت کا ذکر ہوا ہے۔

خاوند کی وفات کے علاوہ طلاق کی شکل میں عدت کے دوران بھی عورت کے لئے

باہر نکلنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ طلاق کی آیت نمبر ا میں مردوں کو اس بات سے روکا گیا کہ وہ عورتوں کو طلاق کے بعد عدت کے دوران ہی گھر سے نکال دیں اور عورتوں کو بھی اس بات سے منع کیا گیا کہ وہ خود گھروں سے نکل جائیں۔ اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانے میں مطلقہ عورتوں خصوصاً جن کے خاوند فوت ہو جاتے تھے انہیں سخت ذہنی اذیت سے دوچار ہونا پڑتا تھا انہیں تمام معاشرے سے الگ تھلگ کر کے ایک غلیظ و تاریک کمرے میں رہنے پر مجبور کیا جاتا تھا اور گندے کپڑے پہننے کی پابندیاں لگائی جاتی تھی اور پھر اس کے بعد جاہلیت کی بعض فضول قسم کی رسمیں ادا کرنے کے بعد اس گھر یا کمرے سے باہر آتی تھیں۔ اسلام نے جہاں ان تمام پابندیوں کو ختم کیا اور اسے عزت و وقار کے ساتھ اسی گھر میں رہنے کا حق دیا۔ وہاں خوشبو اور زیب و زینت کی دوسری اشیاء استعمال کرنے سے منع کیا۔

جہاں تک کام یا دوسری کسی ضرورت کے تحت باہر نکلنے کا تعلق ہے تو قرآن کی تعلیمات اور احادیث میں جو تفصیل آئی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں تو اس کی اجازت نہیں اور خیر و برکت اسی میں ہے کہ اسلامی احکام پر عمل کر کے عورت چار ماہ دس دن گھر میں گزارے لیکن شدید ضرورت کے تحت عورت کو گھر سے باہر جانے کی اجازت بھی دی گئی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کے پاس یک عورت آئی جس کا خاوند فوت ہو چکا تھا اور وہ عدت گزار رہی تھی۔ اس نے پوچھا کہ میرا والد بیمار ہے کیا میں اس کے یہاں جا سکتی ہوں؟ تو ام سلمہ نے دن کے وسطہ میں جانے کی اجازت دے دی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ شہدائے احد کی بیویوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ شکایت کی کہ گھر میں وہ تنہائی محسوس کرتی ہیں تو کیا ہم کبھی ایک دوسری کے پاس رات گزار سکتی ہیں؟ تو آپؐ نے انہیں ایک دوسری کے گھر میں جانے کی اجازت دی اور فرمایا کہ سونے کے وقت اپنے گھروں میں آ جایا کرو۔ (نیل الاوطار)

اس طرح کی متعدد روایات اور صحابہ کرامؓ کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی عورتیں ضرورت کے مطابق اپنے گھروں سے باہر نکل سکتی ہیں۔

اس لئے آپ نے کام کرنے کے بارے میں جو دریافت کیا ہے یہ بھی ایک ضرورت اور مجبوری ہے جس کی وجہ سے عدت گزارنے والی عورت کو کچھ دیر کے لئے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ لہٰذا جس عورت کا اور کوئی ذریعہ معاش نہیں کوئی کمانے والا بھی نہیں چھٹی بھی نہیں مل سکتی اور کوئی متبادل بھی نہیں تو ایسی صورت میں وہ کام پر جا سکتی ہیں لیکن عام سادہ اور باوقار لباس میں جانا چاہئے اور زیب وزینت اور آرائش سے مکمل پرہیز کرنا ہوگا۔

حضرت جابرؓ سے ایک حدیث مروی ہے کہ میری خالہ کو تین طلاقیں ہو چکی تھیں (وہ حالت عدت میں تھی) تو وہ کھجور کاٹنے کے لئے باہر گئی- اسے ایک آدمی نے منع کیا تو وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئی اور یہ بات ذکر کی تو آپؐ نے فرمایا تو باہر جا کر کھجوریں کاٹ سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے تو اس طرح اللہ کی راہ میں صدقہ کرے یا کوئی خیر و بھلائی کرے۔ (مسلم شریف)

اب اس حدیث سے بھی ہم یہ استدلال کر سکتے ہیں کہ ضرورت اور کام کے لئے عورت باہر جا سکتی ہے کیونکہ عام حالات میں تو مطلقہ عورت کو بھی عدت کے دوران باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

بعض مسنون کام

بچے کی پیدائش پر ضروری مسنون کام

سوال: برمنگھم سے ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ بچے کی پیدائش پر مسلمانوں کے لئے کون کون سے کام کرنا مسنون اور ضروری ہیں؟

جواب: نومولود بچے کے مسلم والدین پر پیدائش کی مناسبت سے' جو حقوق ہیں ان میں درج ذیل کام سرفہرست ہیں جن کی رسول اکرم ﷺ نے تعلیم و ترغیب دی۔ کانوں میں اذان' تحنیك' عقیقہ' سر کے بال منڈانا اور نام رکھنا۔

اذان: بچے کا اس دنیا میں آنے کے بعد اپنے والدین پر پہلا حق یہ ہے کہ اس کے کانوں میں اذان دی جائے۔ حدیث ہے۔

عن ابی رافع قال رایت رسول اللہ ﷺ اذن الحسن بن علی حین ولدته فاطمة بالصلوة۔[1]

حضرت ابو رافع سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت حسنؓ بن علیؓ کے کان میں نماز والی اذان پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت جب حضرت حسنؓ حضرت فاطمہؓ کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔

تو گویا کہ بچے کے کانوں میں سب سے پہلی آواز جو پڑنی چاہئے وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی ہونی چاہئے اور اس کے کانوں اور دل و دماغ کو اللہ کے نام اور نماز و ایمان کی دعوت سے سب سے پہلے پکارنا چاہئے۔ دوسری احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے بچے یا بچی کی پیدائش کے فوراً بعد اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت (تکبیر) کی تعلیم دی۔

---

[1] سنن ابی داود ج۳ باب فی المولود یوذن فی اذنه ص ۶۹۱ رقم الحدیث ۱۶۶۷

برطانیہ میں مسلمانوں کی اکثریت اس سنت کی ادائیگی میں انتہائی غفلت برتتی ہے۔ایک طبقہ تو اپنے دین اور روایات سے اتنا دور جاچکا ہے کہ وہ بچے کی پیدائش پر ناچنے گانے اور پارٹیاں کرنے کا اہتمام تو کرتا ہے مگر اذان کا سرے سے تصور ہی ختم ہوچکا ہے۔ بعض وہ ہیں جن کو کئی، نوں اور ہفتوں کے بعد اذان یاد آتی ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کو بروقت کوئی مولوی یا مسجد کا امام نہ ملے تو بھی کئی کئی دن اذان نہیں کہتے حالانکہ ہر مسلمان بچے کے کان میں اذان کہہ سکتا ہے اور اذان تو گئے گزرے مسلمان کو بھی یاد ہوتی ہے اس لئے کسی مولوی کی تلاش میں وقت ضائع کرنے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ نومولود کا والد خود اس کے کان میں اذان کہے کیونکہ وہی سب سے پہلے اس کی زیارت بھی کرتا ہے اور اس وقت موجود بھی ہوتا ہے۔

تحنیك: تحنیك سے مراد یہ ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد کوئی نیک صالح آدمی کھجور یا کوئی دوسری چیز اپنے منہ میں چبا کر بچے کے تالو میں لگاوے یا مل دے اور اس کے لئے دعائے خیر و برکت بھی کردے۔

عن عائشة ان رسول الله ﷺ كان يوتى بالصبيان فيبرك عليهم ويحنكهم۔[1]

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ لوگ اپنے بچے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لاتے اور آپؐ ان کے لئے دعا فرماتے اور تحنیك بھی کرتے (یعنی کوئی چیز چبا کر تالو میں ملتے)

متعدد احادیث میں تحنیك کا ذکر آتا ہے مگر یہ ان سنتوں میں سے ہے جن پر بہت کم عمل کیا جاتا ہے بلکہ اس طرح کی پیاری سنتیں بدعات کے طوفان میں غرق ہوچکی ہیں۔اس لئے ان سنتوں کو زندہ کرنا اور ان پر عمل کرنا حضور ﷺ سے محبت و عقیدت کا ثبوت ہے۔

[1] مسلم مترجم ج ١ کتاب الطہارۃ باب حکم بول الطفل الرضیع و کیفیة غسله ص ٤١١

عقیقہ: عربوں کے ہاں جاہلیت میں بھی عقیقہ کا رواج تھا۔ اسلام نے اسے باقی رکھا اور اس کی شکل کو مزید بہتر اور باوقار بنایا۔ رسول اکرم ﷺ نے عقیقہ کے بارے میں نہ صرف ترغیب دی بلکہ خود عقیقہ کر کے عملی نمونہ بھی پیش کیا۔ حدیث ہے:

عن ابی بریدة قال کنا فی الجاهلية اذا ولد لاحدنا غلام ذبح شاة و لطخ راسه بدمها فلما جاء الاسلام کنا نذبح شاة یوم السابع ونحلق راسه ونلطخنه بزعفران۔[1]

حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم لوگ یوں کرتے ہیں کہ جب کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تو وہ بکری ذبح کرتا اور پھر اس کا خون بچے کے سر پر لگاتا پھر جب اسلام آیا (رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے مطابق) تو ہم ساتویں دن عقیقہ کرتے اور بچے کا سر مونڈ کر خون کی بجائے اسے زعفران سے معطر کرتے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں دن عقیقہ کرنا مسنون طریقہ ہے۔
ایک دوسری حدیث میں آتا ہے

عن ام کرز قالت سمعت رسول الله ﷺ یقول عن الغلام شاتان و عن الجارية شاة ولا یضرکم ذکرانا کن او اناثا۔[2]

حضرت ام کرز سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ (عقیقہ میں) لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری کی جائے اور عقیقہ کا جانور نر ہو یا مادہ اس میں کوئی حرج نہیں، (یعنی برابر ہے)

اس بارے میں تیسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ

---

[1] ابو داود مترجم ج ۲ باب فی العقیقة ص ٤٤٨ رقم الحدیث ١٠٧١

[2] نسائی ج ۳ کتاب العقیقة باب کم یعق عن الجارية ص ٢٠٤ رقم الحدیث ٤٢٢٣، ابن ماجه مترجم ج ۳ کتاب الذبائح باب العقیقة رقم الحدیث ٣١٦٣

عن سمرة بن جندب ان رسول الله ﷺ قال کل غلام رهينة بعقيقة تذبح عنه يوم سابعه ويحلق ويسمى۔[1]

حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بچہ اپنے عقیقہ کے عوض رہن رہتا ہے جو ساتویں دن اس کی طرف سے کیا جائے۔ اسی طرح اس کا سر منڈوایا جائے اور اس کا نام بھی رکھا جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ شکر کے طور پر جو آدمی بچے جیسی نعمت ملنے پر عقیقہ نہیں کرتا تو گویا بچہ اس کے بدل گروی ہوگا۔

ایک چوتھی حدیث بھی ہے

عن ابن عباس ان رسول الله ﷺ عق عن الحسن والحسين كبشا كبشا۔[2]

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے عقیقہ میں ایک ایک مینڈھا ذبح کیا۔

اس حدیث سے خود آپ کا اپنا نمونہ سامنے آتا ہے اور یہ بھی گنجائش نظر آتی ہے کہ بیٹے کی طرف سے بھی ایک جانور ذبح کیا جاسکتا ہے۔ یہ ان لوگوں کے لئے رخصت ہوسکتی ہے جو دو جانور ذبح کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عقیقہ بے حد اہم سنتوں میں سے ہے۔ جس معاشرے میں بدعات عام پھیل چکی ہوں وہاں ایسی سنتوں کو زندہ کرنا نہایت ضروری ہے جنہیں لوگ بالکل چھوڑ چکے ہیں۔ آج مسلمان بچے کی پیدائش پر کئی من مٹھائی تقسیم کردیتے ہیں' بڑی بڑی پر تکلف دعوتیں بھی کرتے ہیں مگر انہیں اس عظیم سنت پر عمل کرنے کی سعادت نصیب نہیں ہوتی۔ یہ کتنے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ کھانے پینے کے لئے جو بدعات ورسومات رائج ہیں ان کی مولوی صاحبان اور عوام سب

---

[1] نسائی مترجم کتاب العقیقة باب متی یعق ص ۲۰۵ رقم الحدیث ٤٢٢٦

[2] ابو داود مترجم کتاب العقیقة ص ٤٤٧ رقم الحدیث ١٠٦٩

بڑی فکر سے پابندی کرتے ہیں مگر عقیقہ کی اہمیت نہ مولوی صاحبان بتاتے ہیں اور نہ لوگوں کو اس کی اہمیت کا احساس ہے۔

عقیقہ خوشی کے موقع پر چونکہ اظہار تشکر ہے اس لئے اس کا گوشت ہر آدمی کو دیا یا کھلایا جا سکتا ہے۔ اس میں امیر و غریب کی کوئی تمیز نہیں جب کہ باقی صدقات و خیرات یا نیاز کے طور پر دی جانے والی چیزیں غرباء و مساکین کا حق ہیں پیشہ ور مولویوں یا برادری کے لئے ان کا کھانا جائز نہیں۔

بال منڈوانا: اس سے پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ساتویں دن بچے کا عقیقہ کیا جائے' بال منڈوائے جائیں اور نام رکھا جائے۔ اس حدیث سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں کاموں میں نومولود بچہ ہو یا بچی دونوں شریک ہیں اور دونوں کی طرف سے یہ تینوں کام کئے۔ اس لئے پیدائش کے وقت جو بال ہوتے ہیں وہ بچے اور بچی دونوں کے صاف کئے جائیں گے۔

بخاری شریف کی ایک دوسری حدیث سے مزید وضاحت ہوتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:

> **مع الغلام عقیقة فاھریقوا عنه دما و امیطوا عنه الاذی۔**[1]
>
> بچے کے ساتھ عقیقہ ہے لہٰذا بچے کی طرف سے خون بہاؤ اور اس کے سر سے تکلیف دہ چیز کو صاف کر دو۔ یعنی بال منڈوا دو۔

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ سر منڈانے کو عقیقہ کے ساتھ ایسی ہی مناسبت ہے جیسی حج میں قربانی کے ساتھ سر منڈانے کو ہے چونکہ دونوں کام ملت ابراہیمی شعائر میں سے ہیں اس لئے دونوں کا آپس میں جوڑ ہے۔ اس سے اس میں بچہ اور بچی کی تفریق نہ ہوگی اور اس حدیث میں پیدائشی بالوں کو تکلیف دہ چیز سے تعبیر کیا گیا- اس لئے اس سے سر کو صاف کرنا ضروری ہو گیا۔ بعض لوگ ان پیدائشی بالوں کو کئی کئی ہفتے اور مہینے

---

[1] فتح الباری ج ۱۱ کتاب العقیقة باب اماطة الاذیٰ عن الصبی ص ۷ رقم الحدیث ۵۴۷۳

پالتے رہتے ہیں۔ یہ سراسر جہالت ولاعلمی کی بنا پر ہے اور سنت نبوی کے خلاف بھی۔

ترمذی شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے کہا کہ حسن کا عقیقہ کرنے کے بعد اس کے سر کے بال منڈواؤ اور ان بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کردو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نومولود کے بالوں کے وزن جتنی چاندی یا اس کی قیمت کا صدقہ بھی سنت ہے اور اس خوشی کے موقع پر شکر وامتنان کے کاموں میں شامل ہے۔

نام رکھنا: حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا

حق الولد علی الوالد یحسن اسمه و یحسن ادبه۔[1]

یعنی باپ پر بچے کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی اولاد کا نام اچھا رکھے اور اس کو اچھے آداب سکھائے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: آدمی اپنی اولاد کو سب سے پہلے جو تحفہ دیتا ہے وہ نام ہے اس لئے اچھا نام رکھا کرو۔ حضرت ابودردا فرماتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن تم اپنے اور اپنے باپ کے نام کے ساتھ پکارے جاؤ گے اس لئے اچھے نام رکھا کرو۔ خود رسول کریم ﷺ نے عبداللہ اور عبدالرحمٰن جیسے ناموں کو پسند فرمایا ہے کیونکہ اس میں بندے کی عبدیت کا اقرار ہے جس سے عاجزی کا اظہار ہوتا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات آئی ہیں ان کی طرف نسبت کرکے کوئی نام رکھا جاسکتا ہے جیسے عبدالغفار، عبدالقادر، عبدالظاہر وغیرہ۔ پہلے نبیوں کے نام بھی پسندیدہ ہیں۔ آپؐ نے اپنے بیٹے کا نام ابراہیم رکھا۔ دوسرے نام جیسے حسن، حسین، یہ بھی پسندیدہ ہیں۔ کوئی بھی معنوی لحاظ سے اچھا نام رکھا جاسکتا ہے سوائے ان ناموں کے جن سے شرک وکفر کی بو آتی ہو جیسے بعض لوگ پیراں دتہ پیر بخش امام بخش یا

---

[1] ضعیف الجامع الصغیر (۲۷۳۱) سلسلة الاحادیث الضعیفه رقم الحدیث ۱۹۹ بحوالة شعب الایمان بیهقی

عبدالرسول نام رکھتے ہیں۔ان سے بہتر نام اللہ دتہ اللہ بخش اور عبداللہ ہیں۔نام میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی عبدیت کا اعلان بہرحال جائز نہیں ہے۔

ختنہ: بچے کی پیدائش کے بعد ایک اور کام بھی ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے فطرت کے کاموں میں سے قرار دیا ہے اور وہ ہے ختنہ۔جو سنت ابراہیمی ہے اور مسلمانوں کو اس پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔بخاری شریف کی حدیث ہے۔

اختتن ابراهيم بعد ما الى ثمانون سنة۔[1]

یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی (۸۰) سال کی عمر میں ختنہ کرایا تھا۔

اگر کوئی شخص نیا مسلمان ہو تو رسول اکرم ﷺ نے اسے ختنہ کرانے کا حکم دیا۔

مناسب اور بہتر یہی ہے کہ بچے کے عقیقہ کے ساتھ ہی اس کا ختنہ بھی کرایا جائے۔اگر کوئی عذر نہ ہو تو اس فرض کی ادائیگی میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔بعض لوگ ختنہ کرانے میں غیر ضروری تاخیر کر دیتے ہیں یہ بھی جائز نہیں۔

ختنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال: بریڈ فورڈ سے عبدالحمید قاسم لکھتے ہیں: ختنے کی شرعی حیثیت کیا ہے اور بچے کا ختنہ کس عمر میں کرنا چاہئے؟ اس بارے میں قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب: ختنہ ان امور میں سے ہے جنہیں نبی کریم ﷺ نے فطرت سے قرار دیا ہے۔وہ امور جنہیں بنیادی فطرت سے قرار دیا جا سکتا ہے- ایک تو وہ ہیں جن کا تعلق دل سے ہے۔وہ ایمان و یقین ہے- وہ ایمان ہے جس سے دل کے اندر تزکیہ و صفائی پیدا ہو یا وہ صفات جن کے ذریعے انسان کے قلب و ذہن میں طہارت و پاکیزگی پیدا ہو- انہیں

---

[1] فتح الباری ج ۷ کتاب احادیث الانبیاء باب قول اللہ تعالی واتخذ اللہ ابراهیم خليلا ص ۳۶ رقم الحدیث ۳۳۵۶

فطرت ایمانی سے قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر جسمانی فطرت یا وہ امور جن کا تعلق ظاہر و بدن سے ہے جیسا کہ حضرت عمار بن یاسرؓ راوی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

من الفطرة المضمضة والاستنشاق و قص الشارب والسواك وتقليم الاظافر و نتف الابط والاستمداد والافتتان۔[1]

"یعنی فطرت میں سے جو کام ہیں ان میں کلی کرنا' ناک صاف کرنا' مونچھوں کا کاٹنا' ناخن کاٹنا' بغل کے بالوں کو صاف کرنا' زیر ناف بالوں کا صاف کرنا اور ختنہ کرنا۔"

ختنے کی شرعی حیثیت کے بارے میں فقہاء و علماء کی مختلف آراء ہیں بعض اسے واجب قرار دیتے ہیں جب کہ بعض کے نزدیک یہ سنت ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام حسن بصری اور بعض حنبلی علماء کے نزدیک یہ سنت ہے اور امام مالکؒ' امام احمدؒ اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک یہ واجب اور ضروری ہے۔

ختنے کو سنت قرار دینے والوں کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت شداد بن اوس روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

الختان سنة للرجال مكرمة للنساء۔[2]

حضرت امام حسن بصری یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جو لوگ ایمان لائے ہیں ان میں سفید سیاہ فام رومی فارسی اور حبشی ہر قسم کے لوگ تھے مگر آپؐ نے ان کے اسلام قبول کرنے سے قبل کبھی یہ **تفتیش** نہیں فرمائی تھی کہ ان کا ختنہ ہوا ہے یا نہیں۔

ختنہ کو واجب کہنے والے کی پہلی دلیل یہ حدیث ہے جسے ابوداؤد نے حضرت عشیر بن کلیب نے عن ابیہ عن جدہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس جب

---

[1] سنن ابن ماجة للالبانی ابواب الطهارة ص ٥٩ رقم الحديث ٢٩٢

[2] مرفوعاً عن ابن عباس و اسامة و ابی ایوب بیهقی ٣٢٥/٨ العلل لابن ابی حاتم ٢٤٧/٢

میں مسلمان ہو کر آیا تو آپؐ نے فرمایا

الق عنك شعر الكفر واختتن ۔[1]

کہ کفر کی حالت کے بالوں کو صاف کرواور ختنہ بھی کرو۔

دوسری دلیل امام زہریؒ کی یہ روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا

من اسلم فليختتن و ان كان كبيرا

کہ جو مسلمان ہو اسے ختنہ کرنا چاہئے خواہ وہ عمر میں بڑا ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت امام مالکؒ کا اس بارے میں کافی سخت موقف ہے وہ فرماتے ہیں کہ جس آدمی کا ختنہ نہ ہوا ہو' نہ اس کی امامت جائز ہے اور نہ اس کی گواہی قبول کی جائے گی۔ کیوں کہ ان کے نزدیک ختنہ کے بغیر صحیح طہارت و صفائی کا قائم رکھنا ممکن نہیں اور ظاہر ہے جب صفائی اور طہارت نہیں ہو گی تو نماز کیسے ہو گی اور جس آدمی کی نماز نہیں اس کی گواہی بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کی اپنی نماز درست مان بھی لی جائے تب بھی امامت کے لئے ایسا شخص مناسب نہیں۔

امام ترمذیؒ نے حضرت ابوایوبؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اربع من سنن المرسلين الختان والتعطر والسواك والنكاح ۔[2]

چار چیزیں انبیاء کرام کی سنت میں سے ہیں ختنہ' خوشبو' مسواک اور نکاح۔

ان تمام روایات کا جائزہ لیا جائے تو یہ موقف قوی نظر آتا ہے کہ ختنہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ یہ عام سنتوں کی طرح نہیں ہے کیوں کہ حضور اکرم ﷺ نے اس کا حکم دیا اور اسے فطرت میں سے قرار دیا اور اسے اسلام کا شعار بھی قرار دیا جا سکتا

---

[1] ابوداؤد كتاب الطهارة باب فى الرجل يسلم فيؤمر بالغسل رقم ٣٥٦۔

[2] مشكوة كتاب الطهارة باب السوال الفصل الثانى رقم ٣٨٢' ترمذى كتاب النكاح باب ما جاء فى فضل التزويج والحث عليه ١٠٨٢ ترمذی میں الختان کی بجائے الحياد کے لفظ ہیں۔

ہے اور مردوں کے لئے خاص طور پر یہ بہت اہم ہے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ بچوں کا ختنہ کس عمر میں کرنا چاہیے تو اس بارے میں سنت میں عمر کی کسی حد کا کوئی ذکر نہیں ہے جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر کسی عمر میں بھی ختنہ کیا جاسکتا ہے لیکن چونکہ اس کا تعلق فطرت اور جسمانی طہارت سے ہے اس لئے بلوغت سے پہلے پہلے ہی ختنہ کرنا قرین عقل و قیاس ہے۔ تاکہ دینی فرائض کی ادائیگی کے وقت وہ روحانی و جسمانی طور پر تیار ہو۔

ویسے پیدائش کے کچھ دنوں کے بعد ختنہ کرنا افضل ہے ایک تو اس سے تکلیف کا زیادہ احساس نہیں ہوتا' دوسرا بڑا یا بالغ آدمی ختنہ کرنے یا اس کے ذکر سے بعض اوقات تھوڑی سی شرم بھی محسوس کرتا ہے اس لئے بچپن میں کرنا ہی اچھا ہے۔ ہاں جو شخص نیا مسلمان ہوا ہو وہ جس عمر میں اسلام لایا اسی عمر میں اس کا ختنہ ہوگا۔

عقیقہ سنت ہے؟

سوال: والتھم سٹو لندن سے محمد رفیق لکھتے ہیں

عقیقہ کی تفصیل تحریر کریں اور عقیقہ کتنی عمر تک کیا جاتا ہے؟ کسی بچے کے پیدا ہونے کے بعد یا دو چار سال کی عمر تک کیا جاسکتا ہے؟

جواب: عقیقہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے جس تاکید کے ساتھ حکم فرمایا اس کی وجہ سے بعض نے اسے واجب قرار دیا ہے لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ اہم سنتوں میں سے ہے۔

آپؐ نے فرمایا: ہر نو مولود عقیقہ میں رہن ہے' ساتویں دن اس سے ذبح کیا جائے اور اس کا سر منڈایا جائے۔ ایک حدیث میں ۷ دن کے بعد ۱۴ دن کے بعد ۲۱ دن کے بعد کا بھی ذکر ہے۔ امام بیہقی کی ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس

آدمی کو سات دن چودہ دن یا اکیس دن بعد کرنے کی طاقت نہ ہو اسے جب میسر ہو اس وقت عقیقہ کر سکتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عقیقہ خود نبوت کے بعد کیا تھا۔ بہر حال مسنون طریقہ تو یہی ہے کہ پیدائش کے ساتویں' چودھویں یا اکیسویں دن بعد عقیقہ کیا جائے اور اگر کسی کو طاقت نہ تھی یا کسی اور وجہ سے نہ کر سکا تو وہ بعد میں عمر بھر کر سکتا ہے اس طرح تلافی مافات ہو جائے گی۔

داڑھی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال: کارڈف سے غلام حسین دریافت کرتے ہیں

(الف) داڑھی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ہمارے ہاں مقامی مسجد میں ایک پوسٹر میں لکھا ہے کہ داڑھی واجب ہے اور حدیث میں ایک بالشت حد ہے اس سے کم نہیں منڈوانا یا کتروانا جائز نہیں۔ جو ایسا کرتے ہیں وہ توبہ و تجدید نکاح کریں۔ کیا واقعی ایسی صورت میں تجدید نکاح کی ضرورت ہے۔

جواب: (الف) داڑھی کی شرعی حیثیت کے بارے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں ہم مفصل جائزہ پیش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں درج ذیل امور پر روشنی ڈالیں گے۔

اول: داڑھی رکھنا واجب ہے یا سنت

دوم: داڑھی منڈوانا حرام ہے یا مکروہ

سوم: داڑھی کتروانا جائز ہے یا نہیں اور یہ کہ داڑھی کتنی لمبی ہونی چاہیے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ داڑھی مردانگی کی علامت اور مردوں کی زینت ہے اور ہر مذہب میں اس کی حیثیت مسلمہ ہے۔ قدیم زمانے میں بادشاہوں اور حکمرانوں اور

علماء اور فلاسفروں کے لئے داڑھی امتیازی نشان سمجھا جاتا تھا۔ داڑھی منڈوانے کا رواج ایران کے آتش پرست حکمرانوں سے ہوا اور پھر اس کے اثرات پھیلتے گئے۔ یورپ اور مغرب میں مدتوں داڑھی عزت؛ وقار کی علامت سمجھی جاتی رہی ہے۔ طبی نقطہ نظر سے بھی داڑھی منڈانے کو نقصان دہ قرار دیا گیا ہے۔ تمام آسمانی مذاہب میں داڑھی کو بنیادی اہمیت حاصل رہی اور قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انبیاء بھی داڑھی رکھتے تھے۔

چنانچہ سورہ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے غصے سے جب اپنے بھائی حضرت ہارون کے بال پکڑے تو انہوں نے کہا۔

﴿يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي﴾ (طه : ۹۳)

اے میری ماں کے بیٹے میری داڑھی اور سر کے بال نہ پکڑ۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں:

سبحان الذی من زین الرجال باللحی والنساء بالقرون والذوائب

پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھی سے زینت دی اور عورتوں کو گیسوؤں اور زلفوں سے زینت عطا فرمائی۔

اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے جن چیزوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ فطرت میں سے ہیں ان میں داڑھی بڑھانا بھی شامل ہے۔ فطرت کی ان چیزوں میں ختنہ' زیر ناف بالوں کی صفائی' ناخن تراشنا' داڑھی بڑھانا اور مونچھیں تراشنا شامل ہیں۔

خود سرورِ عالم ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ

کان کثیر شعر اللحیة

آپ کی داڑھی مبارک بہت گھنی تھی۔

(ا) داڑھی کے واجب یا سنت ہونے کے بارے میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ ان سنتوں میں سے ہے جن کے ترک

کے بارے میں سخت وعید آئی ہے۔ جن علماء نے داڑھی رکھنے کو واجب کہا ہے' ان کے نزدیک بنیاد یہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

احفوا الشوارب و اعفوا اللحی۔[1]

مونچھیں تراشو اور داڑھیاں بڑھاؤ۔ (بخاری و مسلم)

اور عربی میں لحیہ (داڑھی) کا لفظ ٹھوڑی اور دونوں رخساروں کے بالوں پر بولا جاتا ہے۔

بخاری شریف کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: مشرکین کی مخالفت کرو اور مونچھیں تراشو اور داڑھی بڑھاؤ۔

وجوب پر دوسری حدیث یہ پیش کی جاتی ہے جو مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ

امرنا باحفاء الشوارب واعفاء اللحية۔[2]

کہ حضورؐ نے ہمیں مونچھیں کاٹنے اور داڑھی چھوڑنے کا حکم دیا۔

تیسری یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ کسریٰ کے جو قاصد رسول اللہؐ کے پاس آئے تھے' انہوں نے داڑھیاں چٹ کرائی ہوئی تھیں اور لمبی لمبی مونچھیں رکھی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھ کر آپؐ نے فرمایا:

ویلکما من امر کما بھذا ؟ قالا امرنا ربنا۔[3]

کہ تمہیں یہ شکل بنانے کا کس نے حکم دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہمارے رب (یعنی بادشاہ کسریٰ) نے یہ حکم دیا۔ تو اس موقع پر آپؐ نے فرمایا:

---

[1] مختصر مسلم كتاب الحيض باب احفوا الشوارب و اعفوا الحى ص ١١٤ رقم الحديث ١٨٤

[2] سنن أبى داؤد مترجم ج ٣ كتاب الترجل باب فى اخذ الشارب ص ٣١٣ رقم الحديث ٧٩٧

[3] تاريخ ابن جرير ٣/٩١ ـ ٩٠

ولکن ربی امرنی باحفاء لحیتی وقص شاربی[1]

لیکن میرے رب نے تو مجھے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کٹوانے کا حکم دیا ہے۔

بہر حال اگر واجب نہ بھی ہو تو داڑھی وہ سنت موکدہ ہے جس کا چھوڑنا کسی شکل میں جائز نہیں۔

داڑھی منڈوانا حرام ہے؟

جہاں تک داڑھی منڈوانے کا تعلق ہے تو اس کے حرام ہونے پر تمام ائمہ اور علماء کا اتفاق ہے بعض نے اسے مکروہ کہا ہے لیکن ان کے اقوال دلیل کے لحاظ سے کمزور ہیں۔ درج ذیل دلائل واڑھی منڈوانے کی حرمت پر شاہد ہیں

(۱) قرآن حکیم میں سورہ نساء کی یہ آیات جن میں شیطان کے بارے میں ذکر ہے اور شیطان نے کہا تھا "میں تیرے بندوں میں سے کچھ کو اپنے پیچھے لگاؤں گا' ان کو گمراہ کروں گا اور ان کو ہوس دلاؤں گا اور میں ان کو تعلیم دوں گا کہ وہ جانوروں کے کان چیریں گے اور میں ان کو کہوں گا کہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورتوں کو بگاڑیں گے۔" اب اس میں فلیغیرن خلق اللہ سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا کہ اس میں داڑھی منڈانا بھی شامل ہے۔

امام غزالی نے بھی ظاہری صورت کو مرد و عورت کے درمیان امتیاز قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں: "داڑھی مردوں کی پوری خلقت میں داخل ہے اور اس سے ظاہری صورت میں عورتوں اور مردوں کے درمیان امتیاز ہے"

اور خلقت (شکل) میں تبدیلی کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے۔

(۲) آنحضرت ﷺ نے فرمایا

---

[1] تاریخ ابن جریر ۳/۹۱ - ۹۰

احفوا الشوارب واعفوا اللحی ولا تشبھوا بالیھود-[1]

مونچھیں کٹاؤ' داڑھیاں بڑھاؤ اور یہودیوں کے ساتھ مشابہت اختیار نہ کرو۔

ایک روایت میں عیسائیوں اور مجوسیوں کا ذکر ہے کہ داڑھی رکھ کر ان کی مخالفت کرو۔

ان احادیث اور اقوال سے کم از کم اس قدر تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ محض فیشن اور غیروں کی نقالی میں داڑھی منڈواتے ہیں وہ حرام فعل کا ارتکاب کرتے ہیں اور اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے ظاہری چیزوں میں بھی اسلام کے دشمنوں کی مخالفت کرنے کا حکم دیا ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ظاہری چیزوں میں غیروں کی مشابہت کا اثر باطنی چیزوں پر بھی پڑتا ہے اور اپنا اور اپنے دین کا تشخص ختم ہو جاتا ہے اور اس پر متعدد تجربات شاہد ہیں اور پھر قرآن و سنت اور اجماع امت سے یہ ثابت ہے کہ کفار کی ایسے ظاہری امور میں مخالفت ضروری ہے جو ان سے باطنی قربت کا ذریعہ بنتے ہیں یا ان سے ذریعہ بننے کا اندیشہ پیدا ہو۔

اسی طرح جو لوگ نبی کریم ﷺ کی اس سنت مبارکہ کو حقیر سمجھ کر اسے ترک کرتے ہیں اس کے حرام ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ داڑھی تو ایک اہم سنت ہے ایک عام سنت کو بھی حقیر سمجھنا یا اس سے مذاق کرنا نہ صرف حرام ہے بلکہ یہ بعض اوقات کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

علماء نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے الاستھانة والاستھزاء علی الشریعة کفر (شرح عقائد)

کہ شریعت کے کسی کام کو حقیر سمجھنا یا اس سے مذاق کرنا کفر ہے۔

ملا علی قاریؒ ترک سنت کے بارے میں ایک حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "جو شخص حقارت یا لاپرواہی سے رسول اللہ ﷺ کی سنت چھوڑتا ہے وہ کافر و ملعون ہے اور جو سستی و کاہلی سے ترک کر دیتا ہے' وہ عاصی و نافرمان ہے۔"

---

[1] الطحاوی فی شرح معانی الآثار ۲ ص ۳۳۳

علامہ ابن ھمامؒ فتح القدیر میں فرماتے ہیں کہ جو شریعت کے کسی کام کو کفریہ الفاظ سے مذاق کرے تو وہ کفر کی طرح ہے۔

ہمارے ہاں یہ بیماری موجود ہے کہ لوگ سنت نبویؐ داڑھی کے طرح طرح کے نام لے کر مذاق کرتے ہیں اور اسے حقیر اس حد تک سمجھا جاتا ہے کہ بعض جاہل عورتیں اپنے خاوندوں کو داڑھی منڈوانے پر مجبور کر دیتی ہیں اور بعض بے دین گھرانے شادی میں داڑھی منڈوانے کی شرطیں لگاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے یہ ارشادات سامنے رکھ کر اپنے انجام کی خیر منانی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی شکل و صورت کو نہ صرف قبول نہ کیا بلکہ اسے تمسخر و مذاق بھی بنایا۔ ان کا ٹھکانا آخر کہاں ہوگا یہ معمولی بات نہیں۔ کبرت کلمة تخرج من افواھم یہ بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے' اس لئے اس انداز سے اس سنت کو ترک کرنے کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

داڑھی کی حد

داڑھی کے منڈوانے کے ناجائز ہونے پر تو کوئی اختلاف نہیں ہاں البتہ داڑھی کی حد پر اختلاف ہے یہ کتنی لمبی ہونی چاہیے۔

داڑھی کٹوانے کے جواز میں ترمذی شریف کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے

ان النبی ﷺ کان یاخذ من لحیته من عرضها و طولها۔[1]

کہ نبی ﷺ اپنی ریش مبارک کے عرض سے بھی اور طول سے بھی کچھ ترشوا دیتے تھے۔ اس حدیث کی صحت میں کلام ہونے کے باوجود ائمہ دین کی تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ داڑھی ایک مشت سے کم رکھنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ حضرت

[1] ترمذی مترجم ج۲ ابواب الاستئذان و الادب باب ما جاء فی الاخذ من اللحية ص ۲۴۹

عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ایک مشت سے زیادہ بال ترشوادیتے تھے۔ جب کہ داڑھی بڑھانے والی احادیث کے راوی بھی خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔

تمام روایات اور اقوال وافعال کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شریعت کا اصل مدعا تو یہ ہے کہ داڑھی رکھی جائے' ہرگز منڈائی نہ جائے اور افضل و بہتر یہی ہے کہ مکمل داڑھی ہو اور زیادہ کم نہ کرائی جائے۔ ہاں اگر داڑھی کا بے ڈھنگا پن دور کرنے اور اس کوفت سے بچنے کے لئے کچھ بال طول و عرض سے کم کر لئے جائیں تو اس میں بظاہر کوئی شرعی دلیل مانع نہیں۔

اس طرح ایک مشت سے کم کرانے سے پرہیز کیا جائے لیکن ایک مشت سے کم پر لفظ داڑھی کا اطلاق ہو گا اور اس داڑھی کو بھی ہم ناجائز نہیں کہہ سکتے اور یہ داڑھی بھی منڈوانے سے تو بہتر ہے۔ خاص کر جب کوئی شخص سنت نبوی سمجھ کر رکھے تو اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے لیکن اسے داڑھی بڑھانے کی تلقین کرنی چاہیئے۔ ہاں اگر کوئی تھوڑی سی داڑھی محض فیشن کے طور پر رکھتا ہے تو اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں۔

آپ نے جو لکھا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ داڑھی منڈوانے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور پھر دوبارہ نکاح کی ضرورت پیش آئے گی تو اس کی کوئی دلیل قرآن و حدیث سے ثابت نہیں۔ داڑھی منڈوانے کو سنگین گناہ قرار دینے کے باوجود رسول اللہ ﷺ صحابہ کرامؓ اور ائمہ دین سے یہ چیز ثابت نہیں کہ اس گناہ کے ارتکاب سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور داڑھی رکھنے کے بعد اسے اپنے نکاح کی تجدید کرنا ہو گی ایسے لوگوں کو اپنے قول کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش کرنی چاہیئے۔

جہاں تک توبہ کا تعلق ہے تو یہ بالکل درست ہے۔ جس طرح دوسرے گناہوں سے توبہ ضروری ہے اسی طرح اس گناہ سے توبہ کرنا بھی ضروری ہے۔

داڑھی منڈوانا جرم ہے؟

سوال: لیڈز سے محمد یٰسین لکھتے ہیں' کس حدیث سے ثابت ہے کہ داڑھی ایک

مشت ہونی چاہئے؟

جواب: داڑھی سنت انبیاء ہے۔اس کا رکھنا نہایت ضروری ہے اور اس کا منڈانا جرم ہے۔رسول اکرم ﷺ نے اس کی سخت وعید فرمائی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

خالفوا المشرکین اوفوا اللحی واحفوا الشوارب۔[1]

مشرکوں کی مخالفت کرتے ہوئے داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھوں کو خوب کٹاؤ۔ (بخاری و مسلم)

ترمذی شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

عشر من الفطرة قص الشارب و اعفاء اللحية والسواك والاستنشاق وقص الاظفار وغسل البراجم و نتف الابط و حلق العانة واقتناص الماء قال زكريا قال مصعب و نسيت العاشرة الا ان تكون المضمضة۔[2]

یعنی دس چیزیں فطرت میں سے ہیں۔ مونچھیں صاف کرنا' داڑھی لمبی کرنا' مسواک کرنا' ناک میں پانی لینا' ناخنوں کو تراشنا' انگلیوں کی گرہوں کو دھونا' بغل سے بال اکھاڑنا' زیر ناف بال مونڈنا' پانی سے استنجا کرنا۔ زکریا لکھتے ہیں کہ راوی حدیث مصعبؓ نے کہا دسویں چیز میں بھول گیا ہوں۔ غالباً وہ کلی کرنا ہے۔

ابوداؤد میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

كنا نعفي السبال الا في حجة او عمرة۔[3]

---

[1] مشکوٰۃ للالبانی ج ۲ باب الترجل ص ۱۲۶۱ رقم الحدیث ۴۴۲۱

[2] ترمذی مترجم ج ۲ ابواب الاستئذان و الادب باب ماجاء فی تقلیم الاظفار ص ۲۴۸

[3] فتح الباری ج ۱۱ کتاب اللباس باب تقلیم الاظفار ص ۵۴۲ شرحی حدیث رقم ۵۸۹۲

یعنی ہم لوگ داڑھی کے بال چھوڑ دیا کرتے تھے مگر حج و عمرہ میں کٹواتے تھے۔

بخاری شریف میں تعلیقاً حضرت عبداللہ بن عمر کے بارے میں آتا ہے کہ:

کان ابن عمر اذا حج او اعتمر قبض علی لحیته۔[1]

یعنی عبداللہ بن عمرؓ جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی داڑھی کو مٹھی سے پکڑ کر کٹوا لیتے۔

ابوداؤد اور نسائی کی ایک روایت میں حج و عمرہ کے بغیر ابن عمرؓ کے بارے میں آتا ہے کہ مردان بن سالم کہتے ہیں رایت ابن عمر یقبض علی لحیته لیقطع ما زاد علی الکف[2] کہ میں نے ابن عمرؓ کو دیکھا وہ داڑھی کو ہاتھ میں پکڑتے اور جو مٹھی سے زائد ہوتی اس کو کاٹ دیتے۔

ان مختلف احادیث سے تین چیزیں ثابت ہوتی ہیں:

اول: داڑھی فطرت میں سے ہے اور اس کا رکھنا ضروری ہے اور اسے مطلق چھوڑ دینا بہتر اور افضل ہے۔ رسول اکرم ﷺ سے کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے داڑھی ایک مشت سے زائد کٹوائی ہو یا اس کا حکم دیا ہو۔ اس لئے افضل عمل تو یہی ہے کہ داڑھی پوری رکھی جائے۔

دوم: بعض آثار اور اقوال صحابہؓ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک مٹھی سے زائد کٹوانے کی اجازت ہے اور بعض صحابہؓ نے اس پر عمل کیا صرف حج کے موقع پر یہ اجازت ہے اور بعض نے اس کی عام اجازت دی ہے مگر یہ جائز کی حد تک ہے۔ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ داڑھی ایک مشت ہونی چاہئے بلکہ صرف جواز کی حد تک ثبوت ملتا ہے۔

سوم: بعض ائمہ کرام اور علماء نے یہ کہا ہے کہ جب داڑھی کے بال بکھر جائیں اور زیادہ بڑھ جائیں تو مٹھی سے پکڑ کر مناسب تراش خراش جائز ہے۔

لیکن یہ بات بہر حال پیش نظر رہنی چاہئے کہ پوری داڑھی رکھنا سب کے

---

[1] فتح الباری ج ۱۱ کتاب اللباس ص ۵٤۱ باب تقلیم الاظفار رقم الحدیث ۵۸۹۲

[2] ابوداود کتاب الصیام باب القول عندالافطار ۲۳۵۷ السنن الکبری للنسائی دارقطنی ۲٤۰ حاکم ٤۲۳/۱ بیهقی ۲۳۹/٤ ابن السنی ٤۷۸ شرح السنة ۲٦۵/٦

نزدیک افضل ہے۔

کیا سیاہ خضاب لگانا جائز ہے؟

سوال: برمنگھم سے عبدالہادی لکھتے ہیں: عرض یہ ہے کہ آپ کے ماہنامہ "صراط مستقیم" کی وساطت سے مسئلے کی وضاحت چاہتا ہوں۔ مسئلہ کی وجہ دریافت یہ ہے کہ میری عمر اس وقت ۳۵ سال ہے لیکن میری داڑھی اور سر کے بال اکثر سفید ہو گئے ہیں۔ میری بیوی کی عمر ۲۴ سال ہے اور اس کے سر کے بال سیاہ۔ بیوی کے ساتھ چلتا ہوا بوڑھا دکھائی دیتا ہوں۔ بیوی اصرار کرتی ہے کہ داڑھی اور سر کو سیاہ خضاب لگالوں۔

میں مذہبی آدمی ہوں خلاف شرع کام سے ڈرتا ہوں۔ چند دوستوں کو میری پرابلم کا پتہ چلا تو انہوں نے تو تین حوالے بھی جمع کئے تاکہ میری تسلی ہو۔ وہ حوالہ جات آپ کی طرف ارسال کر رہا ہوں تاکہ حوالہ جات کی تصدیق ہو سکے۔

(۱) تیسیر الباری ترجمہ و تشریح صحیح بخاری از مولانا وحید الزماں صاحب جلد ۳ باب المناقب صفحہ ۵۸۱

جب زیاد بن عبید اللہ کے پاس حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک لایا گیا تو سر اور داڑھی کے بال سیاہ خضاب سے رنگے ہوئے تھے۔

مولانا وحید الزماں صاحب اس حدیث کے حاشیہ میں لکھ رہے ہیں کہ اس سے سیاہ خضاب لگانے کا جواز ثابت ہوا۔

(۲) فتاویٰ عالمگیری جلد نہم صفحہ ۱۰۵ پر مرقوم ہے:

غیر حالت جنگ میں بھی خضاب کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

امام ابو یوسف کا قول ہے کہ "جس طرح میں چاہتا ہوں میری بیوی میرے لئے زینت کرے اسی طرح میری بیوی بھی چاہتی ہے کہ اس کے لئے زینت کروں"

(۳) عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ غیروا الشیب و لا تشبهوا بالیهود[1]

(۴) وعن ابی هریرة ان النبی ﷺ قال ان الیهود والنصاری لا یصبغون فخالفوهم۔[2]

جو چند دوست سیاہ خضاب کے خلاف ہیں' وہ کہتے ہیں سب سے پہلے سیاہ خضاب فرعون نے لگایا' لہٰذا ناجائز ہے۔

آپ براہ کرم صراط مستقیم میں صحیح وضاحت فرما کر ہم جیسے جوان بوڑھوں کے لئے کوئی آسان راستہ متعین فرمائیں تاکہ گھریلو زندگی پرسکون رہے۔

جواب: سیاہ خضاب کے بارے میں صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ناجائز ہے اور نبی کریم ﷺ نے اس سے واضح الفاظ میں منع فرمایا ہے اور اس سلسلے میں ذیل کی احادیث خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۱) حضرت ابوبکر صدیق کے والد حضرت ابوقحافہؓ کے بارے میں حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ انہیں فتح مکہ کے دن حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو ان کے سر اور داڑھی کے بال ثغامہ (ایک قسم کی سفید گھاس) کی طرح سفید ہو چکے تھے تو آپؐ نے فرمایا: غیروا هذا واجتنبوا السواد اسے تبدیل کردو مگر سیاہ رنگ سے دور رہنا۔[3]

(۲) حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آخری زمانے میں ایک ایسی قوم آئے گی جو سیاہ خضاب لگائے گی جس طرح کبوتر کے سینے سیاہ ہوتے ہیں ایسی قوم جنت کی خوشبو تک نہ پائے گی۔

(۳) حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں خضاب کے بارے میں مختلف احادیث پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: خضاب کے بارے میں کہتے ہیں کہ جس خضاب کی

---

[1] مشکوۃ للالبانی کتاب اللباس باب الترجل ص۱۲۶۶ رقم الحدیث ٤٤٥٥

[2] مشکوۃ المصابیح للالبانی ج۲ باب الترجل ص ۱۲۶۱ رقم الحدیث ٤٤٢٣

[3] مشکوۃ المصابیح ج۲ باب الترجل ص ۱۲۶۱ رقم الحدیث ٤٤٢٤

اجازت دی گئی ہے وہ سیاہ رنگ کے علاوہ دوسرے رنگ ہیں۔ اس لئے کہ سیاہ خضاب کے بارے میں مرفوع و موقوف احادیث سے عدم جواز واضح طور پر ثابت ہوتا ہے۔

سیاہ خضاب کے جواز میں ابن ماجہ کی یہ حدیث عام طو پر پیش کی جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے خضابوں میں سے بہتر خضاب سیاہ خضاب ہے اس سے تمہاری عورتوں کو رغبت تمہاری طرف زیادہ ہوتی ہے اور تمہاری ہیبت تمہارے دشمنوں پر زیادہ ہوتی ہے۔

اول: تو یہ حدیث ضعیف ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی میں لکھا ہے کہ اس میں دو راوی ضعیف ہیں۔ اس لئے یہ قابل استدلال نہیں ہو سکتی۔

دوم: اگر اس حدیث کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس میں سیاہ خضاب لگانے کی اجازت اس شکل میں ثابت ہوتی ہے جب میدان جنگ میں کوئی شخص اپنے آپ کو جوان بہادر ثابت کرنا چاہے تاکہ دشمن پر اس کا رعب طاری ہو تو ایسی صورت میں وہ اپنے بڑھاپے کو چھپا سکتا ہے یا پھر قبل از وقت بال سفید ہو گئے یعنی چھوٹی عمر میں بڑھاپے کی عمر شروع ہونے سے پہلے کسی وجہ سے سفیدی آگئی تو اس کے لئے بھی اجازت کی گنجائش اس حدیث سے نکالی جا سکتی ہے۔

جہاں تک ان تین دلیلوں کا تعلق ہے جو آپ نے اپنے خط میں تحریر کی ہیں تو ان میں جو سیدنا حضرت حسین بن علیؓ کے سفید بالوں کے سیاہ خضاب سے رنگین ہونے کا واقعہ ہے اگر اسے درست تسلیم کر لیا جائے تو وہ بھی میدان جنگ میں ایک ضرورت کے تحت تھی اسے دلیل نہیں بنایا جا سکتا اور پھر یہ واقعہ یا فتاویٰ عالمگیری کا فیصلہ یا حضرت امام یوسفؒ کا قول یہ سارے دلائل صحیح احادیث کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ جب مسلم شریف کی صحیح حدیث میں آپ نے سیاہ رنگ استعمال کرنے سے منع فرما دیا ہے تو اس کے بعد ان دلائل کا پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی جس حدیث میں آپ نے یہود و نصاریٰ کی مخالفت کر کے رنگ لگانے کا حکم دیا ہے اس میں بھی سیاہ خضاب کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے اس حدیث سے

بھی استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال صحیح احادیث سے سیاہ خضاب لگانے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت امام نوویؒ نے تو اسے حرام قرار دیا ہے۔ حالت جنگ میں جواز موجود ہے اس طرح اگر کسی کے بچپن میں بال سفید ہو جاتے ہیں یا جوانی میں بوڑھا ہو جاتا ہے تو ایک گھریلو ضرورت کے تحت اس کے لئے بھی جواز کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے لیکن اصل میں سیاہ خضاب لگانے کی اجازت بہر حال نہیں ہے۔

کیا لمبی داڑھی والے گستاخ رسول ہوتے ہیں؟

سوال: لیڈز سے محمد یٰسین پوچھتے ہیں

کیا کسی حدیث سے ثابت ہے کہ جن کے ماتھے پر داغ ہوں گے' داڑھی لمبی ہوگی' مونچھیں نہیں ہوں گی وہ گستاخ رسولؐ ہوں گے؟

جواب: عام طور پر اہل بدعت یا ان میں سے بھی جاہل قسم کے اور بد طینت لوگ یہ نشانیاں بیان کر کے مسلمانوں کو گستاخ رسول ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ ایسی کوئی حدیث نہیں جس میں یہ کہا گیا ہو کہ جن کی یہ نشانیاں ہوں گی وہ گستاخ رسول ہوں گے۔ یہ محض جھوٹ اور کم عقلی اور کم علمی کی باتیں ہیں اور پھر یہ تو بالکل بے وقوفی کی بات ہے اس طرح تو ہر جماعت اور ہر فرقے کے بڑے بڑے بزرگ اور علماء نعوذ باللہ گستاخ ٹھہریں گے۔ کیوں کہ ہر فرقے میں ایسے علماء اور نیک لوگ ہیں جن کی پوری داڑھیاں اور سجدے کے نشانات ہیں اور ہمارے ہاں بڑے بڑے پیر حضرات تو ان ظاہر نشانیوں ہی سے لوگوں پر اپنے تقوے اور نیکی کا رعب ڈالتے ہیں۔

عام طور پر لوگ خارجیوں کے بارے میں ایک حدیث پڑھ کر اسے اپنے مخالفین پر چسپاں کرتے ہیں جس میں نبی کریم ﷺ نے خارجیوں کی نشانیوں کا ذکر کیا ہے اور ایسی احادیث تمام علماء کے نزدیک خارجیوں کے بارے میں ہیں جن کے عقائد واعمال کا سب کو علم ہے۔ یہ گروہ آج بھی سلطنت اومان میں پایا جاتا ہے۔

بدعت کے مختلف روپ

علماء سو اور بدعت

سوال: جناب صبح صادق جہلمی تحریر کرتے ہیں: جیسا کہ آپ "صراط مستقیم" کے صفحات میں بدعات پر روشنی ڈالتے رہتے ہیں اور دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر شہر میں کئی مساجد ہیں جہاں یہ بدعات زوروں پر ہیں۔ پوچھنا یہ ہے کہ کیا ان علماء کرام کو یہ بدعتیں نظر نہیں آتیں۔ اگر آتی ہیں تو قوم کو پاکستان میں اور معصوم لوگوں کو اس ملک میں یہ لوگ کیوں گمراہ کر رہے ہیں۔ اس کے پیچھے کیا مقاصد کارفرما ہیں؟

جواب: آپ نے تفصیل سے جواب طلب کیا ہے اس موضوع پر "صراط مستقیم" میں مفصل مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اگر آپ اپنا پورا ایڈریس تحریر کریں تو ہم آپ کو وہ مضامین ارسال کر دیں جن میں ان اسباب و وجوہ کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کی بنا پر علماء خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

یہاں اختصار سے چند باتیں عرض کرتے ہیں کہ علماء سوء ہر دور میں رہے ہیں۔ یہود و نصاریٰ سے لے کر مسلمانوں تک ہر دور میں ایسے علماء آپ کو نظر آئیں گے جنہوں نے دین کو بطور پیشہ اور کاروبار استعمال کیا اور اس کے لئے انہوں نے علم و شرافت کی دھجیاں بکھیریں اور دنیا کے اموال جمع کرنے کے لئے لوگوں کو خوش کیا۔ حق بات کہنے کی بجائے ایسی باتیں کیں اور ایسے مسائل لوگوں کو بتائے جن سے لوگ خوش ہوں اور مولوی حضرات کی جیبیں بھی بھری جائیں۔

اس سلسلے میں قرآن حکیم کی دو آیتیں اور رسول اکرم ﷺ کی دو حدیثیں تحریر کرتا ہوں اگر وقت ملے تو ان کی تفسیر و تشریح کا مطالعہ ضرور کیجئے۔

(۱) ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبة:۳۱)

انہوں نے اپنے عالموں اور درویشوں (پیروں) کو اللہ کے سوا رب بنالیا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عدی بن حاتم نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول میں بھی ان لوگوں میں اسلام سے پہلے شامل رہا ہوں۔ وہ اپنے علماء اور مذہبی پیشواؤں کو رب تو نہیں مانتے۔

اس پر آپؐ نے فرمایا:

"کیوں نہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ جسے وہ حلال کرتے تھے تم اسے حلال سمجھ لیتے تھے۔ وہ جسے حرام ٹھہراتے تم اسے (آنکھیں بند کر کے) حرام سمجھ لیتے۔ پس یہی ان کی عبادت تھی اور ان کو رب بنانا تھا"

آج کل کے علماء سوء اور جاہل عوام کا معاملہ آپ کو اس سے مختلف نظر نہیں آئے گا۔

(۲) دوسری آیت ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (التوبة : ٣٤)

اے ایمان والو! بہت سے عالم اور درویش ناحق طریقے سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

اب اللہ کی راہ سے بظاہر تو کوئی عالم یا پیر نہیں روکتا لیکن جب لوگوں سے ناحق مال بٹورے گا سادہ لوح عوام کو توہم پرستیوں میں مبتلا کر کے ان سے نذرانے وصول کرے گا تو ظاہر ہے کہ پھر وہ صحیح دین کیسے بتا سکتا ہے وہ تو خرافات و توہمات اور بدعات کے ذریعہ ہی اپنا کاروبار چلائے گا۔ ایسا شخص اپنے کاروبار کے ذریعے گویا کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روک رہا ہے۔

یہ بھی علماء اور مذہبی پیشواؤں کے بارے میں ہے۔

(۳) نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

"اللہ کی مخلوق میں سب سے افضل اور اعلیٰ علماء ہیں اور سب سے برے اور

شرار بھی علماء ہی ہیں"

اس حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ علماء کے نام سے ایک ایسا گروہ ہمیشہ موجود رہے گا اور نبی کریم ﷺ نے انہیں سب سے شریر قرار دیا ہے۔

(۴) آپ ﷺ نے قیامت کے قریب کی علامات کا جہاں ذکر فرمایا وہاں یہ بھی فرمایا کہ:

"ایسے جاہل علماء کے روپ میں سامنے آجائیں گے جو بغیر علم کے دین کے مسائل بتائیں گے اور فتوے دیں گے۔ فضلوا واضلوا[1] خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے"

ان آیات کریمہ واحادیث نبویہ سے ایسے گروہ کے بارے میں آپ کو ضروری تعارف یقیناً حاصل ہو گیا ہو گا۔

رجب کے کونڈے

سوال: ریڈنگ سے کرم الٰہی تحریر کرتے ہیں

رجب کے چاند کی بائیس تاریخ کو اکثر لوگ خاص کر شیعہ حضرات کونڈے دیتے ہیں ان کے متعلق ذرا تفصیل سے بتائیں۔

جواب: رجب کے مہینے میں بے خبر اہل سنت اور شیعہ حضرات میں جو رسمیں رائج ہیں ان میں ایک کونڈے دینے یا کونڈے بھرنے کی رسم بھی ہے۔ یہ اور اس طرح کی دوسری رسومات کی دین میں کوئی اصل نہیں۔ بلکہ دین میں اضافہ اور دین کے نام پر کھانے پینے کا ذریعہ ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق کونڈوں کی رسم کچھ اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ کھیر یا کوئی میٹھی چیز ۲۱ رجب کو شب کو تیار کر کے رکھ دیتے ہیں پھر

---

[1] ترمذی مترجم ج۲ ابواب العلم باب ما جاء فی ذهاب العلم ص ۲۰۶

اس پر حضرت جعفر صادق کے نام کا ختم پڑھا جاتا ہے۔ ختم کے الفاظ کا ہمیں پوری طرح علم نہیں ہے۔ کیونکہ ہر جگہ اور ہر علاقے میں مولوی اور میاں حضرات نے الگ الگ الفاظ بنائے ہوئے ہیں یا قرآن کی بعض سورتوں کا انتخاب کیا ہوا ہے' اس کے بعد ۲۲ کو یہ چیز عزیز و اقارب اور دوست واحباب مل کر کھاتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ غیر ثابت چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت جعفر صادق کی وفات ۲۲ رجب کو نہیں بلکہ صحیح تاریخی روایت کے مطابق ۱۵ شوال کو ہوئی ہے اور اگر ۲۲ رجب بھی ہو تو کسی کی وفات سے آخر کونڈوں یا کھانے پینے کا کیا تعلق ہے؟ تاریخ اسلام میں جو اتنی بڑی بڑی ہستیاں گزری ہیں اگر سب کی پیدائش یا وفات کے دن کونڈے بھرنے یا کھانے پینے کا سلسلہ شروع کیا جائے تو پھر سال میں شاید کوئی دن بھی ایسا نہیں ہو گا جس میں کسی بزرگ کی پیدائش یا وفات نہ ہوئی ہو تو پھر حضرت جعفر صادق کے ساتھ اس کا کیا تعلق؟ ہر وہ چیز جو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے ثابت نہ ہو وہ دین میں بدعت ہو گی۔ اسے دنیاوی رسم ہی کہا جائے گا' اس کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔

سوال: ہمارے ہاں بعض لوگ حضرت جعفر صادقؒ کے نام کے کونڈے دیتے ہیں اور کہتے ہیں اس سے رزق میں اضافہ ہوتا ہے۔

جواب: ہر وہ کام جو ثواب کی نیت سے کیا جائے مگر اس پر کتاب و سنت سے دلیل نہ ہو تو وہ عمل غیر مقبول ہے۔ حضرت جعفر صادق یا حضرت فاطمہ الزہرا ؓ کے نام کے کونڈے دینے ایسے عمل میں سے ہیں جس کا ثبوت خیر القرون میں نہیں ملتا۔ بخاری شریف کی حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رد [1] جو شخص ہمارے دین میں کوئی ایسی بات پیدا کرے گا جو دین میں سے نہیں ہے تو وہ مردود ہو گی۔ اس لئے یہ محض ایک رسم ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔

---

[1] صحیح البخاری کتاب الرقاق باب الانتهاء عن المعاصی

اور ایسا عمل بجائے ثواب کے موجب گناہ ہو سکتا ہے لہٰذا ہمیں رسموں سے اجتناب کر کے صحیح اور اصل دین پر چلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

برتھ ڈے اور شادی کی سالگرہ کی شرعی حیثیت

سوال: ویمبلے (مڈل سیکس) سے نذیر احمد تحریر کرتے ہیں: مندرجہ ذیل امور کے متعلق قرآن و سنت کی روشنی میں تسلی بخش جواب دیں تاکہ جملہ قارئین اس سے مستفید ہو سکیں۔

۱۔ وہ مسلمان جو پیغمبر اسلام ﷺ کا یوم میلاد منانا قرآن و سنت سے استدلال کر کے بدعت اور خلاف شروع قرار دیتا ہے لیکن اپنے بچوں کا برتھ ڈے اور شادی کی سالگرہ اہتمام اور خوشی سے مناتا ہے اور وہی مسلمان کسی دوسری برتھ ڈے پر شرکت کرتا ہے اس کے انتظام میں آگے آگے ہوتا ہے۔ ایسے شخص کے متعلق قرآن و سنت کی روشنی میں بتائیں کہ اس کا یہ طرز عمل اسلامی ہے یا غیر اسلامی؟

جواب: ۱۔ حدیث نبویؐ کی روشنی میں بدعت کی تعریف یہ ہے کہ دین میں کسی ایسی نئی بات کا اضافہ کرنا جس کی آپؐ کی زندگی میں کوئی دلیل نہ ہو حالانکہ بعد میں نہ کوئی ضرورت پیدا ہوئی اور نہ ہی آپ کے زمانے میں اس کام کے کرنے میں کوئی امر مانع تھا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منه فھو رد[1]

جس کسی نے ہمارے اس معاملے میں کوئی نئی بات نکالی تو وہ مردود ہوگی۔

اس حدیث میں "اس معاملے" کے جو الفاظ ہیں ان سے واضح ہو گیا کہ دینی معاملات میں اجر و ثواب کی نیت سے اور اللہ کا قرب تلاش کرنے کی غرض سے جو نیا کام کیا جائے گا وہ بدعت ہوگا اور دینی معاملات میں اپنی طرف سے اضافہ بدعت ہوگا

[1] بخاری کتاب الرقاباب الانتہاء عن المعاصی

اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ بعض لوگ جہالت سے کہہ دیتے ہیں کہ موٹر کار عینک اور ٹوپی وغیرہ یہ بھی نئی چیزیں ہیں تو کیا یہ بھی بدعت ہیں؟ یہ چیزیں اس لئے بدعت شمار نہیں ہوں گی کہ یہ دین میں اضافہ نہیں اور کوئی بھی شخص ان چیزوں کے استعمال میں ثواب نہیں ڈھونڈتا اور نہ ہی انہیں قرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتا ہے اس لئے کہ یہ ضروریات زندگی میں سے ہیں جنہیں دین میں زیادتی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس بنیاد پر اگر کوئی شخص کسی نئے کام کو بدعت قرار دیتا ہے جیسے مروجہ میلاد وغیرہ تو وہ صحیح موقف اختیار کرتا ہے۔ جہاں تک برتھ ڈے اور سالگرہ منانے کا تعلق ہے۔ یہ ایک ماڈرن بدعت ضرور ہے لیکن بدعت کی شرعی تعریف اس پر صادق نہیں آتی کیونکہ کوئی بھی شخص اپنے بیٹے کی برتھ ڈے اور شادی کی سالگرہ ثواب کی نیت سے یا قرب الٰہی کی غرض سے نہیں کرتا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ یہ کام اب جائز ہو گیا ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے یہ بدعت سے بھی سنگین ہے کیونکہ یہ غیر مسلموں خصوصاً یہود و نصاریٰ کی تقلید میں کیا جاتا ہے اور غیروں کی تقلید اور ان کی مشابہت کو نبی کریم ﷺ نے سخت گناہ قرار دیا ہے۔ برتھ ڈے سالگرہ پھر ان مواقع پر کیک کاٹنا موم بتیاں جلانا اور بجھانا اس طرح کی تمام خرافات مسلمان غیر مسلموں سے لے رہے ہیں۔ یہ روش مسلمانوں کے اسلامی تشخص کے لئے تباہ کن ہے۔

نبی کریم ﷺ نے متعدد مناسبتوں سے ارشاد فرمایا کہ:

خالفوا الیھود والنصاری۔

کہ یہود و نصاریٰ کی تقلید کی بجائے ان کی مخالفت کرو۔

ایک اور حدیث میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا

من تشبه بقوم فهو منهم[1]

جو شخص کسی دوسری قوم (غیر مسلم) کی مشابہت اختیار کرے وہ ان ہی میں سے ہے۔

---

[1] المعجم الاوسط للطبرانی ج۹ ص ۱۵۱ رقم الحدیث ۸۳۲۳

غیروں کی تقلید میں کیے جانے والے یہ کام ایک لحاظ سے بدعت قرار دیے جاسکتے ہیں۔ مسند احمد کی ایک حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:

ما ابتداع قوم بدعة الا نزع الله عنهم من السنة مثلها۔[1]

کوئی قوم جب بدعت جاری کرتی ہے تو اللہ اس کے بدلے میں ان سے سنت اٹھالیتے ہیں۔

اور بچوں کی پیدائش اور دوسری مناسبتوں سے ڈے منانے والے یہ لوگ سنتوں کو ترک کرتے ہیں۔ بچے کے کان میں اذان' اس کے بال کٹوانے اور عقیقہ جیسی سنتوں سے محروم کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ ان کی جگہ انہوں نے انگریزوں کی سنتوں کو اپنالیا ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ جو شخص ایسی تقریبات میں شرکت کرتا ہے اس کی کیا پوزیشن ہوتی ہے تو ظاہر ہے بدعت اور معصیت کے کسی کام میں شرکت اس سے تعاون کے مترادف ہے۔ اس لئے ایسی تقریبات میں عمومی طور پر شرکت جائز نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص اس نیت سے شریک ہوتا ہے کہ وہاں تبلیغ کرے گا یا اس مروجہ رسم سے انہیں روکنے کی کوشش کرے گا تو یہ الگ بات ہے اور جو شخص ایسی تقریبات میں ذوق و شوق سے شریک ہوتا ہے بلکہ ان کا اہتمام کرتا ہے تو اس کے اس فعل کو اسلامی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مروجہ عرس و گیارہویں کیوں جائز نہیں؟

سوال: برمنگھم سے محمد بشیر نقشبندی لکھتے ہیں کہ بصد احترام و آداب میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کچھ عرصہ پہلے آپ نے عرس حضرت ہجویری پر کچھ اعتراض کیا اور گیارہویں شریف پر بھی اور اس کا پروف۔ چاہتے ہیں۔ نقشبندی صاحب آگے لکھتے ہیں

[1] تفهيمات الهية ج۲ ص ٦٤

کہ یہ چیزیں جن پر آپ اعتراض کرتے ہیں آپ کے پیشوا حضرت شاہ ولی اللہ کے مکتوبات اور نواب صدیق حسن بھوپالی کی تصنیف الداء والدواء سے حوالہ دوں گا۔

اس کے بعد ایک دو واقعات نقل کرتے ہیں۔ ایک میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خواب کو بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے بہت سے اولیاء اللہ کو حلقہ باندھ کر مراقبہ میں بیٹھے دیکھا جن میں خواجہ نقشبند دوزانو اور حضرت جنید تکیہ لگا کر بیٹھے ہیں اور سب استغناء ماسوا اللہ اور کیفیات فنا میں ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ سب حضرات حضرت علیؓ کے استقبال کے لیے جا رہے ہیں۔ حضرت علیؓ کے ساتھ اس موقع پر حضرت اویس قرنی بھی ہیں۔ ایک حجرہ نہایت صاف تھا۔ اس میں یہ بزرگ داخل ہو گئے۔ وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ آج غوث الثقلین کا عرس ہے۔

ایک واقعہ شاہ عبدالرحیمؒ کا لکھا ہے کہ وہ خواجہ باقی باللہ کے عرس کا منظر بتاتے ہیں کہ کوئی ان کے سامنے چاول کوئی گوشت اپنے ذمہ لیتا اور کوئی کہتا میں فلاں قوال لاؤں گا۔

جواب: نقشبندی صاحب کے طویل خط کا خلاصہ ہم نے نقل کر دیا ہے۔ ان کا سوال یہ ہے کہ جب مذکورہ بزرگان دین (جن کو انہوں نے ہمارے پیشوا کہا ہے) یہ کام کرتے ہیں تو آپ کیوں نہیں مانتے یا اس طرح کے کاموں کو ناجائز اور بدعت کیوں سمجھتے ہیں۔ اصل موضوع تو عرس اور گیارہویں کی شرعی حیثیت ہے لیکن اس سے پہلے میں چند امور کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں تاکہ نقش بندی صاحب کے ذہن میں جو شبہات ہیں ان کے ازالے میں آسانی رہے۔

(۱) انہوں نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ آپ کے پیشوا حضرت شاہ ولی اللہ تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ ہمارے ہادی و پیشوا تو سرور دو عالم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ شریعت ان پر نازل ہوئی ہے نہ کہ شاہ ولی اللہ پر۔ ہمارا یہ عقیدہ اور ایمان ہے کہ غلطیوں سے پاک اور مبرا صرف انبیاء کرام ہیں انہیں بذریعہ وحی براہ راست اللہ تعالیٰ کی راہنمائی حاصل ہوتی ہے جب کہ کسی بھی امتی کو یہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا

اور دوسروں سے اجتہادی غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ بلاشبہ تمام ائمہ دین' محدثین' اولیاء کرام اور علماء امت قابل احترام ہیں۔ ہر مسلمان کے لئے ان کا ادب و احترام ضروری ہے لیکن نبی کریم ﷺ کے فرمان کے مقابلے میں ان کی بات چھوڑی بھی جاسکتی ہے جبکہ آپ کی کسی ایک بات کا انکار بھی کفر ہے۔

(۲) ہاں علماء دین کی ایسی باتیں جن میں نصیحت و خیر خواہی ہو اور حضور اکرم ﷺ کے فرامین کے مطابق و موافق ہوں ایسی باتوں کو ضرور قبول کرنا چاہئے لیکن اصل پیشوا کا مقام سرکار دو عالم کو حاصل ہے۔

(۳) اس لئے میرے بھائی ہم شاہ ولی اللہ اور نواب صدیق حسن خان کی ہر بات ماننے کے پابند نہیں ہیں۔ یہ شان سوائے رسول اللہ ﷺ کے اور کسی کو حاصل نہیں۔

(۴) یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ نقشبندی صاحب نے یہاں اپنے موقف کی بنیاد ایک خواب پر رکھی ہے۔ بھائی صاحب دین یا شریعت کا کوئی مسئلہ کبھی بھی خواب کے ذریعے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے سامنے جب کائنات کی سب سے عظیم ہستی کی ۲۳ سالہ زندگی کی واضح روشن اور کامل بیداری کی ہدایت موجود ہے تو یہاں ہمیں کسی خواب کا سہارا لینے کی آخر کیا ضرورت ہے۔ آج کل کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ قرآن و صحیح احادیث چھوڑ کر من گھڑت قصوں خوابوں اور کہانیوں پر اعتماد کیا جاتا ہے جب کہ بزرگان دین کا تو یہ حال تھا کہ وہ سند کے بغیر احادیث بھی قبول نہیں کرتے تھے اور پھر عقائد کے لیے تو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ مگر یہاں یہ حال ہے کہ عقائد کے معاملے میں بھی جھوٹے' فضول اور من پسند خوابوں ہی کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ آج کل کے زیادہ تر واعظ بھی قرآن و حدیث کی بجائے شعر و شاعری اور موضوع قصوں ہی سے عوام کا دل بہلاتے ہیں۔

(۵) اگر خوابوں پر دار و مدار ہو تو یہود و نصاریٰ کے علاوہ بت پرست اور آتش پرست بھی اپنے مذہب کی حقانیت کے لئے جو خواب بیان کرتے ہیں انہیں بھی ماننا

ہوگا۔ مرزا غلام احمد قادیانی بھی شروع میں خواب ہی بیان کیا کرتے تھے۔ اس لئے خواب جس بزرگ کو آئے یہ اس کے اور اللہ کے درمیان ہے دوسرے کے لئے کسی کا خواب ہرگز شرعی حجت یا دلیل نہیں بن سکتا۔

(۶) ہمارے لئے اصل راہنمائی کے دو صاف اور شفاف چشمے ہیں وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہیں۔ جیسا کہ نبی کریم صص ۔نے حجتہ الوداع کے موقع پر اپنے تاریخی خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ میں تمہارے لئے دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری سنت جب تک ان دونوں پر مضبوطی سے قائم رہو گے تم کبھی گمراہ نہیں ہو سکتے۔

ایک دوسری حدیث حضرت عرباض بن ساریہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ہمیں وعظ فرمایا۔ اس حدیث میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی فرماتے ہیں میرے بعد جب تم زیادہ اختلاف دیکھو گے تو میری اور میرے صحابہ کی سنت پر مضبوطی سے قائم رہنا۔

اور پھر صحابہ کرامؓ کے زمانے میں یہ حال تھا کہ اگر حضور ﷺ کی بات کے مقابلے میں وہ کسی دوسرے کی بات سنتے تو اسے ہرگز قبول نہ کرتے۔

ان ضروری باتوں کی وضاحت کے بعد اب نقشبندی صاحب غور کریں کہ کیا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے زمانے میں مروجہ عرس یا گیارہویں جیسی کسی رسم کا دور دور تک بھی نشان ملتا ہے؟ کیا رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد خلفاء راشدین اور دوسرے صحابہؓ نے آپ کا عرس کیا؟ تو کیا نعوذ باللہ یہ ساری پاک ہستیاں عرس کی نیکیوں اور سعادتوں سے محروم ہی رہی ہیں۔ ہمارا یہی دعویٰ ہے کہ یہ کھانے پینے کی رسمیں اور عوام کا مال بٹورنے کے بہانے ہیں اور ہم ایسی کوئی بات قبول نہیں کر سکتے جس کا ثبوت قرآن و حدیث یا عمل صحابہ سے پیش نہ کیا جائے بلکہ اس کے برعکس مروجہ عرسوں میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کے واضح فرامین موجود ہیں۔ اب نقشبندی سے گزارش ہے کہ وہ درج ذیل احادیث پر

خلوص و دیانت سے غور کریں اور پھر خود ہی فیصلہ فرمائیں۔

پہلی حدیث: **لا تجعلوا قبری عیدا۔**[1]

یعنی میری قبر کو عید گاہ نہ بناؤ"۔

اب عید کا معنی ہے بار بار لوٹ کر آنا۔ ہر وہ جگہ عید ہے جہاں لوگ بار بار جاتے ہیں اور وہ زمانہ اور وقت عید ہے جس میں کوئی کام بار بار کیا جاتا ہے اور ہر وہ مجمع عید ہے جو بار بار اکٹھا ہوتا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم ﷺ کے اس ارشاد کی تعمیل کی اور کبھی بھی آپ کی قبر پر مجمع نہیں لگایا نہ وہاں کبھی لنگر تقسیم ہوئے اور نہ کبھی وقت مقرر کر کے وہاں میلے کی شکل بنانے کی اجازت دی۔ وہ آپ کی قبر پر جاتے تو عزت و وقار سے سلام پڑھ کر واپس تشریف لے آتے۔ دوسری طرف اپنے میلوں اور عرسوں کا حال بھی نقشبندی صاحب کے سامنے ہے کہ مسلمان کس ذوق و شوق سے ایسے میلوں میں جاتے ہیں اور پھر وہاں کن خرافات و منکرات میں مبتلا ہوتے ہیں اور مردوں و عورتوں کے اختلاط سے کیا کیا خرابیاں رونما ہوتی ہیں۔ برطانیہ میں چونکہ بزرگان دین کی قبریں تو ہم ساتھ نہیں لا سکے لیکن ان کے ناموں کے بورڈ لگا کر یہاں دربار قائم کر دیئے اور قبروں کی بجائے مساجد میں عرس شروع کر دیئے اور ایسی مساجد میں جب عرس ہوتے ہیں تو لوگ وعظ و نصیحت کے شوق کی بجائے زیادہ تر کھانے پینے کا ذوق پورا کرنے جاتے ہیں۔ جس کے بے شمار شواہد ہمارے پاس موجود ہیں۔ بشیر صاحب کہیں یہ خیال نہ کریں کہ ہم نے اس حدیث میں لفظ عید کا ترجمہ درست نہیں کیا' اس لئے ہم ان کے ایک بزرگ مشہور عالم و مفسر قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کی وضاحت نقل کرتے ہیں جو حنفی مسلک کے جید عالم ہیں اور اہل حدیث دیوبندی اور بریلوی میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

قاضی ثناء اللہ صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] مشکوۃ کتاب الصلاۃ باب الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و فضلها رقم ۹۲۶ بحوالۃ نسائی . ابوداود کتاب المناسک باب زیارۃ القبور ۲۰۴۲

لا یجوز ما یفعله الجهال بقبور الاولیاء الشهداء من السجود والطواف حولها و اتخاذ السرج والمساجد الیها و من الا جتماع بعد الحول کالاعیاده یمونه عرسا۔ (تفسیر مظہری ۲/ ۶۵)

ترجمہ: "جاہل لوگ حضرات اولیاء و شہداء کے مزارات پر جو کچھ کرتے ہیں وہ سب ناجائز ہے۔ ان کو سجدہ کرنا' ان کے گرد طواف کرنا' ان پر چراغاں کرنا' اور ان کی طرف سجدے کرنا اور ہر سال میلوں کی طرح ان پر جمع ہونا جس کا نام عرس ہے' یہ سب ناجائز ہیں۔" اب یہاں قاضی صاحب نے عید کا معنی عرس ہی لیا ہے۔

دوسری حدیث: بخاری و مسلم میں ہے کہ حضرت ام جنید اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے حبش کے دو ایسے گرجاؤں کا ذکر رسول اللہ ﷺ کے سامنے کیا جس میں انہوں نے تصاویر دیکھی تھیں تو اس پر آپؐ نے فرمایا:

ان اولئك اذا كان فیهم الرجل الصالح فمات بنوا علی قبره مسجدا وصوروا تلك الصورة اولئك شرار الخلق عند الله یوم القیامة[1]

ان لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ جب ان میں کوئی نیک آدمی مر جاتا ہے تو اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے ہیں اور نیک بندوں کی تصویریں نقش کر لیتے ہیں یہی لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہوں گے۔

آج کے دور سے رسول اللہ ﷺ کا یہ سچا فرمان کتنی مطابقت رکھتا ہے۔ میں نے برطانیہ کے ایک شہر میں اپنی آنکھوں سے ایک پیر صاحب کی فوٹو پونڈوں کے عوض فروخت ہوتی دیکھیں اور بیچارے مرید دھڑا دھڑ خرید بھی رہے تھے۔

تیسری حدیث: مؤطا امام مالکؒ میں ہے:

ان رسول الله ﷺ قال اللهم لا تجعل قبری وثنا یعبد اشتد غضب

---

[1] فتح الباری ج۳ کتاب الجنائزة باب بناء المساجد علی القبر ص ٥٦٩ رقم الحدیث ١٣٤١

اللہ علی قوم اتخذوا قبور انبیاء ھم مساجد۔[1]

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! اے اللہ میری قبر کو بت کی طرح نہ بنانا جس کی پوجا کی جائے اس قوم پر اللہ کا سخت عذاب آئے جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا"

اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی اور آپ کے روضہ اطہر کو ان خرافات سے محفوظ رکھا۔

چوتھی حدیث: مسلم شریف میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

الا و ان من کان قبلکم کانوا یتخذون قبورا انبیائھم و صالحیھم مساجدا الا فلا تتخذوا القبور مساجد انی انھاکم عن ذالک۔[2]

"خبردار ہو۔ تم سے پہلے لوگوں نے اپنے نبیوں اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔ خبردار تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا۔ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں"

نقشبندی صاحب کو ہم بتاسکتے ہیں کہ کتنے مزاروں اور درباروں پر زندہ و مردہ بزرگوں کو سجدے کئے جارہے ہیں۔

پانچویں حدیث: ابن ماجہ' ترمذی' نسائی اور ابوداؤد کی حدیث ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال لعن رسول اللہ ﷺ زائرات القبور و المتخذین علیھا المساجد و السرج۔[3]

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لعنت بھیجی قبروں پر

---

[1] مسند احمد ۲/۲۴۶' موطأ کتاب قصرالصلاۃ فی السفر رقم الحدیث ۸۵ باب جامع الصلاۃ

[2] مسلم مترجم ج ۱ کتاب المساجد باب النھی عن بناء المساجد علی القبور ص ۱۰۵

[3] سنن نسائی مترجم ج ۱ کتاب الجنائز باب التغلیظ فی اتخاذ السرج علی القبور ص ۷۲۰ رقم الحدیث ۲۰۴۷

جانے والی عورتوں پر اور ان پر بھی جو قبروں کو مسجدوں کی طرح بنا لیتے ہیں اور ان پر جو وہاں چراغ جلاتے ہیں۔

کتنے پیارے طریقوں سے سرور کونین ﷺ نے بار بار تنبیہ فرمائی۔ اگر مسلمان اب بھی اس پر توجہ نہ دیں تو غور کیجئے کہ روح پاک پر کیا گزرے گی؟

ہم اب فیصلہ نقشبندی صاحب پر چھوڑتے ہیں کہ وہ رسول اللہ کی صحیح اور سچی باتیں مانتے ہیں یا شاہ ولی اللہ کے خواب اور نواب صدیق حسن خان اور شاہ عبدالرحیم کے نقل کردہ واقعات؟

یہاں تک تو ہم نے قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ وضاحت کر دی ہے کہ مروجہ عرس کا قرآن یا سنت سے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان موقعوں پر ہونے والے بیشتر اعمال رسول اکرمؐ کی تعلیمات کے خلاف ہیں لیکن نقشبندی صاحب نے اپنے خط میں چونکہ بزرگان دین کے اقوال کے حوالے دیئے ہیں اس لئے ان کی مزید تسلی اور اطمینان کے لئے ہم بھی شاہ صاحب کا قول پیش کرتے ہیں جس سے زیر بحث موضوع اور ان علماء امت کا موقف بھی واضح ہو جاتا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

نقش بندی صاحب نے عرس کے بارے میں شاہ صاحب کا ایک خواب بیان کیا ہے جبکہ عالم بیداری میں شاہ صاحب کے ارشادات بحوالہ ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ شاہ صاحب اپنی عظیم الشان اور معرکہ آراء کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

لا تجعلوا زيارة قبری عيدا اقول هذا اشارة الى سد مدخل التحريف كما فعل اليهود والنصارى بقبور انبياء هم وجعلوها عيدا ما سما بمنزلة الحج۔ (حجۃ اللہ البالغہ ص ۷۷ ج ۲ طبع مصر)

میں کہتا ہوں کہ آپؐ نے جو یہ فرمایا کہ میری قبر کی زیارت کو عید نہ بناؤ' اس میں اشارہ ہے کہ تحریف کا دروازہ بند کر دیا جائے کیونکہ یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء کی قبروں کو حج کی طرح عید و میلہ بنا دیا تھا۔

اپنی دوسری کتاب میں شاہ صاحب تحریر کرتے ہیں:

و من اعظم البدع ما اخترعوا فی امر القبور و اتخذوھا عیدا۔

(تفہیمات الٰہیہ ج ۲ ص ٦٤)

بڑی بدعتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں نے قبروں کے بارے میں بہت سی باتیں اپنی طرف سے بنالی ہیں اور قبروں کو میلہ گاہ بنالیا ہے۔

میرے خیال میں نقشبندی صاحب کے لئے شاہ صاحب کے خواب سے ان کی بیداری کی باتیں زیادہ قابل اعتماد ثابت ہوں گے۔

انہوں نے آخر میں جو یہ لکھا ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ کے دادا کے وقت بھی مزارات پر عرس منایا جاتا تھا' یہ بھی کوئی دلیل نہیں۔ ہمارے لئے سند اور دلیل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے وقت کی بات ہوگی نہ کہ شاہ صاحب کے دادا صاحب کے وقت کی۔

باقی گیارہویں کے بارے میں ہم اس سے پہلے تفصیل سے بحث کر چکے ہیں کہ اس رسم کی بھی کوئی اصل نہیں۔ خود منانے والوں کی اکثریت کو اس کے شان نزول کا پتہ نہیں اور پھر بات بھی سوچنے کی ہے کہ ایک خاص تاریخ کو گھر والے مل کر کھیر کھالیں یا مسجد میں نمازی جمع ہو کر گیارہ تاریخ کو زردہ پلاؤ سے پیٹ بھر لیں تو اس سے کسی غریب کو کیا فائدہ یا کسی روح کو ثواب پہنچنے کا کیا احتمال ہے؟ یہ تو سب کھانے پینے کے ڈھنگ ہیں بھائی۔ شریعت محمدی میں اس کا کوئی نہ اصل ہے نہ ثبوت۔ اللہ تعالیٰ ضد اور تعصب کے بغیر ہم سب کو حق سمجھنے اور اس پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین!

گیارہویں شریف مستحب ہے؟

سوال: لندن سے محمد عبداللہ پوچھتے ہیں کہ جنگ اخبار میں کسی صاحب نے گیارہویں شریف کو مستحب قرار دیا ہے۔ آپ بھی اس پر روشنی ڈالیں۔

جواب: حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی چھٹی صدی ہجری کے وہ عظیم بزرگ گزرے ہیں جن کی ذات اقدس سے امت محمدیہ نے بہت فیض حاصل کیا اور انہوں نے سنت نبوی کی اشاعت کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیں وہ خود بھی عمل بالحدیث ہی کو افضل سمجھتے تھے اور دوسروں کو عمل بالحدیث کی تلقین کرتے تھے جس پر ان کی معرکہ آراء کتاب غنیۃ الطالبین بھی گواہ ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کا احترام اور ان سے محبت کو ہم ایمان کا جزو سمجھتے ہیں اور اولیاء اللہ کی شان میں گستاخی کرنے والے کو ہم اللہ تعالیٰ کا دشمن سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اولیاء اللہ کی محبت کا صحیح معیار یہی ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں ان کی اتباع کی جائے اور جن چیزوں سے ان بزرگوں نے منع کیا ہے' ان سے باز رہا جائے اس کے علاوہ محبت کا اور کوئی معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ انبیاء میں سے ہیں مسلمان ان کو اللہ کا مقدس رسول مانتے ہیں مگر عیسائیوں نے محبت میں اتنا غلو کیا کہ انہیں خدا کا بیٹا بنا دیا اب جو مسلمان حضرت عیسیٰ کو عیسائیوں کی طرح نہیں مانتا یا ان کو خدا کا بیٹا نہیں مانتا تو عیسائی کہتے ہیں تم عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانتے اور ان کا رتبہ گھٹاتے ہو۔ اسی طرح آج کل مسلمانوں کا ایک گروہ ان لوگوں پر اولیاء اللہ کی توہین کا الزام لگا دیتا ہے جو ان کے خود تراشیدہ عقیدے کو نہ مانے یا جو محبت کے اس معیار کو تسلیم نہ کرے جو انہوں نے خود قائم کر رکھا ہے۔

(۱) گیارہویں کے بارے میں جو دلائل دیئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ

ہے کہ یہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے وصال کا دن ہے اور یوم وصال منانا جائز ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر گیارہویں کی طرز کا کسی نیک آدمی کا یوم وصال منانا کوئی نیکی کا کام ہوتا تو ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ پہلے انبیاء کا یوم وصال منا کر ہمیں ایک نمونہ دے جاتے۔ پھر صحابہ کرام خود سرور دو عالم ﷺ کا یوم وصال اس انداز سے مناتے جس طرح آج کل گیارہویں منائی جارہی ہے مگر اس چیز کا کسی کے ہاں کوئی ثبوت نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ آج کے دور میں ہمیں بزرگوں کے یوم وصال منا کر ثواب حاصل کرنے کی بہت ضرورت ہے ان لوگوں کو اس کی حاجت نہ تھی تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے پانچ چھ سو سال پہلے کیا کوئی ایسا بزرگ نہیں گزرا جن کا ہم یوم وصال منا سکیں؟ رسول اکرم ﷺ پھر خلفاء راشدین اور پھر صحابہ کرام کی عظیم جماعت ان سب کو چھوڑ کر آخر ہم صرف شاہ جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا یوم وصال کیوں مناتے ہیں؟ اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ گیارہویں تو ہر مہینے کو دی جاتی ہے جب کہ یوم وصال سال میں ایک بار گزرتا ہے اور اس کے علاوہ تاریخ میں شاہ صاحب کی تاریخ وصال پر بھی اتفاق نہیں۔ ۸، ۹، ۱۱ اور ۱۷ مختلف روایات ہیں۔

(۲) جہلا کا ایک گروہ تو اسے کھلم کھلا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام کی نذر و نیاز قرار دیتا ہے اور وہ برملا کہتے ہیں کہ ہم نے شاہ جیلانی کے نام کی گیارہویں پکائی یعنی ان کے نام کی نذر کی۔ اس کے حرام ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں کیونکہ یہ غیر اللہ کے نام کی ہے اور نذر و نیاز یہ ایک مالی عبادت ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے جیسے التحیات کے الفاظ میں صراحت ہے کہ التحیات للہ والصلوات والطیبات تمام قولی بدنی اور مالی عبادتیں صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔

(۳) جہلا کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ گیارہ تاریخ کو ہم اس لئے گیارہویں دیتے ہیں کہ شاہ صاحب نے گیارہ سال کے ڈوبے ہوئے بیڑے کو نکالا تھا۔ یہ محض ایک بے اصل اور بے سند حکایت ہے جسے کوئی بھی عالم بیان نہیں کر سکتا اور کوئی سمجھ

دار آدمی ایسی گپ کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ رسم ثواب کے لئے ہے تو پھر ثواب کسی کو بھی پہنچانے کے لئے دن یا تاریخ کا مقرر کر لینا اپنی طرف سے اس کا کوئی ثبوت نہیں اور نہ ہی ایصال ثواب کے لئے کھیر یا کسی اچھے کھانے کی شرط ہے۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک رسم ہے جس کا تحفظ مذہبی بہروپیوں کے ایک گروہ نے اس لئے کیا کہ اس طرح ان کا کاروبار خوب چمک رہا ہے۔ ختم یا چہلم تو گاہے گاہے ہوتے ہیں' برسی یا سالگرہ کے لئے بھی سال بھر انتظار کرنا پڑتا ہے لیکن کوئی مرے یا نہ مرے گیارہویں شریف تو ہر مہینے آہی جاتی ہے اس سے تو فرار نہیں لہٰذا سادہ لوح مسلمان اس رسم کی پابندی بڑے ذوق و فکر سے کرتے ہیں' چاہے وہ فرائض و واجبات سے غافل ہوں۔ اب ایک چیز جو پانچ چھ سو سال بعد وجود میں آئی اسے مستحب کہنا جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

گیارہویں شریف کی حقیقت کیا ہے؟

سوال: لیڈز سے محمد یٰسین لکھتے ہیں

گیارہویں شریف کے بارے میں وضاحت کریں کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ یہ فرض ہے یا واجب یا سنت؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح کریں اور پیران پیر عبدالقادر جیلانی کے زمانے میں گیارہویں کس طرح کرتے تھے؟

جواب: گیارہویں شریف کے بارے میں "صراط مستقیم" میں متعدد بار مفصل مضامین شائع ہو چکے ہیں آپ صراط مستقیم کے پرانے رسالوں میں ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ

قرآن و حدیث میں گیارہویں جیسی رسم کا نہ ذکر ہے نہ ثبوت۔ اگر یہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام کی دی جاتی ہے یا انہیں راضی اور خوش کرنے کے لئے ہے تو یہ حرام ہے کیوں کہ یہ غیر اللہ کے نام کی نذر ہے اور نذر لغیر اللہ قرآنی نص

کے ذریعے حرام ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ (المائدة : ٣)

اللہ نے تم پر مردار اور خنزیر کا گوشت اور جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام نذر کی گئی ہو' ان سب کو حرام قرار دیا ہے۔

اب اگر تو یہ غیر اللہ کے نام کی ہے یا اللہ کے سوا کسی کو راضی کرنے یا اس لئے کہ اس کے نام کی نذر دینے سے وہ ان کی کوئی مشکل حل کر دے گا تو ایسی تمام صورتیں حرام ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ صرف حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کو ثواب پہنچانے کے لئے گیارہویں دیتے ہیں یہ غیر اللہ کی نذر تو نہیں ہوئی لیکن ثواب پہنچانے کے اس طریقے کا ثبوت بھی قرآن وحدیث میں نہیں ہے۔ یہ محض ایک رسم بن گئی ہے ورنہ حضرت پیران پیر کے علاوہ بھی تو بے شمار بزرگان دین اور اولیاء امت ہیں۔ آخر ان کے نام کی یا انہیں ثواب پہنچانے کے لئے کوئی گیارہویں یا بارہویں کیوں نہیں دی جاتی؟

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو محض صدقہ وخیرات کرتے ہیں۔ یہ تو کسی نام کی نذر ونیاز نہیں۔ یہ اس لیے غلط ہے کہ مروجہ طریقہ کار تو یہ ہے کہ اس گیارہویں کو یا مولوی صاحبان کھاتے ہیں یا عزیز واقارب اور گھر والے خود بیٹھ کر ہڑپ کر جاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ صدقہ کیا ہے۔ صدقے کی یہ قسم کم از کم ہماری سمجھ میں نہیں آرہی کہ خود صدقہ کرو اور پھر خود کھا جاؤ۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک دعوت یا پارٹی کہا جاسکتا ہے۔ ہاں اگر دوستوں وعزیزوں یا ائمہ وخطباء حضرات کے اعزاز میں دعوت کو کوئی گیارہویں کا نام دیتا ہے تو اسے ہم ناجائز نہیں کہہ سکتے۔

عورتوں کے متفرق مسائل

احتلام کی حالت میں عورت پر غسل واجب ہے؟

سوال: لندن سے ایک بہن لکھتی ہے کہ میری عمر اس وقت سترہ سال ہے۔ میں جب سے سن بلوغ کو پہنچی ہوں مجھے خواب میں احتلام ہوتا ہے (خط کے اصل الفاظ مختلف ہیں) میرا پہلا سوال تو یہ ہے کہ خواب میں اگر پانی کی طرح کوئی چیز محسوس ہو تو کیا غسل ضروری ہو جاتا ہے؟ مجھے اس سلسلے میں اپنے والدین اور بھائیوں کے سامنے غسل کرتے ہوئے بہت شرم محسوس ہوتی ہے اور دوسرا سوال یہ ہے کہ میرے بال بہت لمبے ہیں اور مجھے ان کے دھونے میں بہت تکلیف محسوس ہوتی ہے تو کیا سارے بالوں کو غسل کی شکل میں دھونا ضروری ہے یا بالوں پر ہاتھ پھیر دینا ہی کافی ہے؟

جواب: خواب میں احتلام پر عورت پر بھی اسی طرح غسل واجب ہے جس طرح مرد پر واجب ہے۔ بشرطیکہ بیداری کے بعد وہ اس کے آثار محسوس کرے یعنی تری وغیرہ۔ اس سلسلے میں یہ حدیث آپ کے لئے مفید ہو گی۔

حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ ام سلیم نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تو حق سے نہیں شرماتا۔ کیا عورت بھی احتلام کے بعد غسل کرے گی؟ آپؐ نے فرمایا ہاں جب وہ پانی دیکھے۔ تو حضرت ام سلمہ نے کہا اللہ کے رسول کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ اس کے بغیر اولاد ماں کے مشابہ کیسے ہو سکتی ہے۔ (بخاری و مسلم)

تو شہوت کے ساتھ خواب میں یا بیداری میں اگر منی خارج ہو جائے تو غسل واجب ہو جائے گا ہاں اگر پیشاب سے ملتا جلتا پانی خارج ہوتا ہے جو منی کی طرح نہیں تو

ایسی صورت میں غسل تو واجب نہیں ہو گا مگر وضو ٹوٹ جائے گا۔

بال بڑے ہوں یا چھوٹے فرض غسل کی صورت میں ان کی جڑوں تک پانی کا پہنچنا ضروری ہے۔اس کے بغیر غسل صحیح نہیں ہو گا۔

دودھ چھڑانے سے قبل دوسرا بچہ

سوال: ویسٹ جرمنی سے چند رفقاء نے لکھا ہے

قرآن و حدیث میں تحریر ہے کہ جب بچہ پیدا ہو تو اسے ماں اڑھائی سال تک دودھ پلائے جب کہ اڑھائی سال سے قبل ہی عورت دوسرے بچے کو جنم دیتی ہے۔اس بارے میں واضح ارشاد فرمائیں۔

جواب: قرآن کی رو سے بچے کو دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے۔ارشاد باری ہے "اور مائیں اپنے بچوں کو دو برس دودھ پلائیں وہ جو یہ مدت پوری کرنا چاہتی ہیں" (البقرہ:۲۳۳)

اس دوران اگر دوسرا بچہ ہو جاتا ہے تو ظاہر ہے اس مدت کے اندر وہ پہلے بچے کو بھی دودھ پلا سکتی ہے اور قرآن و حدیث میں ایسی کوئی صراحت نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ دوسرا بچہ ہونے سے پہلے بچے کو دودھ نہیں پلایا جا سکتا۔بلکہ دو سال تک وہ دونوں بچوں کو دودھ پلا سکتی ہے۔اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

کیا لمبے ناخن رکھنا جائز ہے؟

سوال: شفیلڈ سے مسز جبیں اختر لکھتی ہیں کہ عورتوں خصوصاً بعض نوجوان لڑکیوں میں یہ فیشن چل نکلا ہے کہ وہ اپنے ناخن لمبے رکھتی یا ایک انگلی کا ناخن خاص طور پر بڑھا لیتی ہیں۔شرع میں اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: نبی کریم ﷺ نے جن چیزوں کو فطرت میں شمار کیا ہے ان میں ناخنوں کا کاٹنا بھی شامل ہے۔ مسلم شریف کی حدیث ہے کہ آپ نے دس چیزوں کو فطرت میں سے قرار دیا۔

وھی قص الشارب واعفاء اللحیة والسواك واستنشاق الماء وقص الاظفار و غسل البراجم و عقد الاصابع و نتف الابط وحلق العانة وانتقاص الماء[1]

مونچھوں کا کاٹنا' داڑھی بڑھانا' مسواک کرنا' ناک میں پانی ڈالنا' ناخن کاٹنا' انگلیوں کے درمیان جوڑوں کا دھونا' زیر بغل بال صاف کرنے زیر ناف بالوں کو صاف کرنا استنجا کرنا۔ ایک دوسری روایت میں ختنے کا بھی ذکر ہے۔ اس طرح یہ دس کام فطرت میں سے قرار دیئے گئے۔

اب اس میں ناخن کاٹنا بھی فطرت میں شمار کیا ہے۔ اس لئے ناخن بڑھانا رسول اکرم ﷺ کے حکم سے روگردانی ہے جو جائز نہیں اور مسلمان بہنوں کو چاہئے کہ وہ ایسے میک اپ اور زینت سے پرہیز کریں جس میں ہمارے پیارے نبی صص کے حکم کی نافرمانی ہوتی ہو اور پھر اگر یہ فیشن محض غیر مسلموں کی تقلید اور نقل میں ہے تو پھر اور زیادہ جرم ہے۔ ایک تو فطرت کی مخالفت کی۔ حدیث نبوی پر عمل نہیں کیا اور دوسرا مغربی عورتوں کی نقالی کرتے ہوئے یہ کام کیا۔

نبی کریم ﷺ نے ایسے مردوں اور عورتوں سے سخت الفاظ کے ساتھ اظہار بیزاری فرمایا جو غیر مسلموں کی اندھی تقلید میں اسلامی طرز معاشرت کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

ماں اسلامی لباس پر ملامت کرے تو لڑکی کیا کرے؟

سوال: میں مسلمان لڑکی ہوں۔ ایک کمپنی میں ملازمت کرتی ہوں اور کوشش کرتی

[1] مسلم مترجم ج ۱ کتاب الطهارة باب خصال الفطرة ص ۳۹۰

ہوں کہ اسلامی لباس زیب تن کیے رکھوں لیکن میری ماں مجھے ہمیشہ اس پر ملامت کرتی رہتی ہے اور کہتی ہے یہ قدیم روایت ہے۔ اب تجھے موجودہ زمانے کے مطابق پہننا چاہیے ورنہ تجھے ملازمت سے جواب مل جائے گا۔ اب ایسے حالات میں میرے لئے کیا حکم ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ آپ کے دین پر قائم رہنے کے اس جذبے کو قائم رکھے اور اس میں مزید قوت پیدا کرے۔ آپ جیسی بہنوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق قرآن و سنت کی روشنی میں والدین یا ماں کو مطمئن کریں اور اگر اس کے باوجود مطمئن نہ ہوں تو ان کو حضور ﷺ کا یہ فرمان سنا دیں: **لا طاعة المخلوق في معصية الخالق**[1] کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے لئے مخلوق میں سے کسی کی بات بھی نہیں مانی جائے گی چاہے۔ والدین ہی کیوں نہ ہوں۔ ہاں دوسرے معاملات میں والدین سے اچھا سلوک جاری رکھیں۔

کیا اجنبی عورت سے مصافحہ کرنا جائز ہے؟

سوال: برمنگھم سے امانت علی نے دریافت کیا ہے کہ اجنبی عورت سے مصافحہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب سے مطلع کریں۔

جواب: غیر محرم سے مصافحہ کرنا جائز نہیں اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں اسے حرام قرار دیا جاسکتا ہے۔ بخاری شریف میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ عورتوں سے زبانی بیعت لیا کرتے تھے اور حضورؐ کے ہاتھ نے کبھی کسی اجنبی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا تھا۔

امام احمد نے رحیمہ بنت رقیقہ سے روایت کیا ہے' انہوں نے کہا کہ میں نبی

---

[1] مشکوۃ للالبانی کتاب الامارۃ و القضاء ص ۱۰۹۲ رقم الحدیث ۳۶۹۶

اکرم ﷺ کے پاس دو عورتوں کے ہمراہ حاضر ہوئی تاکہ بیعت کریں۔ آپ نے قرآنی آیات کے مطابق شرک نہ کرنے' چوری نہ کرنے' زنانہ کرنے' اولاد کو قتل نہ کرنے اور بہتان نہ باندھنے جیسے امور میں عہد لیا اور ولا یعصینك فی معروف اور نیکی میں آپ کی مخالفت نہ کرنے کا عہد لیا اور آخر میں آپ نے فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا بے شک بیعت کے لئے میری بات ایک، عورت کے لئے یا ایک سو عورت کے لئے برابر ہے۔ یعنی سب سے ایک ساتھ زبانی بیعت لی جاسکتی ہے۔

یہ صحیح ترین روایات ہیں جن سے اجنبی عورت سے مصافحہ کرنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے اور اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جس طرح مردوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اجنبی عورتوں سے مصافحہ کریں اسی طرح عورتوں کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ غیر مردوں سے مصافحہ کریں۔

سوال: برمنگھم سے محمد افضل دریافت کرتے ہیں کیا عورتوں سے مصافحہ کرنا جائز ہے اور اس میں مسلم و غیر مسلم کا کوئی فرق ہے؟ اگر کوئی بزرگ عمر رسیدہ ہو تو وہ مصافحہ کر سکتا ہے۔ نیز بعض مسلم ملکوں میں دیکھا گیا ہے کہ لوگ اپنی رشتہ دار عورتوں کو بوسہ بھی دیتے ہیں۔ اس بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

جواب: غیر محرم عورتوں سے مصافحہ جائز نہیں اور قرآن و سنت کے احکام سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرام کاموں میں سے ہے اور بعض اوقات یہ فعل فحاشی اور گناہ کے ارتکاب کا سبب بنتا ہے۔ قرآن میں جب عورتوں کو غیر محرموں کے سامنے زینت اور بناؤ سنگھار کے اظہار سے منع کیا گیا ہے---- کیونکہ یہ بھی اسباب فتن میں سے ہے---- تو مصافحہ کے ذریعہ اس طرح کے امکانات اور زیادہ ہیں اور پھر حدیث میں نبی کریم ﷺ نے واضح طور پر فرمایا:

انی لا اصافح النساء۔[1]

---

[1] سنن نسائی مترجم ج ۳ کتاب البیعت باب بیعة النساء ص ۱۹۰ رقم الحدیث (۴۱۸۷)

"میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

ما مست ید رسول اللہ ﷺ ید امراۃ قط حین البیعۃ انما کان یبایعھن بالکلام۔[1]

"یعنی رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ نے کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا تھا بلکہ آپ عورتوں سے بیعت بھی زبانی طور پر لیتے تھے۔

اور اس سلسلے میں مسلم و غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں بلکہ غیر مسلم خواتین کو اسلام کے احکام بتانے چاہئیں تاکہ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے ایک آدھ بار ہاتھ ملا بھی لیا تو آئندہ اس کام سے احتیاط کرے۔ جہاں تک کسی بزرگ یا عمر رسیدہ آدمی سے کسی عورت کے مصافحہ کرنے کا تعلق ہے تو جب رسول اکرم ﷺ نے یہ کام ناپسند فرمایا ہے تو کسی اور بزرگ کا کیا اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ دور میں بعض لوگ جو بیعت کے نام پر عورتوں کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں یا ان سے علیحدگی اور خلوت میں ملاقاتیں کرتے ہیں یہ سب ناجائز ہیں۔ اسی طرح غیر محرم عورتوں کا بوسہ بھی حرام ہے بلکہ اس میں مصافحہ سے بھی زیادہ فتنہ انگیزی کا خطرہ پایا جاتا ہے۔ اس لئے مصافحہ ہو یا بوسہ' غیر محرم عورتیں چاہے کہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں' ہرگز جائز نہیں اور اس کے حرام ہونے پر مسلم علماء کا اجماع اور اتفاق ہے۔

غیر محرم خواتین کو سلام کہنا جائز ہے؟

سوال: لیوٹن سے مقبول احمد کاظمی تحریر کرتے ہیں کہ کیا حضور ﷺ نے غیر محرم اور پردہ دار خواتین کو سلام کرنے سے منع فرمایا ہے؟ مکمل حدیث لکھ کر شکریئے کا موقع دیں۔

---

[1] فتح الباری ج ۹ کتاب التفسیر باب اذا جاء کم المؤمنات مهاجرات ص ۶۲۷ رقم الحدیث ۴۸۹۱ و ص ٤ ٦ رقم الحدیث ۲۷۱۳

جواب: جہاں تک قرآن و حدیث کے عمومی دلائل کا تعلق ہے تو اس میں سلام کہنے اور جواب دینے میں مرد و عورت یا محرم و غیر محرم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اس بارے میں قرآن کی یہ آیت خاص طور پر قابل غور ہے

﴿وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا﴾ (النساء: ۸۶)

اور جب تمہیں کوئی سلام کے الفاظ کہے تو تم بھی جواب میں اس سے بہتر سلامتی کے کلمات کہو یا اس کے الفاظ لوٹا دو۔

اب اس آیت میں مرد و عورتیں سب شامل ہیں اور کسی دوسری آیت یا حدیث میں مزید کوئی وضاحت بھی نہیں جس سے فرق معلوم ہوتا ہو۔

امام بغویؒ "شرح السنہ" میں یہ حدیث لائے ہیں:

عن جرير بن عبد الله ان النبي ﷺ مر على نسوة فسلم عليهن۔[1]

حضرت جریر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عورتوں کے پاس سے گزرے تو آپ نے انہیں سلام کیا۔

اور بہت سی روایات اور اقوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دور نبوی میں مرد عورتوں کو سلام کہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ بعض تابعین ائمہ کے ایسے اقوال بھی امام بغوی نے نقل کئے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص مقصد یا حکمت کا تقاضا ہو تو مردوں کو عورتوں سے علیک سلیک کرنے میں احتیاط برتنا چاہئے۔

مثلاً عورت اکیلی ہے اور یہ خدشہ ہے کہ سلام کہنے سے مزید گفتگو کا دروازہ کھل جائے گا اور نوبت غلط خیالات و تصورات تک پہنچ جائے گی تو پھر احتیاط ہی بہتر ہے، یعنی اگر کسی فتنے یا خرابی کا اندیشہ ہو تو پھر غیر محرم عورتوں کو سلام کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے بصورت دیگر اس میں کوئی ممانعت یا قباحت نہیں۔

بہر حال یہ سارے احتیاط کے تقاضے ہیں جنہیں اگر ملحوظ رکھا جائے تو بہتر ہے، عمومی طور پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

---

[1] مسند احمد ۳۵۷/۲ شرح السنة ۲۶۵/۱۲ رقم ۳۳۰۸

عورت بال کٹا سکتی ہے؟

سوال: ہنسلو سے ایک بہن پوچھتی ہے۔ عورتوں کے لئے بال کٹوانے کا کیا حکم ہے؟
جواب: جہاں تک عورتوں کے بال کٹوانے کا مسئلہ ہے تو موجودہ دور میں یہ فیشن اور مغرب کی تقلید میں کیا جاتا ہے اور عام طور پر وہی عورتیں بال کٹواتی ہیں جو مغربی تہذیب کی دلدادہ ہوتی ہیں اور اسلامی تعلیمات سے انہیں زیادہ لگاؤ نہیں ہوتا وہ صرف فیشن اور اپنے حسن کی نمائش کے لئے یہ سب کچھ کرتی ہیں۔ چونکہ وہ بال غیروں کے سامنے حسن نمائی کے لئے کٹواتی ہیں اس لئے اس کے بعد وہ دوپٹے یا چادر سے بھی اپنے آپ کو آزاد کر لیتی ہیں۔ اس طرح ایک برائی سے ایک دوسری برائی جنم لیتی ہے جو پہلی سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ آزاد خیال عورتیں یہ سارے کام شمع محفل بننے کے شوق میں کرتی ہیں نہ کہ اسلامی تعلیم کی روشنی میں۔ اس لئے اس عمل کو کسی شکل میں بھی جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ سوائے اس کے کہ کسی عورت کو بیماری یا کسی دوسری مجبوری کی وجہ سے بال کٹوانے پڑ جائیں تو یہ الگ بات ہے۔

کسی دوسری قوم کے ایسے فعل کی نقل کرنا جس میں مسلمانوں کا دینی یا دنیاوی کوئی فائدہ بھی نہ ہو ہرگز جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا من تشبہ بقوم فھو منھم[1]

جس نے کسی دوسری قوم کی نقل کی تو گویا کہ وہ انہی میں سے ہے۔ کیونکہ وہ ان کے اعمال و افعال اور تہذیب و تمدن کو بہتر و برتر سمجھتا ہے اور بھی متعدد احادیث میں یہود و نصاریٰ اور غیر مسلموں کی نقل اور تقلید سے منع کیا گیا ہے۔

ایک اور لحاظ سے بھی بال کٹوانے کا فعل ناجائز قرار دیا جاسکتا ہے کہ ایسی

---

[1] المعجم الاوسط للطبرانی ج۹ ص ۱۵۱ رقم الحدیث ۸۳۲۳

عورتیں بالوں کا اسٹائل مردوں کی طرح بنا لیتی ہیں اور بعض اوقات تو مرد و عورت میں پہچان بھی مشکل ہو جاتی ہے' اس انداز سے بال کٹوائے جاتے ہیں۔ جب کہ رسول اکرم ﷺ نے اس روش سے بھی منع فرمایا ہے۔

بخاری شریف کی حدیث ہے کہ

لعن رسول الله ﷺ المتشبهين من الرجال بالنساء والمتشبهات من النساء بالرجال۔[1]

آپؐ نے ان مردوں پر لعنت فرمائی جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔

اوران عورتوں پر بھی لعنت فرمائی جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔

اب اس میں لباس' چال چلن' بول چال اور بالوں کی تراش خراش سب کچھ آ جاتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اظہار زینت کے لئے غیروں کے سامنے جسم کے کسی حصے کی بھی نمائش عورت کے لئے حرام ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بال کٹوا کر پھرا نہیں دکھانے کے لئے ایسی عورتیں اکثر و پیشتر دوپٹے یا چادر سے بے نیاز ہو جاتی ہیں۔ تو اس انداز سے اظہار زینت نص قرآنی سے حرام و ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے

﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوَاتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِالتّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِالطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ﴾ (سورة النور: ۳۱)

"اور وہ (عورتیں) اپنا بناؤ سنگھار ان لوگوں کے سوا کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں اپنے خاوند' اپنے باپ' خاوند کے باپ' اپنے بیٹے' خاوند کے بیٹے' بھائی' بھائیوں کے بیٹے' بہنوں کے بیٹے' اپنے میل جول کی عورتیں اپنے غلام' وہ مرد جو کسی قسم کی خواہش نہ رکھتے ہوں اور بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے

[1] مشکوۃ للالبانی ج ۲ کتاب اللباس باب الترجل رقم الحدیث ۴۴۲۹

واقف نہ ہوں۔"

اب مندرجہ بالا رشتوں کے سوا عورت کے لئے اپنے سر' بازوؤں یا پنڈلیوں کی نمائش کسی کے سامنے جائز ہے نہ تنہائی میں نہ کسی عام اجتماع یا مجلس میں۔ خود رسول اللہ ﷺ سے بھی اس بارے میں سخت وعید آئی ہے جب کہ بال کٹوانے سے اکثر و بیشتر مقصود ہی نمائش ہوتا ہے۔

فرض غسل میں بالوں کا دھونا ضروری ہے؟

سوال: ایک بہن برمنگھم سے دریافت کرتی ہیں کہ غسل کرنا جب ضروری ہے تو بالوں کے علاوہ اگر باقی سارا جسم پانی سے تر کرلیا جائے تو فرض ادا ہو جائے گا یا بالوں کا دھونا بھی ضروری ہے۔ یا سر کے بالوں پر اگر تر ہاتھوں کے ساتھ مسح کرلیا جائے تو کیا وہ کافی نہیں ہوگا؟

جواب: فرض غسل یا غسل جنابت میں مرد اور عورت دونوں کے لئے پورے جسم پر پانی ڈالنا ضروری ہے۔ اگر جسم کا کوئی حصہ بھی خشک رہا تو غسل صحیح نہیں ہوگا اور اس حالت میں کوئی نماز اور عبادت قبول نہیں ہوگی۔ خاص طور پر بالوں کے بارے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق بالوں کی جڑوں تک (یعنی چمڑے تک) اگر پانی نہیں پہنچتا تو غسل ادا نہیں ہوگا۔ مسئلہ یہ نہیں کہ عورتیں بالوں کو کھلا چھوڑیں یا باندھ کر رکھیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ پانی بالوں اور چمڑے کو تر کرے۔

جہاں تک بالوں پر مسح کرنے کا تعلق ہے تو قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے بلکہ غسل کا حکم دیا گیا ہے اور غسل کا معنی معروف ہے۔ اس میں مسح کا ذکر نہیں ہے ہاں اگر کوئی شرعی عذر ہو یعنی بیماری کی وجہ سے یا یہ خطرہ ہے کہ اگر سر دھویا گیا تو تکلیف بڑھ جائے گی۔ یا سر میں ایسا زخم ہے جس میں تکلیف

بڑھ جانے کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں مسح جائز ہوگا لیکن بغیر کسی عذر یا مجبوری کے غسل جنابت میں سر کے بالوں پر مسح کافی نہیں ہوگا۔

فرض غسل کے علاوہ جہاں تک عام غسل کا تعلق ہے تو اس میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگر کسی وجہ سے کوئی آدمی یا عورت جسم کے کسی حصے کو نہیں دھونا چاہتے اور ضروری صفائی کر لیتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ غسل کرتے وقت پہلے وضو کرنا بہتر ہے۔

مرد ڈاکٹر سے عورت علاج کرا سکتی ہے؟

سوال: نارتھ ہیمپٹن سے واجد علی پوچھتے ہیں:

جہاں لیڈی ڈاکٹر میسر نہ ہو کیا وہاں عورت مرد ڈاکٹر سے علاج کروا سکتی ہے؟ افغان مہاجرین کے بارے میں اخباروں میں آیا کہ وہ مرد ڈاکٹر سے اپنی عورتوں کا علاج نہیں کراتے اور ڈاکٹر جو ان کے علاج کے لئے گیا انہوں نے اسے گولی مار دی۔

جواب: اگر لیڈی ڈاکٹر میسر نہ ہو تو عورت مرد ڈاکٹر سے علاج کروا سکتی ہے۔ پردے کی پابندی کا یہ مطلب نہیں کہ مریض عورت جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اس کا مرد سے علاج نہ کروایا جائے۔ ہاں اگر عورت ڈاکٹر میسر ہو تو پھر ان سے علاج کرانا بہتر ہے۔ افغان مہاجرین میں سے جس نے یہ کام کیا ہے اس نے لاعلمی اور جہالت سے ایسا کیا ہوگا۔ ان کے علماء اور راہنما کو چاہئے کہ وہ انہیں مسئلے کی صحیح اہمیت سے آگاہ کریں یہ وہاں کے مقامی علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ انہیں اس بات کا قائل کریں۔

عورت ڈرائیونگ کر سکتی ہے؟

سوال: برمنگھم سے ابوالفاروق قریشی لکھتے ہیں:

برطانیہ جیسے ماحول میں اکثر خواتین کو بعض ضروریات کے لئے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ آپ دین اسلام کی روشنی میں اس سوال کا جواب ارشاد فرمائیں کہ کیا یہ بہتر نہیں کہ پرائیویٹ بسوں ٹیکسی وغیرہ سے سفر کرنے کی بجائے خواتین لیڈی ڈرائیور انسٹریکٹرز سے ڈرائیونگ سیکھ کر اپنی ذاتی کاروں میں ضروری سفر کریں تاکہ مختلف خدشات واوہام سے محفوظ رہیں۔

جواب: اسلام میں ایسا کوئی حکم نہیں جو عورتوں کو باہر نکلنے اور ضروری کام کرنے سے منع کرتا ہو۔ ازواج مطہرات اور صحابیات نے بھی ضروری کاموں کے لئے سفر کیے ہیں اور گھر سے باہر بھی نکلی ہیں۔ لیکن ان بنیادی اسلامی اصولوں کی پابندی ضروری ہوگی جن کی وضاحت قرآن وسنت میں موجود ہے جن میں سے چند درج ذیل ہیں

۱۔ عورت کی اصل ذمہ داری گھر کے نظام کی نگرانی اور اولاد کی تربیت ہے اس کے کسی بھی کام سے اس کی اس ذمہ داری پر اثر نہیں پڑنا چاہیے۔

۲۔ ڈرائیونگ یا کسی بھی دوسرے کام میں اس امر کا امکان نہیں ہونا چاہئے کہ مردوں سے اختلاط ہوگا یا کسی مرد سے خلوت ہوگی۔

۳۔ اپنے جسم کی نمائش سے قطعی پرہیز کرے گی۔

۴۔ گھر سے باہر کے کام اس مجبوری کی وجہ سے کر رہی ہے کہ اس کا خاوند ان کاموں کے کرنے سے عاجز ہے یا موجود نہیں ہے۔ یا بعض معاشرتی ضرورتوں کے پیش نظر اسے باہر نکلنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے قواعد کی پابندی کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیکھنے یا کار چلانے میں بظاہر کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔ خواتین بسوں میں زیادہ محفوظ ہیں یا اپنی کاروں میں سفر کرتے ہوئے تو اس کا انحصار حالات پر ہے۔ بعض اوقات اکیلی عورت کار چلاتے ہوئے بھی کئی قسم کے خطرات کی زد میں ہوتی ہے اور اسے زیادہ حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے اور بسا اوقات بسوں میں دوسری عورتوں کے ساتھ زیادہ مامون ہوتی ہے۔

یاد رہے کہ ہم نے یہاں جو بحث کی ہے وہ شہر اور محلے کے اندر ضروریات زندگی کے سلسلے میں عورت کے باہر نکلنے یا ڈرائیونگ کرنے سے متعلق ہے لیکن شہر سے باہر یا ملک سے باہر اکیلی عورت کا سفر کرنے کا حکم اس سے مختلف ہے اور اس سفر کے بارے میں شرائط بھی مختلف ہیں۔

عورت کی جگہ صرف گھر ہی ہے؟

سوال: یہ تو ٹھیک ہے کہ عورت کو اسلام میں پردے میں رہنا چاہئے لیکن کیا اسلام میں عورت کی جگہ صرف گھر ہی ہے؟

جواب: یہ تو آپ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ عورت کا پردے میں رہنا ضروری ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ عورت گھر سے نکل باہر نہیں نکل سکتی۔ ضرورت کے لئے عورت کا باہر جانا جائز ہے مگر اس کیلئے اسلام نے چند شرائط اور حدود و قیود رکھی ہیں۔ اگر ان کا لحاظ نہ رکھا جائے تو پھر عورت کا باہر پھرنا فتنہ و فساد کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ سب سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ عورت جب باہر نکلے تو اس کا لباس باپردہ ہونا چاہئے اور خاص ضرورت کے تحت ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھ سکتی ہے بشرطیکہ فتنہ کا باعث نہ بنے۔ میک اپ اور بناؤ سنگھار کر کے باہر پھرنا کسی حالت میں بھی جائز نہیں ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ غیر محرم مردوں میں خلط ملط نہ ہو۔ اسی طرح اسلام نے یہ قید بھی لگائی ہے کہ سفر میں عورت کو اکیلے نہیں جانا چاہئے بلکہ کسی محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی عورتیں سودا سلف لینے باغوں یا کھیتوں میں کام کرنے کے لئے باہر نکلتی تھیں لیکن یہ سب کچھ اشد ضرورت کی شکل میں ہے۔ ورنہ عورت کی اصل ذمہ داری گھریلو امور کی نگرانی اور بچوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ آپ اس سلسلے میں قرآن کے ان دو مقامات کے معانی اور تفاسیر کا مطالعہ کریں تو اس موضوع پر آپ کو تفصیلی معلومات حاصل ہوں گی۔ ازواج مطہرات کے

بارے میں ارشاد قرآنی ہے:

﴿وَ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ﴾ (الاحزاب : ۳۳)

(اے نبی کی بیویو!) "تم اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور بے پردگی کا اس طرح مظاہرہ نہ کرو جس طرح پہلے جاہلیت کے زمانہ میں کیا جاتا تھا اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل کرو"

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ﴾ (نور : ۳۱)

"اور مسلمان عورتوں کو حکم دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی عزتوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار (غیروں کے سامنے) ظاہر نہ کریں مگر جتنا خود ہی ظاہر ہے اور اپنے گریبانوں کو اپنے دوپٹوں سے ڈھانپ کر رکھیں"

عورت پر اس کے قبیلے کے کیا حقوق عائد ہوتے ہیں؟

سوال: بریڈ فورڈ سے محمود حسین لکھتے ہیں کہ میری پھوپھی صاحبہ قبیلے کے بنیادی حقوق کے بارے میں سمجھنا چاہتی ہیں کہ ایک عورت پر اس کے قبیلے کے کیا کیا حقوق عائد ہوتے ہیں یعنی اس کے خاوند کے' بھائیوں کے' بہنوں کے اس پر کیا حقوق ہیں اور اس کے ساس وسسر کے اس پر کیا حقوق ہیں اور دیگر رشتہ داروں کے اس پر کیا حقوق ہیں۔ اسی طرح اس کے ان پر کیا حقوق ہیں؟

جواب: اسلام میں عائلی واجتماعی نظام زندگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ایک صحیح متوازن اور معتدل معاشرہ تب ہی وجود میں آسکتا ہے جب باہمی حقوق وفرائض کا پورا

پورا لحاظ کیا جائے۔ اسی لئے اسلام رشتہ داروں اور خاص طور پر قریبی عزیزوں کے حقوق کی نگہداشت کی بڑی تاکید کرتا ہے اور حق تلفی یا قطع رحمی کی مذمت کرتا ہے۔ خاوند اور بیوی کا رشتہ سب سے قریبی اور مضبوط ہے اس لئے ان کے باہمی حقوق و فرائض بھی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک نگہبان اور ذمہ دار ہے اور اپنی زیر نگرانی لوگوں کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا۔ حاکم نگہبان ہے اور عورت خاوند کے گھر اور اولاد کے بارے میں ذمہ دار ہے اس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ہر ایک اپنے اپنے مقام پر محافظ اور مسئول ہے۔ (بخاری و مسلم)

اب خاندان اور قبیلے میں جس قدر کوئی زیادہ ذمہ دار' بااختیار اور نگرانی کرنے والا ہے' اسی قدر اس کی اللہ کے ہاں جوابدہی بھی ہوگی۔ اسلام نے مرد کو اس لحاظ سے فوقیت دی ہے کہ وہ نان و نفقہ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اور باہر کے کام کاج زیادہ تر اس کے سپرد ہوتے ہیں جب کہ عورت کو اس لحاظ سے فوقیت و اہمیت ہے کہ گھریلو معاملات خصوصاً اولاد کی تعلیم و تربیت کا زیادہ تر انحصار اس پر ہے۔ اگر وہ اس ذمہ داری کو احسن طریقے سے پورا نہیں کرے گی تو گھر کی ملکہ بننے کا اسے کوئی حق نہیں ہوگا۔ وہ گھر کی ملکہ اسی شکل میں ہے جب وہ گھر کے نظام کو صحیح طور پر چلائے اور اس کے ساتھ خاوند کی اطاعت اور اس کے حقوق کی ادائیگی کا بھی پورا خیال رکھے کیونکہ خاوند کو جو عورت کی تمام ضروریات پورا کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے' اس کے بعد عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی پسند و ناپسند رضا و ناراضگی کا خیال رکھے۔

حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس عورت کی موت اس حالت میں آئی کہ اس کا خاوند اس پر راضی تھا تو ایسی عورت جنتی ہے۔[1]

عورت کے لئے ہرگز روا نہیں کہ وہ اپنے گھر اور مال میں خاوند کے مشورے یا اجازت کے بغیر کوئی تصرف کرے۔ اس کے لئے یہ بھی غیر پسندیدہ ہے کہ

[1] ترمذی کتاب الرضاع باب ما جاء فی حق الزوج ۱۱۶۱

وہ ایسے لوگوں سے تعلقات قائم کرے یا ایسے لوگوں کو گھر آنے کی اجازت دے جنہیں خاوند پسند نہیں کرتا۔ اسلام جس طرح زندگی کے ہر معاملے میں اعتدال کو پسند کرتا ہے اسی طرح عائلی زندگی میں بھی وہ میانہ روی چاہتا ہے اور یک طرفہ ٹریفک کی اجازت نہیں دیتا کہ عورت تو خاوند کے سارے حقوق پورے کرے لیکن خاوند کو اپنے فرائض کی خبر تک نہ ہو یا وہ بالکل ان کی پرواہ تک نہ کرے اور عورت کو محض گھر کی نوکرانی سمجھ کر اس سے جانوروں کی طرح برتاؤ کرے بلکہ اسلام عورت کے بارے میں مردوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے۔ کہ وہ عورتوں کو برابر کا شریک سمجھیں اور ان کی رائے مشورے اور بات کو برابر کی اہمیت دیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے حجتہ الوداع کے خطبے میں بھی عورتوں کے حقوق کا خیال رکھنے اور ان کے مقام و وقار کے تحفظ کی تاکید فرمائی ہے۔

ترمذی کی حدیث ہے' آپؐ نے فرمایا:

اکمل المؤمنین ایمانا احسنھم خلقا و خیارکم خیارکم لنسائھم۔[1]

''ایمان میں زیادہ کامل وہ ہیں جو اخلاق میں زیادہ اچھے ہیں اور تم میں بہتر ہیں وہ جو اپنی عورتوں کے لئے بہتر ہیں یعنی ان سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔''

خاوند اور بیوی دونوں کے لئے ساس و سسر* والدین کی مانند ہیں۔ ان کا ادب و احترام ان کے لئے اسی طرح لازمی اور ضروری ہے جس طرح وہ اپنے والدین کا احترام کرتے ہیں اور ساس و سسر کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنی بہو کو اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھ کر اسے محبت و شفقت دیں۔ اسی طرح لڑکی کے والدین کے لئے داماد اپنے لڑکوں کی طرح ہے وہ اس کے لئے محبت و پیار کے ایسے ہی جذبات رکھیں جیسے اپنے لڑکوں کے بارے میں رکھتے ہیں اگر یہ طرز عمل اپنا لیا جائے اور عائلی زندگی میں اسلامی حقوق و

---

[1] ابو داؤد کتاب السنة باب الدلیل علی زیادة الایمان و نقصانه ٤٦٨٢' دارمی کتاب الرقاق باب فی حسن الخلق ٢٧٩٢

فرائض کا پوری طرح پاس کیا جائے تو ہماری بے شمار خاندانی چپقلشیں اور پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں۔

عورت جس قبیلے میں آتی ہے اس گھر یا خاندان کے تمام اقرباء کے حقوق اسے معلوم ہونے چاہئیں۔ اگر پہلے ان سے کوئی رشتہ نہ بھی ہو تب بھی اس نئے رشتے کے بعد خاوند کے تمام رشتہ داروں سے اس کی درجہ بدرجہ رشتہ داری قائم ہو جائے گی۔ اسے ان تمام کے حقوق کا خیال رکھنا ہوگا۔ اسی طرح خاوند کے لئے بھی یہ لازم ہے کہ وہ عورت کے رشتہ داروں سے درجہ بدرجہ ان تعلقات کی پاسداری کرے جن کی اسلام تاکید کرتا ہے۔ میں نے درجہ بدرجہ اس لئے کہا ہے کہ خاندان و قبیلے کے جتنے بھی لوگ ہیں ان سے تعلق رشتے کی قریبی یا دوری کے مطابق ہوگا جو زیادہ قریبی ہوگا اس کا حق بہر حال زیادہ ہوگا۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ

یا رسول اللہ من احق بحسن الصحبه قال. امك ثم امك ثم امك ثم ابوك ثم ادناك ادناك[1]

کہ اے اللہ کے رسولؐ حسن سلوک میں سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا تمہاری والدہ۔ پھر تمہاری والدہ پھر تمہاری والدہ پھر تمہارے والد پھر جو جتنا قریب ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہ کہتے ہیں کہ جو رشتے توڑتا ہے (یعنی رشتہ داروں سے اچھا سلوک نہیں کرتا) میں نے بھی اس سے تعلق توڑ دیا اور جو رشتے جوڑتا ہے میں بھی اس سے تعلق جوڑتا ہوں۔[2]

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من احق الناس بحسن الصحبة (۵۹۷۱)
مسلم کتاب البر والصلة باب بر الوالدین و انهما احق به (۲۵۴۸)

[2] ابوداؤد کتاب الزکاة باب فی صلة الرحم (۱۶۹۴)

بخاری و مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے کہ جو قریبی رشتہ داروں کو صدقہ و خیرات دیتا ہے یا ان کی مدد کرتا ہے اس کے لئے دو اجر ہیں۔ ایک اس صدقے کا اور ایک رشتہ داری کا۔

ایک اور حدیث سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اپنے والدین یا اقرباء کے جو دوست ہیں ان کا بھی آپ پر حق ہے اور ان سے بھی حسن معاملہ اور نیکی کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ خود رسول اکرم ﷺ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد ان کی سہیلیوں کو تحائف پورے اہتمام سے بھیجا کرتے تھے۔

بہر حال قبیلے اور خاندان کے اندر تمام لوگوں سے حسن سلوک اور ادب و تعظیم ضروری ہے اور ان کے حقوق باہر کے لوگوں سے زیادہ ہیں۔ ہاں البتہ جہاں خاندان و قبیلہ میں اسلامی احکام کی پابندی کا فقدان ہو اور وہ شریعت کی مخالفت کرتے ہوں ان کے مقابلے میں دور کے دیندار اور نیک و صالح زیادہ بہتر حق دار ہیں اور وہی اصل رشتہ دار ہیں۔ خونی رشتہ دار اگر دین کے احکام جھٹلاتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کی پابندی نہیں کرتے تو ایسے لوگوں سے اگر محض اللہ کی رضا کے لئے رشتہ ختم کر دیا جائے تو یہ جائز ہوگا۔ یہ قطع رحمی میں داخل نہیں۔ حقوق و فرائض کا سارا نظام قبیلے کے انہی رشتہ داروں کے لئے ہے جو اسلام کی تعلیمات کو دل و جان سے تسلیم کرنے کے بعد ان پر عمل بھی کرتے ہیں اور جو دین سے دور ہوں وہ رشتہ داری سے بھی دور ہی ہوتے ہیں۔

رضاعت کتنی بار دودھ پینے سے ثابت ہوتی ہے؟

سوال: بریڈفورڈ سے سلیم خان کابل پوری دریافت کرتے ہیں کہ رضاعت کا مسئلہ ثابت کرنے کے لئے کسی بچے کا کسی عورت کا صرف ایک بار دودھ پینا ہی کافی ہے یا قرآن و حدیث میں کوئی خاص تعداد مقرر ہے؟

جواب: رضاعت کا مسئلہ اس لحاظ سے اسلامی شریعت میں کافی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے ذریعے بھی رشتوں کی حرمت ثابت ہوتی ہے یعنی اگر ایک شخص کسی کے ساتھ دودھ پینے میں شریک ہے اب ایک عورت کا دودھ پینے کی وجہ سے وہ آپس میں بھائی اور بہن بن جائیں گے اور جس طرح حقیقی بھائی بہن کے درمیان نکاح نہیں ہو سکتا اسی طرح دودھ پینے والے بھائی بہن کے درمیان بھی نکاح نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کتنی مقدار میں دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوتی ہے تو یہ مسئلہ ذرا تفصیل طلب ہے اس سلسلے میں وہ حدیثیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو قرآنی آیت کا مفہوم متعین کرتی ہیں اور یہ حدیثیں اس مسلک کی تائید کرتی ہیں کہ اگر پانچ مرتبہ سے کم (یعنی پانچ گھونٹ سے کم) دودھ پیا ہے تو رضاعت ثابت نہیں ہوگی۔

پہلی روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

لا تحرم المصة والمصتان[1]

ایک یا دو مرتبہ کا پینا حرام نہیں کرتا۔

دوسری حدیث ترمذی شریف کی ہے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا

لا تحرم من الرضاعة المصة و المصتان[2]

کہ ایک یا دو گھونٹ سے رضاعت کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

اب چونکہ قرآن حکیم کی اس آیت میں جو یہ حکم ہے کہ

﴿اُمَّهَاتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾

یعنی رضائی ماؤں اور بہنوں سے بھی نکاح حرام ہے۔

---

[1] مسلم مترجم ج۳ کتاب الرضاع ص ٦٧

[2] ترمذی للالبانی کتاب الرضاع باب لاتحرم المصة و لا المصتان ص ۳۳٦ رقم الحدیث ١١٦٦

اب اس میں یہ وضاحت نہیں کہ کتنی مرتبہ دودھ پینے سے یہ حرمت ثابت ہو گی۔ چنانچہ مذکورہ بالا دونوں احادیث نے اس کی تخصیص کر دی کہ اگر پانچ سے کم مرتبہ پیا ہے تو پھر حرمت ثابت نہیں ہو گی۔

دوسرا مسلک یہ ہے کہ جتنا بھی دودھ پیا یعنی کم یا زیادہ حرمت ثابت ہو جائے گی۔اس کی دلیل تو قرآن کی مذکورہ آیت ہے جس میں مقدار کا کوئی ذکر نہیں لہذا اس میں قلیل وکثیر دونوں شامل ہیں۔

دوسری دلیل ترمذی شریف کی یہ حدیث ہے کہ:

لا یحرم من الرضاع الا ما فتق الامعاء[1]

رضاعت ثابت نہیں ہو گی مگر اس سے جو انتڑیوں کو تر کر دے یا پھر بھر دے

اس مسلک کے حاملین کے خیال میں پانچ سے کم مرتبہ پینے سے بھی انتڑیاں سیر ہو سکتی ہیں۔

دلائل کا موازنہ کرنے سے پہلا مسلک درست ثابت ہوتا ہے کیونکہ حدیث میں واضح طور پر پانچ کا ذکر آگیا ہے اس سے کم میں نہیں اور یہ صراحت بھی آگئی کہ ایک یا دو دفعہ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہو گی اور احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کم از کم پانچ گھونٹ کی مقدار کی جائے تاکہ اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ دودھ اس کے پیٹ میں پہنچا ہے اور اس نے انتڑیوں کو سیر کیا ہے۔

قرآن کی آیت کی حدیث نے وضاحت کر دی ہے اس لئے اس سے استدلال اس معنی میں درست نہیں۔ جو حدیث پیش کی جاتی ہے کہ وہ رضاعت جو انتڑیوں کو بھر دے تو ظاہر ہے کہ ایک یا دو تین گھونٹ سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ حدیث پہلے مسلک کی تائید کرتی ہے۔ اس سے زیادہ صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ پانچ گھونٹ سے کم سے رضاعت کی حرمت ثابت نہیں ہو گی۔ واللہ اعلم بالصواب

---

[1] ترمذی للالبانی ج ۱ کتاب الرضاع باب ماجاء ان الرضاعة لا تحرم الا فی الصغر دون الحولین ص ۳۳۸ رقم الحدیث ۱۱۶۸

گانا بجانا

گانے بجانے اور آلات موسیقی کا شرعی حکم

سوال: گانے بجانے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کچھ لوگ اسے جائز بھی کہتے ہیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب: اس میں کوئی شک نہیں کہ جب کسی بات پر جھگڑا یا اختلاف ہو جائے تو صحیح فیصلہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (النساء: ٥٩)

"اگر تم اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو جھگڑے کی شکل میں فیصلے کے لئے اللہ اور رسول ﷺ کی طرف لوٹ جایا کرو۔"

گانے بجانے کے بارے میں بھی ہمیں صحیح فیصلہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول کی سنت سے ملے گا۔ قرآن کی یہ آیت اس سلسلے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ﴾ (لقمان: ٦)

"اور کچھ لوگ کھیل تماشے کی باتیں خریدتے ہیں (اپنا مال اور وقت دے کر) تاکہ جہالت کے بل بوتے پر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے غافل کر دیا جائے اور پھر اسے وہ مذاق سمجھتے ہیں۔"

یعنی ہر وہ بات جو دل کو غافل کرے وقت ضائع کرے اور کوئی خیر کا پہلو اس میں

نہ ہوا سے لھو کہا جا سکتا ہے جب کہ اللہ کا یہ حکم ہے کہ انسان اس زمین کو خیر' عدل اور اصلاح کے کاموں سے آباد کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے اس روایت کے مفہوم کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اس سے مراد غناء (گانا) ہے تین مرتبہ یہ کلمہ دہرایا۔ ابن ابی شیبہ کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباسؓ' حضرت جابرؓ' حضرت عکرمہؒ' حضرت سعید بن جبیرؒ' حضرت مجاہدؒ' اور حضرت مکحولؒ سب نے اس آیت کی وہی تفسیر کی ہے جو ابن مسعودؓ نے کی۔ حضرت حسن بصری کا قول ہے کہ یہ آیت گانے اور آلات موسیقی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ان بد بخت لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ کا کلام سن کر تو کوئی نفع حاصل نہیں کر پاتے لیکن گانے بجانے اور آلات موسیقی پر فریفتہ رہتے ہیں۔

۲۔ بخاری شریف کی یہ حدیث بھی اس آیت کی تائید کرتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لیکونن فی امتی اقوام یستحلون الحر والحریر والخمور والمعازف۔[1]

میری امت میں ایسے گروہ پیدا ہو جائیں گے جو زنا' ریشم' شراب اور گانے بجانے کے آلات کو حلال کر لیں گے یعنی بے دریغ ان کاموں کے ارتکاب کریں گے۔

۳۔ ابن عساکر نے حضرت انسؓ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے

ان رسول اللہ ﷺ قال من قعد الی قینة یستمع منها صب فی اذنه

[1] مشکوۃ للالبانی ج۳ کتب الرقاق باب البکاء و الخوف ص ۱٤٦٨ رقم الحدیث ٥٣٤٣

الآنك يوم القيامة (الجامع الصغير ج ٢ ص ١٦٣)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کسی گانے والی کے پاس اسے سننے کے لئے بیٹھا تو قیامت کے دن پگھلا ہوا لوہا اس کے کانوں میں ڈالا جائے گا۔

۴۔ بیہقی اور طبرانی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ عمر بن قرۃ نامی ایک شخص رسول اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہا گانا بجانا میرا ذریعہ معاش ہے مجھے اس کی اجازت دی جائے اور میں کوئی فحش گانا نہیں گاؤں گا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے ڈانٹا اور فرمایا میں اس کام کی اجازت نہ دوں گا جس میں نہ عزت ہے نہ وقار۔ اللہ کے دشمن تو جھوٹ بول رہا ہے۔ اللہ نے تجھے حلال اور پاکیزہ رزق دیا ہے اور تو اپنے لئے وہ ذریعہ معاش اختیار کرتا ہے جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔

کیا حضور ﷺ نے گانے کی اجازت دی تھی؟

سوال: لندن سے محمد اسلم لکھتے ہیں۔ کیا اسلام میں گانا بجانا موسیقی اور قوالی وغیرہ سب ممنوع و ناجائز ہیں؟ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانے میں بھی گانے گائے جاتے تھے اور آپ نے ان کی اجازت دی تھی۔ اس بارے میں کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب: اصل مسئلے کی وضاحت سے پہلے دو باتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

اول یہ کہ اسلامی شریعت میں کسی چیز کے جائز و ناجائز یا حلال و حرام ہونے کے بارے میں اصل اتھارٹی قرآن و حدیث ہے۔ ان کے علاوہ کوئی شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو اگر اس نے قرآن و حدیث سے دلیل کے بغیر کسی چیز کے جائز و ناجائز ہونے کے بارے میں فیصلہ دیا تو وہ قابل قبول نہ ہو گا۔ موسیقی ہو یا قوالی یا گانا بجانا ان کی حرمت کراہت یا عدم جواز اگر قرآن و سنت سے ثابت ہو جاتا ہے تو اس کے بعد کوئی

بڑی سے بڑی شخصیت بھی اسے جائز قرار نہیں دے سکتی اور اگر کسی زمانے میں بڑے بڑے لوگ بھی موسیقی یا قوالی کے شائق رہے ہوں تو ان کا یہ فعل ہمارے لئے سند ہے نہ دلیل۔

دوسری بات جس کا ذکر یہاں ضروری ہے وہ یہ کہ کوئی حرام یا ممنوع کام جب لوگوں میں عام ہو جائے اور اکثریت اس میں ملوث ہو جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہرگز نہیں بن سکتا کہ وہ کام اب حلال اور جائز ہو گیا ہے۔ آج کل موسیقی اور گانا بجانا اس قدر عام ہے کہ شاید ہی کوئی گھرانہ اس سے محفوظ ہو اور قوالی کا تو یہ عالم ہے کہ اسے ایک عبادت اور ثواب کے طور پر سنا جاتا ہے اور لوگوں کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ یہ کام جب اتنی کثرت سے رائج ہیں کوئی گھر بھی ان سے محفوظ نہیں تو یہ ناجائز کیسے ہو سکتا ہے۔ حالانکہ شرعی طور پر اس بات میں کوئی وزن نہیں کہ کسی کام کو تھوڑے لوگ کر رہے ہیں یا زیادہ۔ اصل وزن تو اس بات کا ہے کہ وہ کام قرآن و سنت کی رو سے جائز ہے یا ناجائز؟

اب ہم اصل مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ ثبوت اور اطمینان کے لئے کافی ہے کہ رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کے زمانے میں نہ قوالیاں تھیں اور نہ گانے بجانے کی محفلیں جمتی تھیں اور نہ سماع و سرود کا کہیں نشان ملتا ہے اس کے برعکس آپ نے ان لوگوں کے برے انجام سے ڈرایا جو ان حرام کاموں کو حلال کریں گے۔ صحیح بخاری شریف کی یہ حدیث ہے آپ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگ ریشم شراب اور گانے بجانے کو حلال کریں گے اور انجام کار ان کی شکلیں مسخ ہو جائیں گی اور وہ بندر اور خنزیر بن جائیں گے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ قرآن نے لہو و لعب کی ایسی شکلوں کی مذمت کی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام سے دوری کا سبب بنتی ہیں اور دور حاضر میں گانے بجانے کی کوئی بھی ایسی شکل نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ انہیں سننے کے بعد ایمان تازہ ہوتا ہے بلکہ مروجہ گانے بجانے کی جتنی بھی شکلیں ہیں وہ دین سے دوری کا باعث بنتی

ہیں۔ اس لئے سورہ لقمان آیت نمبر ۵ میں لہو الحدیث کے ان پرستاروں کو رسوا کن عذاب کی خبر دی گئی ہے۔

چاروں اماموں اور دوسرے مجتہدین نے بھی موسیقی کے بارے میں واضح طور پر کہا ہے کہ یہ ناجائز ہے اور بعض نے کھل کر اسے حرام قرار دیا ہے۔ امام شافعیؒ نے تو یہاں تک کہا کہ جو شخص گانے اور موسیقی کا دلدادہ ہو اس کی شہادت بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے اصحاب سے بھی موسیقی کے حرام ہونے کے اقوال ثابت ہیں۔ امام مالک کے بارے میں آتا ہے کہ ان سے مدینہ کے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جو گانے بجانے کے رسیا تھے تو انہوں نے فرمایا یہ مدینہ کے فاسق لوگ ہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں گانے گائے جاتے تھے اور آپ نے انہیں سنا تھا یا اجازت دی تھی یہ قطعی طور پر غلط ہے۔ شاید ان لوگوں کا اشارہ ان بچیوں کے شعر کے گانے سے ہے جو مختلف مناسبات سے ثابت ہیں جیسے ہجرت کے موقع پر اور پھر عید وغیرہ کی مناسبت سے ثابت ہے۔ لیکن ان لڑکیوں کی شعر گوئی پر موجودہ دور کے فحش اور بے ہودہ گانوں کو قیاس کرنا درج ذیل وجوہ کی بنا پر بالکل باطل ہے۔

۱۔ جو بچیاں حضور اکرم ﷺ کے زمانے یا آپ کی موجودگی میں شعر گا کر پڑھتی تھیں ان کے بارے میں دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ چھوٹی اور نابالغ بچیاں تھیں۔ ان معصوم بچیوں کے پاکیزہ اشعار پڑھنے کو موجودہ دور کی پیشہ ور گانے والیوں سے ملانا غلط ہے۔

۲۔ اس دور میں جو شعر گوئی یا گانے کے واقعات ملتے ہیں ان میں سے کسی میں بھی موسیقی کے آلات کا ذکر نہیں ہے اور آج کل کی موسیقی کے سامنے جو گانے کا لازمی جزو بن چکی ہے اس کو جائز کرنے کے لئے کسی روایت یا حدیث میں ذرہ بھر بھی گنجائش نہیں۔ ہاں البتہ دف بجا کر اشعار پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے (دف وہ ڈھولک ہے جو صرف

ایک طرف سے ہاتھ سے بجائی جاتی ہے) اس سے زیادہ کسی چیز کا ذکر تک نہیں۔

۳۔ بعض روایات سے اگر چھوٹی بچیوں یا بالغ مردوں کے اشعار پڑھنے یا گانے کے جواز کے دلائل اگر تسلیم بھی کر لئے جائیں اور یہ مان لیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اس کی ایک حد تک اجازت تھی تب بھی دور حاضر کے گانے بجانے اور قوالی و موسیقی کی محفلوں کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کجا وہ پاکیزہ اشعار جن میں اسلام کی عظمت کا ذکر ہے اور جہاد کی ترغیب دی گئی ہو اور کجا اس دور کے پیشہ ور گانے والوں اور گانے والیوں کے سفلی جذبات کو بھڑکانے والے اشعار جن میں عورت جنس اور شیطانی عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے ان میں باہمی نہ کوئی مناسبت ہے اور نہ کوئی تعلق۔

ایسے پاکیزہ اشعار کا پڑھنا جن میں اسلام کی سربلندی اور حقانیت کا ذکر ہے یا رسول اکرم ﷺ صحابہ کرامؓ اور دوسری اسلامی شخصیتوں کے مناقب و فضائل بیان کئے گئے ہوں یا اللہ کی راہ میں جہاد کی رغبت دلائی گئی ہو وہ حضور ﷺ کے زمانے میں بھی جائز تھے اور آج بھی جائز ہیں۔

نعتوں اور قوالیوں کا کیا حکم ہے؟

سوال: کونٹری سے اسراء بی بی لکھتی ہیں۔

آپ نے گانے بجانے اور اس کے سننے سنانے والیوں کے بارے میں جو لکھا ہے تو کیا قوالیوں نعتوں کا جو سلسلہ گانے بجانے کے ساتھ ہوتا ہے ان کا سننا یا ان کے پاس جانا بھی ناجائز ہے؟

جواب: جہاں تک نعت کا تعلق ہے تو فی نفسہ اس کے سننے میں کوئی قباحت نہیں بلکہ اگر نعت میں رسول اللہ ﷺ کی شان اور آپ کا صحیح مقام بیان کیا گیا ہو تو اس کا پڑھنا اور

سننا باعث ثواب ہے۔اسی طرح قوالی بھی اگر اچھے اسلامی اشعار پر مشتمل ہو تو اس کا سننا بھی جائز ہے لیکن ان دونوں کے جواز کے لئے کچھ قیود و شروط ہیں جو درج ذیل ہیں:

الف۔ان کے ساتھ آلات موسیقی استعمال نہ ہوں کیونکہ آلات موسیقی کے استعمال سے رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر منع فرمایا ہے۔

ب۔ جس جگہ نعت پڑھی جائے وہاں اجنبی عورتوں مردوں کا اختلاط نہ ہو ایسی مجلس میں جانا جائز نہ ہوگا بے شک وہاں نعت خوانی کیوں نہ ہوتی ہو۔

ج۔ نعتوں میں مبالغہ آمیزی نہ ہو اور اشعار میں جھوٹ اور غلط بیانی سے کام نہ لیا گیا ہو۔

سوال: ڈنمارک سے طلعت محمود لکھتے ہیں

(۱) قوالیاں گانا اور سننا کیا قرآن وحدیث کی رو سے جائز ہے اور وہ بھی موسیقی کے ساتھ؟

جناب "فتحی عثمان" ایڈیٹر ان چیف "عربیہ" نے دسمبر ۱۹۸۳ء کے شمارے میں سوالات کے جوابات دیتے ہوئے ابن حزم کے حوالے سے موسیقی کو جائز قرار دیا ہے جب کہ حدیث رسولؐ ہے کہ میں آلات موسیقی توڑنے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔

جواب: قوالی کا گانا اور سننا نا جائز ہے۔ قرآن وحدیث میں اس پر واضح احکام موجود ہیں۔ارشاد ربانی ہے

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا﴾ (لقمان: ٦)

اور بعض لوگ لہو ولعب اختیار کر کے اپنی جہالت سے اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور حق کا مذاق اڑاتے ہیں ان کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔

عربی زبان کے ماہرین کی اکثریت نے لھو کا معنی "گانے بجانے کا شغل" کیا ہے

بعض نے اس سے گانے بجانے کے آلات بھی مراد لئے ہیں۔

بخاری شریف کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میری امت کے کچھ ایسے بدبخت لوگ بھی ہوں گے جو شراب ریشم اور معازف کو حلال سمجھیں گے۔ معازف کا معنی تمام اہل لغت کے نزدیک سامان لہو ولعب ہے اور یہ گانے کے آلات جو قوالی میں استعمال کئے جائیں ڈانس میں یا گانے میں یہ سب حرام ہیں۔ علماء نے تو یہ بھی فتویٰ دیا ہے کہ اگر قرآن بھی آلات موسیقی کے ساتھ پڑھا جائے گا تو اس کا سننا بھی حرام اور ناجائز ہے۔[1]

مسند احمد کی ایک روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

ان الله حرم الخمر و الميسر و المزر والكوبة والفنين۔[2]

کہ اللہ تعالیٰ نے شراب جوئے باجے اور طبلے وغیرہ سب حرام قرار دیئے ہیں۔

ترمذی شریف کی حدیث ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لا تبيعوا القينات و لا تشتروهن و لا تعلموهن و لا خير في تجارة فيهن و ثمنهن حرام۔[3]

کہ گانے والیوں کی خرید و فروخت نہ کرو اور نہ انہیں گانا سکھاؤ۔ ان کی تجارت میں ہرگز کوئی بھلائی نہیں ہے۔

امام نووی شرح صحیح مسلم میں لکھتے ہیں کہ گانے کو امام ابو حنیفہؒ اور دوسرے ائمہ عراق نے حرام قرار دیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اپنے فتوے میں حنفی فقہ کی مشہور کتاب محیط کے حوالے سے لکھتے ہیں:

---

[1] بخاری کتاب الاشربة ۵۵۹۰

[2] مسند احمد۲/۱۶۵-۱۶۷-۱۷۱-۱۷۲

[3] ترمذی کتاب التفسیر باب و من سورة لقمان ۳۲۰۶

التغنی والتصفیق واستماعها کل ذالك حرام و مستحلها کافر

(فتاوی عزیزی اردو ص ۲۱۷ بحوالة محیط)

گانا بجانا تالیاں پیٹنا اور ان کا سننا یہ سب حرام ہیں اور ان کو حلال قرار دینے والا کافر ہے۔

اب ظاہر ہے کہ قوالی میں موسیقی بھی ہے اور تالی بھی بجائی جاتی ہے۔

قرآن و حدیث کے ان دلائل کے بعد مفتی عثمان صاحب کے جواب کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ امام ابن حزم یا کوئی دوسرا امام بھی غلطی کر سکتا ہے۔ اگر انہوں نے لکھا ہے تو وہ درست نہیں ہے۔ اللہ کے رسول کے سوا کوئی معصوم نہیں۔ اس لئے قرآن و حدیث کے دلائل سامنے آجانے کے بعد کسی کے قول کا سہارا لینا مناسب نہیں ہے۔

موجودہ فلموں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال: کرائیڈن سے محمد حنیف صاحب دریافت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آپ نے "صراط مستقیم" میں گانے بجانے اور موسیقی وغیرہ کو اسلام میں غلط اور ناجائز ثابت کیا ہے تو اس کا مطلب ہے یہ فلمیں وغیرہ سب ناجائز ہیں اور اسلامی ملک جو فلم بناتے ہیں اور دکھاتے ہیں کیا یہ بھی منع ہیں اور پھر جو ان فلموں میں رقص و ڈانس ہوتا ہے وہ بھی ناجائز ہوگا۔ ذرا اس مسئلے پر مزید روشنی قرآن و حدیث کے لحاظ سے ڈال کر شکریہ کا موقع دیں۔

جواب: مسلمانوں کے ہاں یہ مرض اب عام ہے کہ جب کوئی ناجائز گناہ معصیت بدعت اور حرام کام لوگوں کی اکثریت کرنا شروع کر دے اور پھر سرکاری سرپرستی بھی انہیں حاصل ہو جائے تو اسے ہم مشرف بہ اسلام کر لیتے ہیں اور بغیر کسی تردد کے ایسے

گناہ کے کاروبار شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ فلمیں گانے بجانے اور رقص و سرود کی محفلیں بھی اس ضمن میں آتی ہیں۔ حالانکہ قرآن و سنت میں ان کاموں کی ممانعت یا حرمت کا حکم بالکل واضح ہے۔

مندرجہ ذیل آیات و احادیث کو سامنے رکھ کر فیصلہ خود کرلیں۔

"آپ حکم دیں مومن مردوں کو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ طریقہ بہت پاکیزہ ہے۔ اللہ ان کاموں سے خوب واقف ہے جو وہ کرتے ہیں" (سورہ النور)

اب آپ خود اندازہ کرلیں کہ موجودہ دور کی مقبول عام فلموں میں کیا یہ ممکن ہے کہ نظریں نیچی رکھی جائیں؟ بلکہ ان فلموں کے مکالمے 'گیت' ناچ' چٹکلے اور اشارے سارے کے سارے بے ہودہ قسم کے ہوتے ہیں اور انہیں نرم سے نرم الفاظ میں بے حیائی کی حرکات ہی کہا جاسکتا ہے۔

سورہ نور میں مومن عورتوں کو بھی اسی طرح کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ مردوں کے بارے میں ابھی ہم نے ذکر کیا ہے (النور : ۳۰)

اخلاق و شائستگی کا جو معیار قرآن حکیم نے ایک مومن مرد اور عورت کے لئے تجویز فرمایا اس پر پابندی کا سختی سے حکم بھی دیا اور دونوں آیتوں میں لفظ "قل" آیا ہے جو امر کا صیغہ ہے کہ اے رسولؐ آپ مومنوں کو ایسے کرنے کا حکم دیں۔

اب فلموں میں نامحرم مردوں اور عورتوں کے ذریعے اختلاط' عشقیہ گانے گانا اور پھر رقص و ناچ کے ذریعے جسم کے مختلف حصوں کو نمایاں کرنا' ان چیزوں کو کون شخص قرآنی تعلیمات کے مطابق قرار دے سکتا ہے؟

سورہ نور کی آیت مذکورہ میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ عورتیں اپنی آرائش کو ظاہر نہ کریں مگر جو خود بخود ظاہر ہے اور اپنی اوڑھنیوں کو اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنی آرائش کو اپنے خاوندوں کے سوا کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں۔

اب غیر اخلاقی اور فحش حرکات' عریانی' برہنگی اور رقص چاہے یہ فلموں میں ہو یا بازاروں میں اور مختلف محفلوں میں' اس کا ایک ہی حکم ہے اور آج تک کوئی ایسا مفسر پیدا نہیں ہوا جس نے ان کاموں کو جائز یا قرآنی تعلیمات کے مطابق قرار دیا ہو۔

قرآن کا یہ حکم بھی بالکل صریح ہے:

"اور نہ ماریں اپنے پاؤں زمین پر تاکہ وہ بناؤ اور سنگھار ظاہر ہو جائے جسے وہ چھپائے ہوئے ہیں" (النور: ۳۱)

اب مروجہ فلموں میں فتنہ انگیز اور شر انگیز نگاہوں سے بچنا یا بچانا ممکن ہی نہیں اور اب ان کے حکم کا فیصلہ آپ قرآنی آیات کی روشنی میں خود کر لیں۔

اس سلسلے میں چند احادیث نبوی بھی ملاحظہ فرمالیں۔

(۱) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اللہ فرماتے ہیں نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے۔ جو اس کو میرے خوف سے ترک کرتا ہے میں اسے ایمان کی نعمت سے بدل دوں گا جس کی مٹھاس وہ اپنے دل میں پائے گا۔

(۲) حضرت جریر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اگر اچانک کسی اجنبی عورت پر نظر پڑ جائے تو اس کا کیا حکم ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کے بعد نگاہ پھیر لو۔

(۳) حضرت ابوہریرہؓ نے ایک عورت کو آتے ہوئے دیکھا کہ اس سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی ہیں۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو مسجد سے آرہی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں۔ آپ نے پوچھا کیا تو نے خوشبو لگا رکھی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں تو انہوں نے کہا میں نے اپنے محبوب ابو القاسم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عورت کی نماز قبول نہیں فرماتا جو مسجد میں تیز خوشبو لگا کر جائے جب تک وہ گھر لوٹ کر غسل جنابت کی طرح غسل نہ کرے۔

(۴) وہ عورتیں جو زرق برق اور بھڑکیلے لباس پہن کر بازاروں میں پھرتی رہتی

ہیں اور اجنبی مردوں کے ساتھ بغیر کسی قید و حد کے ملتی جلتی رہتی ہیں ان کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے میمونہ بنت سعد کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ عورت جو آراستہ و پیراستہ ہو کر نامحرم مردوں میں اترا اترا کر چلتی ہے قیامت کے دن وہ مجسم تاریکی ہوگی جہاں نور کی کرن تک نہ ہوگی۔

ان کے علاوہ متعدد آیات واحادیث ایسی ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ فلمیں جن کی مقبولیت کا راز ہی بداخلاقی و عریانی ہوتا ہے اور ایسی فلمیں اخلاق اور کردار کے لئے زہر قاتل ہیں اور نئی نسل کو بگاڑنے میں خطرناک کردار انجام دے رہی ہیں' ان کے جواز کی ذرہ بھر گنجائش نہیں۔ اور شریعت اسلامیہ میں اس سے کم درجے کے فحش مناظر' بے ہودہ حرکات اور شہوانی جذبات کو ابھارنے والے رقص وناچ بھی ممنوع ہیں۔ نہ اس کی قرآن اجازت دیتا ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے۔

رہی یہ بات کہ اسلامی ملک یہ کام کرتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان ملکوں میں اسلام پر عمل کہاں ہوتا ہے۔ یہ مسلم ممالک تو ہیں اسلامی نہیں۔ اسلامی ملک وہی ہیں جہاں شریعت اسلامی کے احکام پر عمل ہوتا ہے اور اسلامی حدود اور اسلامی قوانین کا عملی نفاذ ہے۔ جہاں مسلمان اللہ کی حدود توڑیں اور شریعت کے اصولوں کو پس پشت ڈالیں' وہاں کے حکمران بھی مجرم ہیں اور عوام بھی اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں۔

دستاویزی' تعلیمی اور سائنسی فلموں کی حیثیت

سوال: بریڈفورڈ سے منیر احمد لکھتے ہیں

آپ کا شائع کردہ پرچہ باقاعدگی سے پڑھتا ہوں جس سے کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پچھلے دنوں ایک سوال نظر سے گزرا جس میں جناب عبدالحفیظ نے دریافت

فرمایا کہ ویڈیو فلموں کی کمائی سے مسجد کے لئے چندہ دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ آپ نے جواباً تحریر فرمایا کہ ایسی فلم یا فلمیں جن میں دین کے خلاف کوئی بات نہ ہو یا اس سے بے حیائی اور بدکاری پھیلنے کا اندیشہ نہ ہو تو ایسی کمائی کو حرام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ مذہب اسلام میں گانے بجانے کو حرام قرار دیا گیا ہے اور آج کل کے زمانے میں شاید ہی کوئی ایسی فلم ہو جس میں گانا بجانا نہ ہو اور یہی گانا بجانا اسلام میں حرام ہے جو کہ مندرجہ ذیل حوالہ جات سے ثابت ہے۔ حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ تم لوگ گانے سے پرہیز کرو کہ وہ شیطان کی طرف سے ہے اور اللہ کے نزدیک شرک ہے اور سوائے شیطان کے نہیں گاتا۔ (عین الہدایہ جلد ۲ ص ۲۲۳)

اس کے بعد کچھ اور کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جن میں گانے بجانے کو حرام یا ناجائز کہا گیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ آپ ہی انصاف سے بتایئے کہ کون سی ایسی ویڈیو فلموں کی دوکان ہے جہاں ناچ گانے والی فلموں کی خرید و فروخت نہیں ہوتی۔ گستاخی معاف تو پھر آپ نے کیسے تحریر فرمادیا کہ اس کمائی کو حرام قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جواب: گانے بجانے کے ناجائز ہونے میں تو کوئی اختلاف نہیں اور فحش اور بے ہودہ گانوں کے حرام ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں۔ ہاں البتہ اس سلسلے میں آپ نے حضرت جابر کے حوالے سے جو حدیث لکھی ہے کہ یہ اللہ کے نزدیک شرک ہے۔ اس طرح کے الفاظ مجھے تلاش کرنے کے باوجود کسی حدیث میں نظر نہیں آئے۔ اس طرح لہو و لعب اور کھیل تماشے کے بارے میں جو دوسرے حوالے آپ نے تحریر کئے ہیں، وہ بھی اپنی جگہ درست ہیں اور ظاہر ہے کہ حرام کاموں کے ذریعے حاصل کی گئی کمائی بھی حرام ہی ہوگی۔ لیکن میں نے گزشتہ کسی سوال کے جواب جو یہ تحریر کیا تھا کہ ایسی فلمیں جن سے فحاشی اور بے حیائی پھیلنے کا اندیشہ نہ ہو تو ایسی کمائی کو حرام قرار نہیں دیا جاسکتا اس کا مطلب واضح ہے کہ اگر ایسی فلمیں ہوں یا ایسی فلمیں فروخت کی جائیں جن میں یہ قباحتیں نہیں ہیں تو ایسی کمائی جائز ہے۔ رہی یہ بات کہ میں آپ کو ایسی

دوکان بتاؤں جس میں اس طرح کی فلمیں فروخت ہوتی ہوں یا ایسی فلم کا نام آپ کو بتاؤں جس سے بے حیائی یا ناچ گانے کا کام نہیں لیا جاتا تو یہ میری ذمہ داری نہیں۔ میں نے تو ایک اصول بتا دیا ہے۔ اگر اس کے مطابق کوئی دکان یا فلم ایسی نہیں ملتی بلکہ سب میں گندے اور غلط کام ہیں تو یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ میں دکانوں یا فلموں کے نام لے کر آپ کو نہیں بتا سکتا کہ فلاں فلم دیکھا کریں اور فلاں نہ دیکھا کریں یا فلاں دکان سے ویڈیو کی فلمیں ملتی ہیں اور فلاں سے نہیں۔ ہاں البتہ اتنی بات ضرور لکھوں گا کہ دستاویزی، تعلیمی، سائنسی اور دوسری کئی قسم کی ایسی فلمیں ہیں جن میں بے شمار اچھے پہلو ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی دکان دار صرف ایسی فلموں کا کاروبار کرتا ہے تو اسے آپ حرام ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے مطلق طور پر یوں ہی بغیر سوچے سمجھے یہ کہہ دینا کہ ہر فلم حرام ہے یا ہر فلم کا کاروبار کرنے والے کی کمائی حرام ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ شریعت نے حلال و حرام کے کچھ اصول متعین کر دیئے ہیں ان کے مطابق ہر زمانے میں مختلف کاموں یا ایجادات کو پرکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں۔

حرام اشیاء

شراب کی حرمت

کیا شراب سے علاج کر سکتے ہیں؟

سوال: نارتھ ہمپٹن سے واجد علی پوچھتے ہیں
کیا آدمی بیمار ہو تو دوا کے طور پر شراب پی سکتا ہے اور اگر بھوکا ہو تو حرام گوشت کھا سکتا ہے؟

جواب: شراب بطور علاج استعمال کرنا بھی حرام ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ شراب خود بیماری ہے نہ کہ علاج اور جو خود بیماری ہے اس کے ذریعے علاج نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں ایسی اضطراری حالت یا مجبوری جس میں جان جانے کا خطرہ ہو تو اس وقت حرام شے اتنی مقدار میں استعمال کر سکتا ہے جس سے اس کی جان بچ جائے زیادہ نہیں۔ یہی حکم حرام گوشت کا ہے۔ اگر کوئی آدمی بھوک سے مرنے لگا ہے تو ایسی صورت میں اتنا کھا سکتا ہے جس سے مرنے سے بچ جائے۔

علامہ صاحب جو شراب کی فروخت کو جائز کہتا ہے

سوال: ہمارے ہاں ایک علامہ صاحب ہیں جو مسلمانوں کے لئے شراب کا فروخت کرنا جائز قرار دیتا ہے بلکہ شراب خانوں کا افتتاح کرتا ہے۔ آپ ازراہ کرم اپنے خیال سے مستفید فرمائیں کہ ایک خطیب جو شراب خانے کا افتتاح کرتا ہے اس کا اسلام میں

کیامقام ہے۔

از عبدالستار علوی نقش بندی مانچسٹر

جواب: شراب کے حرام ہونے کے بارے میں نہ کوئی اختلاف ہے اور نہ ہی اس میں کوئی گنجائش ہے بلکہ اس کی حرمت پر امت کے درمیان شروع سے لے کر آج تک اتفاق چلا آرہا ہے۔ اب اگر کوئی نام نہاد علامہ یا خطیب شراب خانوں کا افتتاح کرکے اس حرام کاروبار کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تو وہ سنگین جرم کا ارتکاب کررہا ہے۔ ہمیں تو یقین نہیں آتا کہ کوئی عالم جو لوگوں کی امامت و خطابت کرتا ہو وہ ایسی حرکت کرسکتا ہے۔ اور اگر یہ درست ہے اور جیسا کہ آپ نے لکھا ہے کہ وہ اس کے فروخت کرنے کے جواز کا بھی فتویٰ دیتا ہے تو ایسا شخص نہ امامت کے قابل ہے اور نہ ہی وہ خطابت کے فرائض انجام دینے کا اہل ہے۔

امامت کے بارے میں فقہاء نے جو شرائط بیان کی ہیں ان پر ایسا شخص پورا نہیں اترتا۔ نبی کریم ﷺ نے جس طرح شراب پینے والے پر لعنت فرمائی ایسے ہی آپ نے شراب بنانے والے پر لعنت فرمائی فروخت کرنے اور پلانے والے پر بھی لعنت کی ہے اور ملعون شخص مسلمانوں کی دینی پیشوائیت کا ہرگز اہل نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ اس ملک میں ہمیں اپنے دینی شعائر کی حفاظت کرنے اور اسلامی تشخص کو بچانے کی توفیق عطا کرے۔ آمین!

توبہ سے قبل کثرت شراب نوشی

سوال: لیڈز سے محمد سلطان لکھتے ہیں کہ میرے ایک دوست کو شراب نوشی کی عادت تھی۔ میں ہمیشہ اسے شراب ترک کرنے کی تلقین کرتا رہتا تھا۔ ایک دن اس نے وعدہ کیا کہ وہ اب شراب چھوڑ دے گا اور میرے ساتھ مسجد میں نماز کے لئے

جائے گا اور اس گناہ سے توبہ کر دے گا مگر جانے سے پہلے اس نے شراب کی بوتل لے کر پینا شروع کر دی اور کہا کہ توبہ سے پہلے جی بھر کر پی تو لوں۔ اس بارے میں شریعت کا کیا مسئلہ ہے اور کیا ایسے آدمی کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

جواب: شراب نوشی قطعی طور پر حرام ہے۔

ارشاد ربانی ہے

اے ایمان والو! بلا شبہ شراب' جوا' انصاب (بت) اور ازلام (تیر سے فال نکالنا) شیطانی کاموں کی گندگی ہے پس تم اس سے دور ہو تا کہ کامیاب ہو جاؤ۔ شیطان یہی چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعہ دشمنی اور بغض پیدا کرے اور تمہیں اللہ کی یاد سے روک دے اور نماز سے' پس کیا تم رک جاؤ گے؟ (مائدہ:۹۰۔۹۱)

خود نبی کریم ﷺ سے ہی ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ:

کل مسکر خمر و کل مسکر حرام۔[1]

کہ ہر نشہ آور چیز شراب ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔

تمام امت کا شراب کی حرمت پر اجماع ہے۔ جس شخص نے شراب کے حرام ہونے کا انکار کیا وہ مرتد اور خارج از اسلام ہے۔ ہاں نیا مسلمان جسے شراب کی حرمت اور اس کی سنگینی کا صحیح علم نہیں' اس کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ بصورت دیگر ہر مسلمان کا پینا' پلانا' خریدنا' بیچنا' اٹھانا اور پیش کرنا حرام ہے۔ دور جدید میں بھی اس کے جسمانی' روحانی' معاشرتی اور اجتماعی نقصانات کھل کر سامنے آچکے ہیں اور غیر مسلم سوسائٹیاں بھی اب اسکے نتائج سے پریشان ہیں۔ ایک مسلمان کا اس سے بچنا لازمی اور ضروری ہے۔

جہاں تک آپ کے دوست کے اس فعل کا تعلق ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے یوں تو ایک مسلمان کے لئے اس طرح کا رویہ اختیار کرنا جائز نہیں کہ وہ توبہ سے پہلے اس جرم کا اعادہ کرے اور یہ خیال کرے کہ توبہ تو کرنی ہی ہے اب جی بھر کر اس جرم کا

---

[1] ترمذی للالبانی ج۲ ابواب الاشربۃ باب ما جاء فی کل مسکر حرام ص ۱۶۹ رقم الحدیث ۱۹۴۱

اعادہ کرلو۔ خدانخواستہ توبہ کے خیال کے بعد اس جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے اس کی موت آجاتی ہے تو ایسے شخص کی آخرت برباد ہو سکتی ہے۔ اس لئے جونہی احساس ہو جائے پھر اس برائی کو فوری طور پر ترک کر دینا چاہئے اور توبہ دراصل ترک گناہ کے عزم ہی کا نام ہے۔ اگر خیال کرے اور زبان سے توبہ توبہ بھی کرتا ہے مگر ساتھ اس برائی کو بھی کرتا ہے تو ایسی توبہ کی کوئی حیثیت نہیں ہے مگر چونکہ توبہ ہر قسم کے گناہ کا کفارہ ہے اس لئے جو شخص توبہ سے پہلے اس فعل کو بار بار کرتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اسے اتنی مہلت دے دیتا ہے' عملاً وہ سچی توبہ بھی کرلیتا ہے تو اس کی توبہ بہرحال قبول ہو سکتی ہے۔ کیونکہ موت سے پہلے بڑے سے بڑے گناہ کی توبہ ممکن ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

"اے میرے بندو جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں بے شک اللہ تمام گناہ معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہے اور اپنے رب کی طرف جھک جاؤ اور اس کے مطیع بن جاؤ اس سے پہلے کہ اس کا عذاب تمہیں آپہنچے اور پھر کوئی بھی تمہاری مدد نہیں کرے گا اور اس کی پیروی کرو۔ جو سب سے بہتر تمہارے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے اس سے قبل کہ اس کا عذاب تمہارے پاس اچانک آجائے اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے۔" (سورہ زمر: ۵۳)

دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"بے شک توبہ ان لوگوں کے لئے ہے جو جہالت کی وجہ سے گناہ کرتے ہیں پھر فوری توبہ کرلیتے ہیں۔ بے شک ایسے لوگوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے اور ایسے لوگوں کے لئے توبہ فائدہ مند نہیں جو برے کام کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے کسی کی موت آجاتی ہے تو کہتا ہے اب میں توبہ کرتا ہوں" (سورہ نساء: ۱۷۔۱۸)

تیسری آیت بھی اس مفہوم کی ہے اے ایمان والو! اللہ کے لئے خالص توبہ کرو قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے گناہوں کو دور کر دے۔ (سورہ التحریم : ۸)

چوتھی آیت میں ہے اور وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے نہ ایسی جان کو قتل کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے مگر اس کے حق کے ساتھ اور نہ وہ زنا کرتے ہیں جو کوئی یہ کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا قیامت کے دن ایسے لوگوں کو دوگنا عذاب دیا جائے گا اور وہ ہمیشہ جہنم میں ذلیل و خوار رہے گا مگر وہ لوگ جنھوں نے توبہ کی اور نیک عمل کئے ایسے لوگوں کی برائیاں اللہ تعالیٰ نیکیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہے۔(سورہ الفرقان:۶۹)

توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ کتنا ہی بڑا گناہ کیوں نہ ہو توبہ کے بعد معاف ہو جاتا ہے۔

حرام چیزوں کے استعمال کے باوجود یورپ ترقی کر رہا ہے؟

سوال: مغربی جرمنی سے کسی صاحب نے پوچھا ہے۔

سور' شراب' زنا' جوا' کیوں حرام ہیں۔ اسلام کے نزدیک جس قوم میں یہ برائیاں ہوں وہ ترقی نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود یورپ کیوں ترقی کر رہا ہے؟

جواب: جہاں تک شراب' جوئے' زنا' خنزیر اور سود وغیرہ کے حرام ہونے کی وجہ اور سبب کا تعلق ہے تو اس بارے میں دو باتوں کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ پہلی یہ کہ ہر انسان کے لئے یہ معلوم کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی ممکن ہے کہ فلاں چیز کیوں حرام ٹھہرائی گئی اور کس وجہ سے اس کا استعمال کرنا ممنوع ٹھہرایا گیا۔ کیونکہ جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان کی خباثتیں یا نقصانات کا معلوم کر لینا یہ انسان کے بس میں نہیں ہوتا ایک ہی چیز کا نقصان ایک آدمی اپنے علم اور تجربے سے معلوم کر لیتا ہے جب کہ دوسرے کے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں ہوتیں اور پھر ایک حرام کردہ چیز کی خباثت ایک زمانے میں ظاہر نہیں ہوتی جب کہ دوسرے زمانے میں وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔

مثلاً سور کے گوشت کی مثال ہی لیجئے کہ جب یہ حرام کیا گیا تو اس وقت شاید ہی کسی کو اس کی حرمت کا سبب یا علت معلوم تھی لیکن سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ انکشافات ہوتے گئے کہ اس میں ایسے مہلک جراثیم اور کیڑے ہوتے ہیں جو بے شمار بیماریوں کا سبب بن سکتے ہیں بہر حال کوئی انکشاف ہو یا نہ ہو مسلمان اس عقیدے پر قائم رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق کائنات اور حکیم و خبیر ہے اس لئے یہ اسی کا حق ہے کہ جس چیز کو چاہے حلال ٹھہرائے اور جسے چاہے حرام قرار دے دے اس پر اعتراض کرنے یا اس کی نافرمانی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود اہل علم کا یہ فرض ہے کہ وہ خلق خدا کے سامنے ان محرمات کے نقصانات اپنے علم اور تجربات کی روشنی میں واضح کریں تاکہ اسلام کی سچائی اور حقانیت پر لوگوں کا یقین اور زیادہ پختہ ہو۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ جب ہر انسان کے بس میں ایک چیز کی اصلیت یا ماہیت معلوم کرنا نہیں ہے تو پھر آخر اسے کس چیز پر انحصار کرنا ہوگا؟ ظاہر ہے وہ صرف اور صرف وحی الٰہی ہے مگر ایک شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے اور محمد ﷺ اللہ کے سچے نبی و رسول ہیں تو پھر اسے چیزوں کی حلت و حرمت کا اختیار اللہ وحدہ لا شریک ہی کو دینا ہوگا' کسی عالم' درویش' بادشاہ یا حکمران کو یہ اختیار دینے کا معنی یہ ہوگا کہ اس کا خدا اور قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کو کسی چیز کی حرمت و حلت کے بارے میں شک ہے تو پہلے اسے قرآن و اسلام کے بارے میں اپنے عقیدے کا جائزہ لینا چاہیۓ کہ اگر ان کی سچائی پر اس کا ایمان ہے تو پھر خالق کائنات کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا چاہے اس کی حکمت یا فلسفہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے (یہ کوئی ضروری نہیں)

شراب: اب شراب کو ہی لیجئے اس کی حرمت کی سب سے بڑی وجہ اور سبب تو یہ ہے کہ اسے اس ذات نے حرام ٹھہرایا ہے جو چیزوں کا پیدا کرنے والا اور ان کی خوبیوں

اور مضرتوں کا صحیح علم رکھنے والا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ اسے کیوں حرام ٹھہرایا؟ اس کا کیا نقصان ہے؟ اس بارے میں موجودہ دور میں یہ بات تقریباً متفق علیہ ہو چکی ہے کہ شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کے بے شمار طبی اور معاشرتی نقصانات ہیں جس سے انسان کی صحت اور اخلاق دونوں پر اثر پڑتا ہے اور آج ان کی بہتات اور کثرت استعمال دنیا بھر کے لئے مسئلہ بن چکا ہے۔ رہی یہ بات کہ شراب کے کچھ فوائد بھی ہیں تو قرآن نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کے نقصانات منافع کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں لہٰذا یہ حرام ہے اور جدید تحقیق نے اس کے نقصانات واضح کر دیئے ہیں۔

جوا: قرآن نے شراب کے ساتھ ہی جوئے کا ذکر بھی کیا ہے کیونکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے ایک بیماری کا شکار ہونے والا دوسری میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ ہارے ہوئے جواری اکثر شراب کے ذریعے ہی عارضی اور مصنوعی تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جوئے کے نقصانات فرد اور معاشرے دونوں کے لئے بالکل واضح ہیں جنہیں سمجھنے کے لئے کسی لمبے چوڑے فلسفے کی ضرورت نہیں اس کھیل میں محنت اور وقت دونوں کی بربادی ہے۔ جواریوں کے درمیان بغض و عداوت اکثر قتل و غارت تک پہنچتی ہے اور اس مرض میں مبتلا عیاش لوگ خاندان' کاروبار اور معاشرتی روایات سب کو تباہ کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگ محض آرزوؤں کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ محنت اور اسباب کی تلاش کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ صرف بازی جیتنے کے لئے بسا اوقات دین' عزت اور وطن کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں اسی لئے قرآن نے انہیں رجس من عمل الشیطان کہا کہ گندے شیطانی کام ہیں' ان سے بچ کر رہو۔

خنزیر: جدید طب نے خنزیر کے گوشت کے نقصانات واضح کر دیئے ہیں کہ اس کا کھانا ہر خطے خصوصاً گرم ممالک میں انتہائی نقصان دہ ہے۔ بعض سائنس دانوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کے کھانے سے جسم میں خطرناک قسم کے کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مسلم ماہرین نے جو تحقیق کی ہے اس کے مطابق خنزیر کے گوشت کے زیادہ

استعمال سے غیرت کم ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اگر اتنا ہی نقصان دہ ہے تو انگریز اور دوسرے غیر مسلم اتنی کثرت سے استعمال کیوں کرتے ہیں۔ تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ مغربی ممالک کے لوگ یا دوسرے غیر مسلم ہر اس چیز سے دور رہتے ہوں جو نقصان دہ ہو۔ سگریٹ کے استعمال سے جو خطرناک بیماریاں جنم لے رہی ہیں اور سرطان کے اسباب میں بھی اب سگریٹ نوشی کو شامل کر لیا گیا ہے۔ کیا اس کے بعد یورپ والوں نے سگریٹ نوشی چھوڑ دی ہے؟ اس لئے یہ کوئی دلیل نہیں کہ شراب اور خنزیر کے نقصان سے یہ بچے ہوئے ہیں بلکہ ان ساری بیماریوں میں مبتلا ہونے کے باوجود یہ ان گندگیوں کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں اور یہی چیز ان کی ہلاکت اور بربادی کا سبب بنے گی۔

زنا: اسلام دین فطرت ہے اس لئے اس نے فطری خواہشات کی بھی حدود مقرر کر دی ہیں۔ اگر انسان کو جنسی خواہشات کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے اور زنا کو جائز قرار دے دیا جائے تو خاندانی اور عائلی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ حسب و نسب اور حقوق و فرائض کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسلام نے نہ تو یہ کیا کہ اس کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا کہ جہاں چاہے جانوروں کی طرح اپنی خواہش پوری کر لے اور کوئی دینی یا اخلاقی رکاوٹ بھی اس کے سامنے نہ ہو اور نہ ہی اس سے ٹکرانے کی اجازت دی کہ گوشہ نشینی اختیار کر لی جائے اور شادی بیاہ اور دوسری دنیاوی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی کر کے رہبانیت اختیار کر لی جائے۔ بلکہ اسلام نے اعتدال کی راہ اختیار کی ہے کہ کچھ حدود مقرر کی ہیں جن کے اندر رہ کر نکاح کی شکل میں خواہش پورا کرنے کی اجازت دی اور ان حدود سے باہر زنا کی شکل کو حرام و بے غیرتی قرار دیا اور صرف اسلام ہی کا نہیں بلکہ تمام آسمانی مذاہب کا یہی موقف ہے۔

اب جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جس قوم میں یہ بیماریاں آجائیں وہ ترقی کر سکتی ہے یا نہیں اور یورپ والوں میں یہ بیماریاں پائی بھی جاتی ہیں پھر بھی وہ ترقی کر رہے ہیں؟

یہ بڑا نازک سوال ہے اور اکثر لوگ اس شبہ میں مبتلا ہو کر دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ترقی صرف مادی وسائل کی بہتات کا نام نہیں کہ جس قوم کے پاس ہتھیاروں یا دنیاوی اسباب کی بہتات ہو وہ ترقی یافتہ ہے ہمارے نزدیک ترقی یافتہ وہ قوم ہے جس نے مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی قدروں کو بھی اجاگر کیا ہو اور ان کا بھی تحفظ کر رہے ہوں۔ جیسا کہ اسلام کے روشن دور کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ آج جنہیں آپ ترقی یافتہ سمجھتے ہیں وہ اخلاقی اور روحانی طور پر اس قدر کھوکھلے ہو چکے ہیں کہ اگر بداخلاقیوں اور بدکرداریوں کی رفتار یہی رہی تو اہل مغرب بہت جلد انتہائی بھیانک انجام سے دو چار ہوں گے۔ آپ ہی بتائیں کہ نیو یارک جو دنیا کے معیار کے مطابق مہذب ترین اور سب سے ترقی یافتہ ملک کا مرکزی شہر ہے وہاں چند گھنٹوں کے لئے اگر بجلی فیل ہو جائے تو حیوانیت و درندگی کس طرح ناچتی ہے نہ کسی کی عزت محفوظ رہتی ہے نہ مال ایک رات میں چوریوں اور ڈاکوں کا شمار کر کے بتائیں کہ اسی کا نام ترقی ہے؟ جبکہ زنا شراب اور جوئے کی وجہ سے وہاں جتنے قتل اور فسادات ہو رہے ہیں وہ اس سے الگ ہیں۔ ہتھیاروں کی ترقی کا انجام بھی برا نظر آتا ہے شاید یہ کسی بدحواسی میں آ کر اپنے ہی بنائے ہوئے ہتھیاروں سے تباہ و برباد ہو جائیں اور جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو اکثر ایسے ہی ہوتا ہے۔ ہاں آپ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ دنیاوی اور مادی لحاظ سے ان لوگوں کو مسلمانوں پر فوقیت حاصل ہے لیکن ایسا کیوں ہے؟ یہ بھی قابل غور بات ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ غالب رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کفار کے مقابلے میں ان کی ہمیشہ مدد کرے گا اور اس کی تکمیل اسی شکل میں ہو گی جب مسلمان اللہ سے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کریں اور اللہ نے بارہا یہ وعدہ پورا کیا کہ جب مسلمانوں نے اس کی سچی اطاعت کی تو پھر وسائل کی کمی کے باوجود انہیں غالب و کامیاب کیا۔ اور اگر دونوں شرابی دونوں زانی یعنی کفار بھی عیاش اور مسلمان بھی عیاش دونوں بدعمل و بدکردار

ہو جائیں تو پھر اللہ کے نزدیک دونوں برابر ہیں۔ جو تعداد اور مادی قوت میں زیادہ ہو گا وہ دوسرے پر غالب آجائے گا۔ موجودہ صورت حال ایسی ہی ہے کہ کفار دشمن اسلام بھی ہیں' زانی و شرابی بھی ہیں مگر پھر مسلمانوں پر غالب اور مادی لحاظ سے ان سے آگے ہیں کیونکہ عیاش ہونے کے باوجود وہ محنت بھی کرتے ہیں اور زندہ رہنے کے کچھ اصولوں پر کاربند بھی ہیں۔ ان کے مقابلے میں مسلمان اپنے دین سے باغی بھی ہیں۔ زنا و شراب کو بھی جائز ٹھیرائے ہوئے ہیں اللہ کے قانون کو اپنے ملکوں سے ...لیس نکالا بھی دیا ہوا ہے اور ان عیاشیوں اور بغاوتوں پر اضافہ یہ کہ محنت بھی نہیں کرتے اور معاملات و اخلاق میں کوئی اصول و ضابطہ بھی نہیں تو ظاہر ہے یہ دوسروں سے پیچھے ہی رہیں گے بلکہ اللہ سے عہد کرنے کے بعد پھر یہ بغاوت و سرکشی زیادہ ناراضگی کا سبب بنتی ہے۔ اللہ کی اطاعت اور اس کی فرماں برداری ہی مسلمانوں کی امتیازی شان ہے۔ یہ نہ رہی تو پھر کفار اپنی محنت و قوت سے ان پر غالب آسکتے ہیں۔ اس بحث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کفار کے لئے شراب و زنا یا دوسرے گناہ مفید ہیں اور نقصان دہ نہیں اور ان کی ترقی میں رکاوٹ نہیں۔ بلکہ یہاں بھی کچھ خدائی قوانین و ضابطے ہیں جنہیں قرآن بیان کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی شان حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے تو ہم اس کو کوشش کے صلے میں پوری پوری عطا کرتے ہیں کسی قسم کی کمی نہیں چھوڑتے مگر صرف دنیا کے طالبوں کے لئے آخرت میں سوائے جہنم کی آگ کے اور کچھ نہیں ہو گا۔ (ھود:۱۵۔۱۶)

اب اس سے واضح ہو گیا کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ دنیا کے حصول کی خاطر محنت کرنے والوں کو ان کی محنت کا پورا پورا صلہ عطا کرتا ہے۔ لیکن اس ساری ترقی یا قوت کے باوجود کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ مسلسل نافرمانیوں اور سرکشیوں میں رہنے کی وجہ سے اچانک عذاب الٰہی کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے

اور کتنے ہی بستیوں والے جو اپنی معیشت کی ترقی پر اترانے لگ گئے ہم نے ان کو ایسے صفحہ ہستی سے مٹایا کہ اس جگہ بعد میں کوئی کم ہی آباد ہے اور بالاخر ہر چیز ہماری ملکیت میں آگئی۔ (قصص: ۵۸)

اور بعض اوقات انہیں مہلت بھی دی جاتی ہے اور جوں جوں سرکشی و بغاوت میں زیادہ ہوتے ہیں بظاہر وسائل و اسباب بھی کثرت سے دیئے جاتے ہیں اور پھر اچانک عذاب الٰہی کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے

جب وہ نصیحت کی چیزوں کو بھول گئے تو ہم نے ہر چیز کے دروازے ان پر کھول دیئے۔ یہاں تک کہ وہ اکڑنے لگے تو اچانک ہم نے پکڑ لیا اور پھر ناکامی کے سوا انہیں اور کچھ نہیں ملا۔ (انعام: ۴۴)

یہ اور اس طرح کی دوسری آیات میں قرآن نے قوموں کے عروج و زوال پر بڑے پیارے انداز سے روشنی ڈالی ہے اگر آپ بغور ان کا مطالعہ کریں تو مسلمانوں کے زوال اور غیر مسلموں کی ظاہری چمک دمک کے اسباب با آسانی آپ کی سمجھ میں آجائیں گے۔

مختصر یہ کہ اخلاقی و معاشرتی برائیاں کسی قوم کے حق میں بھی بہتر نہیں ہو سکتیں چاہے وہ موجودہ مسلمانوں کی طرح کوئی پس ماندہ قوم ہو یا دنیا کی مادی قوتوں کی طرح ترقی یافتہ۔ سلطنت روم کے عروج و زوال کی داستان کا مطالعہ کریں۔ بغداد کے عروج اور اندلس کی ترقی کو دیکھیں اور پھر ان کی تباہی کے اسباب کا جائزہ لیں۔ دور نہ جایئے اپنے ہاں سلطنت مغلیہ کی تباہی اور زوال ہی کی تاریخ کا مطالعہ کر لیں۔ ہر جگہ آپ کو قانون قدرت یکساں نظر آئے گا۔ اسکے ضابطے اٹل ہیں۔ اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔

موجودہ بین الاقوامی صورت حال تو ہمارے یقین اور ایمان کو پختہ کر رہی ہے اور ایسے لگتا ہے کہ ترقی و قوت کے سہارے جینے والے شاید آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں اور پھر خدا کسی دوسری قوم کو ان کی جگہ لا کر بسائے۔

اس بات کا جاننا بھی ضروری ہے کہ اسلام ترقی کا ہرگز مخالف نہیں لیکن اسلام ترقی کے نام پر اخلاقی گراوٹ اور روحانی فساد کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علماء یا اسلامی قدریں ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں ترکی میں کمال اتاترک نے ۱۹۲۴ء میں اپنے خیال سے عربی کا وجود مٹایا اور ملا کو راستے سے ہٹایا یہ سمجھ کر کہ یہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ دین و ملا کے ہٹ جانے کے بعد کیا وہاں واقعی ترقی ہوئی ہے۔ ہوٹلوں سینماؤں میں تو ترقی نظر آئے گی لیکن آج تک وہاں سیاسی سکون اور معاشی ترقی نہیں ہو سکی۔ بلکہ وہ قوم آج پھر روحانی قدروں کی طرف تیزی سے لوٹ رہی ہے اور وہاں چند سالوں کے بعد کمال اتاترک کا نام لینے والا بھی شاید کوئی باقی نہ رہے۔ ماضی قریب میں شاہ ایران کا انجام بھی ہمیں یہ سوال حل کرنے میں کافی مدد دے سکتا ہے۔

سور کا گوشت حرام کیوں ہے؟

سوال: ہیرٹ براک مغربی سے بشیر احمد بھٹہ دریافت کرتے ہیں سور کے گوشت کی حرمت کے بارے میں روشنی ڈالیں کہ خدا تعالیٰ نے کن وجوہات کی بنا پر اسے حرام قرار دیا ہے؟

جواب: سور کے گوشت اور شراب کی حرمت کے بارے میں صراط مستقیم کے دسمبر ۱۹۸۲ء کے شمارے میں مفصل بحث شائع ہو چکی ہے۔ اب اختصار کے ساتھ پھر اس پر روشنی ڈال دیتے ہیں۔

شراب، خنزیر، جوا اور سود جیسی اشیاء کے حرام ہونے کی وجہ یا سبب جاننے سے پہلے دو باتوں کا جاننا بہر حال ضروری ہے۔

ایک یہ کہ ہر انسان کے لئے یہ جاننا نہ تو لازمی ہے اور نہ ہی ممکن ہے کہ کوئی چیز

کیوں حلال ہے اور کیوں حرام کی گئی۔ حرام چیزوں کے نقصانات یا مضرتیں معلوم کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ایک ہی چیز کا نقصان ایک آدمی علم یا تجربے کی بنیاد پر معلوم کر لیتا ہے جب کہ دوسرے کے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں ہوتیں۔ اس لئے اسے ان کے نقصان کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک زمانے میں ایک چیز کے نقصان دہ پہلو ظاہر نہیں ہوتے جب کہ دوسرے زمانے کے ماہرین اس کے نقصانات کے اسباب معلوم کر لیتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ہر انسان کے بس میں ایک چیز کی اصلیت یا ماہیت معلوم کرنا نہیں اور نہ ہی اس کے پاس اتنا علم ہے تو پھر اسے کس چیز پر انحصار کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے وہ صرف اور صرف وحی الٰہی ہے۔ اگر ایک شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کا عقیدہ ہے کہ قرآن اللہ کی سچی کتاب ہے اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی اور رسول ہیں۔ ایسے شخص کو حلال و حرام کا اختیار بھی اللہ وحدہ لا شریک ہی کو دینا ہوگا۔ کسی عالم یا درویش یا حاکم و بادشاہ کو ہرگز اختیار نہیں کہ وہ اشیاء کی حلت و حرمت کے فیصلے کرتا پھرے۔ اس لئے اگر ایک مسلمان کو کسی چیز کی حلت و حرمت کے بارے میں شبہ ہے تو اسے پہلے قرآن و اسلام کے بارے میں اپنے عقیدے کا جائزہ لینا چاہئے اور اگر ان کی سچائی پر اس کا ایمان پختہ ہے تو پھر خالق ارض و سما کے ہر حکم کے سامنے اسے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا چاہے اس کی حکمت اور علت اس کی سمجھ میں آ جائے یا نہ آئے کیونکہ اس کے حلال و حرام ہونے کی سب سے بڑی اور واضح وجہ تو یہ ہے کہ اسے حلال و حرام اس ذات نے ٹھہرایا ہے جو ان ساری چیزوں کو پیدا کرنے والا اور ان کے فوائد و نقصانات کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہے۔

جہاں تک ایک غیر مسلم کا تعلق ہے کہ وہ کس طرح ان چیزوں کے فائدوں یا نقصانات کا قائل ہو سکتا ہے جب کہ وہ قرآن یا اسلام کو تو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ یہاں بھی پہلی بات تو وہی ہے کہ ایسے شخص کو پہلے اسلام کا صحیح تعارف کرائیں اور بتائیں کہ اسلام میں یا مسلمانوں کے نزدیک حلال و حرام کرنے کی اصل اتھارٹی کون ہے اور کیوں

ہے اور یہ کہ مسلمان مقدس کتاب قرآن کے بارے میں ایک فیصلہ کن کتاب کی حیثیت سے کیا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس کتاب کی سچائی یا حقانیت کے لئے ان کے پاس کون سے دلائل ہیں۔ کسی بھی شخص کو بنیادی اسلامی عقائد اور تصورات کا قائل کئے بغیر آپ محض چند باتوں کا الگ سے قائل نہیں کر سکتے۔ اسلام زندگی کا ایک مربوط اور مستقل نظام پیش کرتا ہے۔ اگر اس کے کسی جز کو الگ کر کے آپ کوئی فیصلہ کرنا چاہیں گے تو اس میں خاصی مشکلات پیش آئیں گی۔ اس لئے قرآنی احکام کی صداقت اور ہمہ گیریوں کے اثبات کے بغیر اس کے کسی جزوی حکم کی حکمت با آسانی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ جس دور میں قرآن نازل ہوا تھا' اس وقت کسی چیز کی حکمت یا اصول معلوم کرنے کے لئے آلات یا مشینیں آج کی طرح نہ تھیں تو پھر کس طرح قرآن نے دنیا میں اپنی سچائی تسلیم کروائی اصل سمجھنے والا تو یہی نکتہ ہے مگر اس کے باوجود اہل علم کا ہر دور میں یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اللہ کی طرف سے حرام کردہ چیزوں کے نقصانات اپنے علم اور تجربات کی روشنی میں واضح کریں اور اس کے لئے دور جدید کی تمام ایجادات اور مشینریوں سے فائدہ اٹھائیں تاکہ اسلام کی حقانیت اور سچائی پر لوگوں کا یقین اور زیادہ پختہ ہو۔

اب ہم حلت و حرمت کے سلسلے میں قرآن حکیم کے ایک ضابطے کا ذکر کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ

﴿يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ﴾ (اعراف: ۱۵۷)

یعنی اللہ کا نبیؐ لوگوں کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام بتلاتا ہے اب ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ خالق کائنات ہی کر سکتا ہے جو حکیم و خبیر ہے اور کسی چیز کے پاک و پلید ہونے کا علیم ہے لیکن ضابطہ یہ دے دیا کہ پاکیزہ چیزیں ہی حلال ہیں اور گندی چیزیں حرام۔

گندی اور خبیث چیزیں چاہے ظاہری گندگی ہو چاہے باطنی وہ سب حرام ہیں۔
اب خنزیر کو لیجئے اس میں دیگر مضرات کے علاوہ ظاہری گندگی بھی ہے۔ اس کی شکل و

صورت' اس کا رہن سہن اور اس کے کھانے پینے ان سب چیزوں میں گندگی یا کراہت کے پہلو نمایاں ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ دور جدید کے ماہرین نے اس کے گوشت کے مضر اثرات پر بھی تحقیقی کام کیا اور اس کے گوشت سے جو بیماریاں انسانی جسم کے اندر پیدا ہوتی ہیں ان کی نشان دہی کی ہے جن میں سے کچھ ذیل میں دی جا رہی ہیں

۱۔ایک چھوٹا سا کیڑا جسے LUM COIL BALANTID کہتے ہیں جو خنزیر کی انتڑیوں میں رہتا ہے اور کئی متعددی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔

۲۔"WELL ,S DISEASE" یہ بیماری بھی خنزیر اور کتے کی وجہ سے انسان تک پہنچتی ہے۔

۳۔"ERYSPELOLD" یہ بیماری خنزیر کو عام طور پر ہوتی ہے اور پھر اس کے ذریعہ انسان کو منتقل ہو جاتی ہے۔

۴۔"TAENIA SOLLUM" یہ ایک لمبا کیڑا ہوتا ہے جو انتڑیوں سے خوراک چوس لیتا ہے اور پھر بیماری کا سبب بنتا ہے۔

یہ اور اس طرح کی متعدد بیماریوں کی اطباء نے نشان دہی کی ہے مگر اس کے باوجود ہم یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس کی حرمت کی اصل وجہ اس ذات کا حکم ہے جو چیزوں کی حقیقت واصلیت بہتر جانتا ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسرا ڈاکٹر ان مذکورہ بیماریوں کا انکار کر دے یا کل کوئی دوسرا ماہر اس کی کوئی اور حکمت دریافت کر لیتا ہے لیکن ہم اس کی حکمت یا وجہ معلوم کرنے کے محتاج نہیں ہیں۔اس لئے بہتر یہی ہے کہ غیر مسلموں کو بھی اسلام کی روشن تعلیمات اور قرآن کی اصل دعوت کا ہی قائل کیا جائے اس کے بعد حلال وحرام کے سارے قرآنی اصول ان کی سمجھ میں آ جائیں گے۔ان شاء اللہ

خنزیر کا ایک سیر گوشت کھا سکتے ہیں؟

سوال: بین بری سے عبدالحفیظ لکھتے ہیں

ہمارا ایک دوست کہتا ہے کہ خنزیر کا ایک سیر گوشت کھا لینا حرام ہے۔ وہ کہتا ہے میں نے بریلوی عالم کی کتاب میں یہ پڑھا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: خنزیر کا گوشت ایک سیر ہو یا ایک من وہ بہر صورت حرام ہے اور اس کی حرمت قرآن سے ثابت ہے۔ اسے کوئی بریلوی یا دیوبندی عالم جائز نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی نے ایسے لکھا ہے آپ کے دوست نے غلط سمجھا ہے۔ ہاں اگر کسی کی جان بھوک کی وجہ سے نکل رہی ہو تو ایسی حالت میں وہ کھا سکتا ہے اور وہ بھی اتنی مقدار میں جس سے اس کی جان بچ جائے اور ظاہر ہے ایک سیر گوشت سے بہت کم کھانے سے بھی جان بچ سکتی ہے۔ مگر یہ انتہائی مجبوری کی حالت میں ہے۔

حرام اور مشکوک اشیاء کی فروخت کا حکم؟

سوال: برمنگھم سے غلام ربانی لکھتے ہیں۔ ہمارے بہت سے دکاندار بعض ایسی چیزیں فروخت کرتے ہیں جو شرع میں مشکوک ہیں اور اکثر اس کے بارے میں جانتے بھی ہیں جیسے:

(۱) سب سے اہم چیز گوشت ہے جو کہ حلال نہیں یعنی انگریز لوگ جو کھاتے ہیں اس میں سور کا گوشت بھی ہو سکتا ہے اور دوسرا بھی؟

(۲) جانوروں کی چربی سے بنی ہوئی چیزیں جن میں بسکٹ' صابن' کھانے پکانے

والی چربی یا مارجرین (Margarine) اور سویٹ وغیرہ کیا ایسی چیزیں فروخت کرنا قرآن وسنت کی روشنی میں جائز ہے؟

(۳) جانوروں کی خوراک کے بارے میں جو ٹین میں ہوتی ہے اور یہ کتے یا بلی کی خوراک ہوتی ہے اس میں عموماً جانوروں کی آنتوں کا استعمال ہوتا ہے اس کے علاوہ دل اور کلیجے وغیرہ کا استعمال بھی ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ مردار کھاتے ہیں اس طرح اس خوراک میں بھی مردار ہی استعمال کرتے ہیں۔ کیا شریعت میں جانوروں کے لئے ایسی مردار چیزوں سے بنی ہوئی خوراک کا بیچنا جائز ہے؟

جواب: خنزیر کا گوشت حرام ہے اسی طرح جو اسلامی طریقے سے ذبح نہیں کیا گیا وہ بھی حرام ہے اور ان کے بارے میں قرآن کے واضح احکام ہیں کہ یہ حرام ہیں۔ لہذا ان کا فروخت کرنا بھی ناجائز ہے۔

(۲) حرام جانوروں کی چربی سے بنی ہوئی اشیاء بھی حرام ہیں اور ایسی چیزوں کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں اور اس میں صابن 'سویٹ' چاکلیٹ وغیرہ سب شامل ہیں۔

(۳) جانوروں کی خوراک کے سلسلے میں چونکہ شریعت میں کوئی ایسی پابندی نہیں کہ ان کو بھی حلال خوراک کھلائی جائے۔ اس لئے صرف جانوروں کے لئے تیار کی گئی خوراک جس قسم کی بھی ہو اس کی خرید وفروخت جائز ہے۔ کیونکہ جانور حلال وحرام کے قوانین کے پابند نہیں اس لئے ان کے لئے حرام اشیاء سے تیار کی گئی خوراک بھی جائز ہے اور اس کی خرید وفروخت میں بھی بظاہر کوئی امر مانع نہیں۔

ہاں' انسانوں کے لئے بنائی گئی حرام اشیاء کا استعمال اور ان کی خرید وفروخت مسلمانوں کے لئے ہرگز جائز نہیں اور اس میں جتنی احتیاط کی جائے وہ بہتر ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے

من اتقی الشبهات فقد استبرا لدینه[1]

[1] بخاری کتاب الایمان باب فضل استبراء لدینه ۵۲ وبیوع ۲۰۵۱، مسلم کتاب المساقاة ۱۰۷ - ۱۵۹۹

جو مشکوک چیزوں سے بچ گیا اس نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا۔

اور ویسے بھی حرام و ناجائز چیزوں کی خرید و فروخت کے ذریعے حرام کاموں سے تعاون ہو جاتا ہے اور ایک مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ حرام کاموں کی تجارت یا پھیلانے میں تعاون کرے۔ قرآن کا ارشاد ہے

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾

کہ گناہ اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔

کیا حرام غذا کھانے والی مرغیاں حلال ہیں؟

سوال: مغربی جرمنی سے خالد بشیر لکھتے ہیں۔ ہم نے گوشت کے حلال و حرام کے بارے میں آپ کے رسالے میں بہت کچھ پڑھا۔ اسی سلسلے میں ہم چند دوستوں نے مل کے زندہ مرغیاں خرید کر خود ذبح کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ہم میں سے ایک دوست نے ایک دن ٹی وی میں مرغیوں کی خوراک کے بارے میں ایک پروگرام دیکھا کہ وہ خوراک جو مرغیاں کھاتی ہیں ان میں غیر مشروع طریقوں سے ذبح کئے ہوئے جانوروں کا خون انتڑیاں گویا کہ سب گندگی وغیرہ ملا کر مرغیوں کی خوراک بناتے ہیں اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس خوراک میں زیادہ تر خنزیروں کا خون وغیرہ ہوتا ہے۔ گویا مرغیاں جو خوراک کھاتی ہیں تو ان میں ان چیزوں کا اثر ضرور ہوتا ہوگا۔ اس بارے میں آپ بتائیں کہ آیا ہم یہ مرغیاں کھانا چھوڑ دیں یا کیا کریں جبکہ مرغی تو ہمارے لئے حلال ہے؟ نیز خنزیر کی چربی سے بنی ہوئی چیزوں پر بھی روشنی ڈالئے۔

جواب: وہ جانور جن کی خوراک حرام چیزیں یا غلاظت ہو انہیں حدیث میں جلالہ کہا گیا ہے۔ اس میں مرغیوں کے علاوہ بھیڑ بکری اور گائے بھی شامل ہو سکتی ہے۔ آپ نے جن مرغیوں کے بارے میں دریافت کیا ہے وہ بھی اس کے ضمن میں آسکتی ہیں۔

اس بارے میں حضرت عمرو بن شعیب کی یہ حدیث بڑی واضح ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے جلالہ کا گوشت کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع فرمایا ہے۔ اس لئے کہ جن جانوروں کی ساری خوراک حرام یا غلیظ چیزیں ہوں یا ان کی خوراک کا غالب حصہ ان چیزوں پر مشتمل ہو تو ان کا گوشت کھانا جائز نہیں۔

لیکن اگر یہ مرغیاں جو خوراک کھاتی ہیں ان میں کچھ اور چیزیں بھی شامل ہیں یعنی حلال و حرام چیزوں کو ملا کر ان کی خوراک تیار کی گئی ہے تو ایسی شکل میں یہ دیکھا جائے گا کہ زیادہ حصہ کس چیز کا ہے۔ اگر حلال اشیاء خوراک میں زیادہ ہیں تو پھر جائز ہے اور اگر حرام اشیاء کی کثرت ہے تو پھر ناجائز ہے۔ بعض ائمہ نے اس کا معیار یہ بھی مقرر کیا ہے کہ اگر اس کے گوشت کے ذائقے رنگ یا بو میں فرق ہے یعنی عام مرغیوں سے مختلف ہے تو پھر جائز نہیں۔ بصورت دیگر جائز ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ایسی مرغی کو تین دن تک اپنے پاس رکھ کر صحیح خوراک دیتے اور اس کے بعد ذبحہ کر کے کھا لیتے۔ اس لئے اگر یہاں بھی یہ صورت ممکن ہو تو اس طرح کھا لینا جائز ہو گا۔ پاک و ہند میں بھی مرغیاں دیہاتوں میں انتڑیاں اور دوسری گندی چیزیں کھاتی ہیں لیکن چونکہ ان کی غذا ملی جلی ہوتی ہے اس لئے یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

بہر حال احتیاط اسی میں ہے کہ ایسی مرغیوں کا گوشت کھانے سے اجتناب کیا جائے جن کی خوراک کا غالب حصہ حرام گوشت یا خون ہے ہاں اگر تین دن تک روک کر اسے صحیح خوراک دے کر ذبح کر لیا جائے تو پھر اس کے کھانے میں کوئی مانع نہیں۔

آخر میں جو خنزیر کی چربی سے بنی ہوئی چیزوں کے بارے میں دریافت کیا ہے تو اس سلسلے میں اگر ثابت ہو جائے کہ کسی چیز میں خنزیر کی چربی کی ملاوٹ ہے تو اس کا کھانا جائز نہیں۔ اگر کسی آدمی نے تحقیق کر کے ایسی فہرست شائع کی ہے تو اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔

ذبح سے قبل جانور کو الیکٹرک شاک لگا سکتے ہیں؟

سوال: کارڈف سے محمد حسین سوال کرتے ہیں
بعض لوگ ذبح کرنے سے پہلے جانور کو جو الیکٹرک شاک لگاتے ہیں اسکو جائز کہتے ہیں آپ کی کیا رائے ہے کہ اس حالت میں جائز ہے؟

جواب: جہاں تک الیکٹرک شاک کے بعد ذبح کرنے کا تعلق ہے تو الیکٹرک لگانے کے بعد اگر جانور زندہ رہتا ہے پھر تو ہم اسے حرام قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ زندہ جانور ہی ذبح کیا گیا ہے لہذا یہ جانور حلال ہوگا۔ بشرطیکہ ذبح کرنے کی باقی شرطیں پوری کی گئی ہوں۔ تاہم اگر الیکٹرک شاک کے بغیر ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت مل جائے تو پھر اسے ترجیح دینی چاہئے کیونکہ جہاں شک یا اختلاف والی بات ہو وہاں احتیاط کرنا بہر حال بہتر ہے۔

شراب اور سود کیوں حرام ہیں؟

سوال: بریڈفورڈ سے شبیر احمد لکھتے ہیں۔
(الف) شراب کیوں حرام کی گئی۔ کیا یہ دوائی کی شکل میں استعمال کی جاسکتی ہے اور کیا شراب زخم پر لگائی جاسکتی ہے؟
(ب) سود کیوں حرام کیا گیا ہے؟

جواب: اشیاء کے حلال و حرام ٹھیرائے جانے کے بارے میں شریعت اسلامیہ کا بنیادی اصول قرآن حکیم ان الفاظ سے بیان کرتا ہے

﴿يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ﴾ (اعراف:۱۵۷)

یعنی اللہ کا نبیؐ لوگوں کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام بتلاتا ہے اور جن چیزوں کو آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے حرام قرار دیا ہے ان میں ظاہری یا باطنی نجاست وخباثت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ ہماری عقل میں وہ آئے یا نہ آئے۔

جہاں تک شراب' جوئے' زنا' خنزیر اور سود وغیرہ کے حرام ہونے کی وجہ اور سبب کا تعلق ہے تو اس بارے میں دو باتوں کا جاننا نہایت ضروری ہے پہلی یہ کہ ہر انسان کے لئے معلوم کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی ممکن ہے کہ فلاں چیز کیوں حرام ٹھہرائی گئی؟ اور کس وجہ سے اس کا استعمال ممنوع ٹھہرایا گیا؟ کیونکہ جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان کی خباثتیں یا نقصانات کا معلوم کرلینا ہر انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ ایک ہی چیز کا نقصان ایک آدمی اپنے علم اور تجربے سے معلوم کرلیتا ہے جب کہ دوسرے کے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں ہوتی اور پھر ایک حرام کردہ چیز کی خباثت ایک زمانے میں ظاہر نہیں ہوتی جب کہ دوسرے زمانے میں وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔

مثلاً سور کے گوشت کی مثال ہی لیجئے کہ جب یہ حرام کیا گیا تو اس وقت شاید ہی کسی کو اس کی حرمت کا سبب یا علت معلوم تھی لیکن سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ انکشافات ہوتے گئے کہ اس جانور میں ایسے مہلک جراثیم اور کیڑے ہوتے ہیں جو بے شمار بیماریوں کا سبب بن سکتے ہیں۔ بہر حال کوئی انکشاف ہو یا نہ ہو مسلمان اس عقیدے پر قائم رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق کائنات اور حکیم و خبیر ہے اس لئے یہ اسی کا حق ہے کہ جس چیز کو چاہے حلال ٹھہرائے اور جسے چاہے حرام قرار دے دے۔ اس پر اعتراض کرنے یا اس کی نافرمانی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس کے باوجود اہل علم کا فرض ہے کہ وہ خلق خدا کے سامنے ان محرمات کے نقصانات اپنے علم اور تجربات کی روشنی میں واضح کریں تاکہ اسلام کی سچائی اور حقانیت پر لوگوں کا یقین اور زیادہ پختہ ہو۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ جب ہر انسان کے بس میں ایک چیز کی اصلیت یا ماہیت معلوم کرنا نہیں ہے تو پھر آخر کس چیز پر انحصار کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے وہ صرف اور صرف

وحی الٰہی ہے۔ اگر ایک شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے اور محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول و نبی ہیں تو پھر اسے چیزوں کی حلت و حرمت کا اختیار اللہ وحدہ لا شریک ہی کو دینا ہوگا۔ کسی عالم' درویش' بادشاہ یا حکمران کو یہ اختیار دینے کا معنی یہ ہوگا کہ اس کا خدا اور قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ لہذا اگر کسی شخص کو کسی چیز کی حرمت و حلت کے بارے میں شک ہے تو پہلے اسے قرآن و اسلام کے بارے میں اپنے عقیدے کا جائزہ لینا چاہئے اگر ان کی سچائی پر اس کا ایمان ہے تو پھر خالق کائنات کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ چاہے اس کی حکمت یا فلسفہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے یہ کوئی ضروری نہیں۔ اس کی حرمت کی سب سے بڑی وجہ اور سبب تو یہ ہے کہ اسے اس ذات نے حرام ٹھہرایا ہے جو چیزوں کا پیدا کرنے والا اور ان کی خوبیوں اور مضرتوں کا صحیح علم رکھنے والا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ اسے کیوں حرام ٹھہرایا؟ اس کا کیا نقصان ہے؟ اس بارے میں موجودہ دور میں یہ بات تقریباً متفق علیہ ہو چکی ہے کہ شراب اور دوسری نشہ آور چیزوں کے بے شمار طبی اور معاشرتی نقصانات ہیں جس سے انسان کی صحت اور اخلاق دونوں پر اثر پڑتا ہے اور آج ان کی بہتات اور کثرت استعمال دنیا بھر کے لئے مسئلہ بن چکا ہے۔ رہی یہ بات کہ شراب کے کچھ فائدے بھی ہیں تو قرآن نے اس کی تصریح کی ہے کہ اس کے نقصانات منافع کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں لہٰذا یہ حرام ہے اور جدید تحقیق نے اس کے نقصانات واضح کر دیئے ہیں۔ ہمارے لئے تو سب سے بڑی اور بنیادی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم نے جن چیزوں کو صراحت کے ساتھ حرام قرار دیا ہے ان میں شراب شامل ہے اور ان چیزوں میں کسی نہ کسی نوع کی گندگی اور نجاست ضروری ہوتی ہے جیسے ایک آیت میں مردار' خون اور خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کی نذر حرام قرار دیئے گئے۔ اب ان میں مردار' خون اور خنزیر کی ظاہری گندگی اور نجاست واضح ہے جب کہ غیر اللہ کے نام کی نذر اس لئے حرام قرار دی گئی کہ اس میں نذر ماننے والے کی

ذہنی خباثت یعنی مشرکانہ نیت اور اس کے عقیدے کی گندگی و خباثت شامل ہوتی ہے اور یہ باطنی و روحانی نجاست ہے۔ اسی طرح شراب میں ظاہری نجاست بھی ہے اور باطنی بھی اور جو چیز انسان کو عقل و فکر سے کچھ دیر کے لئے محروم کر دیتی ہے اسلام اسے کسی حالت میں بھی پینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام نے شراب کو تین مرحلوں میں بتدریج حرام قرار دیا:

پہلے سورہ بقرہ کی یہ آیت (۲۱۹) نازل ہوئی کہ "اے نبیؐ آپ سے یہ لوگ شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیں کہ دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ (دنیاوی فوائد بھی لوگوں کے لئے ہیں) اور ان کا گناہ ان کے فوائد سے بڑا ہے"

اس کے بعد سورۃ النساء کی آیت (۴۳) نازل ہوتی ہے کہ "اے ایمان والو تم ایسی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ' جب تم نشے میں ہو یہاں تک کہ تم ہوش میں آکر یہ جان لو کہ تم کیا کر رہے ہو"

اور آخر میں شراب کی قطعی حرمت کا حکم سورۃ المائدہ کی آیت (۹۰/ ۹۱) میں نازل ہوتا ہے "اے ایمان والو بلا شبہ یہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سب گندی اور ناپاک چیزیں ہیں اور شیطانی کام ہیں لہٰذا ان سے مکمل طور پر بچو تاکہ تم کامیاب ہو سکو شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے میں مبتلا کر کے تمہارے درمیان بغض و عداوت پیدا کر دے اور آپس میں لڑا دے اور اللہ کی یاد اور نماز سے تمہیں باز رکھے۔ کیا تم (شراب اور جوئے اور دوسری گندی چیزوں سے) رکنے والے ہو؟"

جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ نے کہا کہ "انتھینا ربنا"[1]

اے رب ہمارے ہم باز آئے یعنی ہم نے اسے مکمل طور پر چھوڑ دیا۔

احادیث میں بھی شراب کی مذمت اور شرابی کے لئے وعید کیلئے سخت الفاظ آئے ہیں۔

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ یمن سے ایک شخص رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک شراب کے بارے میں دریافت کیا جو یمن میں لوگ مکئی یا جوار کی قسم

[1] ابو داؤد ج۳ کتاب الاشربة باب تحريم الخمر ص ۱۲٤ رقم الحديث ۲۷۲

سے بناتے تھے۔ آپ نے پوچھا کیا اس میں نشہ لانے کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے؟ اس نے کہا ہاں اس سے نشہ تو پیدا ہوتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور پھر آپ نے فرمایا نشہ پینے والے کے ساتھ اللہ کا یہ عہد ہے جسے وہ ضرور پورا کرے گا۔ اور وہ یہ کہ آخرت میں اس کو طینۃ الخیال پلائے گا۔ لوگوں نے عرض کیا۔ یہ کیا چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا دوزخیوں کے جسم سے نکلنے والا گندہ مادہ۔ (صحیح مسلم)

نشہ آور چیز تھوڑی ہو یا زیادہ وہ حرام ہے اسی طرح ایسی چیز بطور دوا بھی استعمال نہیں کی جا سکتی۔ حضرت وائل الحضری روایت کرتے ہیں کہ ایک صحابی حضرت طارق بن سوید نے رسول اللہ ﷺ سے شراب کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اسے منع فرمایا۔ صحابی نے کہا اللہ کے رسول! کیا میں اسے بطور دوا استعمال کر سکتا ہوں؟ تو آپ نے فرمایا وہ چیز دوا کیسے بن سکتی ہے جو خود بیماری ہے۔ (صحیح مسلم شریف)

اس حدیث سے صاف طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ عام حالات میں شراب بطور دوا بھی استعمال نہیں کی جا سکتی اور نہ زخم پر لگائی جا سکتی ہے۔ ہاں البتہ اگر کسی مریض کی زندگی خطرے میں ہو تو اتنی مقدار میں شراب کی اجازت ہو سکتی ہے جس سے اس کی زندگی بچ جائے۔ مگر یہ بھی انتہائی خاص حالات میں۔

شراب پینا تو سنگین جرم اور کبیرہ گناہ ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ جو شراب پیتے تو نہیں لیکن اس لعنت میں کسی نہ کسی طریقے سے شامل ہوتے ہیں انہیں بھی رسول اکرم نے ملعون قرار دیا ہے اور جو سرور دو عالم ﷺ کی زبان مبارک سے لعنتی قرار دیا گیا ہو اس کا ٹھکانہ کہاں ہو گا۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب کے سلسلے میں دس آدمیوں پر لعنت کی (۱) شراب نچوڑ کر دینے والا (۲) شراب اپنے لئے نچوڑنے والا (۳) پینے والا (۴) پلانے والا (۵) کسی کے لئے اٹھا کر لے جانے والا (۶) جس کے لئے اٹھا کر لے جائی جائے (۷) شراب بیچنے والا (۸) شراب خریدنے والا (۹) شراب کسی کو تحفہ کے طور پر دینے والا (۱۰) شراب کی کمائی کھانے والا۔

اس فرمان نبویؐ کے بعد ہمارے وہ بھائی اپنے انجام کے بارے میں سوچ لیں جو دنیا کے محض عارضی فائدے کے لئے شراب کی فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں یا ہوٹلوں اور کلبوں میں ساقی کا کردار ادا کرتے ہیں۔

(ب) سود کی حرمت بھی قطعی ہے جو سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۸، ۲۷۹ سے ثابت ہے۔ ارشاد ربانی ہے "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو سود تمہارا باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر واقعی مومن ہو لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خبر دار ہو جاؤ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ اگر تم توبہ کرلو تو اصل مال لینے کا تمہیں حق ہے نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے"

رسول اکرم ﷺ نے سود اور سود خور دونوں کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ آپ نے فرمایا اگر سود کی ستر قسمیں یا درجے بھی کئے جائیں تو سب سے آخری درجے کے سود کا گناہ بھی اتنا ہوگا جتنا اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کا ہے

ایک اور حدیث میں ہے آپؐ نے فرمایا" جہاں سود اور زنا عام ہو جائے وہاں اللہ کے عذاب کو دعوت دی جاتی ہے"

دیگر آسمانی مذاہب میں بھی سود کو حرام ٹھہرایا گیا تھا۔ یہودیوں کے عہد قدیم میں ہے کہ "جب تیرا بھائی محتاج ہو تو اس کی مدد کر، اس سے فائدہ اور نفع طلب نہ کر" (خروج ۲۲، ۲۴) مگر یہودیوں نے باقی چیزوں کی طرح اس میں بھی تحریف کی اور کہا کہ بھائی سے مراد صرف یہودی ہے اور باقی ساری دنیا سے سود لینا جائز ہے۔ اور آج دنیا پر سودی نظام کی شکل میں جو لعنت مسلط ہے یہ یہود کی کارستانی ہے اور وہی اس کے بانی ہیں۔

عیسائی مذہب میں بھی سود کی طرز کے ناجائز منافع سے منع کیا گیا تھا۔ اسلام نے سود کی تمام اقسام کو حرام ٹھہرایا ہے اور علماء اسلام نے اس کی معقول وجوہ بھی بیان کی ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) سود کے ذریعہ کچھ مال بغیر کسی بدلے کے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک شخص اگر پونڈ کے عوض دو پونڈ حاصل کرتا ہے تو اس کے عوض نہ اس نے کوئی چیز دی اور نہ ہی کوئی کام کیا۔

(۲) سود پر تکیہ کر کے لوگ کام کرنے اور محنت سے جی چراتے ہیں۔ کیونکہ صاحب مال کے لئے بغیر کاروبار کے مال کمانا سود کے ذریعہ آسان ہو جاتا ہے۔

(۳) قرض کے ذریعہ مسلم بھائی سے تعاون کا طریقہ ختم ہو جائے گا اور سود کے لالچ کی وجہ سے لوگ محض ہمدردی اور تعاون کے جذبے سے قرض نہیں دیتے۔

(۴) سودی لین دین کی وجہ سے امیر کمزور اور غریب سے زائد مال حاصل کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ غریبوں کو مال دینے کی تاکید کرتا ہے۔

(۵) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سود طاقتور اور سرمایہ دار کے مفادات کے تحفظ کے لئے غریبوں کا خون چوس لینے کا نام ہے۔ اس کے ذریعہ دولت مند اور سرمایہ دار کی دولت اور سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے اور غریب کی غربت میں اضافہ ہوتا ہے۔ گویا کہ ایک طبقہ دوسرے طبقے سے ناجائز ذریعے سے دولت کما کر مال دار بن جاتا ہے۔ یہ چیز معاشرے میں حسد و بغض پیدا کرتی ہے۔ طبقاتی کش مکش شروع ہو جاتی ہے جس کا انجام شدید خونریزی ہوتا ہے۔

سود کا یہ نقصان جس طرح قدیم مہاجنی سودی نظام میں تھا اسی طرح آج کے جدید بینکاری کے سودی نظام میں ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آج کے سودی نظام کو پرانے سودی نظام کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ قدیم زمانے میں سرمایہ دار اور ساہوکار سود کے ذریعے شہروں اور بستیوں کے غریبوں کی جانوں اور عزتوں سے کھیلتے تھے تو آج کا سرمایہ دارانہ نظام سودی معاشی سسٹم کے ذریعہ دنیا بھر کے پس ماندہ اور غریب ملکوں پر مسلط ہو چکا ہے اور آج غریب ممالک اس سودی نظام کے شکنجے میں اس قدر پھنس چکے ہیں کہ ہزار کوشش کے باوجود اقتصادی اور سیاسی آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح بینکوں اور دوسرے اداروں سے سود پر قرض لینے

والے کتنے لوگ ہیں جو نسل در نسل سود ادا کر رہے ہیں اور کتنے ہیں جو بینک کرپٹ ہو کر مارے مارے پھر رہے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ تو عام قرض سے بھی پناہ مانگتے اور یہ دعا کرتے کہ:

اللھم انی اعوذبك من غلبة الدین و قھر الرجال[1]

"اے اللہ میں قرض کے غلبے اور لوگوں کے تسلط سے تیری پناہ مانگتا ہوں"

اور ہم نہ صرف قرض بلکہ ہزاروں کا سود بھی اپنی اولادوں کے لئے ورثے میں چھوڑ کر جاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے سودی کاروبار میں گواہ اور کاتب کی حیثیت سے شرکت کرنے والوں پر بھی لعنت کی ہے۔ حدیث میں ہے "آپ نے فرمایا اللہ نے سود کھانے والے' کھلانے والے' گواہ بننے والے اور لکھنے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ (ترمذی' ابوداؤد' نسائی)

واللہ اعلم بالصواب

بنک سے سود لے کر کسی غریب کو دیا جا سکتا ہے؟

سوال: براکل مغربی جرمنی سے محمد اشفاق نعیم پوچھتے ہیں

جرمن میں بینکوں کا ایک اصول ہے کہ اگر کسی آدمی کی رقم نارمل اکاؤنٹ یعنی بغیر سودی اکاؤنٹ میں ایک سال تک پڑی رہے تو بینک والے پانچ فیصد منافع دیتے ہیں جب کہ سودی اکاؤنٹ میں ۱۱' ۱۲ اور ۱۴ فیصد تک منافع دیا جاتا ہے یہ منافع لینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر یہ منافع اپنی ذات پر خرچ کرنے کی بجائے پاکستان میں کسی غریب آدمی کو دے دیا جائے یا تحفہ وغیرہ دے دیا جائے تو یہ درست ہے یا نہیں؟ یا یہ پانچ فیصد بینکوں سے لیا ہی نہ جائے۔ اگر لے لیا گیا ہو تو اس کا کیا کیا جائے؟

---

[1] مشکوۃ للالبانی ج۲ کتاب الدعوات باب الدعوات فی الاوقات ص ۷۵٦ رقم الحدیث ۲٤٤۸

جواب: بینکوں سے سود کی رقم وصول کرنے کے بارے میں ایک فتویٰ "صراط مستقیم" کی فروری کی اشاعت میں آچکا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ منافع پانچ فی صد ہو یا چودہ فیصد وہ بہر حال سود ہے اس لئے اس کا وصول کرنا یا لے کے آگے تقسیم کرنا بنیادی طور پر جائز نہیں۔ ہاں اگر لاعلمی سے رقم پر سود بن گیا تو اسے لے کر مستحق لوگوں کو دے دیا تو بعض علماء نے اس کی اجازت دی ہے لیکن اس کی عادت بنالینا یا اس کو بنیاد بنا کر سود کی رقم کی وصولی شروع کر دینا جائز نہیں۔

سود والے مکان فروخت کریں

سوال: جن لوگوں نے مکانات خریدے ہوئے ہیں وہ سود دیتے ہیں لیتے نہیں۔ مگر سود تو حرام ہے۔ اب کچھ مسلمان وہ مکان فروخت کر کے کونسل کا مکان لینا چاہتے ہیں مگر انہیں مکان ایسی جگہ ملتے ہیں جو دور ہے یا خراب علاقہ میں ہے ایسے آدمی کو سود دیتے رہنا چاہئے یا کیا کرنا چاہئے؟

جواب: سود کی حرمت کے بارے میں صراط مستقیم میں مفصل بیان ہو چکا ہے۔ مکان خریدنے یا تبدیل کرنے کے سلسلے میں بھی اگر سود دینا پڑتا ہے تو وہ بہر حال ناجائز ہے۔ سود دینے اور لینے والے شریعت میں دونوں سخت گناہ گار ہیں جہاں تک مجبوری کا تعلق ہے تو اس بارے میں ہر شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ کس قدر مجبور ہے اگر اسے مکان نہ کرائے پر ملتا ہے نہ خریدنے کی طاقت ہے اور اسے سردی یا گرمی سے مرنے کا خطرہ ہے تو ایسی مجبوری میں تو حرام کا استعمال جائز ہے۔ لیکن مکان کونسل دور دیتی ہے یا نزدیک' یہ کوئی مجبوری نہیں۔ سود سے بچنا مقصود ہے تو مکان جہاں بھی ملے حاصل کرنا چاہئے۔

لاٹری کا شرعی حکم کیا ہے؟

سوال: مغربی جرمنی سے جناب سالک لکھتے ہیں یہاں جرمنی میں LOTO کے نام سے انعام دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً منسلکہ فارم پر کر کے ایک جرمن مارک دو خانوں کی ادا ئیگی ہوتی ہے۔ پھر جب انعام نکلتا ہے تو پہلا انعام تقریباً دس لاکھ مارک ہوتا ہے اور بے شمار لوگ ہر ہفتہ یہ لوٹو (لاٹری) ڈالتے ہیں۔

جواب: جرمن زبان میں جس چیز کو لوٹو کہا جاتا ہے ہمارے ہاں اسے لاٹری کہتے ہیں اس کے جوا ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور جوا بھی ایسے ہی حرام ہے جیسے شراب حرام ہے اور قرآن میں جوئے کی حرمت واضح طور پر آچکی ہے۔ پھر لاٹری جو جوئے کی ایک قسم ہے اس کے رسیا عام طور پر محنت سے جی چراتے ہیں وہ خالی آرزوؤں کے سہارے جیتے ہیں۔ جدوجہد اور اسباب پر بھروسہ ختم ہو جاتا ہے بعض لوگ پول یا لوٹو کے فارم بھرتے بھرتے سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی دولت ضائع کر بیٹھتے ہیں اور کنگال ہو جاتے ہیں اور جوئے کی بھی شکل یہی ہے کہ ایک آدمی ایک بار پھر دوسری بار پھر تیسری بار اور مسلسل ہارنے یا اپنے پیسے ضائع کرنے کے باوجود بار بار اس امید پر کہ اب کی بار اس کا نمبر آجائے گا اور اتنی بڑی رقم کا مالک بن جائے گا اور اس طرح یہ لوگ کنگال ہو جاتے ہیں اور دین و دنیا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس لیے جوئے 'لاٹری 'لوٹو یا پول ان سب میں ایک چیز آپ کو مشترک نظر آئے گی۔ وہ یہ کہ بغیر محنت کے بہت بڑی رقم کا مالک بن جائے اور پھر اس آرزو پر وہ سب کچھ کھو بیٹھتا ہے۔ لہٰذا اس کے جواز کی کوئی شکل نہیں۔ لاٹری میں بھی جوئے والی ساری خرابیاں پائی جاتی ہیں۔

لائف انشورنس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال: میڈ سٹون کینٹ ونگ جیل سے محمد اسلم پوچھتے ہیں

کیا لائف انشورنس کرنا حرام ہے؟ شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: لائف انشورنس جسے بیمہ زندگی کہتے ہیں عام طور پر اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص ۱۰ یا ۱۲ ہزار رقم پر انشورنس کراتا ہے یہ رقم اس نے ایک مقررہ مدت کے اندر قسطوں میں ادا کرنی ہوتی ہے۔ جب یہ رقم یا مدت پوری ہوتی ہے تو اسے اصل رقم اور اس پر منافع بھی ملتا ہے۔ اس مدت سے قبل اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کے ورثاء کو پوری مقرر رقم کمپنی جو بیمہ کرتی ہے ادا کر دیتی ہے۔

ہمارے نزدیک مروجہ لائف انشورنس تین وجوہ کی بنا پر ناجائز ہے:

اول: اس لئے کہ تمام انشورنس کمپنیاں جو کاروبار کرتی ہیں وہ سودی ہوتا ہے اور سود کی حرمت اسلام میں بڑی واضح ہے اور وہ کمپنی اس سود ہی کا کچھ حصہ انشورنس کرانے والوں کو دیتی ہے۔

دوم: قرآن نے حرام اور ناجائز کام میں تعاون کرنے سے بھی منع فرمایا ہے کہ

ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان

کہ گناہ اور سرکشی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔

اور یہ کمپنیاں عام طور پر سود کی بنیاد پر قائم ہوتی اور چلتی ہیں۔ اس لئے ان سے تعاون گویا سود کے رواج اور پھیلاؤ میں تعاون ہے اور یہ جائز نہیں۔

سوم: اس کے علاوہ اس میں جوئے کا بھی ایک پہلو پایا جاتا ہے۔ لائف انشورنس کرانے والے عام طور پر اس ذہن سے سوچتے ہیں کہ اگر زندہ رہے تو اصل رقم محفوظ ہی ہے، کچھ منافع بھی مل جائے گا اور اگر مر گئے تو وارثوں کا کام بن جائے گا اس لئے وہ

ایک لحاظ سے مرنے یا جینے کی بازی لگاتے ہیں اور اس طرح جوے کی یہ ایک قسم بن جاتی ہے جسے قرآن نے حرام قرار دیا ہے ویسے بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کمپنی جو یک مشت رقم اس شخص کو دیتی ہے یہ کیا ہے؟ ظاہر ہے نہ ہدیہ اور نہ تحفہ ہے اور نہ ہی وہ اسے قرض حسنہ دے رہی ہوتی ہے تو پھر واضح ہے کہ سود میں سے اسے حصہ ادا کیا جارہا ہوتا ہے۔ہاں اگر مضاربت کی شکل ہو یعنی کمپنی حلال کاروبار میں اس کا مال لگاتی ہے اور پھر نفع و نقصان میں وہ شریک ہے اور مقررہ مدت کے بعد حساب کر کے اس کا منافع اس کو دے دیا جاتا ہے تو یہ جائز ہے۔

☆☆☆

مختلف فرقے

کیا موجودہ فرقوں میں سے کسی ایک کی اطاعت ضروری ہے؟

سوال: ویلبرٹ (مغربی جرمنی) سے افتخار احمد لکھتے ہیں

(۱) فرقہ کی تعریف کیا ہے۔ پاکستان میں سرگرم عمل مختلف دینی گروہ مثلاً دیوبندی' بریلوی' تبلیغی جماعت' جماعت اسلامی' اہل حدیث' شیعہ اور پرویزی وغیرہ علیحدہ علیحدہ فرقے ہیں اور کیا ایک عام مسلمان کے لئے ان میں سے کسی ایک کی اطاعت ضروری ہے؟

جواب: ایک فرد کی بجائے زیادہ لوگوں کے مجموعے کو فرقہ کہا جا سکتا ہے۔ لغوی اور شرعی طور پر گروہ' جماعت اور خاندان و قبیلے پر فرقے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

مختلف مقاصد کے حصول کے لئے جماعتوں یا تنظیموں کا وجود میں آنا یا کسی خاص کام کے لئے کسی ایک جماعت کو قائم کرنا شرعاً نہ غلط ہے اور نہ نقصان دہ۔ خود قرآن کریم میں جس ایک مقام پر فرقے کا لفظ آیا ہے وہاں بھی مراد ایک مجموعہ یا جماعت ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾ (التوبة : ۱۲۲)

"تو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کے ہر فرقے میں سے ایک طائفہ جایا کرے تاکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔"

اب یہاں فرقے سے مراد ایک بڑی جماعت اور طائفہ سے مراد ایک چھوٹی

جماعت ہے۔ یعنی مختلف علاقوں میں جو مسلمان جماعتوں کی شکل میں رہتے ہیں وہ سارے نہیں بلکہ ان میں سے کچھ چھوٹی جماعتیں اللہ کی راہ میں نکلیں۔ بعض نے یہاں فرقے سے مراد خاندان اور قبیلے لیا ہے کہ مختلف مسلم خاندانوں اور قبیلوں سے کچھ لوگ اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں وقف کر دیں تو قرآن نے یہاں اس مفہوم میں فرقے کے لفظ کو معیوب نہیں سمجھا۔ ہاں قرآن میں جس چیز کو معیوب سمجھا گیا اور اس سے روکا گیا وہ فرقہ بندی اور گروہ بندی ہے جس سے امت کی وحدت ختم ہو جاتی ہے۔ اور مسلمانوں میں انتشار و افتراق پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں ان کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن میں "لا تفرقوا" کے الفاظ سے اس فرقہ بندی سے منع کیا گیا ہے جیسا کہ اس وقت امت کی حالت ہے کہ مسلم جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہیں اور مسلم ممالک ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہیں۔

پاکستان میں جن مختلف جماعتوں تنظیموں یا فرقوں کا آپ نے ذکر کیا ہے ان میں سے دعویٰ تو ہر ایک کا یہی ہوگا کہ وہ اسلام کی ترجمان اور کتاب و سنت کی داعی ہے لیکن مسئلہ نام یا فرقے کا نہیں کیونکہ فرقہ بندی' جماعت سازی اور تنظیموں کے قیام کو کوئی شخص روک نہیں سکتا۔ ہر شخص کا یہ حق ہے کہ وہ دین کی دعوت پیش کرے اور قرآن و سنت کی بنیاد پر اپنی تنظیم یا جماعت کی تشکیل کرے لیکن مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ایک عام مسلمان ان سب کے دعوے سنتا یا پڑھتا ہے تو اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کس کا ساتھ دے یا کس کی دعوت کو قبول کرے۔ فرقوں اور جماعتوں کی کثرت کے موقع پر ایک شخص کے لئے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں لیکن دیگر مشکلات کی طرح اس مشکل کو حل کرنے کے لئے بھی قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرنا چاہئے کہ وہ اس کا کیا حل پیش کرتے ہیں اور جب امت میں ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو ایک مسلمان کو کس بنیاد پر فیصلہ کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں قرآن ہماری مکمل راہ نمائی کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ (النساء : ۵۹)

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے امیر کی پس اگر کسی چیز میں تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے تو پھر رجوع کرو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے احسن ہے۔“

اب یہاں مسلمانوں کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کریں اور رسول کی اطاعت کریں اور اسلامی ریاست کے خلیفہ اور حکمران کی پیروی بھی ایسی صورت میں لازم ہے جب وہ اللہ اور رسول کی اطاعت کے دائرے کے اندر رہ کر حکمرانی کرے اور اگر کسی بات میں اختلاف ہو جائے یعنی تنازعے کی شکل پیدا ہو جائے تو خود اپنی مرضی یا رائے یا محض اکثریت سے فیصلہ نہیں ہو گا بلکہ ایسی صورت حال میں اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت کی طرف رجوع کر کے فیصلہ ان سے کرانا ہو گا۔

خود رسول اللہ ﷺ نے جب امت کو فرقوں میں بٹ کر اپنی قوت اور رعب ختم کرنے کے نقصان سے آگاہ کیا تو اس وقت بھی یہی ارشاد فرمایا تھا کہ جتنے گروہ اور فرقے ہوں گے بڑے بڑے ناموں اور وعدوں کے باوجود ضروری نہیں کہ حق بھی ان کے ساتھ ہو بلکہ وہ سارے کے سارے گمراہ ہو سکتے ہیں ہاں سوائے ان کے جو اس دین پر قائم رہیں گے جس پر آج میں اور میرے صحابہ ہیں۔ تو کسی فرقے جماعت یا تنظیم کے وجود یا عدم وجود سے زیادہ اصل قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان کی دعوت کیا ہے۔ فرقہ بندی اور گروہ بندی کی شکل میں عام مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اندھی تقلید، شخصیت پرستی، رسم و رواج اور جذباتی کیفیات سے الگ تھلگ ہو کر یہ سوچیں کہ قرآن و حدیث اور صحابہ کرام کی تعلیمات کیا ہیں۔ جو جماعت یا فرد یا تنظیم یا ادارہ وہ خاص

دعوت پیش کرتا ہے اس سے تعاون بھی کرنا چاہئے اور اس کی دعوت کو قبول کر کے اس کی اشاعت کے لئے کوشش بھی کرنا چاہئے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن و سنت اور صحابہ کے تعامل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اگر مسئلے کا ثبوت ان مراجع سے نہیں ملتا تو اس کی شرعی حیثیت مشکوک ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو مزید روشنی حاصل ہو سکتی ہے۔ آپ قرآن کا سادہ ترجمہ پڑھیں' بخاری و مسلم اور دوسری صحیح احادیث کا مطالعہ کریں اور سیرت النبی اور سیرت صحابہ پر ثقہ اور معتبر کتابوں کو پڑھیں۔ اس طرح دین اور بنیادی عقائد و اعمال کا اجمالی خاکہ پوری طرح آپ کے سامنے آجائے گا۔

جن فرقوں اور جماعتوں کے نام آپ نے تحریر کئے ہیں ان میں دیوبندی بریلوی تو برصغیر میں حنفی مذہب ہی کی دو الگ الگ شاخیں ہیں۔ فقہی طور پر دونوں حنفی ہیں۔ بعض عقائد میں دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء دیوبند کا (دیوبند ایک دینی درس گاہ کا نام ہے) بریلوی علماء سے اختلاف ہوا (بریلوی کی نسبت بریلی شہر کی طرف ہے۔ اس گروہ کے بانی مولانا احمد رضا خاں آف بریلی ہیں) تو اس طرح دو گروہ وجود میں آگئے جو بعد میں الگ الگ فرقے کی حیثیت سے معروف ہو گئے۔

جماعت اسلامی ایک سیاسی تنظیم ہے جو اسلامی نظام کی داعی ہے اور اس میں مختلف مکاتب فکر کے لوگ شامل ہیں۔ اہل حدیث کی دعوت خالص کتاب و سنت کی اتباع ہے وہ توحید کو ہر قسم کے چھوٹے بڑے شرک کی آمیزش سے اور سنت کو بدعت سے پاک کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ حنفی' شافعی' مالکی اور حنبلی کی طرح ایک امام کی تقلید نہیں کرتے بلکہ ان کا موقف یہ ہے کہ چاروں مشہور اماموں اور دوسرے بڑے امام جو مختلف زمانوں میں ہوئے ہیں ان سب کے افکار و اجتہادات کی قدر کرنی چاہئے اور کسی ایک کی تقلید میں تعصب کی بجائے جس امام کے دلائل قوی ہوں اور قرآن و حدیث سے قریب تر ہوں اس کی بات کو بلا چوں وچرا مان لینا چاہئے اور علماء کرام کو اس سلسلے میں دلائل و شواہد کی روشنی میں فیصلہ کرنا چاہئے۔

جہاں تک شیعہ کا تعلق ہے ان میں متعدد فرقے ہیں لیکن صحابہ کرام سے بغض و عناد رکھنے والے اور ان کی شان میں گستاخی کرنے والے صحیح مسلمان نہیں ہو سکتے اور ان کے عقائد گمراہ کن ہیں۔ ایسے لوگوں سے خیر و بھلائی کی توقع نہیں کی جاسکتی جو ان پاک ہستیوں کا احترام بھی نہ کریں جن کے واسطے سے یہ دین دنیا میں پھیلا اور صحیح شکل میں ہم تک پہنچا۔

پرویزی نہ کوئی فرقہ ہے نہ جماعت یہ مسٹر غلام احمد پرویز صاحب کے پیروکاروں اور مداحوں کا نام ہے جو فتنہ انکار حدیث کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا نہ ممکن ہے نہ معقول۔ دراصل یہ اعمال سے پیچھا چھڑانے کا ایک بہانہ ہے کہ حدیث کا انکار کر دیا جائے اور قرآن کی من مانی تفسیر و تعبیر کرکے دین کا حلیہ بھی بگاڑ لیا جائے۔ یہ انتہائی خطرناک تحریک ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔

کیا سیکولر جماعتوں کو ووٹ دینا جائز ہے؟

سوال: پاکستان میں ممکنہ انتخابات میں کسی سیکولر جماعت یا کسی غیر مذہبی جماعت کو ووٹ دینا جائز ہے یا نا جائز؟

جواب: پاکستان ایک مسلم ملک ہے اور اسے اسلام کے نام پر قائم کیا گیا تھا مگر بد قسمتی سے اسے صحیح اسلامی ریاست بنانے کی کوششیں ۴۵ سال گزرنے کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکیں۔ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ پاکستان کو صحیح اسلامی ملک بنانے اور اس میں شریعت اسلامیہ کے عمل کا نفاذ کرنے کے لئے جدوجہد کرے اور ووٹ کا حق یا ووٹ کا استعمال بھی اسی جدوجہد کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے صرف ان جماعتوں اور افراد کو انتخابات میں ووٹ دینا چاہئے جو خود اسلام پر کاربند ہوں اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے مخلص بھی ہوں اور انہیں قرآن و حدیث اور صحیح دینی تعلیمات کا علم بھی ہو۔

ایک اسلامی ملک میں کسی سیکولر یا غیر اسلامی ذہن' فرد یا جماعت کو ہرگز ووٹ نہیں دینا چاہیے۔ ووٹ ایک امانت ہے' اس کا غلط استعمال سنگین جرم اور گناہ ہے۔

اسماعیلی فرقے کے عقائد کیا ہیں؟

سوال: والتھم سٹو لندن سے محمد رفیق پوچھتے ہیں:
مسلمانوں میں اسماعیلی فرقے کا بانی کون تھا اور اس کے عقائد کیا ہیں؟

جواب: تاریخ میں جن باطنی قوتوں کا ذکر ملتا ہے ان میں اسماعیلی فرقہ بھی ہے وہ اس کی نسبت اسماعیل بن جعفر الصادق کی طرف کرتے ہیں۔ اسماعیلیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اسماعیل بن جعفر ۱۴۵ھ میں فوت نہیں ہوا تھا بلکہ عباسی خلفا کے ڈر سے روپوش ہو گیا تھا اور اسماعیل مختلف ملکوں میں اپنے پیروکاروں سے ملتا رہا یہاں تک کہ ۱۵۸ھ میں بصرہ میں اس کی وفات ہوئی۔ اسماعیلی یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ اس کی اولاد میں محمد علی اور فاطمہ تھے اور والد کے بعد محمد بن اسماعیل خفیہ امامت کرتا رہا۔ پھر اس کا لڑکا احمد امام بنا۔ پھر محمد تقی پھر رضی الدین اور پھر عبداللہ اور پھر محمد المہدی۔ یہ امامت کا سلسلہ سات سال اور ساتویں کو وہ آخری امام سمجھتے ہیں۔

شروع میں ان کے عقائد غیر اسلامی تھے اور مسلم خلفاء نے ان کے خلاف جہاد کیا۔ ان کے اکثر عقائد قدیم ایرانی عقائد سے ماخوذ تھے۔ بعد میں عام شیعوں کے عقائد انہوں نے اپنا لئے۔ ان کے نزدیک امام معصوم ہی کے ذریعے ہدایت و علم حاصل کیا جا سکتا ہے اور کوئی مسئلہ یا رائے امام معصوم کے بغیر ان کے نزدیک قابل قبول نہیں چاہے اس کی واضح نص قرآن و سنت میں موجود ہو۔ آج بھی وہ اپنے امام و پیشوا کو امام معصوم ہی کا درجہ دیتے ہیں اور اس کی اتباع اسی جذبے سے کرتے ہیں۔

(آغا خاں عقائد صفحہ ۱۴۵۔۱۴۶)

ذات پات کی تقسیم جائز ہے؟

سوال: محمد رفیق دریافت کرتے ہیں
مسلمانوں میں جو ذات پات کی تقسیم ہے اس کی بنیاد کیا ہے اور جو پیشہ ور قومیں بنی ہوئی ہیں مثلاً چوہدری راجہ بھٹی اور قریشی وغیرہ کیا اسلامی رو سے جائز ہیں؟ اگر جائز ہیں تو یہ لوگ ایک دوسری قوم میں شادی بیاہ کیوں نہیں کرتے اور اصل نام کو چھوڑ کر اونچی دم کیوں لگاتے ہیں؟

جواب: ذات پات کی تقسیم خصوصاً پیشے کی بنیاد پر یہ تقسیم بالکل غیر اسلامی ہے اور پھر ان ذاتوں کی بنیاد پر فخر کرنا یا دوسروں کو حقیر سمجھنا بالکل غلط ہے۔ تعارف اور پہچان کے لئے خاندانوں یا قبائل کی تقسیم کی جا سکتی ہے جیسا کہ قرآن میں ہے

﴿وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا﴾ (الحجرات : ۱۳)

کہ ہم نے خاندان اور قبیلوں میں تم کو تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

یہ تقسیم ایک تو پیشے یا کام کی بنیاد پر نہیں اور دوسرا اس کا مقصد کسی کی برتری یا بڑائی ثابت کرنا نہیں بلکہ محض تعرف کے لئے ہے۔ اسلام ایسی طبقاتی تقسیم کا قطعی مخالف ہے جس سے انسان دوسرے انسان کا غلام بن جائے اور معاشرے میں کردار و عمل کی بجائے دوسری چیزیں بڑائی یا عزت کا ذریعہ بن جائیں یہاں تو ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کا اصول ہے یعنی پیشہ یا ذات پات نہیں بلکہ برتری اور فخر کا ذریعہ تقویٰ اور نیک اعمال ہیں۔

ایسا گروہ جو دین میں تحریف کرتا ہے انہیں چندہ دینا جائز ہے؟

سوال: بریڈ فورڈ سے سلیم خاں لکھتے ہیں

مسلمانوں کا ایک ایسا گروہ جو دین حنیف میں کھلم کھلا ترمیم و تخفیف (اپنی ضروریات کے مطابق) کرتا رہے غیر اللہ کے نام پر نذر و نیاز بھی دیتا رہے بالفاظ دیگر شرک کا مرتکب ہوتا رہے تو کیا ایسے گروہ کو دین کے کسی کام میں دست تعاون بڑھانے کو کہا جاسکتا ہے جب کہ وہ پہلے کی طرح اپنے خود ساختہ طور طریقوں پر اڑے رہیں حالانکہ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن پاک کے یہ الفاظ کہ "اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ" موجود ہوں' اور اگر ایسا گروہ دین کے نام پر کسی قسم کی مالی یا دیگر قسم کی امداد کی درخواست کرے تو کیا ایسے لوگوں کی مدد کرنا جائز ہے؟

جواب: جو لوگ دین میں تحریف اور کھلم کھلا غیر اللہ کے نام پر نذر و نیاز دیں تو انہوں نے شرک کا ارتکاب کیا ہے اور شرک سب سے بڑا گناہ ہے جو توبہ کے بغیر نا قابل معافی ہے۔ ایسے لوگوں سے ایسے کاموں میں ہر گز تعاون نہیں کرنا چاہئے جن کے ذریعے شرک و بدعت پھیلتا ہو اور دین کی بنیادوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ ہاں اگر وہ کوئی ایسا کام کرتے ہیں جس میں عام مسلمانوں کی بھلائی ہے اور دین کے فائدے کا کام ہے تو ایسا کام جو شخص بھی کرے اس سے تعاون کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس سلسلے میں قرآن کا اصول بڑا واضح ہے کہ:

﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾(المائدة : ۲)

کہ نیکی اور تقوے کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں مت تعاون کرو۔

ظاہر ہے شرک سب سے بڑا گناہ اور زیادتی کا کام ہے۔ ایسے کاموں میں تو تعاون کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر عام نیکی اور بھلائی کے کام جو شخص بھی کرے اس سے تعاون میں کوئی مضائقہ نہیں۔

کیا مذہبی یا سیاسی جماعت کو چندہ دینا جائز ہے؟

سوال: ایسٹ ہیم لندن سے راجہ محمد رفیق لکھتے ہیں۔

کیا کسی مذہبی یا سیاسی جماعت کو چندہ دینا جائز ہے۔ دینی جماعتیں بھی کافی ہیں۔ دین تو ایک ہے مگر ان جماعتوں نے کافی دین بنا رکھے ہیں اور پھر یہ جماعتیں صرف چندے کی بنیاد پر چل رہی ہیں ان کو گورنمنٹ گرانٹ تو نہیں دیتی اور پھر کچھ جماعتیں دین کو کافی نقصان بھی پہنچا رہی ہیں۔ اگر خالص اللہ کے دین کے لئے کام کریں تو ان میں فرقہ پرستی نہیں ہونی چاہئے مگر اب تک کئی ایسی جماعتیں ہیں جو مسلمانوں کو نفرت سے دیکھتی ہیں اور غیر مسلموں سے پیار کرتی ہیں۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسی جماعتوں کو چندہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جہاں تک دینی جماعتوں یا سیاسی و معاشرتی جماعتوں کو چندہ دینے یا مالی تعاون کرنے کا مسئلہ ہے تو اس سلسلے میں قرآن کریم کا ارشاد بڑا واضح ہے کہ

﴿تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدة : ۲)

”نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں باہمی تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ہرگز تعاون نہ کرو۔“

تو یہ قرآن کا اصول ہے کسی فرد یا جماعت سے تعاون کے سلسلے میں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے کام سے کسی کا دینی یا دنیاوی بھلا ہو رہا ہے اور اس میں شریعت کے کسی حکم کی مخالفت بھی نہیں ہو رہی تو ایسی جماعت سے ضرور تعاون کرنا چاہئے۔ بعض

جماعتوں کے کچھ کام اگر خلاف اسلام ہیں اور کچھ وہ نیکی کے کام بھی کر رہے ہیں تو نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ان سے تعاون کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ ہاں اگر ان سے تعاون کرنے کی وجہ سے ان کے برے پہلو نمایاں ہونے کا خطرہ ہے یا اس چندے سے وہ غلط کام کرنے شروع کر دیں تو ایسے لوگوں سے مالی تعاون نہیں کرنا چاہئے۔ جو لوگ خالص دین کی بجائے فرقہ پرستی اور نفرت انگیزی پھیلاتے ہیں اور ان کی وجہ سے مسلمانوں میں فتنہ و فساد پھیلنے کا اندیشہ ہے' ایسے لوگوں کی مالی مدد نہیں کرنی چاہئے اور ان کے مقابلے میں جو جماعتیں خالص کتاب و سنت کی اشاعت اور مسلمانوں میں اتحاد و تعاون کے لئے کوشاں ہوں انہیں ترجیح دینی چاہئے۔

مسلمانوں سے نفرت اور غیر مسلموں سے پیار یہ کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام تو سبھی سے پیار و محبت کی تلقین کرتا ہے اور اپنے ہم عقیدہ بھائیوں سے زیادہ محبت و قربت کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام نفرت و عناد کے خلاف ہے۔ اخلاقی لحاظ سے اسلام میں غیر مسلم بھی قابل عزت و احترام ہیں لیکن محبت اور قلبی دوستی کے قابل نہیں۔ دشمنان اسلام سے دلی تعلق قائم کرنا اور مسلمانوں سے نفرت کرنا سنگین جرم ہے۔ قرآن نے واضح طور پر کہا ہے

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَ عَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ﴾

کہ اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ (ممتحنہ: ۱)

تو معلوم ہوا کہ وہ غیر مسلم جن کے سینوں میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض و کینہ ہے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے کوشاں ہیں مسلمان ایسے لوگوں کو دوست نہیں بنا سکتے۔ رہی بات اخلاقی طور پر میل جول' عدل و انصاف اور مصیبت و تنگی کے وقت تعاون' یہ ہر انسان کے ساتھ کرنا ضروری ہے۔

بہر حال ایسی جماعتیں یا ادارے جن کے طرز عمل سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہے اور اسلامی تشخص خطرے میں پڑ جاتا ہے ان سے تعاون نہیں کرنا چاہئے کیوں کہ ان سے ایسا طرز عمل اثم و عدوان کے زمرے میں آتا ہے۔

جدید مسائل

کیا اسقاط حمل جائز ہے؟

سوال: وار نگٹن سے ڈاکٹر صلاح الدین لکھتے ہیں

(۱) میں جس جگہ پر ہوں وہاں بہت سارے لوگوں کے لئے ▯ بھی ہے اور علیحدہ باورچی خانہ بھی جہاں چند لوگ اپنی پسند کے مطابق کھانا پکاتے ہیں۔ ان چند لوگوں میں کچھ اور بھی ہیں جو غیر ذبیحہ گوشت یہاں تک کہ لحم خنزیر بھی پکاتے ہیں۔ ضروریات کے برتن اسپتال والوں کی طرف سے مہیا ہیں۔ سوال یہ ہے کہ میں ان برتنوں کو (جیسے پین، دیگچی، پلیٹ، چمچی وغیرہ) صرف صابن یا دیگر واشنگ لیکوڈ سے دھو کر استعمال کر سکتا ہوں کہ نہیں؟

(۲) بازاروں میں ملنے والی خوشبو کی چیزیں پرفیومز اور ڈیوڈرنیٹ اور اسپرے وغیرہ کا استعمال شرعاً جائز ہے کہ نہیں؟ اور اگر یہ سبھی ناجائز ہیں تو کیوں؟

(۳) فیملی پلاننگ اسلام کی نظر میں جائز ہے کہ ناجائز؟

(۴) موجودہ سائنسی نقطہ نظر سے ہماری بہت سی لاعلمیوں کا ازالہ ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے اور ان سبھی کے زیر اثر فیملی پلاننگ کو اپنانے کا ذریعہ بھی بدلتا جا رہا ہے۔ مگر بنیادی طور پر یہ سبھی اس لئے ہو رہا ہے کہ ہم یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اولاد کا ہونا اور نہ ہونا سبب کے زیر اثر ہے اور ہم ان اسباب میں ترمیم کر سکتے ہیں اور اس ترمیم سے مختلف نتیجہ نکل سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہم نے اصولاً مان لیا ہے کہ دنیا کی آبادی میں جس طرح سے اضافہ ہوا ہے اس شرح سے پیداوار میں اضافہ نہیں ہوا ہے اور اگر پیداوار میں اضافہ ہوا بھی ہے تو ایک محدود عرصے کے بعد یہ پیداوار ختم ہو جائے گی جب کہ انسانی

آبادی میں اضافہ (مختلف لڑائیوں کے باوجود مختلف بیماریوں اور مختلف قدرتی ذرائع جیسے زلزلہ) ہوتا ہی رہے گا۔ اس لئے انسانی آبادی کے اضافے اور محدود و قدرتی وسائل وذرائع کے درمیان ایک حد تک توازن (بیلنس) کا ہونا ضروری ہے تو اسلام کی نظر میں یہ نظریہ کہاں سے غلط ہے اور کیوں ہے؟ اور پھر اس کا حل اسلام کیا پیش کرتا ہے؟

(۵) فیملی پلاننگ کے طریقوں میں سے کون سا طریقہ اپنایا جا سکتا ہے جیسے

(الف) عورتیں جو گولیاں ہر دن کھاتی ہیں اور جس سے حمل قرار ہی نہیں پاتا ہے۔ اصولاً کیا یہ غلط ہے؟

(ب) مرد مانع حمل طریقوں کو اپناتے ہیں (میں اس کی وضاحت سے پرہیز کر رہا ہوں) کیا یہ غلط ہے؟

(ث) مرد اور عورت جو اپنی نس بندی کراتے ہیں' کیا یہ حرام ہے اور اس کا اپنانا غلط ہے؟ اگر غلط ہے تو کیوں؟

(۶) ڈاکٹر کی حیثیت سے کئی مرتبہ اسقاط حمل کرنا اور کرانا پڑا ہے۔ اگر آپ سرجن ہیں تو دنیا کے ہر کونے میں (سوائے سعودی عرب کے) غیر قانونی حمل کو حاملہ کی عمر کو مد نظر رکھتے ہوئے (جیسا کہ میں نے اس ملک میں ۱۳' ۱۴ برس کی بچیوں کو دیکھا ہے) سماجی دباؤ کے اثر سے (جیسا کہ اس ملک میں اور دوسرے ملکوں میں بھی) اور کبھی کبھی معاشی دباؤ سے بھی (جیسا کہ بہت مرتبہ شادی شدہ عورتیں صرف اس بنا پر اسقاط کرانے آتی ہیں کہ وہ اس غیر مطلوبہ حمل کو غربت کی بنا پر اپنا رہی ہیں) اسقاط کرانا پڑتا ہے۔ تو کیا اسقاط کرانے والا سرجن یا وہ An Aesthe Tist جو اسقاط کے وقت بے ہوشی کی دوا دیتا ہے اسلام کی نظر میں مجرم ہے اور گناہ اور حرام کاری میں ملوث ہے؟ کیا ڈاکٹر کو اسلامی نظریئے کے مطابق ایک سرجن یا بے ہوش کرنے والے کی حیثیت سے اس طرح کے کام میں یعنی اسقاط کے لئے یا دیگر آپریشن کرنے سے انکار کر دینا چاہیئے۔ میں نے رومن کیتھولک ڈاکٹروں کو ان کاموں کو کرنے سے انکار

کرتے دیکھا ہے مگر یہاں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اپنے وطن سے دور کام سیکھنے کی غرض سے اور پھر مجبوری کے طور پر ان کاموں کو کرنا کیسا ہے؟

(۶) بہت دنوں پہلے تھوڑی دیر کے لئے بی بی سی پروگرام دیکھ رہا تھا جس میں برطانیہ کے نامور سائنس دان اور عیسائی علماء نے حصہ لیا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے اس بحث میں مسئلہ یہ تھا کہ دوران حمل انسانی زندگی (بلکہ غیر انسانی زندگی بھی) واقعتاً کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ کیا زندگی کی شروعات عورت کے پیٹ ہی میں رہنے سے شروع ہو جاتی ہے یا کہ پیدا ہونے کے بعد؟

اور اگر زندگی پیٹ ہی میں شروع ہو جاتی ہے تو کب سے؟ کوئی کہتا تھا کہ جب بچہ ماں کے پیٹ میں ۷ ماہ کا ہو تب سے۔ کوئی کہتا تھا کہ بچہ جب ۲۸ دنوں کا ہو جائے یعنی جب سے ہاتھ پیر کا سانچہ نمودار ہو تب سے۔ کوئی کہتا تھا ۲۸ دنوں سے پہلے بھی یعنی جب مرد اور عورت کا نطفہ آپس میں مل کر اس نئے بچے کی زندگی کی پہلی اینٹ بنا دیں تب سے اور یہ بھی کہ آخر مرد کی منی میں جو کروڑوں کیڑے زندہ متحرک ہیں اس کو بھی کیوں نہ اس زندگی سے منسلک کیا جائے جو اگر فیملی پلاننگ کے زیر اثر مانع حمل طریقوں کو اپنانے کی غرض سے برباد ہو جاتے ہیں۔ میں اس بحث کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا مگر سوال یہ ہے کہ موجودہ سائنسی علم کے مطابق زندگی کی شروعات کو جہاں سے مانا گیا ہے (شاید حاملہ عورت کے پیٹ میں ۳ ماہ کی عمر) اس سے پہلے اگر اسقاط حمل کیا اور کرایا جائے تو اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ نہیں؟ اور اگر اجازت نہیں ہے تو کیوں؟ اور اسلامی مسئلہ کے مطابق زندگی کی شروعات ماں کے پیٹ میں کب سے شروع ہوتی ہے؟

(۷) کلام پاک میں (جس آیت شریفہ میں اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو.....) جس ڈر اور خوف سے اولاد کو قتل کرنے کا ذکر ہے کیا وہ موجودہ فیملی پلاننگ کے طریقوں (جیسے عورتوں کا گولیاں

کھانا- TUBALLIGATION VASECTOMY2 بلکہ اسقاط تین ماہ سے قبل) پر بھی لاگو ہوتا ہے؟ یا یہ اس گناہ کے سلسلے میں کہا گیا ہے جس میں عرب اپنی لڑکیوں کو زندہ گاڑ دیا کرتے تھے؟

(۸) اس ملک میں اگر کوئی مریض مر جائے اور اس کو دفن کرنے کی بجائے جلایا جائے تو ایسی صورت حال میں اسپتال کے ڈاکٹروں کو ایک سرٹیفکیٹ جاری کرنا پڑتا ہے کہ میں اس کی گواہی دیتا ہوں کہ فلاں شخص مر گیا ہے اور اس سرٹیفکیٹ کے بدلے میں ڈاکٹر کو کچھ رقم ہسپتال کی طرف سے فیس کے طور پر ملتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ فیس کے طور پر ملی رقم کا حاصل کرنا جائز ہے؟

براہ کرم ان تمام سوالات کے جواب دے کر ممنون فرمائیں۔

جواب: (ا) کفار یا غیر مسلم کے برتن صابن وغیرہ سے دھو کر استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضرت ابو ثعلبہ نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ

انا بارض قوم اهل كتاب افناكل فی آنيتهم ؟ قال ان وجدتم غيرها فلا تاكلوا فيها وان لم تجدوا فاغسلوها و كلوا فيها.[1]

کہ ہم اہل کتاب کے ملک میں ہیں تو کیا ان کے برتنوں میں کھا سکتے ہیں؟ اس پر رسول اللہ نے فرمایا کہ اگر تم اپنے برتن حاصل کر سکو تو پھر ان کے برتن میں نہ کھاؤ۔ اور اگر تمہیں الگ سے برتن میسر نہ ہوں تو ان کے برتنوں کو دھو کر ان میں کھا سکتے ہو۔

مسند احمد اور ابو داؤد کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ صحابی نے یہ بھی کہا کہ وہ لوگ اپنے برتنوں میں خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں اور شراب پیتے ہیں تو ہم ان کے برتن یا ہانڈیوں کو کس طرح استعمال کریں؟ تو اس کے جواب میں بھی حضور اکرمؐ نے فرمایا

[1] بخاری کتاب الذبائح والصید باب ما اصاب المعراض بعرضه ۵۴۸۸، ۵۴۹۶ مسلم الصید و الذبائح باب الصید بالکلاب المعلمة

کہ پانی سے اچھی طرح ان کے برتن صاف کر لو اور پھر ان میں پکاؤ بھی اور پیو بھی۔

اس لئے اگر اپنے الگ سے برتن میسر نہ ہوں تو غیر مسلم کے برتن کو صاف کر کے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۲) بازاروں میں ملنے والی ایسی خوشبو جس میں کسی حرام چیز کی آمیزش نہیں، اس کا استعمال جائز ہے اور اگر کسی چیز کے بارے میں دلیل سے ثابت ہو جائے کہ اس میں حرام چیز کا استعمال ہوا ہے تو پھر جائز نہیں۔

(۳۔۴) فیملی پلاننگ کی شرعی حیثیت کے بارے میں صراط مستقیم کے ساتویں شمارے بابت جنوری ۸۴ء میں مفصل جواب شائع ہو چکا ہے۔ (اس کی کاپی آپ کو بھیجی جا رہی ہے) خلاصہ یہی ہے کہ کسی عذر یا مجبوری کی وجہ سے انفرادی طور پر منصوبہ بندی جائز ہے (جیسا کہ عورت کی صحت یا بچوں کی صحت وغیرہ کی حفاظت کا مسئلہ ہے) عام حالات میں اس کی ہرگز اجازت نہیں ہے اور نہ ہی قانونی طور پر اسے رائج کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک آبادی کے اضافے کی دلیل کا تعلق ہے تو یہ اسلام میں قابل قبول نہیں۔ رزق اور پیداوار کے اصل ذرائع اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ انسانوں کو ان اسباب وذرائع کو تلاش کرنے اور محنت کرنے کی تلقین کی گئی ہے نہ کہ آبادی پر کنٹرول کرنے کی۔ رزق کی کمی کے خوف سے اولاد کو قتل کرنا یا کسی نفس کے دنیا میں آنے سے روکنے کی کوشش کرنا اس کی نص قرآنی سے حرمت ثابت ہے۔ اس لئے کہ یہ مومن کے بنیادی عقیدہ توحید کے خلاف ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے خالق حقیقی اور رازق کامل ہونے کی نفی ہوتی ہے۔

درج ذیل آیات قرآنی ملاحظہ ہوں:

(الف) اپنی اولادوں کو رزق میں کمی کے ڈر سے قتل نہ کرو اور انہیں رزق تو ہم دینے والے ہیں۔ (انعام:۱۵۱)

(ب) اپنی اولادوں کو قتل نہ کرو رزق میں کمی کے خوف سے، انہیں بھی اور تمہیں بھی

رزق ہم دیتے ہیں۔(اسراء:۳۱)
(ج) کیااللہ کے سوا کوئی خالق ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دے۔(فاطر:۳)
(د) اگر وہ رزق روک لے تو تمہیں رزق کون دے گا۔(ملک:۲۱)

یہ اور اس طرح کی متعدد آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رزق کے خوف سے اولاد کے بارے میں کوئی پابندی جائز نہیں۔ بلکہ یہ سوچ ہی بنیادی اسلامی عقیدے کے خلاف ہے۔

انسانی آبادی کے اضافے اور قدرتی وسائل وذرائع کے درمیان برابری نہ آپ کے ذمے ہے اور نہ ہی یہ انسان کے بس میں ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ قدرتی وسائل محدود ہیں۔ اللہ کی زمین میں انسانی ضروریات کے لئے لا محدود وسائل ہیں۔ علم وفن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان وسائل کی دریافت بھی ہو رہی ہے۔ انسان اور خاص طور پر مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ آبادی پر کنٹرول کے طریقے معلوم کرنے اور اس پر محنت کرنے کی بجائے قدرتی وسائل کی دریافت اور ذرائع رزق کے حصول کے لئے اپنی علمی وفنی صلاحیتیں صرف کریں۔ اس میں قدرت کا کوئی قصور نہیں اگر انسان اللہ کی نعمتوں کو تلاش ہی نہیں کرتا چند ممالک یا چند افراد اگر دولت اور ذرائع پیداوار پر قبضہ کر لیتے ہیں اور باقی بھوکے مرنے لگ جاتے ہیں تو اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا اور اس سے نجات حاصل کرنا بھی انسانوں کا فرض ہے۔ یہ تو خالص مغربی یہودی سرمایہ دارانہ نظام کی چال ہے کہ ساری دنیا کا سرمایہ سمیٹ کر اپنے قبضے میں کر لو اور پھر غریبوں کی غربت دور کرنے کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کا ڈھونگ رچا دو۔

آج دنیا میں ایسے ممالک ہیں بلکہ ایسے افراد ہیں کہ صرف ایک کی دولت اور پیداوار سے ساری دنیا کے غریبوں کی مدد کی جاسکتی ہے اور پھر ان کی برابری کی کوششیں بھی کس قدر ناقص ہیں۔ کبھی یہ کہتے ہیں کہ آبادی بہت زیادہ ہو گئی ہے اس لئے دنیا کو بھوک سے بچانے کے لئے اس پر کنٹرول کیا جائے اور پھر کچھ عرصے بعد کہتے ہیں کہ آبادی میں بہت کمی ہوتی جا رہی ہے اس لئے بچوں کی پیدائش کی شرح میں

اضافے کی ضرورت ہے۔ حال ہی میں برطانوی اخبارات میں یورپین پارلیمنٹ کی طرف سے یہ اپیل شائع ہوئی ہے کہ بچوں کی شرح پیدائش میں اضافہ کیا جائے اور اب یہ کہنا پڑا کہ

A NATION WITH OUT ENOUGH CHILDREN

WOULD BE A SAD NATION

میں ۱۳ اپریل کے ایک اخبار کا تراشہ آپ کو بھیج رہا ہوں جس میں یورپین پارلیمٹ نے یورپ میں بچوں کی شرح پیدائش میں کمی پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ اس لئے ہم آبادی پر کنٹرول یا برابری کے ان انسانی ضابطوں پر نہ یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اسلام میں اس کا حل یہی ہے کہ ذرائع پیداوار کے تلاش کرنے اور اس کی منصفانہ تقسیم کے لئے بھرپور جدوجہد کی جائے۔ کسی عذر یا مجبوری کی وجہ سے انفرادی طور پر برتھ کنٹرول یا اس کی منصوبہ بندی کے لئے عورت اور مرد کوئی بھی ایسا طریقہ استعمال کر سکتے ہیں جو ان کی صحت کے لئے نقصان دہ نہ ہو۔ ایسی گولیاں یا کوئی دوسرا طریقہ استعمال نہیں کیا جا سکتا جو عورت کی صحت پر منفی اثرات ڈالے۔

نس بندی کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ کسی عذر اور مجبوری کے بغیر ہر گز جائز نہیں اور اگر اولاد کی پیدائش کی وجہ سے ماں کی زندگی خطرے میں پڑنے کا خدشہ ہے یا کوئی دوسری خطرناک بیماری لگ سکتی ہے تو ایسی صورت میں نس بندی بھی جائز ہے۔ مگر محض آبادی میں اضافے کے خوف یا رزق میں کمی کے ڈر سے ان میں سے کوئی شکل بھی جائز نہیں۔

(۵) اسقاط حمل حرام ہے اور سماجی دباؤ یا کسی دوسرے بہانے کی وجہ سے حمل کا ضائع کرنا ہر گز جائز نہیں۔ یہاں بھی اگر طبی نقطہ نظر سے کوئی مجبوری ہے مثلاً ولادت کے موقع پر عورت کی ہلاکت کا خطرہ یا کسی مہلک بیماری کا لاحق ہو جانا ایسی شکل میں تو

اس کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کے بغیر اسقاط حمل کی اجازت دینا برائی اور زنا کا راستہ کھولنے کے مترادف ہے جس کی اسلام کسی شکل میں بھی اجازت نہیں دے سکتا۔ مذکورہ بالا عذر کے بغیر اگر کوئی ڈاکٹر یہ کام کرے گا تو وہ بھی اس گناہ میں ملوث ہوگا۔ اگر رومن کیتھولک ڈاکٹر یہ کام کرنے سے انکار کرتے ہیں تو مسلمان ڈاکٹروں کو تو اس سے بھی زیادہ پابند ہونا چاہئے اور ایسے کام کے کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے۔

(۲) نطفے اور ماں کے پیٹ میں بچے کی عمر کے مختلف مراحل کا قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ذکر ہے۔ لیکن سورہ حج اور سورہ المومنون میں قدرے تفصیل دی گئی ہے ارشاد ربانی ہے۔

﴿يَاَيُّهَا النَّاسِ اِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلَى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْآ اَشُدَّكُمْ﴾ (الحج : ٥)

اے لوگو! اگر تم دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں شک میں مبتلا ہو تو ذرا غور کرو کہ ہم نے تمہیں پہلے مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفے سے' پھر جمے ہوئے خون سے' پھر گوشت کے لوتھڑے سے' نقش بنے ہوئے اور بغیر نقش بنائے تاکہ تمہارے لئے کھول کر بیان کردیں۔ پھر ہم جس طرح چاہیں ایک مدت مقرر تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر ایک بچہ بنا کر تمہیں باہر لاتے ہیں پھر تم جوانی تک پہنچتے ہو۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ (المومنون : ١٢، ١٤)

اور بلاشبہ ہم نے انسان کو (سب سے پہلے) منتخب مٹی سے پیدا کیا' پھر ہم نے

اسے نطفے کی شکل میں ایک ساکن جگہ میں رکھا' اس کے بعد ہم نے اس قطرے کو جما ہوا بنا دیا' پھر اس منجمد لہو کو ہم نے گوشت کا لوتھڑا بنا دیا' پھر اس سے ہڈیاں بنائیں اور ہڈیوں کو گوشت کا لباس پہنایا پھر اسے ایک نئی صورت میں لائے۔ تو اللہ بڑی برکت والا ہے اور سب سے بہتر بنانے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں دنوں یا مدت کے تعین کے بغیر مختلف مراحل کا ذکر کر دیا گیا ہے اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ نطفہ رحم میں ٹھہرنے کے بعد زندگی کا عمل ایک حد تک شروع ہو جاتا ہے اور اس نطفے کے بعد مختلف مراحل تکمیل تک آتے ہیں۔

امام ابن کثیرؒ سورہ حج کی آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ نطفہ جب عورت کے رحم میں ٹھہر جاتا ہے تو چالیس دن کے دوران اس میں کچھ اضافے ہوتے ہیں اور پھر وہ سرخ منجمد خون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس حالت میں چالیس دن رہنے کے بعد پھر وہ گوشت کا ایک ٹکڑا بن جاتا ہے جس کی کوئی شکل یا نقشہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد اسکے نقش بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ مثلاً سر' دونوں ہاتھ' سینہ' پیٹ' رانیں' پاؤں اور دوسرے اعضاء کی شکل بنی شروع ہو جاتی ہے۔ کبھی وہ مکمل ہو کر پیدائش ہوتی ہے اور کبھی نامکمل حالت میں اسقاط بھی ہو جاتا ہے یہ ہے معنی مخلقہ اور غیر مخلقۃ کا۔

بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں مزید صراحت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اکرم صادق و مصدوق ﷺ نے بتایا کہ

ان خلقكم احدكم يجمع في بطن امه اربعين ليلة ثم يكون علقة مثل ذالك ثم يكون مضغة مثل ذالك ثم يبعث الله اليه الملك فيومر باربع كلمات فكتب رزقه وعمله واجله وشقي وسعيد ثم ينفخ فيه الروح [1]

تمہاری پیدائش کا سلسلہ یوں ہے کہ ماں کے پیٹ میں چالیس دن نطفہ ٹھہرتا ہے' پھر وہ خون کا ٹکڑا بنتا ہے' چالیس دن اسی حالت میں رہتا ہے' پھر

[1] فتح الباری ج۱۵ کتاب التوحید باب قوله تعالى و لقد سبقت كلمتنا لعبادنا المرسلين ص ٤٠٤ رقم الحديث ٧٤٥٤

گوشت کا ٹکڑا بنتا ہے اور چالیس دن اسی حالت میں رہتا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرشتہ بھیجتا ہے وہ چار باتوں کا حکم لے کر آتا ہے۔ رزق، عمل، موت اور شقی یا سعید ہونے کا پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

امام ابن کثیرؒ نے ابن ابی حاتم اور ابن جریر کے حوالے سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جوں ہی نطفہ رحم میں ٹھہرتا ہے تو چالیس دن یا پینتالیس دن کے بعد فرشتہ آتا ہے اور عمر، رزق، اور لڑکا یا لڑکی ہونے جیسے معاملات اللہ کے حکم سے لکھ دیتا ہے بعض روایات میں چار ماہ کا ذکر آیا ہے کہ چار ماہ کے بعد روح پھونک دی جاتی ہے۔

بہر حال چونکہ نطفے کے استقرار کے ساتھ ہی زندگی کے اعمال کا آغاز ہو جاتا ہے اس لئے اس کا علم ہونے کے بعد اسقاط کرانا جائز نہیں ہوگا چاہے چالیس دن گزریں چاہے چار ماہ۔ اس لئے کہ مذکورہ روایات کی روشنی میں زندگی کی شروعات قطرے سے ہی شروع ہو جاتی ہیں۔

(۷) قرآن میں جس آیت کا ذکر ہے اس میں یہ اسقاط بھی شامل ہو سکتا ہے۔ اگر افلاس کے ڈر سے کرے گا تب تو ظاہر ہے اور اگر اس کے علاوہ کسی سبب سے کرے گا تب بھی ایک نفس کی زندگی ختم کرنے یا کم از کم اسے روکنے کی کوشش کی ہے۔ ہاں اگر شروع میں عورت کی زندگی بچانے کے لیے کر لیا جائے تو بامر مجبوری اس کی گنجائش ہو سکتی ہے مگر وہ بھی ابتدائی ۴۰ دنوں کے اندر اور تین یا چار ماہ کے بعد تو اس کی بھی گنجائش نظر نہیں آتی۔

(۸) میت کو جلانا اسلامی نقطہ نظر سے سخت جرم ہے۔ اسلام میں مسلمان بلکہ انسان کے جسم کا احترام روح نکلنے کے بعد بھی ضروری ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آپ (ﷺ) نے مردے کی ہڈیاں توڑنے یا اسے مارنے سے منع فرمایا ہے۔ اس لئے جلانے کے عمل میں تو مسلمان ڈاکٹر کا شریک ہونا جائز نہیں۔ جہاں تک صرف میت کے سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا تعلق ہے تو موت کی تصدیق کے سلسلے میں ملکی نظام

کے مطابق جو بھی فیس ہے ڈاکٹر اپنے پیشے کے لحاظ سے وہ لے سکتا ہے بشرطیکہ اس میں جھوٹ یا بددیانتی کا کوئی دخل نہ ہو۔

هذا ما عندي والله اعلم بالصواب

مخصوص حالات میں بچوں کی پیدائش میں وقفہ جائز ہے؟

سوال: گلاسگو سے الطاف حسین لکھتے ہیں

(۱) اگر کسی آدمی کے گھر اللہ تعالیٰ پے در پے بچے عطا کر دے اور وہ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ دو تین سال کے لئے پرہیز کرے۔ کیا یہ جائز ہے؟ اس کا مقصد اولاد کا ختم کرنا نہیں بلکہ کچھ عرصے کے لئے پرہیز کرنا چاہتا ہے۔

جواب: بچوں کی پیدائش میں وقفہ یا کچھ عرصے کے لئے پرہیز کے سلسلے میں آپ نے جو دریافت کیا ہے تو مخصوص حالات اور ضروریات کے تحت کوئی شخص انفرادی طور پر اسے اختیار کر سکتا ہے اور شریعت میں اس کی کوئی ممانعت نہیں۔

مثلاً بیوی بیمار ہے اور مزید حمل کی صورت میں اسکے زیادہ بیمار ہونے کا خطرہ ہے۔ والدین کے حالات ایسے ہیں کہ وہ زیادہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی اہلیت نہیں رکھتے یا تھوڑے تھوڑے وقفوں سے زیادہ بچوں کی پیدائش خود بچوں کی صحت پر بھی اثر انداز ہوتی ہے تو ایسی صورت میں والدین باہمی رضامندی سے جائز طریقے سے عارضی پرہیز کر سکتے ہیں۔

مگر نسل کو محدود کرنے کے خیال سے کہ زیادہ ہوگئے تو کھائیں گے. کہاں سے کمائیں گے کیسے یا محض فیشن و تقلید کے طور پر ایک دو بچوں کے بعد آپریشن کروا دینا اور مسلم نسل کے بڑھنے کا سلسلہ منقطع کر دینا یہ جائز نہیں اور نہ ہی کسی حکومت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ آبادی پر کنٹرول کرنے کے لئے نسل کی تحدید کے قوانین بنائے۔

ٹیوب کے ذریعہ بچہ پیدا کرنے میں شریعت اسلامی کا موقف کیا ہے؟

سوال: ٹیوب کے ذریعہ نطفہ منتقل کرنے کے بعد جو بچہ پیدا ہوگا اس کے بارے میں شریعت اسلامیہ کا موقف کیا ہے؟

جواب: ٹیوب بی بی کی خبر سے بعض ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہونے لگا ہے کہ شاید جدید ٹیکنالوجی نے انسان کے بنانے پر قدرت حاصل کرلی ہے حالانکہ یہ سراسر جھوٹ اور شیطانی وسوسہ ہے۔ اس بارے میں قرآن مجید کا جو ارشاد ہے اس کے بعد کسی قسم کا شک وشبہ کرنا دین اسلام سے ناواقفیت اور جہالت ہے۔

﴿اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ﴾ (الواقعہ: ۵۸، ۵۹)

کہ مادہ منویہ کے انتقال کے بعد پیدائش وتخلیق تمہارے اختیار میں ہے یا ہمارے اختیار میں وہ جرثومے جو اللہ نے مرد کے مادہ منویہ میں رکھے ہیں وہ کبھی ناکارہ اور ضائع ہو جاتے ہیں اور کبھی ان سے کچھ پیدا ہی نہیں ہوتا جس کو عقمہ کہا جاتا ہے۔

اب اگر جدید علوم کے ماہرین نے کسی مرد کے مادہ منویہ کو کسی آلے کے ذریعے حاصل کرکے اسے ٹیوب کے ذریعے اس کی شرعی بیوی میں منتقل کردیا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے بچہ پیدا ہوگیا تو اسے جھٹلانے کی گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ اس لئے جب تک شرعی حدود کے اندر کوئی جدید تجربہ کیا جائے گا ہم اسے ناجائز یا حرام نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ سب کچھ اس عقل اور ان ذرائع کو استعمال کرنے کے بعد کیا گیا جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے پیدا کئے ہیں۔ ہاں اگر یہی عمل غیر بیوی یا غیر خاوند میں کیا جائے تو ہم اسے یقیناً حرام کہیں گے۔ لیکن اگر شرعی شادی کے بعد علاج کے طور پر ایسا کیا گیا تو ہم اسے حرام قرار دینے کے لئے دلیل نہیں رکھتے۔

کیا حصص خریدنا جائز ہے؟

سوال: ڈاکٹر صلاح الدین پوچھتے ہیں

آج کل حصص (SHARES) خریدنے کا ہنگامہ بہت ہے۔ برٹش گیس' برٹش ایرویز کے حصص خریدنے کی خبر معلوم ہوگی۔ان کو خریدنا بیچنا اسلامی نقطہ نظر سے جائز ہے یا نہیں؟ بعض کمپنیاں جن کے حصص خریدے جاتے ہیں وہ شراب یا خنزیر کے گوشت کا کاروبار کرتی ہیں۔کیا ایسی کمپنیوں کے شیئرز ایک مسلمان کے لئے خریدنا جائز ہے؟

جواب: اگر کسی کاروباری کمپنی کے حصے آپ نے خریدے ہیں اور پھر اس کے نفع و نقصان میں اپنے حصے کے مطابق آپ شریک ہیں کیونکہ ان کی قیمت بڑھ بھی سکتی ہے اور اس میں کمی کا امکان بھی ہوتا ہے۔ تو بنیادی طور پر یہ جائز ہے۔ اس کے حرام ہونے پر کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔

ہاں' اگر یہ بات آپ کے علم میں آجاتی ہے کہ جس کمپنی کے جتنے حصے آپ خرید رہے ہیں وہ سودی کاروبار کرتی ہے یا شراب و خنزیر فروخت کرتی ہے تو ایسی کمپنیوں کے حصے خریدنا جائز نہیں ہوگا۔ کیوں کہ یہاں بنیادی اصول یہی ہے کہ اس کاروبار میں کسی حرام چیز کا دخل نہیں۔اگر حرام آمدنی اس میں آتی ہے اور واضح طور پر آپ کے علم میں بھی آگیا تو پھر وہ حرام ہی ہوگا۔

اگر کسی کمپنی کے دائرے کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے جیسا کہ آپ نے لکھا ہے تو جس قدر آپ سمجھ سکے ہیں اس کے مطابق آپ فیصلہ کرلیں اصل بات آپ کا اطمینان ہے اگر آپ مطمئن ہیں کہ اس میں حرام کی کوئی آمیزش نہیں تو جائز ہے۔اپنی طاقت اور بساط کے مطابق انکوائری کرلینا چاہئے۔اس کے بعد کوئی اخلاص نیت سے جو فیصلہ بھی کرے گا اس میں وہ برحق ہوگا۔

جلوس میں شامل ہونا شرعاً صحیح ہے؟

سوال: ایسٹ ہیم لندن سے راجہ محمد رفیق لکھتے ہیں

(ا) کیا غیر مسلم ملکوں میں رہ کر مسلمان ملکوں کے لئے جلسے جلوس نکالنا جائز ہے؟ مثلاً افغان مجاہدین' مسجد اقصیٰ اور ▯ کے لئے۔ جو لوگ مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے منصوبے بناتے رہے ہیں وہ ہمیں کیا حقوق دلائیں گے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ جلوس میں شامل ہونا شرعی لحاظ سے جائز ہے یا نا جائز؟

جواب: مسلمان جہاں بھی رہتے ہوں وہ اپنے دین پر کاربند رہتے ہیں اپنے دینی فرائض ادا کرتے ہیں اور اپنے عقیدے کے تحفظ کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور اپنے مسلمان بھائیوں کے مسائل جاننا' انہیں حل کرنے کی سعی کرنا اور ان سے تعاون و مدد کرنا یہ بھی مسلمانوں کے دینی فرائض میں شامل ہے اور ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مجبور و مظلوم بھائی کی اپنی استطاعت کے مطابق مدد کرے۔ اس طرح اگر کسی جگہ اس کے بھائیوں پر ظلم و زیادتی ہو رہی ہو تو اس کے خلاف آواز بلند کرنا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ ظلم روک نہیں سکتا یا ظالم کے ہاتھ نہیں پکڑ سکتا تو کم از کم اس کے خلاف آواز کو بلند کر سکتا ہے یا اس ظلم کے خاتمے کے لئے جو لوگ جدوجہد کر رہے ہوں ان سے تعاون تو کر سکتا ہے۔ دور حاضر میں مسلمان دنیا کے مختلف ملکوں میں ظلم و ستم کا شکار ہیں' ان کی جانیں اور عزتیں خطرے میں ہیں۔ ایسے حالات میں ان کی حمایت میں آواز بلند کرنا اور دنیا کو اس طرح متوجہ کرنا نیکی اور بھلائی کا کام ہے۔ کشمیر افغانستان **فلسطین** اور دوسرے خطوں میں مسلمان محکوم و مظلوم ہیں اور ظالموں کے شکنجے میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ موجودہ دور میں جلوس اور مظاہرے ظالموں کے خلاف جدوجہد کا ایک حصہ ہیں۔ اس لئے اگر اس نیت سے ان جلسوں اور جلوسوں

میں شرکت کی جائے کہ اس سے ظلم کے خلاف آواز بلند ہو گی اور ظالم بے نقاب ہوں گے تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ بعض حالات میں ضروری ہے اور ظلم وزیادتی یا اسلام کے خلاف کوئی حرکت غیر مسلم کرے یا اپنے آپ کو مسلمان کہلوانے والے یہ کام کریں دونوں کے خلاف کسی بھی موثر طریقے سے احتجاج کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اگر نیت صحیح ہے تو ایسا شخص اجر وثواب کا بھی مستحق ہو گا۔

اضطراری حالت میں دوسرے کا گردہ لگایا جا سکتا ہے؟

سوال: سٹوکٹن آن ٹیس سے یم ایس لکھتے ہیں کہ

میں پورے دو سال سے بیمار ہوں اس وقت کڈنی (Kidney) مشین پر دارومدار ہے۔ ایسے مریض کی زندگی کا کیا حال ہوتا ہے اور اسے کیا دشواریاں اور پریشانیاں پیش آتی ہیں ان کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اس کا آخری علاج جس سے مریض نجات پا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی تندرست یا فوت شدہ مسلم یا غیر مسلم کا گردہ آپریشن کے ذریعے نکال کر میرے جیسے مریض کے جسم میں ڈال دیا جائے۔ میرا بھی یہ آپریشن ہونے والا تھا کہ شریعت اسلامی کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے آخری وقت میں کام روک دیا گیا۔ اس لئے امید کرتا ہوں کہ آپ قرآن و حدیث کی روشنی میں مجھے شریعت مطہرہ کے فیصلے سے مطلع کریں گے جو دل ودماغ کی الجھنیں دور کرے اور دوسروں کے اعتراضات کا مکمل جواب بن جائے؟

جواب: عام حالات میں تو اسلامی شریعت اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ دوسرے شخص کا خون یا کسی زندہ اور مردہ کے جسم کا کوئی عضو دوسرے انسان میں منتقل کیا جائے لیکن ایسی مجبوری کی حالت میں جب جان خطرے میں ہو اور اس کے سوا کوئی علاج بھی نہ ہو تو پھر اضطراری حالت میں دوسرے کا عضو جوڑا بھی جا سکتا ہے اور خون بھی دیا

جا سکتا ہے۔اس کا سب سے بڑا ثبوت قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے کہ:

﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

''اللہ نے تمہارے لئے حرام قرار دے دیا مردار' خون' خنزیر کا گوشت' غیر اللہ کے نام کی نذر۔ پس جو کوئی مجبور ہو گیا نہ تو زیادتی کرنے والا ہے اور نہ حد سے بڑھنے والا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔'' (البقرہ : ۱۷۳)

اب یہاں جن اشیاء کو قطعی طور پر حرام ٹھہرایا گیا ان میں خون اور خنزیر کا گوشت بھی شامل ہے مگر استثنائی شکل موجود ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی مجبوری میں مبتلا ہو گیا ہو کہ ان چیزوں کے استعمال کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تو وہ اتنی مقدار میں استعمال کر سکتا ہے جس سے اس کی جان بچ جائے۔

آپ کے کڈنی آپریشن کی بھی یہی صورت حال ہے۔ زندگی خطرے میں ہے۔ یہی ایک راستہ ہے کہ کسی دوسرے کی کڈنی ٹرانسفر کی جائے۔ یہ اضطرار اور مجبوری کی حالت ہے۔اس میں آپ کو اجازت ہے کہ کڈنی ٹرانسفر کا آپریشن کروالیں۔ اللہ تعالیٰ رحم کرنے والا ہے۔ اللہ کے دین میں آسانیاں ہیں تنگیاں نہیں۔ خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

یسروا ولا تعسروا۔[1]

کہ آسانیاں پیدا کرو مخلوق خدا کو تنگیوں میں مبتلا نہ کرو۔

لغزشیں اللہ معاف کرنے والا ہے۔اس لیے اس آیت میں جہاں مجبوری کی حالت میں حرام چیزوں کے استعمال کی اجازت دی ہے وہاں آخر میں کہا کہ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

---

[1] بخاری کتاب الادب باب قول النبی ﷺ یسروا ولا تعسروا (۶۱۲۵) مسلم کتاب الجهاد باب فی الامر بالتیسر ۱۷۳۳/۷

خون کا عطیہ دیا جاسکتا ہے؟

سوال: لیڈز سے علی اکبر دریافت کرتے ہیں کہ کیا خون کا عطیہ دینا یا ایک شخص کا خون دوسرے شخص کے بدن میں منتقل کرنا جائز ہے؟ قرآن و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب: اسلام میں بعض کام عام حالات میں تو جائز نہیں لیکن خصوصی یا مجبوری کی حالت میں ان کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ خون کے عطیئے کا مسئلہ بھی اسی طرح کا ہے کہ یہ ایک مجبور و لاچار آدمی کی مدد کرنا ہے اور خون دے کر اسے بچایا جاسکتا ہے۔

عام حالات میں تو قرآن نے خون کو حرام قرار دیا ہے کہ اس کا پینا یا استعمال کرنا جائز نہیں لیکن قرآن میں ''فمن اضطر'' کے الفاظ سے مجبوری کی شکل میں اجازت بھی دے دی ہے اور پھر اسلام تو باہمی تعاون اور خیر خواہی کی تلقین کرنے والا دین ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے کسی مومن سے دنیا میں کوئی تنگی دور کرنے کے لئے مدد کی اللہ قیامت کے دن اس کی تنگیاں دور کردے گا۔ تو ایسا شخص جسے خون دے کر ہی بچایا جاسکتا ہے اس کی جان خطرے میں ہے اور خون کی مدد کے سوا کوئی دوا کارگر نہیں ہوسکتی تو ایسے شخص کے لئے خون دیا جاسکتا ہے اور اس کے جسم میں خون منتقل بھی کیا جاسکتا ہے۔

حال ہی میں اس مسئلے پر سعودی عرب کے مفتی اعظم سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن بازؒ کا فتویٰ بھی شائع ہوا ہے انہوں نے اسے نہ صرف جائز قرار دیا ہے بلکہ خون کے عطیات دینے کی رغبت بھی دلائی ہے۔

قصاص یا ہاتھ کاٹنے سے قید اور جیل کی سزا بہتر نہیں؟

سوال: آج کل اسلامی سزا ہاتھ وغیرہ کاٹنے سے یہ بہتر نہیں کہ جیل کی سزا دی جائے تاکہ کسی کا ہاتھ ضائع نہ ہو۔

جواب: دنیاوی زندگی کے تجربات سے ہم اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ جو چیز یا مشین کوئی شخص بناتا ہے اس میں خرابی یا نقص کی صورت میں اس کی مرمت یا درستی کے لئے اس کا بنانے والا ہی سب سے زیادہ واقف ہوتا ہے۔ اسی طرح کائنات کا یہ نظام اللہ تعالیٰ کا قائم کردہ اور تمام چیزیں اس کی پیدا کردہ ہیں۔ وہی اس کے بگاڑ اور فساد کی اصلاح کے طریقے بہتر جانتا ہے۔ انسانوں کی فطرت سے وہ سب سے زیادہ واقف ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (الملك : ١٤)

خبر دار اس نے جو پیدا کیا اس کو جانتا ہے اور وہ باریک بین اور خبیر ہے۔

جب ہم بیماری کے علاج کے لئے ڈاکٹر کی طرف اور مشین کی درستی کے لئے انجینیر کی طرف رجوع کرتے ہیں تو پھر اپنے نفوس کے علاج اور معاشرے کی خرابیوں کی درستی کے لئے خالق کون و مکان کی طرف رجوع کیوں نہ کریں۔ ہماری عقلیں ہر بات کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ اس لئے کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم مشرقی یا مغربی عقل پر انحصار کی بجائے خالق کون و مکان کے علاج کو قبول کریں۔ ہاتھ کاٹنے کی سزا چوری کے مجرم کے لئے اس کے خالق نے مقرر کی ہے جبکہ اس میں تبدیلی کی باتیں ہماری ناقص عقل کی اختراعات ہیں۔ اگر ہم یہ کہہ دیں کہ یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ

ایک آدمی اپنے اہل و عیال سے دور جیل میں ڈال دیا جائے اور اس کی آزادی سلب کر کے اسے ایک خاندان سے چھین لیا جائے اس سے بہتر ہے کہ فوراً جرم کی سنگینی کا احساس دلانے کیلئے ہاتھ کاٹ دیا جائے جو دوسروں کے لئے عبرت بھی بنے اور اس کے بعد اسے اپنے گھر میں آزادی کے ساتھ اپنی اصلاح اور کاروبار کی اجازت دیدی جائے۔ اس لحاظ سے بھی اسلامی سزا ہی بہتر معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اگر ہم کوئی فلسفہ اپنی طرف سے نہ بھی نکالیں تو بھی خالق کائنات کا حکم ہی ہمارے لئے کافی ہے۔ فطرت کے رموز وہی بہتر جانتا ہے۔

غیر مسلم کا اشتہار شائع کرنا جائز ہے؟

سوال: کویت سے امین الدین قاضی لکھتے ہیں ماہ جولائی کا شمارہ دیکھ کر ذہن میں ایک سوال آیا سو پوچھ لینا چاہتا ہوں کہ "صراط مستقیم" کے آخری صفحے میں ایک غیر مسلم کا جو اشتہار شائع ہوا ہے کیا یہ جائز ہے؟

جواب: شریعت اسلامیہ میں کاروبار یا لین دین کے بارے میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ آپ کسی غیر مسلم سے کوئی معاملہ سرے سے کر ہی نہیں سکتے بلکہ کتاب و سنت میں اصل اصول یہ ہے کہ کسی حرام کاروبار میں کسی قسم کی شرکت یا معاونت جائز نہیں اور حرام کاروبار چاہے مسلمان کرے چاہے غیر مسلمان وہ بہر حال حرام ہوگا۔

"صراط مستقیم" میں جو اشتہار شائع ہوا وہ ایک غیر مسلم کے کاروبار یا تجارت کے بارے میں ہے اور اس کاروبار میں بظاہر کوئی چیز حرام نہیں تھی۔ ہاں اس اشتہار میں اگر حرام کام کی تشہیر ہو یا حرام چیزیں خریدنے یا بیچنے کی ترغیب ہو وہ بہر حال ناجائز ہے لیکن کسی غیر مسلم ہونے کی وجہ سے کوئی چیز حرام نہیں ہو جاتی۔ رسول اکرم ﷺ خود یہودیوں سے لین دین کرتے تھے۔ صحابہ کرام کے غیر مسلموں کے ساتھ کاروباری

معاملات تھے۔

بخاری شریف میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے' آپ فرماتی ہیں

اشتری رسول اللہ ﷺ من یھودی طعاما و رھنہ درعہ[1]

کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی درعہ گروی رکھ کر ایک یہودی سے کھانے کی چیزیں خریدی تھیں۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جائز اور حلال کاموں میں غیر مسلموں سے لین دین اور معاملہ کرنے میں کوئی شرعی پابندی نہیں ہے۔

[1] فتح الباری ج۵ کتاب السلم باب الرھن ص ۱۸۸ رقم الحدیث ۲۲۵۲

متفرق مسائل

کیا چودھویں صدی آخری صدی ہے؟

سوال: کیا چودھویں صدی آخری صدی ہے اور بعض لوگوں میں آج کل جو یہ مشہور ہے کہ اس صدی کے خاتمے پر قیامت آجائے گی' اس کا اصل یا حقیقت سے کوئی تعلق ہے؟

جواب: مسلمانوں کی جہالت اور اپنے دین سے لاعلمی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اچھے بھلے سنجیدہ لوگ بھی یہ بات کرتے سنے گئے کہ اب تو آخری وقت ہے۔ چودھویں صدی ختم ہونے والی ہے' اس کے بعد قیامت آجائے گی۔

حالانکہ اس بات کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ قیامت کس صدی یا سال میں آئے گی اس بارے میں قرآن و حدیث میں اشارہ تک نہیں دیا گیا حتی کہ خود رسول اللہ ﷺ سے جب قیامت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے بھی قرآن کی زبانی یہ جواب دیا:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ﴾(الاعراف : ۱۸۷)

وہ آپ سے قیامت بپا ہونے کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اس کا علم میرے رب کے پاس ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے

﴿يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾(الاحزاب :۶۳)

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیں کہ اس کا

علم میرے اللہ کے ہاں ہے۔

تیسرے مقام پر ارشاد ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ﴾ (لقمان : ٣٤)

بے شک اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم اور وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ رحموں میں کیا ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کوئی نفس کل کیا کرے گا اور کسی نفس کے علم میں نہیں (سوائے اللہ تعالیٰ کے) کہ وہ کہاں مرے گا۔

اب ان آیات سے واضح ہو گیا کہ قیامت کے صحیح وقت کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر آخر الزمان ﷺ کو بھی نہیں بتایا تو پھر آج کل کے جہلاء کو کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ آخری صدی ہے' اس کے بعد قیامت آ جائے گی۔ حدیث میں قیامت کی نشانیاں ضرور بیان کی گئی ہیں لیکن اس کے لئے سال یا صدی کے تعین کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لئے اس صدی کو آخری صدی قرار دینا کم علمی ہے۔

مجسموں کی تجارت سے ذریعہ معاش

سوال: کیا کسی مسلمان کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ مجسموں کی تجارت کرے' اسے معاش کا ذریعہ بنائے؟

جواب: کسی بھی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مجسموں کی خرید و فروخت یا تجارت کرے کیونکہ احادیث صحیحہ میں ذی روح اشیاء کی تصویر ناجائز قرار دی گئی ہے۔ جب ان مجسموں کا بنانا ہی غلط ہے تو اب ان کی خرید و فروخت اور تجارت بدرجہ اولیٰ ناجائز ہے۔

کسی غیر مسلم کو کافر کہنا کہاں تک درست ہے؟

سوال: کسی کو کافر کہنا (چاہے وہ عیسائی ہو یا یہودی) کہاں تک درست ہے؟

کسی مسلمان کو کافر یا منافق کہنے والے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: جہاں تک عیسائی اور یہودی کو کافر کہنے کا تعلق ہے تو اس بارے میں خود قرآن نے ان کو صاف طور پر کافر کہا ہے۔ ظاہر ہے جنہوں نے ہمارے رسولؐ کی رسالت کا نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے بدترین دشمن بھی ہیں ان کے کافر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ قرآن پاک میں ہے

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾(المائدہ: ۱۷)

جنہوں نے مسیح بن مریم کو خدا کا درجہ دیدیا انہوں نے کفر کیا۔

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾(المائدہ : ۷۳)

وہ لوگ بھی کافر ہیں جنہوں نے اللہ کو تین میں سے تیسرا کہا۔

باقی کسی مسلمان کو کافر یا منافق کہنا ہرگز جائز نہیں۔ جب کوئی مسلمان اپنے کفر کا اعتراف کرے یا وہ شریعت کے کسی بنیادی عقیدے کا انکار کر دے یا کسی حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دے تو ایسی صورت میں اسے کافر کہا جا سکتا ہے لیکن صریح کفر کے بغیر محض کسی عملی کمزوری کی وجہ سے ہم کسی کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ ہم یہاں اس شخص کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے فرمان نقل کرتے ہیں جو مسلمان کو کافر کہتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہہ کر پکارتا ہے تو دونوں سے ایک اس کفر کا مستحق ہوگا۔ اگر اس نے کفر کیا تو ٹھیک ورنہ یہ بات کہنے والے پر صادق آئے گی۔" یعنی اس کا اپنا ایمان ضائع ہوگا۔

دوسری حدیث حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا "جس نے کسی کو کافر کہا یا اللہ کا دشمن کہا اور وہ درحقیقت ایسا نہیں تو پھر اس کا وبال کہنے والے پر لوٹ آئے گا۔"

ان دونوں احادیث سے مسلمان کو کافر کہنے والے کی حیثیت متعین ہو جاتی ہے۔

کیا پانی کی تمام جاندار چیزیں حلال ہیں؟

سوال: کینیڈا سے عابد نعیم نے درج ذیل سوالات ارسال کیے ہیں

(۱) کیا پانی کی تمام جاندار چیزیں اسلام میں حلال قرار دی گئی ہیں؟

ایک صاحب نے کہا کہ سمندر میں بسنے والے تمام جاندار حلال ہیں کیونکہ یہ حضور اکرم ﷺ کی ایک حدیث سے ثابت ہے تو کیا خونخوار قسم کے بحری جاندار اور مختلف انواع کی مچھلیاں بھی بلا کراہت کھائی جا سکتی ہے جیسے Whale `Shark اور Fish Shell وغیرہ۔

جواب: (۱) پانی کی ساری جاندار چیزیں حلال نہیں ہیں۔ مثلاً پانی کا خنزیر یا کتا حلال نہیں ہوگا۔ ہاں البتہ مچھلی کی وہ تمام اقسام جو مچھلی کی تعریف میں آتی ہیں وہ حلال ہیں۔ باقی جو جانور خشکی میں حرام ہیں وہ سمندر میں بھی حرام ہوں گے۔ مثلاً خنزیر کو قرآن نے حرام ٹھہرایا ہے تو اس میں بری اور بحری ہر قسم کا خنزیر شامل ہوگا۔ اسی طرح دوسرے حرام جانوروں کا معاملہ ہوگا۔

جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے جس میں سمندر کے تمام جانوروں کو حلال کہا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے اس کی سند ضعیف ہے۔ باقی مچھلی کی ہر قسم حلال ہے اس پر ائمہ دین کا اتفاق ہے۔

حرام کو حلال کرنے کا اختیار علماء کو ہے؟

سوال: کارڈف سے غلام حسین دریافت کرتے ہیں

اس ملک میں مارگیج وغیرہ کا جو سسٹم ہے یعنی اس میں سود وغیرہ کا اس کی حرمت میں ہمیں تو شبہ نہیں مگر کچھ لوگ بلکہ علماء یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس گھر نہ ہو اور رقم بھی نہ ہو تو وہ سود پر قرض لے سکتا ہے۔ کچھ حاجی اور مولوی صاحب جن کو ہم جانتے ہیں بڑی خوشی سے یہ کام کر رہے ہیں کیا واقعی ایسی کوئی گنجائش ہے؟

جواب: جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ مکانات یا دکانیں خریدنے کے لئے سود پر قرض لینا تو "صراط مستقیم" میں ہم متعدد بار اس موضوع پر لکھ چکے ہیں کہ سود کی کوئی شکل بھی جائز نہیں۔ جو علماء اسے جائز قرار دیتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ لکھ کر اپنے دلائل سے ہمیں آگاہ کریں۔ ہم ان کے دلائل صراط مستقیم میں شائع بھی کریں گے اور ان پر روشنی بھی ڈالیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ کسی چیز کو حلال کرنا اتنا آسان نہیں جتنا ان لوگوں نے سمجھ لیا ہے۔ کسی مولوی صاحب یا حاجی صاحب کا کوئی عمل ہمارے لئے حجت نہیں بن سکتا۔ ہمارے لئے دلیل اور حجت صرف قرآن و حدیث ہیں۔ ہاں اگر کوئی آدمی مرنے لگا ہے اور اگر وہ سود پر قرض نہ لے تو زندہ نہیں رہ سکتا تو اس کے لئے اس قدر اجازت ہو سکتی ہے جس سے اس کی زندگی بچ جائے۔ یا اس طرح کی مجبوری کی کوئی اور شکل ہو۔ جو لوگ اس ملک میں سود دینے کو جائز اور لینے کو ناجائز کہتے ہیں۔ اگر ان سے دلائل لکھوا کر آپ ہمیں بھیج دیں تو ہم ان پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

ایسی صورت میں ماں باپ کی اطاعت کیلئے کیا حکم ہے؟

سوال: ڈنمارک سے غلام حسین خاں لکھتے ہیں۔ تقریباً دس سال میں اور میرے بہن بھائیوں اور والدہ صاحبہ نے ہمارے والد سے تعلق الگ کر لیا ہے۔ کیونکہ انگلینڈ آنے کے بعد وہ بدل گئے اور ایک ایسے ماحول میں پڑ گئے جہاں اسلام سختی سے منع کرتا ہے یہاں تک کہ اب میں تو انہیں خط لکھنا توہین سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ان میں نہ اب شرم ہے نہ ایمان اور نہ خدا کا ڈر۔

جواب: آپ کا اور آپ کے بہن بھائیوں کا اپنے والد سے اور آپ کی والدہ صاحبہ کا اپنے خاوند سے یہ قطع تعلق الحب لله و البغض لله کے مطابق ہے اور پھر رسول اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق **لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق**[1] جہاں خالق کی نافرمانی ہوتی ہے وہاں مخلوق میں سے کسی کی اطاعت جائز نہیں۔

چونکہ ان کے ساتھ رہنے میں غلط ماحول کی وجہ سے آپ یا آپ کے بہن بھائیوں کے بگڑنے کا بھی خطرہ تھا اس لئے علیحدگی میں ہی خیر و عافیت تھی۔

لیکن دو باتوں کا خیال آپ کو اب بھی رکھنا ہو گا۔ ایک تو یہ کہ آپ کو اپنے والد کو راہ راست پر لانے کی کوشش جاری رکھنی چاہئے اور سنت ابراہیمی پر عمل کرتے ہوئے انہیں راہ حق پر لانے کے لئے پورا زور صرف کرنا چاہئے۔

دوسری یہ کہ والد ہونے کے ناطے آپ ان کا ادب و احترام' یا اگر وہ معذور ہو جائیں تو ان کی خدمت کرنا یہ آپ کے لئے بہر حال ضروری ہے۔ الا یہ کہ وہ خود آپ کو اس چیز سے منع کر دیں۔ اس لئے جہاں تک آپ سے ہو سکے ان کے ساتھ

---

[1] مشکوۃ الالبانی کتاب الامارۃ والقضاء ص ۱۰۹۲ رقم الحدیث ۳۶۹۶

حسن سلوک کا برتاؤ کیجئے۔

نفسانی خواہشات کیا ہوتی ہیں؟

سوال: مغربی جرمنی سے ایک صاحب پوچھتے ہیں۔ (یہ سوال امیر جمعیت کے دورہ جرمنی کے دوران انہیں دیا گیا)

نفسانی خواہشات کیا ہوتی ہیں؟ اسلام نے کس قسم کی خواہشات کو کم کرنے کا حکم دیا ہے؟ نفسیاتی طور پر کچھ خواہشات ایسی ہیں جن کو کم کیا جائے تو قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب: اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ جو قرآن اور رسول اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کی شکل میں ہمارے پاس موجود و محفوظ ہے اور یہ نظام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ کوئی بھی ایسا میدان نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہاں قرآن یا اسلام نے ہماری راہ نمائی نہیں کی یا ہمیں دستور العمل نہیں دیا۔ اب اسلام کے نظام' قانون اور ضابطے سے باغی ہو کر اپنی مرضی و منشا کے مطابق زندگی کا لائحہ عمل بنانا یہی نفس کی خواہشات ہیں۔ جس مقام پر بھی قرآنی ضابطے اور خدائی قانون کو توڑا جائے گا اور رسول اکرم ﷺ کے طریقے کو چھوڑ دیا جائے گا وہاں یقیناً نفسانی خواہشات کا دخل ہو گا۔ کسی منکر کا ارتکاب کیا جائے یا کسی فرض کو ترک کیا جائے نفس کی پیروی کے نتیجے میں ہی ایسے ہو گا۔ قرآن نے نفس یا اس کے اتباع کے بارے میں متعدد مقامات پر تذکرہ کیا ہے۔ چند ایک کا ذکر یہاں مناسب ہو گا۔

ایک مقام پر فرمایا ہم اگر چاہیں تو اسے بلند کر دیں لیکن وہ خود ہی زمین کی طرف گرتا جارہا ہے اور اپنے نفس کی پیروی میں لگا ہوا ہے۔ (الاعراف:۱۸۶)

اس شخص کی پیروی نہ کرنا جس کا دل ہمارے ذکر سے غافل کر دیا گیا ہے اور وہ

اپنے نفس کی خواہشات کے پیچھے لگا ہوا ہے۔(الکھف: ۱۲۸)

تم اپنی نفسانی خواہشات کی بنا پر ناانصافی نہ کرنا(النساء:۱۳۵)

کافر لوگ محض گمان کی پیروی کرتے ہیں یا اس چیز کی جو ان کے نفس چاہتے ہیں۔ (النجم:۲۳)

کیا آپ کو اس شخص کا پتہ ہے جس نے نفس کی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے۔ (الجاثیہ:۲۳)

یہ اور اس طرح کی متعدد آیات میں نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام و فرائض جن میں نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اور تمام حقوق العباد شامل ہیں ان کا انکار یا ترک بھی اکثر اوقات نفسانی خواہشات کی پیروی کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ اس طرح برائیوں کا ارتکاب جیسے زنا' شراب اور جوا' یا ظلم' ناانصافی اور بداخلاقی کے تمام اعمال بھی خواہشات نفس کی پیروی میں ہی کئے جاتے ہیں۔ آپ مزید تفصیل کے لئے قرآن کی مذکورہ آیات کا مطالعہ کریں۔

السلام علیکم کی بجائے صرف سلام کہنا جائز ہے؟

سوال: بیکی فیکس سے زین العابدین دریافت کرتے ہیں

"السلام علیکم کی بجائے کچھ لوگ "سلام علیکم" کہتے ہیں اور کچھ صرف سلام اور جواب میں سلام کہا جاتا ہے کیا یہ جائز ہے؟

جواب: "سلام علیکم" کہا جا سکتا ہے مگر اسے عادت نہیں بنانا چاہئے۔ جو الفاظ تواتر سے ثابت ہیں وہ "السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" ہیں۔ صرف "السلام علیکم" بھی درست ہے لیکن صرف "سلام" کہنا یہ درست نہیں بلکہ ناجائز ہے۔ یہ ماڈرن بدعت ہے جو مسلمانوں میں پھیل رہی ہے اس سے بچنا چاہئے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب کسی کو

سلام کہو تو اچھے الفاظ سے کہو اور جواب اس سے بہتر دو اور وہ بہتر الفاظ سنت سے یہی ثابت ہیں "السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ"

دنیا میں سزا کے بعد آخرت کا عذاب ہو گا؟

سوال: محمد اسلم لندن سے دریافت کرتے ہیں کہ جس شخص کو دنیا میں اس کے جرم کی سزا مل جاتی ہے۔ اور قانون کے مطابق وہ سزا پوری کر لیتا ہے کیا آخرت میں اس سے باز پرس ہو گی اور دوبارہ عذاب نہیں ہو گا؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔

جواب: اسلام میں سزا کے بارے میں دو نقطہ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے گناہوں کا کفارہ بھی ہو جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ محض ڈرانے اور تنبیہ کے لئے ہے گناہوں کی معافی کے لئے توبہ ضروری ہے اور زیادہ صحیح اور قرین قیاس یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ جرم اور گناہ کی سزا بھگتنے کے ساتھ جو شخص خالص توبہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ یقیناً اسے آخرت کے عذاب سے بچائے گا۔

اس سلسلے میں مسلم شریف کی وہ حدیث جو حضرت ماعزا سلمیؓ کے بارے میں ہے تائید کرتی ہے کہ ان پر حد جاری ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا لقد تاب توبة لو قسمت بين لوسعتهم[1] کہ انہوں نے ایسی توبہ کی جسے اگر اس امت کے گناہ گاروں پر تقسیم کیا جائے تو ان سب کے لئے کافی ہو گی۔

غامدیہ کی حدیث جو مسلم شریف ہے اس میں یہ مذکور ہے کہ حد جاری ہونے کے بعد رسول کریم ﷺ نے جب ان کی نماز جنازہ پڑھی تو حضرت عمر فاروق نے کہا کہ آپ اس عورت کا جنازہ پڑھ رہے ہیں جس نے زنا کا ارتکاب کیا تو آنحضرت

---

[1] مسلم مترجم ج۲ کتاب الحدود باب حد الزنا ص۳۲۶

ﷺ نے فرمایا:

لقد تاب توبة لو قسمت بين سبعين من اهل المدينة لوسعتهم[1]

کہ اس نے ایسی توبہ کی کہ اگر اسے مدینہ کے ۷۰ آدمیوں پر تقسیم کیا جائے تو سب کے لئے کافی ہے۔

قرآن کریم میں جہاں باغیوں اور فسادیوں کی سزاؤں کا ذکر ہے وہاں انہیں دنیا کے عذاب کے ساتھ آخرت کے عذاب کی نوید بھی سنائی گئی ہے چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ (المائدہ : ۳۳)

یعنی وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد بپا کرتے ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے یا وہ سولی پر لٹکا دیئے جائیں یا ان کے مختلف ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہو گا۔

اس آیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر سزا کے ساتھ توبہ شامل نہیں تو انہیں آخرت کا عذاب بہر حال دیکھنا ہو گا۔

اس سلسلے میں بخاری شریف میں جو حضرت عبادہ بن صامتؓ کی حدیث ہے جس میں صرف سزا کا ذکر ہے اس سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ محض سزا ہی گناہ کا کفارہ بن سکتی ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں

ان رسول الله ﷺ قال و حوله عصابة من اصحابه بايعوني على

---

[1] مسلم مترجم ج ۲ کتاب الحدود باب حد الزنا ص ۳۲۶

الا تشرکوا باللہ شیئا و لا تسرفوا و لا تزنوا و لا تقتلوا اولادکم و لا تاتوا ببھتان تفترونہ بین ایدیکم و ارجلکم و تعصوا فی معروف فمن و فی منکم فاجرہ علی اللہ و من اصاب من ذلک شیئا فعوقب بہ فی الدنیا فھو کفارۃ لہ ومن اصاب من ذلک شیئا ثم سترہ اللہ فھو الی اللہ ان شاء عفا عنہ و ان شاء عاقبہ فبایعناہ علی ذلک۔[1]

حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے گرد صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت بیٹھی تھی اور آپ فرما رہے تھے کہ تمہیں میرے ساتھ یہ عہد کرنا ہوگا (یعنی میری بیعت کرو) کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھراؤ گے' مال میں اسراف سے کام نہیں لو گے' زنا کا ارتکاب نہیں کرو گے' اپنی اولادوں کو قتل نہیں کرو گے اور آگے یا پیچھے کسی پر بہتان نہیں لگاؤ گے اور نیکی کے کاموں میں مخالفت نہیں کرو گے۔ جس نے اس عہد کو پورا کیا تو اللہ اسے اس کا ضرور اجر دے گا اور جس کسی نے ان میں سے کسی جرم کا ارتکاب کر لیا پھر اسے اس کی دنیا میں سزا بھی دے دی گئی تو وہ اس کے لئے گناہ سے کفارہ ہو گی اور جس کسی نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا پھر اللہ نے اس کے جرم پر پردہ ڈال دیا (یعنی کسی کو پتہ نہ چل سکا) تو اسے اللہ چاہے تو معاف کر دے اور چاہے تو سزا دے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے ان باتوں پر حضور ﷺ سے بیعت کی۔

اب یہ صحیح ہے کہ اس حدیث میں بظاہر توبہ کا ذکر نہیں لیکن سیاق و سباق' قرآنی آیت اور دوسری احادیث سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ کفارہ تو دراصل توبہ ہی سے ہو گا کیونکہ اس روایت میں بھی حضور ﷺ نے یہ عہد مومنین سے لیا اور ظاہر ہے مومن سے جو گناہ سرزد ہوتا ہے اور پھر اس کو اس کی سزا ملتی ہے تو وہ یقیناً شرمندہ

[1] مشکوۃ للالبانی ج ۱ کتاب الایمان ص ۱۳ رقم الحدیث ۱۷

ہوتا ہے اور حقیقت میں اس ندامت اور شرمندگی کا نام ہی توبہ ہے۔

شفعہ کن حالات میں جائز ہے؟

سوال: برمنگھم سے محمد اسلم اور ارشاد لکھتے ہیں آپ قانون شفعہ پر شریعت کے مطابق روشنی ڈالیں کہ اسلام میں شفعہ جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کس کو اور کن حالات میں اور شفعہ اسلام میں کتنے عرصہ تک کرنا جائز ہے۔ کچھ دن یا مہینے یا سال تک؟

جواب: شفعہ شریعت میں اس حق کو کہتے ہیں جو کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے مقابلے میں کسی غیر منقولہ جائیداد کو خریدنے میں رکھتا ہے۔ غیر منقولہ جائیداد میں زمین، مکان، دکان، کنواں اور تالاب وغیرہ شامل ہیں۔ اسلام میں شفعہ درج ذیل تین آدمیوں کے لئے کرنا جائز ہے۔

۱۔ شریک: وہ شخص جو کسی دوسرے آدمی کی زمین یا مکان میں شریک ہے اور وہ جائیداد تقسیم نہیں ہوئی ایسی صورت میں اگر وہ شخص اپنے حصے کی جائیداد فروخت کرتا ہے تو اس کے دوسرے ساتھی کو یہاں شفعہ کا حق حاصل ہے یعنی عدالت میں یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں اس جائیداد کو خریدنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ میں اس میں شریک ہوں۔

۲۔ خلیط: وہ شخص ہے جو کسی جائیداد کے مالک کے ساتھ شریک تو نہیں لیکن بعض مشترکہ چیزوں میں وہ دونوں ایک طرح کا حق رکھتے ہیں مثلاً دونوں کا راستہ ایک ہے، پانی مشترک ہے۔ ان میں سے اگر ایک جائیداد فروخت کرتا ہے تو دوسرے کو اس کے خریدنے کا زیادہ حق ہے۔ کوئی غیر شخص خریدے تو یہ شخص اس کے خلاف حق شفعہ کا دعویٰ دائر کر سکتا ہے۔

یہ دونوں صورتیں تو متفق علیہ ہیں۔ان میں کوئی اختلاف نہیں لیکن تیسری شکل میں اختلاف ہے۔

۳۔ جار: یعنی پڑوس کی وجہ سے کسی کو شفعہ کا حق حاصل ہو جائے۔ مثلاً دونوں کی زمین ایک دوسرے سے متصل ہے' مکان ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں تو یہاں پڑوسی کو دوسروں کے مقابلے میں خریدنے کا استحقاق ہوگا لیکن بعض علماء کے نزدیک جب رسول اکرم ﷺ نے یہ فرمادیا کہ

الشفعة فی کل ما لم یقسم فاذا وقعت الحدود و حرمت الطرق فلا شفعة۔ [1]

یعنی شفعہ تو اس غیر منقولہ جائیداد میں ہے جو شرکاء میں تقسیم نہیں ہوئی۔ جب حدود متعین ہو جائیں اور راستے مختلف ہو جائیں تو پھر شفعہ کا حق نہیں۔

تو اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب جائیداد تقسیم ہو جائے اور راستے بھی الگ الگ ہوں تو پھر شفعہ کا حق باقی نہیں رہتا جب کہ دوسروں کے نزدیک پڑوسی کو محض متصل ہونے کی وجہ سے شفعہ کا حق مل جائے گا۔

جو جائیداد مسجد یا کسی مذہبی اور خیراتی ادارے کے لئے وقف کی گئی ہو اس میں حقہ شفعہ نہیں ہوگا اسی طرح جو جائیداد حکومت کسی قانون کے تحت حاصل کرے اس میں بھی حق شفعہ نہیں ہوگا۔

جہاں تک شفعہ کے وقت کا تعلق ہے تو جو آدمی موجود ہو اسے جونہی اس جائیداد کے فروخت ہونے کا علم ہو تو اسے فوراً شفعہ کر دینا چاہئے یا گواہ بنا کر حق شفعہ کا دعویٰ دائر کرنے کا اعلان کر دینا چاہئے اور جو شخص غیر حاضر ہے یا اسے اس سودے کا علم نہیں ہوا تو اسے جب پتہ چلے یا جب وہ واپس آئے تو اسے شفعہ کا حق حاصل ہوگا۔ اگر علم ہونے کے باوجود اس نے نہ دعویٰ کیا نہ گواہوں کے سامنے اعلان یا اس خواہش کا اظہار

---

[1] فتح الباری ج۵ کتاب الشفعة باب الشفعة فی کل مالم یقسم ص۱۹۲ رقم الحدیث ۲۲۵۷

کیا کہ وہ حق شفعہ کرے گا تو بعد میں ایسے شخص کو حق شفعہ حاصل نہ رہے گا اسے علم ہوتے ہی فوراً اپنے ارادے کا اظہار کرنا چاہئے تھا۔ شفعہ کے حق کے تبصرے میں اصل بنیاد وہ حدیث ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے۔

پاکستان میں حق شفعہ کے سابقہ قوانین شریعت اسلامیہ کے مطابق نہ تھے۔ایک انگریز حکومت کے زمانے کا قانون تھا یعنی حق شفعہ پنجاب مجریہ ۱۹۳۱ء کا ایکٹ نمبر۱۔ دوسرا شفعہ شمالی مغربی سرحدی صوبہ مجریہ ۱۹۵۰ء کا ایکٹ نمبر ۱۴۔

اب موجودہ حکومت نے شفعہ کا آرڈر مجریہ ۱۹۸۰ء جاری کیا ہے جو اسلامی مشاورتی کونسل نے شریعت اسلامی کی روشنی میں تیار کیا ہے اس کے نفاذ کے ساتھ ہی پہلے تمام قوانین اور ایکٹ جو شفعہ کے بارے میں تھے وہ منسوخ کر دیئے گئے ہیں۔

قسم توڑنے کا کفارہ کیسے ادا کرے؟

سوال: ویسٹ برلن (مغربی جرمنی) سے متعدد ساتھی ایک مشترکہ خط میں لکھتے ہیں کہ ہم چند ساتھی "صراط مستقیم" کا ہر ماہ باقاعدگی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ آپ کا جریدہ ماشاءاللہ بہت اچھا ہے اور ہم تشنہ لوگوں کی پیاس بجھا رہا ہے۔ ہم اللہ کے حضور دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس پر فتن دور میں مزید کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

قسم کے بارے میں کیا ارشادات ہیں جبکہ بکر ہر بات پر قسم کھاتا ہے اور پھر اس قسم کو توڑتا رہتا ہے۔ وہ اس فعل کو ان گنت مرتبہ دہراتا رہتا ہے اور آخر وہ ایک دن مکمل توبہ کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ گزشتہ تمام قسموں کا کفارہ ادا کرے جب کہ اسے یاد نہیں ہوتا کہ اس نے کتنی مرتبہ قسمیں توڑی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ کیسے کفارہ ادا کرے اور کفارہ کی کپڑے روپے اور کھانے کی صورت میں کیا مقدار ہے؟ اور کفارہ کے

حق دار کون لوگ ہیں؟

جواب: آپ نے قسم کے بارے میں جو پوچھا کہ اگر بکر بار بار قسم کھا کر توڑتا ہے تو اس کے کفارے کی شکل کیا ہوگی۔ یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی نیت کیا ہے۔ اگر وہ یوں ہی عادتاً بار بار قسم کھاتا ہے یا قسم کے الفاظ کثرت سے بولتا رہتا ہے تو اس پر تو سرے سے کوئی کفارہ نہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ (البقرة : ٢٢٥)

اور اگر وہ قسم کی نیت سے ایسے الفاظ کہتا ہے۔

اور پھر اسے توڑتا ہے تو اس پر کفارہ واجب ہے اور جو اس نے بار بار قسمیں کھائی ہیں اگر وہ ایک ہی کام یا معاملے کے بارے میں ہیں تو پھر آخر میں ایک ہی قسم کا کفارہ دینا ہوگا اور اگر مختلف معاملات میں الگ الگ قسمیں کھاتا رہا ہے تو پھر الگ الگ کفارہ ہوگا اور اگر اسے یاد ہی نہیں کہ اس نے کتنی بار قسمیں توڑی ہیں پھر بھی ایک قسم کا کفارہ دے کر آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے۔

کفارہ ادا کرنے کی اشکال درج ذیل ہیں:

ارشاد قرآنی ہے "اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو درمیانے درجے کا کھانا کھلایا جائے جیسا کہ تم خود اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو یا مساکین کو کپڑے پہنا دے یا ایک غلام آزاد کر دے جس کو یہ چیزیں میسر نہ ہو تو وہ تین دن کے روزے رکھ لے"

(المائدہ : ۸۹)

مقدار واضح ہے کہ دس مسکینوں کو ایک بار بٹھا کر کھانا کھلا دے یا ایک مسکین کو دس بار کھانا کھلا دے یا اس کھانے کے برابر رقم دے دے، جس سے وہ دس مرتبہ کھانا کھا سکتے ہیں یا دس مساکین کو کپڑے بنوا کر دے۔ اگر یہ مالی کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہے تو پھر تین دن کے لگاتار روزے رکھ کر قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرے۔

جہاں تک مستحقین کا سوال ہے تو اس کے حقدار وہ سارے لوگ ہو سکتے ہیں جن

کے پاس کھانے پینے کے لئے ضرورت کے مطابق سامان نہیں اور جو ضروریات زندگی سے محروم ہیں۔

روٹی کے ٹکڑوں کو کیا کریں؟

سوال: کسی صاحب نے پوچھا ہے
یہاں بچے ہوئے روٹی کے ٹکڑوں کو دوبارہ استعمال نہ کیا جائے تو پھر کیا کرنا چاہیئے جبکہ دفن کے لئے جگہ بھی نہ ہو۔

جواب: رزق اور کھانے پینے کی اشیاء اللہ کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ اس نعمت کی ناشکری بہت بڑا گناہ ہے۔ بچی ہوئی روٹی' سالن یا کسی دوسری چیز کو پھینک دینا' یہ بھی ناشکری کے ضمن میں آتا ہے- کتنے ایسے لوگ ہیں جو سوکھی ہوئی روٹی کو بھی ترستے ہیں۔ کتنے ایسے مفلوک الحال ہیں جو مہینوں سالن کو ترستے رہتے ہیں اور کتنے ایسے غریب ہیں جو مہینوں پھلوں کی شکل نہیں دیکھتے یہاں بعض لوگ بچی ہوئی روٹی کے ٹکرے جانوروں کو کھلاتے ہیں' بعض چڑیوں جیسے پرندوں کے لئے باہر رکھ دیتے ہیں اور بعض دوبارہ کسی نہ کسی چیز میں استعمال کر لیتے ہیں۔ یہ تینوں طریقے درست اور مفید ہیں لیکن انہیں جلادینا یا پھر دفن کر دینا مستحسن معلوم نہیں ہوتا۔ اگر مجبوری ہو تو الگ بات ہے لیکن اس کے باوجود کوشش کرنی چاہیئے کہ اسے دوبارہ کسی مصرف میں لایا جائے۔ امور خانہ داری سے دلچسپی رکھنے والی خواتین خشک روٹی کو دوبارہ استعمال کرنے کے لئے متعدد طریقوں سے کام لیتی ہیں۔ بہر حال مجبوری کے بغیر جلانا یا پھینکنا جائز نہیں۔ اگر روٹی بچ جائے تو دوسرے وقت کم پکائیں اور بچی ہوئی ساتھ استعمال کرلیں اس میں نہ کوئی قباحت ہے نہ نقصان۔

ہندوؤں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں کھا سکتے ہیں؟

سوال: نارتھ ہمپٹن سے واجد علی صاحب لکھتے ہیں

کیا ہندو مذہب کے لوگوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں کھانا جائز ہے؟ مثلاً یہاں پر ہندوؤں کی مٹھائی وغیرہ کی دوکانیں ہیں۔ کیا ان کی چیزیں کھائی جاسکتی ہیں؟ اس کے علاوہ یہاں انگریزوں کے تمام بسکٹس اور کیکس میں بھی جانوروں کی چربی ہوتی ہے جو میں بھی لاعلمی میں کھاتا رہا ہوں۔ کیا اس کے لئے توبہ کرلینا ہی کافی ہے۔ آپ بھی لوگوں کو اس بارے میں آگاہ کریں۔

جواب: غیر مسلموں کے ہاتھوں کی بنی ہوئی چیزوں کو کھانے سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہئے اور خاص طور پر جب کسی چیز کے بارے میں شبہ ہو تو اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ ہاں غیر مسلموں کی تیار کردہ خشک اشیاء جن میں کسی حرام شے کی آمیزش کا اندیشہ نہ ہو' ایسی چیزوں کو کھانے پینے میں کوئی حرج نہیں۔ ہندو یا عیسائی اگر مٹھائی یا اس طرح کی دوسری چیزیں بنانے میں طہارت وپاکیزگی کی پابندی کرتے ہیں تو پھر ان کی تیار کردہ چیزیں استعمال کی جاسکتی ہیں اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ طہارت و صفائی کے اسلامی اصولوں کی پرواہ نہیں کرتے اور ان کے گندے ہاتھوں پر پلید جسم کی تاثیر کسی نہ کسی انداز سے ان چیزوں میں بھی آجاتی ہے تو ایسی صورت میں ان کی بنائی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

جن چیزوں میں حرام جانوروں کی چربی استعمال ہوتی ہے ان کا کھانا حرام ہے لاعلمی میں جو کام ہو جائیں ان پر گرفت نہیں ہوگی۔ پھر بھی توبہ کرلینا بہتر ہے۔

غیر مسلموں کو سلام کیسے کہنا چاہیئے؟

سوال: ہنسلو سے ایک بہن پوچھتی ہیں کہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کی طرح السلام علیکم کہنا چاہیئے یا اس کا کوئی دوسرا طریقہ ہے؟

جواب: غیر مسلموں کو سلام کرنے میں اگر ابتداء کی جائے یا انہیں مخاطب کیا جائے تو السلام علیکم کی بجائے والسلام علی من اتبع الھدی کہنا چاہیئے۔ حدیث میں بادشاہوں کے نام جو خطوط لکھے تھے ان میں انہی الفاظ کے ساتھ مخاطب کیا گیا تھا' والسلام علی من اتبع الھدی (بخاری کتاب بدء الوحی) یعنی سلامتی ہو اس شخص پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ قیصر و کسری اور جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب کو جو خطوط آپ کی طرف سے بھیجے گئے۔ ان میں اسی طرح سلام لکھا گیا اس لئے یہی سنت قرار پائی کہ جب مسلمانوں سے ملو خط لکھو یا مخاطب کرو تو السلام علیکم کہو اور جب غیر مسلم سے اس طرز کا واسطہ پڑے تو انہیں السلام علی من اتبع الھدی کہو۔ بعض اوقات غیر مسلم کی طرف سے سلام کی ابتدا کی جاتی ہے یا وہ مسلمان کو السلام علیکم کہتا ہے تو اس کے جواب میں بھی بجائے وعلیکم السلام کے صرف وعلیکم کہنا چاہیئے۔ حدیث میں آتا ہے حضور ﷺ نے بعض غیر مسلموں کے سلام کے جواب میں یہ الفاظ فرمائے' جس کا مطلب ہے "اور تم پر وہ چیز ہو جس کے تم مستحق ہو"

درج ذیل احادیث سے مسئلے کی وضاحت مزید ہو جاتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

لا تبدوا الیھود والنصاری بالسلام[1]

کہ یہود و نصاریٰ کو السلام علیکم کہنے میں پہل نہ کرو اور اگر وہ کہہ دیں تو

---

[1] مسلم کتاب السلام باب النھی عن ابتداء اھل الکتاب بالسلام ۲۱۶۷/۱۳

دوسری حدیث میں ہے

اذا سلم علیکم اهل الکتاب فقولوا وعلیکم[1]

جب اہل کتاب میں سے تمہیں کوئی سلام کہے تو تم جواب میں صرف وعلیکم کہو۔

تیسری حدیث میں حضرت اسامہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ایک مجلس کے پاس سے گزرے جس میں مسلمان' مشرک اور یہود مختلف مذاہب کے لوگ موجود تھے تو وہاں نبی ﷺ نے السلام علیکم کہا۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلمان کسی مجلس میں جائے یا ان کو مشترکہ طور پر مخاطب کرے تو ایسے موقع پر جائز ہے کہ ان مسلمانوں کی وجہ سے جو اس اجتماع میں شریک ہیں' سب کو السلام علیکم کہا جائے۔

شیخ احمد کے خواب کی حقیقت

سوال: نیوکاسل سے خواجہ مبشر احمد نے مدینہ کے کسی شیخ احمد کے خواب کے بارے میں وہ اشتہار بھیجا ہے جس میں توبہ کی ترغیب ہے اور جسے لوگ یہاں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے اس خواب کی دینی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا ہے کہ اس پر عمل نہ کیا جائے تو کیا مسلمان واقعی قیامت کے دن اللہ کی رحمت سے ناامید ہوگا؟

جواب: برصغیر پاکستان و ہندوستان میں گذشتہ کئی سالوں سے شیخ احمد کے خواب کے نام سے ایک اشتہار تقسیم کیا جارہا ہے جو محض ایک من گھڑت کہانی ہے۔ اس کے اندر دی گئی بشارتیں اور دھمکیاں کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتیں۔ معمولی دینی سوجھ

---

[1] بخاری کتاب الاستئذان باب کیف الرد علی اهل الذمة ٦٢٥٨ ۔ و مسلم کتاب السلام باب النهی عن ابتداء اهل الکتاب بالسلام ٢١٦٣/٦

بوجھ رکھنے والا آدمی ایسے خوابوں کی حقیقت سے آشنا ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود کم علم اور توہم پرست قسم کے لوگ اس وصیت کو آسمانی وحی سمجھ کر اس پر نہ صرف ایمان لے آتے ہیں بلکہ اس کو پھیلانے کے لئے محنت بھی کرتے ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ وصیت مشہور کی گئی اس زمانے میں شیخ احمد کے نام سے مدینہ منورہ میں کسی آدمی کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور خود اہل مدینہ اس بارے میں بے خبر نظر آتے ہیں۔

(۲) دوسری یہ کہ رسول اکرم ﷺ دنیا سے جب تشریف لے گئے تو دین اسلام مکمل ہو چکا تھا۔ آپ انسانوں کی راہ نمائی اور ان کی دنیا و آخرت میں بھلائی کی ہر چیز کو بیان فرما گئے ہیں اس میں ترغیب بھی ہے ترہیب بھی۔ جنت کے وعدے بھی کئے گئے اور جہنم کے عذاب سے ڈرایا بھی گیا۔ توبہ کرنے کی بار بار تاکید بھی کی گئی اور گناہوں کے بدانجام سے خبردار بھی کیا گیا۔ دین مکمل ہونے کے بعد آپ خود یہ ارشاد فرما گئے کہ میں دو چیزیں تم میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جب تک تم انہیں مضبوطی سے تھام کر رکھو گے تم کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ کیا اتنی واضح ہدایات کے بعد اس بات کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ آپ اس کے بعد امت کو خوابوں کے ذریعے کسی بات کی ترغیب دیں یا کسی بات سے ڈرائیں؟

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے بعد سب سے پاکیزہ ہستیاں آپ کے صحابہ کرامؓ تھے جنہیں آپ کے جانے کے بعد عظیم خلاء محسوس ہوا۔ انہیں کئی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ بعض غلط فہمیوں کی بنا پر اختلاف بھی پیدا ہوئے اور ناخوش گوار واقعات بھی رونما ہوئے مگر اس کے باوجود نہ کسی صحابی کی عالم بیداری میں آپ سے ملاقات ہوئی اور نہ کسی کو خواب میں آپ نے کوئی پیغام دیا اور نہ کوئی وصیت کی اور صحابہ کرامؓ نے اپنے ان مسائل کو حضورؐ ہی کی چھوڑی ہوئی دو چیزوں قرآن وحدیث کے ذریعے حل کرنے کی کوشش فرمائی۔ لہٰذا اس کے بعد بھی کسی کے لئے کوئی گنجائش نہیں کہ وہ وحی کے انداز کی اس طرح کی پیشین گوئیوں کے

وعدے کرے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں ان لوگوں کو سخت تنبیہ فرمائی جو آپ کی طرف غلط بات منسوب کر دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا جو ایسی بات میری طرف منسوب کرے گا جو میں نے نہیں کہی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اسی لئے محدثین نے پوری چھان بین کے بعد ہی ایسی باتوں کو قبول کیا جن کی نسبت رسول اکرم ﷺ کی طرف کی گئی۔ ایسی صورت میں اس وصیت یا خواب کی کیا حیثیت ہو گی جس کی نہ کوئی سند ہے نہ کوئی حوالہ۔

(۵) پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ اس وصیت نامے کے بارے میں جو یہ کہا گیا ہے کہ اسے چھپوا کر آگے تقسیم کرے گا یا آگے پہنچائے گا اسے فلاں فلاں چیز ملے گی یا مال دار ہو گا اور پندرہ دن کے اندر خوش حال ہو جائے گا اور جو اس کو چھپوا کر یا لکھ کر آگے تقسیم نہیں کرے گا اس کا بیٹا مر جائے گا یا غم میں مبتلا ہو گا۔

یہ اور اس طرح کی دوسری باتیں جو اس کاغذ میں لکھی گئی ہیں یہی اس کے جھوٹ اور من گھڑت ہونے کی دلیل ہیں۔ آپ خود اندازہ کریں کہ کیا قرآن حکیم سے بھی یہ کاغذ کا پرزہ افضل اور بہتر ہے کوئی مسلمان کتنا بھی گیا گزرا کیوں نہ ہو وہ اس اشتہار کو قرآن سے افضل ہرگز قرار نہیں دے سکتا اور یہ بھی ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ قرآن میں دنیا و آخرت کی بھلائی کی ہر چیز موجود ہے مگر اس کے باوجود آج تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جو قرآن کو چھپوا کر تقسیم کرے گا اسے اتنی دولت مل جائے گی یا پندرہ دن کے اندر مال دار ہو جائے گا اور جو نہیں چھپوائے گا یا نہیں لکھے گا اسے فلاں فلاں انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ بے شمار وہ لوگ جن کے سینوں میں قرآن کے تیس پارے محفوظ ہیں مگر اس کے باوجود دنیاوی خوش حالی سے محروم ہوتے ہیں اور مال دار نہیں ہوتے اور پھر واقعات کی روشنی میں بھی یہ خواب غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ کتنے ایسے لوگ آج موجود ہیں جنہوں نے اس کی سینکڑوں اور ہزاروں کاپیاں کروا کر تقسیم کیں مگر اس کے باوجود نہ وہ خوش حال ہوئے اور نہ پندرہ دن کے اندر

دولت مند بن سکے اور کتنے ایسے ہیں جو اسے آگے تقسیم نہیں کرتے مگر نہ ان کا بیٹا مرا ہے اور نہ وہ غم میں مبتلا ہوئے ہیں۔

اس لئے مسلمانوں کو اس طرح کی توہم پرستیوں میں مبتلا ہونے کی بجائے قرآن و حدیث کی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور اپنی زندگی سرور دو عالم ﷺ اور آپ کے جاںنثاروں کے نقش قدم پر چل کر گزارنی چاہیے۔ اسی میں دنیا و آخرت کی بھلائیاں ہیں اور یہی چیز کامیابی و نجات کا ذریعہ بھی ہے۔